سال نو مبارک
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
جنوری 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد 43 • شمارہ 01 • جنوری 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر وپروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

نئے سال کا پہلا شمارہ اور سالگرہ نمبر آپ کے ذوق کی نذر... ترقی پذیر جمہوری ممالک میں حکمرانوں اور مقتدر سیاست دانوں کو بُرا بھلا کہنا اور ان کی سیاہ کاریوں پر بے رحمانہ تنقید کرنا ایک فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے لیکن ہم، یعنی میں اور آپ یہ نہیں سوچتے کہ انہیں اپنے سروں پر مسلط کرنے کا گناہ ہم ہی سے سرزد ہوتا ہے۔ انتخابات میں دھاندلیاں ضرور ہوتی ہوں گی مگر باخبری کے اس دور میں جھرلو کا اعادہ ناممکن ہے۔ دو چار ہزار جعلی ووٹ بھگتا بھی لیے جائیں تو مقامی سطح پر کچھ اونچ نیچ ہو سکتی ہے لیکن مجموعی نتائج میں کوئی بڑا الٹ پھیر ممکن نہیں... ایسی دھاندلی ہر حلقے کے ہر پولنگ اسٹیشن پر کسی صورت میں ممکن نہیں۔ یہ ہم سب کی اجتماعی ذمے داری ہے کہ انفرادی طور پر اپنا ووٹ موزوں ترین امیدوار کے حق میں استعمال کریں۔ یہی بات ایٹمی سائنس داں، ڈاکٹر عبدالقدیر خان تواتر سے کہہ رہے ہیں بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ہدایت بھی کر رہے ہیں کہ پیشہ ور الیکشن بازوں اور سیاسی بازی گروں سے نجات کے لیے بے داغ ماضی کے حامل محبِ وطن افراد میدان میں آ جائیں۔ قطرہ قطرہ دریا می شود کے مصداق ایک ایک ووٹ مل کر جمہوری اکثریت کو جنم دیتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارا اکلوتا ووٹ ملکی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ یہ پاکستان کے ہر ووٹر کی ذاتی ذمے داری ہے کہ وہ 2013ء میں آنے والے الیکشن میں ایسے امیدوار کو ووٹ دے جس کا دامن کرپشن، بے راہ روی، اقربا پروری اور دوسرے بدنما داغوں سے پاک ہو۔ لاٹھی اور بھینس کا دور گزر گیا۔ اب صرف اور صرف ووٹ کی طاقت سے پاکستان میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور لائی جانی چاہیے۔ اپنے قارئین کو سالِ نو، قائداعظم کے یومِ پیدائش اور کرسمس کی سہ جہتی مبارکباد دیتے ہوئے ہم دست بدعا ہیں کہ آنے والے سال میں ہمیں من حیث القوم ہمہ جہت خوشیاں نصیب ہوں۔ آمین

نیو ائیر کی محفل میں دیکھتے ہیں کیا رنگینیاں منتظر ہیں۔

خان بوائز ہاسٹل اچھرہ لاہور سے زیب حسن کی فرمائش ''تین سال سے میں سسپنس اور جاسوسی میں خط لکھ رہا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ سال میں ایک یا دو دفعہ حاضری لگواتا ہوں۔ دو مرتبہ بک اسٹال کے چکر لگانے کے بعد آخر 4 تاریخ کو جاسوسی کے درشن ہوئے۔ سرورق کی حسینہ بلاشبہ نہایت ہی حسین تھی اور میرا خیال ہے کہ یہ ذاکر انکل کے بنائے گئے تمام ٹائٹلوں میں حسین ترین حسینہ ہے۔ میں مصوری وغیرہ بھی کر لیتا ہوں اور یہ خط لکھنے کے بعد اس خوب صورت نازنین کو اپنے ہاتھوں سے کاغذ پر منتقل کرنے کا ارادہ ہے۔ سب سے پہلے نکتہ چینی میں انکل کا اداریہ پڑھا۔ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں کہ تبدیلی ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اب عوام میں اتنا شعور ہے کہ وہ کسی اچھے انسان کو منتخب کر سکیں۔ اور یس احمد خان کی بی بی سی آرا واقعی نپی تلی آرا تھیں، بہرکیف کرسیِ صدارت پر براجمان ہونے پر مبارک باد قبول کریں۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بے حد پسند آئے۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو یہ خط میں نے للکار کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے لکھا ہے۔ محبت کے سفیر شہنشاہِ مغل کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ للکار کو ہمیشہ میں رات کو پڑھتا ہوں کیونکہ رات کے وقت للکار پڑھنے سے بڑی جس (مزہ) آتی ہے۔ تابش کی لازوال محبت، جذبات، ہجر و وصل، دوستی، ایکشن اور عمران کا ساتھ، دل کرتا ہے نہ رات ختم ہو نہ للکار ختم ہو۔ اس قسط میں تابش صاحب پھر دیارِ غیر میں اک نئے پھندے میں پڑ گئے ہیں۔ خیر ایک بات باعثِ راحت تھی کہ ثروت کی تھوڑی دیر کی قربت تو ملی نا۔ باقی تابش کی خود اذیتی اور تنہائی دیکھ کے مجھے اپنا شعر یاد آ گیا۔

ان گنت تمناؤں میں اک عجب تمنا یہ بھی تھی
اندھیروں کا نگر ہو اور میں تنہا بھٹکتا پھروں

بدقسمت، نہایت ہی زبردست تحریر تھی۔ کاشف زبیر صاحب میرے فیورٹ رائٹرز میں سے ہیں۔ گرداب پہلی قسط سے لگا تھا کہ اچھا جائے گی لیکن محترمہ اسما قادری صاحبہ نے اسٹوری کو اتنا گھمایا پھرایا اور کرداروں کی بھرمار ہے کہ بس پڑھ لیتے ہیں۔ گرداب میں دلچسپی کا پہلو صرف چودھری افتخار عالم، شہریار اور ماہ بانو کی خاموش محبت تھی جبکہ شہریار کو اے سی سے سیکرٹ ایجنٹ بنا دیا گیا ہے۔ مختصر کہانیوں میں آخری جیت زبردست اور دلچسپ کہانی تھی۔ الٹ پھیر بھی دلچسپی سے لبریز تھی۔ مریم کے خان کی تخلیق دلچسپ اور شاندار کاوش تھی۔ مینا کا کردار پسند آیا۔''

علی پور چٹھہ سے ثاقب تبسم نگینہ کا محبت نامہ ''2012ء کا آخری جاسوس نامہ 5 دسمبر کو نظروں سے ہوتا ہوا ہاتھوں میں آیا تو بے قراری اور سرشاری کی کیفیات دل کے سمندر میں موجزن ہو گئیں۔ دل کش اور نکھرا ہوا سرورق جاذبِ نظر تھا۔ دسمبر کی مکمل خنکی کے باوجود سرورق پر کسی طرح کی ٹھنڈک کے آثار نظر نہ آئے تو قدرے حیرت ہوئی۔ تاہم نیم جان اور خستہ حال مردانہ بازو اور ہاتھ سے بے گرفت ہونے والا ریوالور دیکھ کر محسوس ہوا کہ خیالات اور جذبات کی سرد مہری حسبِ سابق برقرار ہے۔ اسی خیال کے تحت میرا ایک شعر فوراً ذہن کی وادی میں اُترا۔

روح کی اذیت کڑی ہے جسم کی سنگ باری سے
تیری سرد مہری بہت آگے ہے مری کی برف باری سے

(واہ بھی کیا کہنے) اس مسحور کن سرورق کے حصار سے جلدی جلدی نکلنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ محترمہ طاہرہ گلزار پہلے ہی پابندی لگا چکی ہیں کہ میں کسی حسینہ پر فتنہ و فساد اور وجۂ جنگ و جدل کو اتنی باریک بینی سے نہ دیکھا کروں۔ لیجیے صاحب! ہم نہیں دیکھتے، چھوڑ دیتے ہیں، آپ خوش رہیں۔ البتہ محفل خاص میں جناب ادریس احمد خان کی جیت کی خوشی میں بھی ہم خوش ہوئے۔ ادریس صاحب آپ کو بہت مبارک ہو کہ آپ کی نپی تلی رائے نے میدان مار لیا۔ شکیل حسین کاظمی کا شکریہ جنھوں نے ہمیں حق دار سمجھا اور مانا۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ اختر عباس اور ظفر اقبال نے دو ناموں کے ساتھ ایک تبصرہ بھیج کر کفایت شعاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ فی زمانہ جہاں سے بھی ہو، بچت ضروری ہے۔ ماہا ایمان جی! آپ کا طویل تبصرہ خوب صورت تھا، آپ کو کیسے پتا کہ میں صاحب کتاب ہوں؟ میں نے جاسوسی میں تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ آپ نے تعریف کی، آپ کا شکریہ۔ اچھے جملے تھے آپ کے لیکن لت پڑنا والا جملہ پسند نہیں آیا کیوں کہ یہ محاورہ کسی برائی کی عادت کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ جاسوسی یا سسپنس پڑھنا کسی صورت بھی برا کام نہیں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے آمین۔ دلنشین بلوچ! آپ کا بھی شکریہ۔ خیریت رہی ہے اسی لیے دوبارہ آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ حدیثہ کرن اور علی فیض رسول نے بھی شکریہ کا مقروض بنایا ہے۔ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل صاحب! سارے کا سارا نام صرف آپ کا ہی ہے؟ بڑی ہمت ہے آپ کی جناب... کبھی شکر تو آپ بھیج نہیں سکتے کیونکہ آپ کے جائے مقام کا نام نسوال ہے گویا آپ بھاگ جانے والوں میں سے ہیں شاید... پھر بھی امید ہے کہ آپ کبھی شکر بھیج ہی دیں گے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی بدقسمت کو پرکھا۔ مضبوط اور بلند فکر کے نقیب کاشف کی تحریریں باکمال ہوتی ہیں سو اس کہانی میں بھی انھوں نے یہ ثابت کیا۔ محبت، اعتبار اور نفرت کی جنگ میں دولت کا ہتھیار خوب صورتی سے استعمال ہوا۔ بابر نعیم کی جلد بازی بہت شاندار اور خوشگوار اختتام کی حامل کہانی تھی۔ لالچ کا اتنا خوبصورت انجام کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک اخباری غلطی سے مزاح کا عنصر پیدا کرنا بھی مہارت ہے۔ مختار آزاد کا دانا دشمن درمیانے درجے کی کہانی تھی۔ اس کے مکالمے زیادہ جاندار نہیں تھے۔ طاہر جاوید مغل کی للکار اس بار جاندار تھی۔ کلائمیکس اور تھرل نے اسے جاندار بنایا۔ سلیم انور کی نجات بھی عام پلاٹ پر مشتمل عام کہانی تھی۔ خواہ مخواہ کا سسپنس پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ البتہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آخری جیت شاندار کہانی تھی۔ انسانی نفسیات کا بھرپور تجزیہ اس کہانی کی جان تھا۔ اسما قادری کا گرداب دیتا ہی جا رہا تھا لیکن اس بار شہریار نے کچھ حرکت کر ہی ڈالی ورنہ وہ تو جام سا ہو چلا تھا۔ میمونہ عزیز کا "مفید مشغلہ" مفید ثابت ہوا۔ مختلف انداز کی حامل یہ کہانی اچھی تھی۔ جمال دستی کا دیوانہ جمشید دستی کی کہانی لگی۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ کہانی پرتاثیر اور منفرد تھی۔ سرور اکرام کی تیز مرچی کھیر مذہبی پس منظر میں لکھی گئی کہانی تھی جس میں جذبات ابھارنے کے بجائے جذبات بھڑکانے کی کوشش زیادہ تھی۔ مریم کے خان کی تخلیق رسالے کا بلاشبہ ایک شاندار اختتام تھا۔ مدت تک یاد رہنے والی اس کہانی میں اختیارات کے استعمال کو موضوع بنا کر انسان کی بے شمار خصلتوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ اسی شاندار اختتام پر آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔ اپنے وطن کے لیے بھی نیک تمنائیں اور دعائیں۔"

سید محی الدین اشفاق کی فتح پور، لیہ سے عنایت "اداس شاموں کی ٹھنڈی شروعات کے ساتھ ایک اور سال گزر گیا۔ تاہم مزید ٹھٹھرنے سے بچت ہو گئی جب جاسوسی محبت کی گرماہٹ لے کر آیا۔ ٹائٹل حسینہ سر پر گرتے پسٹل سے بلا ڈرے کہہ رہی تھیں کہ پسٹل سے زیادہ خطرناک ان کی مسکراہٹ ہے جس سے بچ کر ہم نے محفل میں چھلانگ لگائی تو کرسی صدارت پر ادریس احمد خان کو براجمان پایا۔ مبارک ہو بادشاہو! کسی کو بھی معاف نہ کرنے والی ماہا ایمان جی کے تبصرے نے محفل کی رونق بڑھا دی، ویلڈن۔ بھائی قمر تقی! اگر خواتین بولتے وقت سانس لینا شروع کر دیں تو مرد حضرات کا صرف سننے کا گلہ ختم نہ ہو جائے؟ تفسیر عباس صاحب! جلدی سے طاہرہ گلزار جی کو سوری بولیں اور کچھ باتیں بھی۔ میرے بھائی قسمت والے ہو کہ صنف نازک میں کسی نے اپنے آپ کو بڑا (باجی) کہا ہے مبارکاں۔ بلقیس خان جی! گرداب میں تشریف تو لائیں، پھنسنا پسند آئے گا آپ کو۔ ثاقب تبسم صاحب! کسی انگوٹھی کا نگینہ بن گئے ہیں؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ للکار کی قسط اس مرتبہ کچھ سست رہی، تابش اور ثروت یوسف کی تلاش میں انڈیا پہنچ گئے۔ لگتا ہے آرا کوٹے والا معاملہ دب گیا ہے۔ انتظار ہے کہ عمران منظر عام پر آئے۔ گرداب اچھے مگر عجیب ٹریک پر ہے۔ ایک کالم انٹرسٹنگ اور دوسرا انتہائی بور ہوتا ہے۔ کہانی کو طول دیا جا رہا ہے۔ کاشف زبیر کی کہانی ٹاپ پر تھی۔ سب پڑھنے والوں کو نیا سال بہت مبارک ہو۔"

علی فیض رسول وڑائچ کا سینٹرل جیل بہاولپور سے شکریہ "قارئین کو نیا سال مبارک۔ حسب معمول جاسوسی 7 تاریخ کو ملا تو دیکھ کر دل کو چین نصیب ہوا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ محفل میں آئے تو .... ادریس احمد خان صاحب کو کرسی صدارت پر براجمان پایا، ادریس احمد خان صاحب! مبارک باد قبول کریں۔ اس کے بعد اپنا خط دیکھا تو اتنی خوشی ہوئی کہ کیا بتائیں، بہت بہت شکریہ۔ شکیل حسین صاحب کا تبصرہ پڑھا، بہت اچھا لگا۔ فوجی صابر صاحب کا تبصرہ پڑھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ بہت اچھا لگا، تابش کا ایک بار پھر انڈیا میں جانا۔ گرداب پڑھی۔ آخر کافی انتظار کے بعد ماہ بانو اور اسلم سامنے آ ہی گئے۔ اب شہریار امید ہے کہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو انڈیا سے نکال ہی لائے گا۔ بدقسمت پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں اچھی لگیں۔"

کورنگی کراچی سے شمس الحق کی اداسی "طویل انتظار کے بعد بالآخر چھ تاریخ کو جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا، پچھلے گیارہ سالوں سے جاسوسی کے لیے ہر مہینے تڑپنا ایک عادت سی بن گئی ہے۔ جاسوسی کا انتظار بھی برا نہیں لگا۔ ٹائٹل جاسوسی کے معیار کے مطابق ہی تھا۔ اشتہارات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے محفل دوستاں میں پہنچے جہاں ادریس احمد صاحب راج کر رہے تھے، مبارک باد۔ ایک نظر کہانیوں پر۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی جس میں تابش پھر انڈیا میں وارد ہو گیا ہے۔ اس بار اس کے ساتھ ثروت بھی ہے لیکن یوسف حسب معمول کمینے پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر گرداب پڑھی، قسط زبردست رہی لیکن آخر میں سسپنس میں ڈال دیا۔ اس کے بعد کاشف انکل کی بدقسمت پڑھی۔ کاشف انکل میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ سرور اکرام کی تیز مرچی

کھیر بھی زبردست رہی، برے کام کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے بھلے مسلمان کرے یا اور کوئی۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہے کیونکہ جہاں میں کام کر رہا تھا وہاں میرا ہاتھ مشین میں آ گیا۔ جاسوسی کی محفل میں یہ پہلی کوشش ہے اس لیے امید ہے کہ کوڑے دان کا حصہ نہیں بنایا جاؤں گا۔" (اوہو... ہماری طرف سے نیک تمنائیں اور دعائیں... اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یابی عطا فرمائے... آپ کے خط کے منتظر رہیں گے)

کراچی سے سارہ کا تبصرہ "سب سے پہلے کاشف زبیر کی بدقسمت پڑھی۔ دوستی، محبت، کیئر کا یہ انداز دل کو بہت بھایا۔ اسٹوری کے تسلسل نے ہر جگہ دلچسپی کا سامان کیا۔ دعوائے خون میں سیلی کے حوصلے کی داد دیتے ہوئے چلتے چلتے آخری جیت تک پہنچے جہاں رائٹر نے نئے اور انوکھے انداز میں زندہ دفن کرنے کے طریقے سے متعارف کرایا۔ مفید مشغلہ میں ہیرس کی مصروفیت شاندار لگی۔ سرورق کا پہلا رنگ اچھا ہے۔ لیکن... کیا اس میں مہاویر جیسا کردار ضروری تھا؟ کچھ حصے حقیقت سے دور لگے۔ مریم کے خان کی تخلیق بھرپور رہی۔ رل کے کردار نے (غلط کام کے باوجود) اپنے مضبوط ہونے کا احساس دلایا۔ گرداب بہتری کی طرف گامزن ہے تو سہی... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ للکار پرفیکٹ اسٹوری ہے۔ کئی نئے موڑ آتے ہیں جس میں ایک موڑ نے تابش کو پھر انڈیا پہنچا دیا۔ اب کے ثروت کے ساتھ یہ مغل انکل کو ذرا جلدی جلدی... پڑوس میں جانے کی عادت نہیں پڑ گئی؟ اللہ خیر کرے۔ (ہمیں بھی تشویش میں مبتلا کر دیا آپ نے) کراچی سے ادریس احمد خان مختصر تبصرے کے ساتھ صدارت کے منصب پر تشریف رکھتے ہیں ویری نائس۔ اسلام آباد سے شکیل حسین کاظمی ہیں جن کا تبصرہ بہت خوب صورت سادگی لیے ہوتا ہے۔ تفسیر انکل! ذاکر انکل کے لاہور میں ہونے کی خبر نے دھماکا کیا نا؟ اب کیا حال ہے؟ ڈاکٹر انتظار مغل! اِدھر پیار لے... اُدھر چل پڑیں... یہ تو بچوں کا کام ہے۔"

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی تہنیت "جاسوسی اس مہینے تاخیر سے ملا۔ حسب معمول سرورق سے شروع کیا اور تعریفی نظروں سے سراہتے ہوئے اپنی کھٹی میٹھی محفل نکتہ چینی میں وارد ہوئے۔ اداریے سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد اپنے نامے پر نظریں پڑیں۔ بہت شکریہ۔ دیگر دوستوں کی آرا سے محظوظ و محفوظ ہوئے۔ پھر سب سے پہلے للکار سے شروع کیا۔ عمران کی اس قسط میں بھی انٹری نہیں تھی۔ تابش کے کارنامے فزوں تر تھے۔ مجموعی طور پر یہ قسط اچھی رہی۔ دوسرا مقبول سلسلہ گرداب تھا۔ شہریار اب بھرپور ایکشن میں نظر آ رہا ہے۔ کہانی آگے چل کر اور دلچسپ ترین ہوگی۔ کاشف زبیر کی بدقسمت نے بھی دلچسپی کو برقرار رکھا۔ دعوائے خون نے بھی متاثر کیا۔ دانا دشمن اور الٹ پھیر کامیاب تھیں۔ جینے کی آرزو میں ڈیوڈ نے اپنی بیٹی کا خوب انتقام لیا۔ نجات میں جینی نے بلیک میلر سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ مفید مشورہ بھی اچھی لگی۔ دیوانہ نے بھی اچھا تاثر دیا۔ نینی کی ہمت کو داد دینا چاہیے کہ اس نے اپنے محبوب شوہر کے دیوانے قاتل کو قتل کر دیا اور مزید قتل کرنے سے روک دیا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق کی کہانیوں میں تیز مرچی کھیر اور تخلیق بہترین کہانیاں تھیں۔"

سرائے عالمگیر سے عزۃ الله بی بی کا اظہار تشکر "سب سے پہلے تو اپنے خط کے شائع ہونے پر جتنی خوشی ہوئی، وہ اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں بہت بہت شکر گزار ہوں۔ مدیر اور ان لوگوں کی جنھوں نے... اپنے اپنے خطوط سے مجھے یاد کیا۔ اسما قادری کی کہانی گرداب مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ ماشاءاللہ بہت اچھا ناول ہے، باقی سب بھی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ میرا دسمبر والے ڈائجسٹ میں خط شائع نہیں ہوا، تھوڑا دکھ ہوا مگر خیر اس امید سے کہ نئے سال کے ایڈیشن میں ضرور شائع ہوگا۔ میری طرف سے تمام احباب کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو اور خاص طور پر محترمہ ماہا ایمان صاحبہ اور محترمہ دلنشین کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔"

کراچی سے اقرا بانو کی باتیں "جاسوسی 2012ء کا آخری شمارہ ملا۔ نئے سال کی مبارک باد۔ جاسوسی ہاتھ میں آتے ہی چینی، نکتہ چینی پر پہنچے۔ نومبر کے شمارے میں ماہا ایمان جی کے خط کے ایک جملے سے مجھے پورا پورا اتفاق ہے۔ کون سا جملہ یہ نہیں لکھوں گی کیونکہ ایک مہابھارت شروع ہو جائے گی۔ جاسوسی ڈائجسٹ اس بار اس لحاظ سے منفرد رہا کہ آدم سے شروع اور حوا پر ختم، یعنی کاشف زبیر نے ابتدا اور مریم کے خان نے اختتام کیا۔ مبارک ہو۔ کاشف زبیر اور مریم کے خان۔ ویسے مریم کے خان کبھی کبھی آپ کا نام مریم کے کان پڑھنے میں آتا ہے۔ ابتدائی کہانی زبردست تھی لیکن یوں لگا جیسے کسی انگلش ناول کا ترجمہ ہو۔ (جی ہاں) للکار میں اس دفعہ ہیرو اکیلا ہی دشمن سے اس کے ملک میں جا ٹکرایا ہے۔ ویسے انکل مغل آپ کی باریک بینی کی داد دینی پڑے گی کہ ثروت کے اس خدشے کا ہی آپ نے تذکرہ کر دیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ تابش بم لگا رہا ہے۔ ویل ڈن۔ گرداب میں اس بار مشابرم خان نے میدان مار لیا۔ یہ قسط پہاڑوں کے بیٹے کے نام رہی۔"

فیصل آباد سے مظہر شہباز بٹ کے اعتراضات "اس دفعہ بھی ذاتی مصروفیت کی وجہ سے حاضری کی امید نہیں تھی لیکن اچانک نظر ماہا ایمان صاحبہ کے تبصرے پر پڑ گئی جس میں میرے متعلق لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے میری سسٹر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نہیں آئی پتا نہیں انھوں نے میری کون سی سسٹر تلاش کر لی ہے۔ بدقسمت کاشف زبیر کی اچھی تحریر تھی۔ خاص طور پر اس ماہ آصف ملک کی دعوائے خون ایک زبردست کہانی تھی۔ سیلی کا کردار لاجواب تھا۔ بطور عورت تو وہ مار کھا گئی لیکن جب ممتا کا مسئلہ آیا تو چٹان بن گئی۔ بالآخر جیت اسی کی ہوئی۔ ویری گڈ۔ للکار میں باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جبکہ تابش کی محبت کسی اور کی ہو چکی ہے تو اب ثروت کی خاطر جان جوکھوں میں کس امید میں ڈال رہا ہے۔ (محبت کا جذبہ بھی کسی کی مدد کرنے پر آمادہ کرتا ہے... ہر ایک کے لیے کون جان دیتا پھرتا ہے) ویسے بھی مغل صاحب کی ہر کہانی میں ہیرو کو بیاہتا ہیروئن سے عشق ہوتا ہے۔ (آپ کو کیوں اعتراض ہے؟) ارے ہاں سرورق کے متعلق تو لکھنا بھول ہی گئے۔ طرح دار حسینہ کس بات پر مسکرا رہی ہیں کہ ریوالور چھوڑ توپ کا گولہ بھی سر پر گرتا تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ٹھیک ہے جی لڑکیوں کا ہے زمانہ جیسا کہ ماہا ایمان ہر کسی سے چھیڑ چھاڑ اور پنگے بازی کرتی ہیں۔" (چھیڑ چھاڑ

کرنے میں کیا قباحت ہے)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی آمد ''جاسوسی اس بار بھی 5 تاریخ کو ایک برفیلی شام میں ملا۔ کیا ہی اچھے دن تھے کہ بھی رسالہ پہلی یا دوسری تاریخ کو مل جاتا تھا۔ سرورق اس بار بھی بہتر تھا مگر حسینہ کچھ ٹی وی کی اداکارہ سے ملتی ہے۔ کرسیٔ صدارت پر اس بار ادریس احمد خان تھے جو شاید پہلی بار آئے اور اسی بنا پر جیت گئے۔ پشاور کے انجینئر عمیر بخش کا شکریہ کہ انہیں میری دور اندیشی اچھی لگی۔ شمارے کی پہلی طویل کہانی کاشف زبیر کی بدقسمت اچھی رہی۔ للکار کا ٹیمپو اس دفعہ کافی تیز رہا۔ میرے اندازے درست نکلے کہ تابش اور ثروت کو ایک اجنبی جگت سنگھ بچانے گیا اور آخر میں بھی لگتا ہے کہ وہی ان کو بچالے گا۔ گرداب میں شہریار کو ایک مشکل ٹاسک مل ہی گیا۔ اس کا سلو کو بھر او لے جانا کتنا سودمند ہوتا ہے یہ آئندہ اقساط میں پتا لگے گا۔ سرورق کی پہلی کہانی سرور اکرام کی تیز سی کھیر اچھی تھی مگر کیا یہ اب ضروری ہو گیا ہے کہ ایسی کہانیوں میں ہندو معاشرے اور رسوم کو اجاگر کیا جائے۔ گرو مہاویر کی جگہ کوئی روایتی بد یا ملنگ بھی تو ہو سکتا تھا۔ سال کی آخری سرورق کی کہانی مریم کے خان کی تخلیق گزشتہ ماہ کی احمد اقبال کی دائرے میں سفر سے کافی ملتی جلتی تھی بہرحال ایک ماڈل کی زندگی پر کافی روشنی ڈالی گئی۔ ترجمہ شدہ مغربی کہانیوں میں تنویر ریاض کی بھیجے کی آرزو عین جاسوسی کے مزاج کی تھی اس لیے سب سے بہتر تھی۔ دوسری کہانیوں میں دعوائے خون، الٹ پھیر، دانا دشمن، نجات، مفید مشغلہ اور دیوانہ بھی اچھی تھیں۔ مقامی کہانی بس ایک ہی تھی۔ آخری جیت جو کہ اندرون سندھ کی روایات کی جھلک اور جرائم پر مبنی تھی۔ اگر کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی نہ ہو تو آئندہ شماروں میں مغربی مصنفین کے ناولوں کی تلخیص شروع کر دی جائے۔'' (ہم پہلے بھی کئی ناولز کی تلخیص شائع کر چکے ہیں۔ بدقسمت کہانی بھی مغرب ناول سے ماخوذ تھی)

راجن پور سے ماہ تاب گل کا انکشاف ''جاسوسی 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق حسینہ کیوٹ سی تھی۔ اپنی محفل میں تمام دوست فل فارم میں تھے۔ خصوصاً ماہا ایمان کی واپسی سے مزہ دوبالا ہو گیا ہے۔ انکل جی! میں نے کہا تھا کہ میرا پروگرام فیملی گپ شپ تو بجے سے گیارہ بجے تک ہوتا ہے، دس بجے تک نہیں۔ للکار قدم قدم پر چونکا رہی ہے زبردست سچویشن ہے۔ گرداب نے بھی زبردست موڑ لیا ہے۔ سرورق کا دوسرا رنگ تخلیق بھی اچھی تحریر تھی اور ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر ان کا تو نام ہی کافی ہے۔ اس مرتبہ انتہائی معروفیت میں سے مشکل وقت نکال کے لکھا ہے انکل جی میرے اختصار یے کو ضرور ضرور شامل اشاعت کیجیے گا اور ہاں اگلے ماہ میں خط نہیں لکھ پاؤں گی کیونکہ... ارے بھئی اب میں مایوں میں بیٹھ کر خط تو لکھنے سے رہی۔ جی ہاں... 5 جنوری... کیا سمجھے؟ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔'' (ہم خالی خولی یاد نہیں رکھتے... جب تک منہ میٹھا نہ ہو...)

وہیکے تارڑ سے حسن سردار رانا کی واپسی ''6 تاریخ کو رسالہ ملا۔ سرورق سادہ مگر پرکشش تھا۔ سب سے پہلے ایک بات عرض کروں کہ میں 80، کی دہائی سے لے کر اب تک جاسوسی کا قاری ہوں۔ ٹائٹل دیکھ کر پہلے سوچا کہ سرورق کی کہانی پڑھوں مگر سب سے پہلے بدقسمت کو اسٹارٹ کیا تو تین دوستوں کی کہانی میں ایسا جکڑا کہ آگے نکل ہی نہیں سکا۔ کاشف زبیر نے بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ آج کل کے دور میں انسانی نفسیات کا بڑا اچھا احاطہ کیا ہے۔ حسب عادت للکار کی باری آئی تو واہ جی واہ طاہر جاوید مغل صاحب! اس دفعہ تو سرحد پار سکھوں کی بستی اور ان کے ماحول کی خوب عکاسی کی ہے۔ جگت سنگھ نے بھی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ بہرکیف للکار اچھی جاری ہے۔ گرداب حسب دستور وطن پرستی اور حب الوطنی کے اعتبار سے خوب صورت جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے کیونکہ محب وطن ڈاکٹر فرحان جمیل کو چھڑانے شہریار عادل کو بھارت جانا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی تیز سی کھیر زبردست رہی۔ تخلیق مریم کے خان صاحبہ اول ڈن شوبز میں کیا کیا ہوتا ہے بڑا خوب صورت اور اچھوتا انداز تھا۔ دیوانہ، جمال وسی صاحب نے تو دسمبر کی سردی کی نسبت سے برف باری میں شاید ہمیں بھی ٹھنڈک کا احساس دلایا، ٹھیک رہی۔ اینڈ ڈیوڈ کی موت اور تنی کی سسکیوں پر ہوا۔ آخری جیت بھی خوب صورت کاوش رہی۔ سسپنس اور جاسوسی کا مطالعہ کرنے والے کا آخری رزلٹ کہ مرنے والا آخری دم تک تھا یعنی بہار خان کے معدے میں مٹی کیسے گئی مطلب بہار خان کو قتل کیا گیا تھا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

بالاکوٹ سے محسن علی موم کی باتیں ''کافی عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ ٹائٹل پر موجود شربتی آنکھوں والی قاتل حسینہ نے قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا یا یوں کہیے کہ ہمارے دلِ کمزور پر قاتلانہ وار کیا جسے ہم بڑی مشکل سے سہہ پائے۔ محفلِ یاراں میں ادریس احمد خان کی نپی تلی گفتگو اسی کی تھی کہ سیدھی کرسیٔ صدارت پر جا لگی مبارک باد جی دل سے۔ پنجاب سے ماہا ایمان کی قلابازیاں، واہ ری جل گئی پر بل نہ گئے۔ دلنشین بلوچ! لگتا ہے کہ آپ ٹیکسلا کے کھنڈرات میں بیٹھ کر تبصرہ لکھتی ہیں جو ہمیشہ سے افسردہ ہی ہوتا ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟ محمد ہمایوں سعید! آپ کا نام ابھی استاد نام بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ اسے بدلتے لیکن آپ نے نام بدل دیا مسکرا کے۔ ماہ تاب گل رانا! آپ نے اپنے پروگرام کی اتنی پبلسٹی کی ہے کہ اب ہمیں سننا پڑے گا دل پر پتھر رکھ کے اور جہاں تک آئینے کی بات ہے تو آئینہ ہمیشہ حقیقت دکھلاتا ہے۔ تنویر عباس کے تبصرے ان کے علم کو واضح کرتے ہیں۔ اس مرتبہ تنویر صاحب غائب ہیں کیوں؟ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح للکار سے آغاز کیا جو کافی سنسنی خیز مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ تابی بارڈر کے پار اور عمران ادھر گویا اب پتا چلے گا تابی کا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ آخر میں کہانی کافی خطرناک موڑ پر ختم ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت جیتتی ہے یا شک۔ گرداب میں شہریار اب ایکشن میں ہوگا۔ دوسری کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ شمارہ کافی لیٹ ملا ہے جس کی وجہ سے پوری کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے ہم قاصر ہیں۔''

ڈاکٹر انتظار نذیر مغل کی حاضری نسووال سے ''6 کو دیدار یار ہو سکا۔ سرورق کی بلوری آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ کر یہ یقین ہو چلا کہ پیارے جاسوسی نے پنجابی فلموں کی طرح 12 من کی دھوبن نما موٹی حسیناؤں سے نجات حاصل کر لی ہے۔ سرورق پر ہی محترم تنویر، محترمہ ماہا پنجابی کے قدموں میں (دل نہیں) ہتھیار پھینکتے نظر آئے اور کاظمی صاحب سگریٹ ہو کر منع کرتے۔ تنویر انکل! ہتھیار پھینکنا مردوں کا شیوا نہیں۔ 2012ء کا آخری صدارتی

معرکہ محفلِ یاراں کی جان محترم ادریس خان کے سر رہا۔ وہ دھائی ہو خان صاحب۔ دلنشین بلوچ! نام ہی کافی ہے مرزا مسز! آپ تو بلیک لسٹ میں بھی نہیں ہیں۔ بری بات... اے عظیم آذر! آپ کتنے بھولے بھالے ہو؟ رانا فیصل! ڈائجسٹ ہوتی نہیں ہوتا ہے۔ فیض بھائی! کائنات کا مشکل کشا آپ کی مشکلات حل فرمائے۔ ریکس احمد! جی آیاں نوں، عمیر شہزاد بخش! آپ کا تبصرہ سمندر کو کوزے میں (اگر آج کل کوزہ دستیاب ہو تو) بند کرنے کے مترادف تھا۔ بھئی واہ واہ۔ قمر تبی! دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ بلقیس خان! 90 فیصد رسالہ پڑھ کر بھی کہتی ہیں کہ بس... واہ، کیا احسان کیا ہے آپ نے ہم پر یہ بتا کر۔ کسی ڈاکٹر یا پیر صاحب نے جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے کی تلقین تو نہیں فرمائی تھی؟ طاہرہ گلزار! واٹ لسٹ ہونے پر مبارکاں۔ دعا والی بات دل کو بھا گئی۔ ہماری تنویر بھائی سے گزارش ہے کہ طاہرہ باجی کو نہ بھولیں۔ پلیز، افتخار اعوان! آپ کا تمام تبصرہ 29 فروری پر مشتمل تھا۔ مسز ربیعہ شاہین! آپ کی بات میں وزن ہے۔ سوسٹ ویگم! جاسوسی کو قارئین کی تنقید شائع کر کے خوشی ہوتی ہے۔ حنا گل باجی! آپ کا خط پڑھ کر لگا کہ آپ نے اپنی معصومیت پر سنجیدگی کا خول چڑھایا ہوا ہے؟ عدنان یوسف! آپ کی جلدی بجا ہے۔ اگر خط 6 کو پوسٹ ہو جائے تو ٹھیک ورنہ سات سمندروں جتنی گہری اور ہمارے ''سیاہ ست'' دانوں کے معدے جتنی بڑی ردی کی ٹوکری حاضرِ خدمت ہوتی ہے۔ ثاقب نگینہ! ہر بار یار ریوڑیاں نہیں بانٹتا۔ تبصرہ تو بہرحال اس دفعہ بھی آپ کا خوب تھا...''

ہنوں سے فہیم اللہ خان کی پہلی شرکت ''معمول کے مطابق میں آج بھی دسمبر کی 6 تاریخ کو جاسوسی محل کے سامنے کھڑا تھا۔ محل کے سامنے کی طرف ایک خوب صورت نیلی آنکھوں والی لڑکی بڑے انہماک سے کسی کی طرف اپنی خوب صورت مسکراہٹ اچھال رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک کرخت شکل والا آدمی منہ میں سگریٹ لیے بڑے ہی انہماک سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اور شاید سوچ رہا تھا کہ کس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ لڑکی کے سر کے اوپر میں نے ایک زخمی ہاتھ سے ریوالور گرتے دیکھا۔ شاید وہ ریوالور لڑکی کی طرف اٹھا تھا لیکن ڈاکر انکل نے بروقت ایکشن لے کر اس کے ارادے ناکام بنا دیے۔ ہم بڑے محفل چینی کی طرف اور دروازہ کھٹکھٹانے پر ناظم آباد کراچی کے ادریس احمد خان نے دروازہ کھولا اور ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد بڑھے کہانیوں کی طرف اور کہانیوں میں حسب معمول سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس دفعہ بھی پوری قسط عمران کے بغیر تھی لیکن پھر بھی بڑی زبردست رہی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید شہریار کو امریکا یا کسی دوسرے ملک بھیجا جائے گا لیکن شاید اسا قادری صاحب شہریار کو ماہ بانو سے دور ہی رکھنا چاہتی ہیں۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ رائٹر کاشف زبیر کی بدقسمت پڑھی، کہانی زبردست رہی۔ کاشف زبیر کچھ بھی لکھیں، مجھے اچھا لگتا ہے۔ آصف ملک کی دعوائے خون میں بین جوائے صاحب اولاد ہو کر بھی بے اولاد رہا۔ اچھی تحریر تھی۔ بابر نعیم کی الٹ پھیر بھی اچھی کہانی تھی۔ مختار آزاد کی دانا دشمن پڑھی، اچھی رہی۔ بیٹے کی آرزو میں ڈیوڈ نے اپنی بیٹی کی جدائی کا قرض اتار دیا۔ پرسٹن کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ نجات، آخری جیت، مفید مشغلہ اور دیوانہ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ رنگوں میں پہلا رنگ پڑھا۔ ایسا لگا جیسے مصنف نے مختلف فلموں اور کہانیوں سے کچھ کچھ مواد اکٹھا کر کے کہانی لکھی ہے۔ اس کے بعد آخری رنگ اور آخری کہانی مریم کے خان کی تخلیق پڑھی۔ زبردست رہی۔''

گاؤں پکی، مالاکنڈ ایجنسی سے بلال لودھی کا انداز ''رسالہ اس دفعہ 5 دسمبر کو یعنی جلدی مل گیا۔ بیشک یہ سال پاکستانی قوم پر بہت بھاری گزرا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ سال 2013ء خوشیوں کی نوید بن کر پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ (آمین) کراچی سے ادریس احمد نے شاید خط سب سے پہلے پوسٹ کیا تھا اس لیے اوّل نمبر پر تھا۔ رسم دنیاداری کے تحت ہم آپ کو مبارک باد سے نوازتے ہیں۔ اختر عباس قمراج صاحب! آپ واضح کریں کہ خط آپ لکھتے ہو یا آپ کا دوست ظفر اقبال ظفری یا آپ دونوں مشترکہ طور پر لکھتے ہو۔ ماہا ایمان صاحبہ کا تبصرہ کافی جامع تھا۔ پشاور کے انجینئر عمیر شہزاد، عثمان غنی، بلقیس خان اور طاہرہ گلزار ایک جگہ ایک ہی لائن میں کھڑے نظر آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ تابش نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی جان پر کھیل کر یوسف کو بچانے کی کوشش کی جبکہ اس نے کمینے پن کی انتہا کی اور تابش کے خلاف ثروت کے کان بھر کر اسے بدظن کیا۔ گرداب اپنی راہ پر گامزن ہے۔ بدقسمت اچھی کہانی تھی مگر کہانی میں بدقسمت کون تھا؟ (پڑھنے کے بعد بھی پتا نہیں چلا) ترجمہ کی ہوئی کہانیوں میں دیوانہ، دانا دشمن، مختصر کہانی نجات اور خاص کر دعوائے خون بہت اچھی کہانی تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی تیز سی کھیر درمیانے درجے کی کہانی ثابت ہوئی۔ سرورق کی دوسری کہانی تخلیق بھی متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ حالانکہ مریم کے خان کا نام دیکھ کر ایسا لگا کہ کہانی زبردست ہوگی۔ کہانی کا موضوع پرانا تھا۔ اس سال کے آخری پرچے میں کہانیاں اچھی تھیں۔''

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی تھیچ ''دسمبر کے یخ بستہ اور خوب صورت موسم میں جاسوسی کا ساتھ بہت رومانوی محسوس ہوا (اچھا... حیرت ہے) کیونکہ میں اپنے گھر یعنی سیالکوٹ سے دور اسلام آباد میں مقیم ہوں بسلسلۂ روزگار۔ میری تنہائی کا بہترین ساتھی جاسوسی سات تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کی واحد بات ایک ریوالور یا دری جو کہ جاسوسی ڈائجسٹ کے سرورق ہونے کا واضح ثبوت تھا۔ سرورق اور اشتہارات کو نظر انداز کرتا ہوا آگے گزر گیا اور فہرست پر جا پہنچا۔ کاشف زبیر کو ابتدائی صفحات پر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ چینی نکتہ چینی میں مدیر اعلیٰ کی پُر درد اور فکر انگیز تحریر پڑھ کر دل غمگین ہو گیا۔ ادریس احمد صاحب کا مختصر مگر جامع تبصرہ پسند آیا اس لیے اوّل تبصرے کے لیے مبارکباد قبول کریں۔ محفل میں اپنا تبصرہ دیکھ کر لگا کوئی اور ہے کیونکہ پھر مضمون دیکھا تو پتا لگا نام تبدیل ہو گیا ہے جو کہ ایک خوب صورت تبدیلی تھی۔ (معذرت غلطی سے اضافہ ہو گیا۔ میں نے ابھی چیک کیا ہے) اور ایک تحفہ میرے تبصرے میں شاعر کا نام صادق حسین شیرازی نہیں صادق حسین کاظمی ہے۔ اختر عباس اور ظفر اقبال آپ دونوں کی پسندیدگی کا نہایت مشکور ہوں۔ اس دفعہ محفل میں بہت سے نئے دوست شامل تھے جو کہ خوشی کی بات ہے۔ میں تمام نئے ساتھیوں کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہوں، ایک ایک کو مخاطب کر کے نہیں کہہ سکتا کیونکہ کوئی ماہرِ فن تلوار بردار موجود ہے جس کی تلوار کی زد سے بہت کم لوگوں کے خطوط بچتے ہیں۔ باقی آپ میرے عزاقی شیکسپیر کو مہربانی

فرما کر ایک دفعہ محفل میں متعارف ہو لینے دیں، ہو سکتا ہے اس کے اقوال لوگوں کی راہنمائی کریں۔ کیونکہ شیکسپیئر نے کہا ہے۔ "کماؤ گے نہیں تو بڑے کیسے ہو گے" یعنی اسی طرح جو پڑھیں گے نہیں سیکھیں گے کیسے۔ عبادت کاظمی صاحب واپسی مبارک ہو۔ کہانیوں میں للکار کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ میں سب سے پہلے اس کی طرف ہی متوجہ ہوتا ہوں اس لیے تابش کو اس کے پہلے سسرال یعنی ہندوستان بھیجنے پر مغل صاحب کو دل کھول کے داد دینی پڑی۔ کچھ بھی ہے، کہانی قاری کو ایک دفعہ گرد و پیش سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ یوسف اور ثروت پر... کافی غصہ آیا۔ ایک شوہر پرست بیوی پر شیکسپیئر نے کچھ کہا تھا جو فی الحال مجھے یاد نہیں۔ (آپ کا شیکسپیئر شادی کرلے گا تو کچھ نہ کچھ ضرور کہے گا) اسما قادری نے بھی شہریار عادل عرف عادل خان کو ہندوستان بھیجنے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ امید ہے آئندہ قسط کوئی دلچسپ ہنگامہ لے کے آئے گی۔ جاسوسی کے اولین صفحات پر کاشف زبیر صاحب بدقسمت کے ساتھ موجود تھے۔ سسپنس سے بھرپور کہانی اور عمدہ طرز بیان، کہانی کو ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ سرورق کے رنگ، سرور اکرام صاحب کا پہلا رنگ تیز میں کھیر اچھا تھا مگر زیادہ لطف نہیں آیا کیونکہ شہزاد کی نیت پہلے ہی صاف پتا چل رہی تھی اس لیے کہانی سے سسپنس ختم ہو گیا۔ مریم کے خان نے دوسرے رنگ تخلیق میں میدان مار لیا۔"

کراچی سے ہما نظیر کی جسارت "میں پہلی بار کسی رسالے میں خط لکھ رہی ہوں۔ (اچھا کام اتنی دیر سے، کیوں؟) میں جاسوسی ڈائجسٹ تین سال سے پڑھ رہی ہوں۔ میں نے کسی کے کہنے پر پہلی بار جاسوسی اور سسپنس پڑھا تھا اور مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں خود لے کر پڑھنے لگی۔ مجھے گھر میں سب ڈانٹتے ہیں کہ کیا میں ہر وقت اس کو پڑھتی رہتی ہوں۔ لیکن میں پھر بھی پڑھتی ہوں میں نیا تو نہیں لیتی پرانا لے کر پڑھ لیتی ہوں۔ ہر دفعہ سوچتی ہوں کہ خط لکھوں مگر نہیں لکھتی، یہ سوچ کر کہ کہیں آپ لوگ میرے خط کو ردی کی ٹوکری میں نہ ڈال دیں۔ اگر آپ نے میرا خط شامل نہ کیا تو میں بھی خط نہیں لکھوں گی۔ اور نہ ہی رسالہ پڑھوں گی اگر آپ نے میرا خط شامل کیا تو پھر بہت سی باتیں کروں گی۔" (لیجیے محترمہ آپ کے کہنے پر ہم نے آپ کا خط شائع کر دیا۔ آئندہ شاید کہانیوں کا بھی ذکر ہو)

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کا مضبوط ارادہ "جاسوسی نے حسبِ معمول تخریبی فطرت کا مظاہرہ کیا اور بہت دیر سے ملا۔ اسی فراق اور دیرا دیری میں ہم نے سوچ لیا تھا کہ بطور ازالہ نہ تو تفسیر صاحب کا تھکا دینے والا تبصرہ پڑھیں گے اور نہ ہی جاوید بلوچ کے سرد دردو دست تبصرے سے استفادہ کیا جائے گا۔ دسمبر کی سرد دھانگ راتوں میں جاسوسی کی سرگرشیوں کا اپنا ہی نشہ ہے۔ انکل جی آپ نے درست فرمایا کہ انتخابات میں سچے، مخلص اور ایماندار لوگوں کا انتخاب کریں مگر جواب طلب سوال تو یہ ہے کہ ہم چنیں بھی تو کیسے چنیں۔ فہرست میں کاشف زبیر کو ابتدائی صفحات پر اور مریم کے خان کو آخری صفحات پر دستیاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کاشف زبیر کی بدقسمت آغاز سے انجام تک اپنے سحر میں جکڑے رکھنے میں کامیاب رہی۔ مریم کے خان کی کہانی تخلیق کار تیز رفتار قلم کی طرح دلچسپ رہی۔ گرداب میں شہریار صاحب ایک بہت اہم مشن پر انڈیا روانہ ہونے لگے ہیں۔ یقیناً وہاں شاندار ہنگامے ان کے منتظر ہوں گے۔ آخری جیت نے بے تحاشا متاثر کیا۔ ہمیشہ جیتنے والے کی آخری جیت کے ہم شدت سے منتظر تھے اور تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ مگر اس نے موت کی وادیوں میں اترتے اترتے بھی جو شاندار بازی جیتی، وہ ان کی سابقہ تمام کامیابیوں پر غالب نظر آئی۔ سلیم انور کی نجات میں مظلوم و معصوم بیوہ کی شاندار کامیابیوں پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی مگر اس کے عاشق صاحب کے تیکھے کارناموں پر ضرور حیرت ہوئی کہ وہاں بھی محبت میں اتنے انتہائی اقدام اٹھائے جاتے ہیں۔ سرور اکرام کی تیز مرچ کھیر متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ للکار اب دیوی کی طرح دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ تابی اب صحیح معنوں میں للکار کا ہیرو نظر آنے لگا ہے۔ جمال دتی کے دیوانے کی آمد اور تنویر ریاض کی جینے کی آرزو بہت زبردست رہی۔"

اوکاڑہ سے لفظوں کے کھلاڑی تفسیر عباس بابر کی شمولیت "زندگی کے گوناگوں مسائل، مہنگائی، مصروفیات، الجھنوں اور تلخیوں سے برسرِ پیکار... حضرتِ انسان کے میزانِ حیات سے ایک اور سال تفریق ہو گیا۔ سال کے آخری مہینے کا آخری شمارہ 5 دسمبر کو دستیاب ہوا۔ حسبِ روایت طاہر جاوید مغل کی للکار سے آغاز مطالعہ کیا۔ سرزمینِ ہندوستان پر ثروت اور تابش کی محبتیں آزمائشیں... عمران کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ اسما قادری کی گرداب زبردست ولاجواب۔ شہریار عادل اور ذیشان اینڈ گروپ کا جذبہ حب الوطنی قابلِ داد ہے۔ کاش ہمارے حکمرانوں میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو جائے۔ سرورق کا پہلا رنگ تیز مرچ کھیر اچھائی کے لبادے میں ایک مکروہ شخص کی گھناؤنی اور قبیح کارروائیاں اور انجام وہی جو کہ ہر برائی کا ہوتا ہے۔ فیصل اینڈ ستارہ کی بے مروتی اور خلوص و وفا کے خمیر میں گندھی اصول و نایاب روداد محبت نہایت پُراثر و دلچسپی سے بھرپور رہی۔ مریم کے خان کی بہترین تخلیق و تحریر تخلیق... حضرت انسان کی حرص و ہوس اور اغراض و مفادات پرستی کا عبرت آمیز قصہ۔ ابتدائی صفحات کا توشۂ خاص۔ کاشف زبیر کی انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کا احاطہ کرتی ہوئی پُراثر تحریر بدقسمت بھی دلچسپ ثابت ہوئی۔ مختار آزاد کا دانا دشمن بھی پسند آیا۔ عصر حاضر میں وفا بھی جرم و گناہِ عظیم ہے۔ تنویر ریاض کی دل گداز تحریر جینے کی آرزو قلب و دل کے خاص اور خالص رشتوں کا دلسوز قصہ۔ سلیم انور کی نجات ایک عاشقِ نامراد کی دلچسپ و اثرانگیز مصروفیات۔ آخری جیت، نور محمد نے تنگ دلی اور مستقل مزاجی کی انتہا کر دی۔ میمونہ عزیز کا مفید مشغلہ بھی خوب رہی۔"

چکوال سے ایم عزیر اسعد کا انداز "دو دفعہ انکل جی سے کلین بولڈ ہونے کے باوجود ایک دفعہ پھر چوکوں اور چھکوں کی نیت لے کر حاضر ہیں، پر کیا کریں کہ اگر انکل جی ایک دفعہ پھر آؤٹ کر کے ہیٹرک کر لیتے ہیں تو ان کی خوشی میں ہم بھی بہت زیادہ خوش ہو جائیں گے۔ (آپ سے کس نے کہہ دیا، ہم اس انداز سے خوش ہوتے ہیں؟) اس دفعہ ٹائٹل اور چٹپٹی نکتہ چینی پر کوئی تبصرہ نہیں البتہ ٹائٹل گرل اتنی سردی میں کاش یا لان وغیرہ کا سوٹ زیب تن کیے نظر آئی جس کے باعث ٹھنڈ کا احساس اس کے چہرے پر پنہاں تھا۔ نئے تبصرہ نگار دوستوں کو خوش آمدید۔ پہلی کہانی بدقسمت کاشف زبیر صاحب کی حقیقت پر

نئی تحریر تھی۔ بعض لوگوں کی وقتی خواہش کی تکمیل کسی کی زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حدوں کو پھلانگنا یا انہیں اپنی مرضی کے مطابق وسیع کرنا ظلم کہلاتا ہے جو کہ وہ اپنے ساتھ بھی کرتا ہے اور دوسرے کے ساتھ بھی۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ عمران کی کمی بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ تابش وحید و صورتِ حال میں پھنسا ہوا ہے۔ ثروت کا تابش سے وقتِ حال شادی نہ ہونا علیحدہ بات ہے مگر تابش کے بارے میں وہ جانتی تھی اس کی وہ محبت ہے اسے تابش کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ بظاہر کچھ بھی ہو اور کوئی کچھ بھی کہے۔" (ہم نے آپ کی خوشی کا سامان کر دیا ہے... سوچیے کس طرح؟)

حیدرآباد سے مبشر حسن کی مبارک باد "دسمبر کا دلکش شمارہ 6 دسمبر کو مل گیا۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ واپسی آنے پر بہت سے دوستوں نے خوش آمدید کہا۔ سرورق کی حسینہ نے تو دل پر وار کیا اور ہم دل کو تھام کر بیٹھ گئے کہ ڈاکٹر انکل بھی ہمیں اتنے خوب صورت جھٹکے دے کر مار ہی نہ ڈالیں۔ واقعی ڈاکٹر انکل کی محبت کی ہم داد دیتے ہیں اور ان کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ کرسیِ صدارت پر ادریس احمد صاحب براجمان تھے اور ان کے پیچھے محمد شکیل کاظمی صاحب اپنا خوب صورت تبصرہ فرما رہے تھے۔ اختر عباس تھراج اور ظفر اقبال تھراج کی محبت دینے کا شکریہ۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ ماہ تاب گل رانا جی! آپ نے ٹھیک کہا۔ فاسٹ دور ہے یاد کا احساس دلانا پڑتا ہے مگر جی جو محبت کرتے ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ للکار بہت ہی اچھی رہی۔ اب دوبارہ وہ بھارت پہنچ گئے ہیں۔ گرداب میں سی ایف پی کا کردار جاندار ہے اسما باجی گڈ، ویری گڈ! آپ کے قلم میں جادو ہے۔ مشاہرم خان بھی اس مرتبہ فارم میں نظر آیا۔ بدقسمت اور دانا دشمن کی بات ہی اور تھی اور ان میں ہر موڑ سسپنس میں ڈال دیتا تھا۔ تراش خراش بھی اچھی تھی۔ جاسوسی کی پوری ٹیم کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔"

راولپنڈی سے ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی کی واپسی "دسمبر 2012ء کا آخری شمارہ پڑھا بلکہ زیرِ مطالعہ ہے۔ خوب صورت، بامعنی اور سادہ سا ٹائٹل زبردست تھا۔ واضح کروں کہ دو تین سال کے بعد چٹپٹی، نکتہ چینی میں حاضر ہو رہا ہوں۔ (خوش آمدید) اپنی کمپنی کو مستحکم بنانے کے لیے وقت چاہیے تھا۔ اب ماشاء اللہ ایک ایم فل اور دوسرا انجینئر بیٹے نے سنبھال لیا ہے۔ لیکن یہ میگزین زیرِ مطالعہ ہی رہا۔ (آپ کی محبت کا شکریہ) ایڈیٹوریل میں آخری لائن 3 کلومیٹر CNG قطار سے نکل کر... وسیع مزہ دے گئی۔ ادریس محمد خان کی نپی تلی آرا واقعی خوب تبصرہ تھا اور مسندِ صدارت مبارک ہو۔ اختر عباس اینڈ کو کی نصیحت عدنان کو بے حد مزہ دے گئی۔ زبردست۔ ماہا ایمان کا تبصرہ خوب، چٹکیاں لی گئیں اور بیان خوب واضح۔ عدنان یوسف کو، محمد اسماعیل اجاگر، سنسان دل کو، بابا تفسیر عباس، ماہتاب اور قمر تنی کے تذکرے بڑے زبردست انداز میں تھے۔ تجربہ اور عمر کے لحاظ سے تو بھی ہم بابا تفسیر عباس سے بھی بڑے "بابے" ہیں۔ دلنشین بلوچ کیوں افسردہ ہو گئی ہیں؟ ڈاکٹر مرزا انتظار جی، اتنی تعلیم اور تجربے کے بعد بھی عقل آنے کی فرمائش کیوں؟ اصل مسئلہ کیا ہے؟ انجینئر عمیر شہزاد کو معلوم ہو کہ آپ کے اپنے گھر میں صنفِ نازک بڑی محترم رشتے دار موجود ہیں؟ اگر ضروری ہے تو بھی جنگلوں اور بیابانوں میں جا کر گم ہو جایئے۔ تابِ تبسم نگینہ کا تبصرہ بڑا زبردست تھا اور ہر ماہ آیا کریں۔ ہاں انور یوسف زئی بھئی ہم تو آپ کے ہمسائے ہیں ذرائی فرونٹس کا رخ ہماری طرف کر دیں نا۔ باقی بڑے اچھے تبصرہ نگار کیوں غیر حاضر ہیں بھئی؟ آئیں اور رونق بڑھائیں۔ سب کے لیے دعا گو ہوں۔ بدقسمت، تیز مرچ کھیر اور تخلیق 2012ء کے آخری شمارے کی بہترین کہانیاں رہی ہیں اور باقی بھی بہت بہترین کہانیاں تھیں۔ ہاں دونوں سلسلے اور زبردست کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی فنکاری "دو ماہ بعد حاضری دے رہی ہوں۔ ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ میں نے ٹائٹل گرل کے علاوہ ٹائٹل پر زیادہ غور نہیں کیا۔ وجہ وہی دوشیزہ کہ وہ اتنی پیاری تھی میرا دھیان اور خیال کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ کہانیوں میں اس دفعہ للکار بہت اچھی رہی اور اس بار اس میں تیزی بھی آئی ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ گرداب میں دیکھتے ہیں کہ شہریار بھارت جا کر کیا کرتا ہے۔ مریم کے خان کی تخلیق نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ کترنوں میں گلاب اور کانٹا، پرداد نے کہا تھا۔ اکسیر ایمان اور اچھی باتیں بہت پسند آئیں۔ سوری کہ باقی رسالہ ابھی پڑھا نہیں، تبصرہ نہیں کروں گی۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی گمشدہ یادیں "سال 2012ء کا الوداعی شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر موجود حسینہ کچھ خاص لگی۔ سب سے پہلے ادریس احمد خان کو کرسیِ صدارت کی مبارک باد۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ صدیوں پر محیط محبت کی داستانیں اور ان کے کردار گویا مغل صاحب کی گرفت میں ہیں۔ تابش کی محبت قابلِ رشک ہے۔ ثروت کی بے مروتی اچھی نہیں لگی۔ جگت سنگھ کا کردار اچھا لگا۔ سرداروں میں پھنسا تابش یقیناً کوئی راہ نکال لے گا۔ موجودہ قسط ہر لحاظ سے بہتر لگی۔ گرداب از ویری گڈ اسما قادری از گریٹ۔ سرورق کی پہلی کہانی تیز مرچ کھیر اچھی لگی۔ دولت کی ہوس رکھنے والے شہزاد جیسے دوست اور رانا جیسے کمینہ فطرت لوگ یقیناً معاشرے کے لیے ناسور ہیں۔ مریم کے خان کی تخلیق شوبز کی چکاچوند روشنیوں میں بسنے والے تاریک ذہنیت کے لوگوں کی داستان اچھی لگی۔ انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں میں گم کاشف زبیر کی بدقسمت اچھی لگی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

رئیس احمد، ہارون آباد۔ کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار، مری۔ حکیم سید محمد رضا نقوی، میانوالی۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ محمد طاہر، قصبہ گجرات مظفر گڑھ۔ عدنان یوسف، بنوں۔ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، بگیانہ روڈ کماریاں۔ محمد نعمان این پیارے، ایس اے کنگ، حطبہ۔ فوجی صابر علی، حیدرآباد کینٹ۔ مہر اختر عباس تھراج، ظفر اقبال ڈورا، کبیروالا۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ ثناء اللہ خان، بنوں۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔

خلل ہے دماغ کا

احمد اقبال

دل جو دیوانہ نہیں آخر کو دیوانہ بھی تھا
بھولنے پر اس کو جب آیا تو پہچانا بھی تھا
اک مہکتا سا وہ لمحہ تھا کہ جیسے اک خیال
اک زمانے تک اس لمحے کو تڑپانا بھی تھا

ہر شخص جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے لیکن اسے کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں... منزل تو سبھی کو نظر آسکتی ہے لیکن سب ہی منزل تک نہیں پہنچ پاتے... کچھ لوگ بظاہر کامیابی کا چولا پہن کر سمجھتے ہیں کہ وہ منزل سے قریب تر ہیں... لیکن وہ محض سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ زندگی کی ساری خواہشیں ترک کرکے خواب دیکھنے... خواب سوچنے... اور خوابوں کی تعبیر کی جستجو میں بے کل رہنے والوں کا قصۂ دل پذیر... جو چلے تو جان سے گزر گئے... اور جو دیکھے خواب... ناتمام خواب تمام ہوگئے...

حسابِ سود و زیاں سے مبرا ایک پراسرار... انھونی کہانی کے ڈرامائی موڑ...

کتنے یقین کے ساتھ ہم اپنی زندگی لامحدود امکانات کے بھروسے پر جیتے چلے جاتے ہیں۔

میں، آپ... اور ہم سب ایسا یقین رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ ایک کروڑ انسانوں کے اس شہر میں اوسطاً دس افراد جو گھر سے سلامتی کے ساتھ نکلتے ہیں، زندہ لوٹ کے گھر نہیں آتے... تو اس میں خوف یا پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں۔ کوئی بس ڈرائیور اناڑی ہو اور کچلا جائے بے گناہ... راہگیر... یا کسی کا نشانہ خطا ہو اور کوئی بے خطا مارا جائے... ایسا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی... مگر امکانات تو نہ ہونے کے برابر ہی ہوئے نا۔ دس لاکھ میں سے ایک... آخر ہم اپنا شمار انہی میں کیوں کریں؟ ان میں کیوں نہ کریں جو ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے خیر و عافیت کے ساتھ واپس لوٹ آئیں۔

سوتے وقت ایسا خیال کسے آتا ہے کہ رات کو کسی وقت اپنے ہی گھر کی سایہ فراہم کرنے والی چھت اور تحفظ دینے والی دیواریں ہم پر آ گریں گی اور گھر ہی اپنا مدفن بن جائے گا۔ بالاکوٹ سے مظفرآباد تک زمین کو تہ و بالا کر دینے والے زلزلے میں ایک لاکھ افراد کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

لیکن ہزاروں لاکھوں سال کی تاریخ میں ایسا ایک ہی بار ہوا تا؟ ایسا ہر روز اور ہر جگہ تو نہیں ہو سکتا۔ امکانات نہ ہونے کے برابر ہوں تو ایسا سوچنا پاگل پن ہے...

چنانچہ انہونی کے امکانات کو حیرت انگیز یقین اور اعتماد کے ساتھ مسترد کرتے ہوئے ہم اپنی اپنی زندگی جینا جاری رکھتے ہیں۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو ہر روز کی طرح میں نے کمبل کو لات مار کے نہیں ہٹایا۔ چیخ مار کے بیڈ پر سے جمپ نہیں لگائی۔ وال کلاک کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتے ہوئے باتھ روم کے بجائے کپڑوں کی الماری میں نہیں گھسا۔ میرے حلق کے بھونپو سے بانگ درا نہیں نکلی کہ... جان... رہنے دو ناشتا... آج پھر دیر ہو گئی۔

میں پُرسکون انداز میں گوڈے پر گٹے رکھے طمانیت سے مسکراتا رہا اور ایک ٹانگ ہلاتے ہوئے گاتا رہا۔ آنا میری جان سنڈے کے سنڈے... کھانا میری جان میرے ساتھ سنڈے کے انڈے... اور اس طربیہ نغمۂ جاں فزا سے میرا ذہن اس خیال کی طرف منتقل ہوا کہ بھینس کا مذکر سنڈے کو (در زبان پنجاب) کہنا بھی کچھ مناسب نہیں لیکن سنڈے کی مؤنث سنڈی ہوتی تو یہ کتنا بُرا ہوتا۔ سنڈی تو نوزائدہ تتلی ہوتی ہے۔ کہاں تتلی کہاں بھینس۔

سنڈے کی صبح دس گیارہ یا بارہ بجے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی معمول کی بات ہے۔ خصوصاً شادی کے اس دور میں جو ہنی مون پیریڈ کہلاتا ہے۔ یہ ایک ہفتہ رہے یا ایک سال۔ آپ کی ہمتِ مردانہ پر منحصر ہے اور نوکری پر۔ ہماری شادی کو ابھی ایک سال پورا نہیں ہوا تھا چنانچہ مجھے اپنی شریک حیات بننے کا اعزاز عطا کرنے والی لڑکی دنیا میں سب سے حسین نظر آتی تھی۔ حسینۂ عالم... حور شمائل... پری پیکر... دلربا ناز آفریں وغیرہ۔ اور میں اسے سویٹ ہارٹ... ڈارلنگ... ہنی وغیرہ جیسے ناموں سے مخاطب کرتا تھا۔ یہی بعد میں بیوی... گھر والی... جورو... گلے میں پڑا ڈھول اور پاؤں کی جوتی ہو جاتی ہے تو یہ بھی گویا معمول ہے۔

ایک نئی بہو نے اپنے خاصے بزرگ سسر محترم کو دیکھا کہ وہ اپنی ہم عمر شریک حیات کو جو ان کے ساتھ رفاقت کی گولڈن جوبلی کر چکی تھیں، بڑے پیار سے کبھی ڈارلنگ، کبھی سویٹ ہارٹ یا ہنی جیسے خطابات دے کر متوجہ کرتے ہیں۔ اس نے بڑے رشک سے اپنے میاں سے پوچھا۔ ”کیا آپ بھی اس عمر میں مجھے ایسے ہی مخاطب کریں گے؟“

شوہر نے آہ بھری۔ ”کرنا ہی پڑے گا۔ اگر مجھے بھی ابا کی طرح نام بھولنے کی بیماری ہو گئی۔“

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کہیں کوئی بات معمول کے مطابق نہیں۔ یہ ہوتا تھا کہ باتھ روم کے شاور سے پانی گرنے کی آواز کے ساتھ میری تقریباً نئی بیوی کے خوشی اور سرمستی میں گنگنانے کی آواز آتی تھی۔ نصیبو لال کا وہ گانا یہ وجوہ یہاں لکھا نہیں جا سکتا جو وہ گاتی تھی۔ پھر وہ بدن پر تولیا لپیٹے، مسکراتی شرماتی... زلف بردوش غسل خانے سے برآمد ہوتی تھی تو گیسوئے اشکبار سے میرے چہرے پر پھوار گرا کے مجھے بیدار کرتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس شرارت کا نتیجہ کیا نکلے گا... یا کبھی یوں ہوتا تھا کہ وہ زلفیں سنوار کے اور لباس بدل کے کافی کا مگ لیے نمودار ہوتی تھی ورنہ ناشتے کی ٹرے کے ساتھ۔ سنڈے کی صبح منہ ہاتھ دھوئے بغیر ایسی دھلی دھلائی نازنین گل بدن گل پیرہن کے ساتھ ناشتا کرنے کے لطف کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ہفتے کے باقی چھ دن آدھا ادھورا ناشتا نگل کے آفس بھاگتا ہو۔ پھر رات گئے لوٹ کر آنے کے لیے۔

میں نے حلق سے کشور کمار کی طرح اونچے نیچے سروں میں گا کے کہا۔ ”جانو... جانو تم کہاں ہو؟“ کوئی جواب موصول نہ ہونے پر میں نے واش روم میں جھانکا۔ اگر وہ اندر ہوتی تو ایک چیخ نما ہنسی کے ساتھ کہتی۔ ”بے شرم... چلو بھاگو یہاں سے۔“ اور چونکہ عقل مندوں نے فرمایا ہے کہ عورت کی نہ میں ہاں ہوتی ہے، اس کا مطلب بھی الٹا ہوتا... لیکن اندر نیم تاریک سیلن تھی۔ ساکت شاور اور خاموشی۔ عام کاہل شوہروں کی طرح میں پھر الٹا لیٹ کے اور تکیے میں سر گھسا کے شبِ گزشتہ کے خمار میں ڈوب گیا اور پیٹ میں دوڑتے چوہوں کے ساتھ خستہ گرما گرم پراٹھے، اٹالین آملیٹ اور مہکتی چائے کے تصور میں کھو گیا۔ کہاں شادی سے پہلے ”کوئٹہ بلوچستان پاکستان ہوٹل پٹھان کا انڈا پراٹھا۔ وہ میلی کچیلی سے سیاہ بھنکتی مکھیوں والی خستہ حال میز اور زخموں سے چور چور کیتلی سے شکستہ کناروں والے غلیظ پیالوں میں پی جانے والی چائے کا ناشتا... اور کہاں یہ گورے گورے ہاتھوں سے خوب صورت مرمریں فرنچ مگ میں پیش کی جانے والی چائے۔ خستہ نازک پراٹھے اور آملیٹ... اور سامنے وہ مہ لقا خود جلوہ فشاں۔

اچانک میں اٹھ بیٹھا۔ ابھی تک میرے کانوں نے یہ نغمۂ جاں فزا نہیں سنا تھا کہ ”چلیے بہت سو لیے... اٹھیے ناشتا آ گیا۔“ یہ تاخیر کسی حد تک خلافِ معمول تھی... اس کا اندازہ

مجھے بلاوجہ پنڈولم کو ہلانے والے کلاک کی طرف دیکھ کے ہوا۔ میں نے اونگھنے یا کاہلی سے انتظار کرنے میں چالیس منٹ گزار دیے تھے۔ پیٹ میں دوڑتے چوہے تو بھوک سے دم توڑ چکے تھے۔ اب میری باری تھی۔ پھر میں نے تپ کے کہا۔ ”یار! کیا آج بھوکا مار دو گی اپنے اکلوتے شوہر کو؟“

دو بیڈ کے اس مختصر ترین فلیٹ میں جس کا بیان کردہ رقبہ ایک ہزار اسکوائر فٹ تھا، فاصلے نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں تھوڑا سا نیم عاتر چھا ہو کے گردن کو سارس کی طرح لمبی کر کے کچن میں جھانک بھی سکتا تھا چنانچہ یہ فرض کرنا محال تھا کہ مہرو کے کانوں تک میری فریاد نہ پہنچی ہو۔ مجھے تو اس جواب کی توقع تھی کہ مجھ سے کہہ رہے ہو یا پڑوسن سے۔ بے خیالی میں جو پڑوسن کو ایک دن میں پریا نکا چوپڑا کہہ بیٹھا تھا۔

اب مجھ پر واجب بلکہ فرض ہو گیا کہ بقلم خود کچن میں جا کے تفتیش کروں کہ ناشتا تیاری کے کس مرحلے میں ہے اور مہرو کی طرف سے جواب موصول نہ ہونے کے کیا اسباب ہیں... لیکن مہرو کچن میں نہیں تھی۔ درحقیقت وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے جہاں جہاں اس کے جسمانی وجود کا امکان تھا۔ ویسے وہ میرے دل میں تھی اور میرے خیالوں میں تھی۔ اسے فریج کے کسی خانے میں یا کچن کیبنٹ میں تلاش کرتا تو یہ پاگل پن ہوتا۔ پر جب میں نے راہداری میں کھلنے والے دروازے کو غیر مقفل دیکھا تو مجھے حیرانی کا پہلا شاک لگا۔ مہرو اتنی صبح صبح یعنی ناشتے سے بھی پہلے آخر کہاں جا سکتی ہے؟ میں تو خیر دس بجے کے بعد جاگا تھا۔ وہ اٹھی ہو گی نو بجے یا ساڑھے نو بجے۔ وہ تو کبھی دودھ یا انڈا لانے کے لیے نیچے نہیں اتری تھی۔ وہ ڈرتی تھی۔ کسی وجہ کے بغیر ڈرتی تھی۔ اس کے اندر ایک کمزور، بزدل، خوف زدہ روح تھی۔

دس منٹ کے اندر اندر میرا تجسس بڑھ کر پریشانی میں ڈھل گیا۔ بھوک نہ جانے کدھر گئی۔ میرا دماغ ہر قسم کے امکانات کی طرف دوڑنے لگا۔ بیشتر امکانات فلمی تھے۔ مثلاً یہ کہ خاموشی سے کوئی سابقہ اور نادیدہ رقیبِ روسیاہ اندر آیا اور اسے اٹھا کے لے گیا۔ میرا مالکِ مکان اپنے گدھے کے منہ والے بکرے کو چھپا کے رکھتا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ کے کہتا تھا کہ خانہ خراب امریکا اس پر بقرعید سے پہلے ہی ڈرون کا حملہ کر دے گا۔ میرا اندیشہ بھی اتنا ہی بے بنیاد تھا۔ ایک امکان تھا کوئی ایمرجنسی... مگر یہ بھی احمقانہ خیال تھا۔ ایمرجنسی خود اسے ہوتی یا کسی اور کو... وہ مجھے بتاتی... کوئی آتا تو مجھے پتا چلتا یا فون کی گھنٹی بجی ہوتی۔

یہ خیال مجھے آ ہی نہیں سکتا تھا کہ میری مہرو... میری محبت میں یوں ڈوبی ہوئی جیسے مربے کے شیرے میں سیب اور مجھے اپنے عشق میں پپا تاتُس بی کی طرح مبتلا کرنے والی مہرین تسنیم مجھے چھوڑ گئی ہے۔ میرے گھر سے بھاگ گئی ہے۔ نظریہ امکانات کے مطابق یہ ناممکن تھا جو ہو چکا تھا۔

وقت جیسے ایک دم رک گیا تھا۔ وہیں جہاں مہرین نے اسی طرح مجھے اکیلا کر دیا تھا جیسے ٹرین کے سفر میں آپ کا واحد ہم سفر اچانک خاموش ہو جائے اور آپ پر انکشاف ہو کہ ٹرین چل رہی ہے مگر اپنے کمپارٹمنٹ میں اب آپ واحد مسافر ہیں۔

میری عقل خبط ہو چکی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو بتاؤں۔ پولیس کو... دوست احباب کو... رشتے داروں کو بتاؤں تو کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں؟ ان کے سوالات کیا ہوں گے؟ یہ مجھے اندازہ تھا مگر جواب میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ کون یقین کرے گا مجھ پر... سب جانتے تھے کہ اس اکیسویں صدی کی لیلیٰ تھی تو مہرین اور مجنوں کا ریکارڈ توڑا تھا تو میں نے... جیسا کہ عیسائی جوڑے نکاح کے وقت اقرار کرتے ہیں... صرف موت ہی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر سکتی تھی۔

بس... موت... بالآخر بات یہاں آ کے ٹھہرے گی اور کوئی نہ کوئی ایک خرانٹ صورت عیار سیرت تھانے دار میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہے گا۔ جس عاشق کی اولاد... وفا کے گھوڑے... ہم نے بہت دیکھے ہیں ایسے ڈرامے باز شوہر... آرام سے بتا دے کہ کیا ہوا تھا؟ تو نے مار کے اسے کہاں پھینکا ہے؟ کہیں گاڑا ہے یا ٹوٹے کر کے کسی نہر میں بہائے ہیں؟ ایسی کیا بات معلوم ہوئی تھی آخر اس کے بارے میں؟ وہ کسی اور کا بچہ لائی تھی؟ یا معاملہ تیرا تھا... کسی اور پہ دل آ گیا ہے؟ چل شاباش... آرام سے بتا دے کہ لاش کا کیا کیا اور آلۂ قتل کہاں ہے... ورنہ ہم تو معلوم کر ہی لیں گے صبح تک... سچ منہ سے نہیں نکلے گا تو کہیں اور سے نکلے گا...

میرا سارا وجود سن ہو گیا۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں؟ سچ ابھی سامنے آ جائے گا۔ مہرین اچانک ہنستی ہوئی اور شرمندگی کی تصویر بنی نمودار ہو گی اور میرے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کہے گی۔ ”مجھے معاف کر دو جانو... اچانک جانا پڑا مجھے... تمہیں بتا بھی نہ سکی... تم بہت ناراض ہو نا مجھ سے... میں نے بہت پریشان کیا نا تمہیں... سوری... وہ دراصل ہوا یوں...“ پھر وہ مجھے ساری بات بتا دے گی جو میری سمجھ میں آ جائے گی۔ اس کے باوجود غصہ کرنے کا حق تو

میرا ہے۔ ایسی بہت سی باتیں میں نے کچن میں خود کافی بناتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھائیں۔ اب بھوک تو جیسے مر چکی تھی۔ سیاہ کافی کو میں نے زہر سمجھ کے پیا۔ اس سے میرے دماغ کی مشین کی ٹیوننگ ہو جاتی تھی۔

تین گھنٹے بعد میں نے ایک لائحہ عمل بنا لیا۔ میں ایسے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ صرف فراقِ یار میں آنسو بہانے سے یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ یہ انتہائی سنگین معاملہ تھا۔ ایک زندہ سلامت، صحت مند اور ذی ہوش عورت جو قانوناً میرے ساتھ رہتی تھی کیونکہ وہ قانونی اور شرعی طور پر میری بیوی تھی۔ اگر اچانک غائب ہو گئی تھی تو ایسا نہیں کہ وہ جادو جانتی تھی یا بھوت پریت کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ دھوئیں کی بنی ہوئی تھی کہ ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ دنیا میں سات ارب انسان تھی... اس ایک عورت کا پتا چلنا چاہیے کہ وہ کہاں گئی اور کیوں... سارے سوالوں کے جواب بہرحال مجھے دینا ہوں گے۔ شرمندگی، رسوائی، تفتیش سب کا سامنا مجھے ہوگا۔

سب سے پہلے میں نے اپنے ایک قابلِ اعتماد اور بے تکلف دوست کو فون کیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ تو آفس گئے ہیں۔ کوئی ارجنٹ میٹنگ آ گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ارجنٹ میٹنگ کہاں اور کس کے ساتھ ہوگی۔ میری آواز پر اس نے کہا۔ ”نورِ چشم... آواز سے تو لگتا ہے... تُو کسی تھانے یا اسپتال سے بول رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تیرے ساتھ وہی ہے نا... تیرے باس کی بیوی؟“

وہ خفت سے ہنسا۔ ”جب تُو جانتا ہے تو پوچھتا کیوں ہے؟“

”یار! وہ میری بیوی گم ہو گئی ہے آج۔“

بات سمجھے بغیر اس نے خفگی سے فون بند کر دیا۔ ”اب یار ہم اتنے کمینے بھی نہیں ہوئے کہ دوستوں کی بیوی...“

اس کا فون پھر نہیں ملا۔ میں جہاں جہاں فون کر سکتا تھا، میں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ ظاہر ہے سب حیران ہوئے کیونکہ میری بیوی کہیں بھی اکیلی نہیں جاتی تھی۔ بیویاں اکیلی میکے چلی جاتی ہیں کیونکہ شوہر صاف انکار کر دیتے ہیں لیکن مہرین کا تو کوئی میکہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ میرے ساتھ بھی صورتِ حال زیادہ مختلف نہیں تھی۔ میرے دو بڑے بھائی تھے جو ہجرت کر کے سات سمندر پار امریکا، کینیڈا چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ مہینے میں ایک بار فون کرتے تھے یا سال میں ایک بار عید کارڈ بھیج دیتے تھے۔ ایک کی بیوی خالص میڈ ان یو ایس اے میم

تھی جس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ دوسری پاکستانی نژاد خاصی مہذب اور ملنسار تھی۔ میری ایک بہن وداع ہو کے دبئی گئی تھی لیکن تیسرے بچے کی پیدائش پر غالباً گھر والوں کی غفلت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ جب میں نے شادی کی تو اس کی اطلاع بڑے بھائیوں کو دے دی تھی اور جواب میں ان کے مبارک باد کے فون بھی آئے تھے۔ لیکن پھر رابطہ نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ اس اخلاقی ذمے داری سے بھی سبکدوش ہو چکے تھے کہ میں چھوٹا اور اکیلا ہوں چنانچہ انہیں میری خبر لینی چاہیے۔

ہاں، ایک ماں تھی جو میرے لیے سب کچھ تھی۔ میرا پورا خاندان تھی۔ میں بڑے بھائیوں کے مقابلے میں بائیس سال چھوٹا تھا چنانچہ میں اس کے لیے ایک ننھا بچہ ہی رہا۔ باقی سب کچھ کیے بغیر باپ کے برابر ہونے کی بات کرتے تھے تو مجھے جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ باپ نے ہم سب کی اعلیٰ تعلیم اور اچھی زندگی کے لیے اتنی محنت کی کہ خود ان کی زندگی مختصر ہو گئی۔ وہ بلڈ پریشر اور اس کے نتیجے میں ہونے والے دل کے روگ کو چھپاتے رہے تاکہ انہیں علاج پر رقم نہ خرچ کرنی پڑے اور کوئی انہیں مجبور نہ کرے۔ ظاہر ہے ان کو ایک دن اچانک زندگی کو خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن تب تک وہ ہم سب کی ذمے داری سے فارغ ہو چکے تھے۔

ماں نے ہمیں رحمت کا سایہ فراہم کیے رکھا۔ وہ شاید اسی لیے شوہر کی موت کے بعد بھی بیس سال زندہ رہیں کہ ہم زندگی کی کڑی دھوپ میں خود کو جلتا محسوس نہ کریں۔ پھر سب انہیں چھوڑ کے چلے گئے۔ جیسے پرندے اڑنے کے قابل ہوتے ہیں تو آشیانوں سے پرواز کر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے وہ یوں اپنی طرف دیکھتی نظر آتی تھیں جیسے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم کب جا رہے ہو ولایت؟ حالانکہ میں انہیں بارہا یقین دلا چکا تھا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں... لیکن تین کی جوانی کے زخم نے انہیں نفسیاتی خوف اور عدم اعتماد میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالآخر جب انہیں یقین آیا تو ان کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ انہوں نے کہا۔ ”جمال! تو بھی گھر بسا لے تو میں چلوں اور یہ تیرے اختیار میں ہے۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔

”ہاں ہے۔“ میں نے ضدی لہجے میں کہا۔

”توبہ کر توبہ جمال... آخر کب کرے گا تو شادی۔ پہلے ایم بی اے کی ضد تھی۔ پھر تیس سال کی شرط لگا دی۔ اب تیس سے اوپر کا ہے۔ اب کیا بہانہ کرے گا؟“

میں نے ان کا ہاتھ تھام کے کہا۔ ”ہولی مدر... ابھی میں سوچ رہا ہوں... یہ ہو سکتا ہے کہ بہانہ ملنے سے پہلے مجھے وہ لڑکی مل جائے جو آپ کی بہو بننے کے لائق ہو... تلاش جاری ہے۔“

انہوں نے اداسی سے کہا۔ ”تیری مرضی... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ صرف تین مہینے بعد مجھے مہرین مل گئی۔ ظاہر ہے اس کے امکانات موجود تھے۔

☆☆☆

جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ یہ ایسی ہی عالمی سچائی ہے جیسے یہ کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ اس میں بھی دیر سویر ہو جاتی ہے ورنہ یہ محاورہ کیسے بنتا کہ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ کبھی کی جگہ آپ کہیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ان دنوں میں اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق کام کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جہاں کوئی مجھے پسند کر لیتا تھا وہاں سب سے پہلے تو مجھے کام کے مقابلے میں تنخواہ بہت تھوڑی لگتی تھی۔ ایک جگہ مجھے باس کی صورت اچھی نہیں لگی۔ وہ ادوم پوری کی کاربن کاپی تھا مگر اس کی آواز اور حرکات و سکنات زنانہ تھیں۔ ایک اور جگہ سے میں یوں بھاگ لیا کہ باس ایک ادھیڑ عمر لیکن ہنوز کنواری خاتون تھی۔ بدصورت بھی اور بددماغ بھی۔ باقی سب جگہ سے مجھے بھگا دیا گیا۔

اس رات میں کرشن نگر سے آگے سانده کلاں کے بس ٹرمینل پر اترا تو آخری مسافر تھا۔ پھر میں نے کنڈیکٹر کو دیکھا تو وہ آگے کسی خاتون مسافر کو جگا رہا تھا۔ ”بی بی اٹھو... سانده آ گیا۔“ اور میں نے چند منٹ بعد ایک لڑکی کو اگلے دروازے سے اترتے دیکھا۔ بس گھوم کے دوسری بسوں کے ساتھ ٹھہر گئی تھی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی اتر کے آخری بس سے آگے اپنے جیسے لوگوں کے حلقے میں شامل ہونے جا رہے تھے۔ یہ شاید آخری بس تھی چنانچہ لکڑی کے کیبن جیسے سب آفس کے باہر ریڈی میڈ کڑک چائے کے آخری دور میں دن بھر کی آمدنی کا حساب کیا جا رہا تھا۔

وہ ایک ویران اور تاریک کھلا میدان تھا جہاں سے میں تقریباً ایک کلومیٹر پیدل چلتا تھا تو اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔ آبادی اس مختصر سے میدان کے چاروں طرف تھی لیکن وہ لڑکی جیسے طے نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کس سمت میں جانا چاہیے۔ اکیلی بائیس چوبیس سال کی لڑکی کے لیے رات کے گیارہ بجے وہ جگہ محفوظ نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتا پایا تو چند قدم چلی پھر رک گئی۔ اس کے تذبذب

نے مجھے کچھ حیران کیا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ نشے میں نہیں تو بیمار ہے۔ اس کی چال میں استقامت نہیں تھی لیکن اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ بے یقینی کا شکار تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ اسے جانا کہاں ہے۔ گھر آس پاس ہوتا تو وہ بس سے اترتے ہی تیر کی طرح اپنی گلی کی سمت پکڑتی۔

لڑکی نے مخالف سمت میں جاتے جاتے ایک بار پلٹ کے میری طرف دیکھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا اب بھی میری نظر اس پر ہے۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ اس کی نظر نے میرے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ وہ یقیناً غلطی سے ادھر آ گئی تھی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ یہ کیا جگہ ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔ اس کی ایک نگاہ نے مجھ سے وہ کہہ دیا جو اس کی زبان کہنے سے قاصر تھی اور ایک لمحے میں اس ان کہی کو سمجھ کے میں نے وہ فیصلہ کیا جو مجھے مشکل میں بھی ڈال سکتا تھا۔

میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ”سنیے۔“ میں نے اتنی اونچی آواز میں کہا کہ وہ سن سکے۔

وہ جیسے گوش برآواز تھی۔ اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”یہاں آپ کے سوا کون ہے۔ یہ خالی بسیں... یہ کھمبا اور درخت۔“ میں نے ایک غیر سنجیدہ بات خاصی سنجیدگی سے کی۔ ”کہاں جانا ہے آپ کو؟“

اس نے رکی مگر بے جان لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

میں نے مفاہمانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”دیکھیے... میں رہتا ہوں یہاں۔ ہر روز انہی بسوں میں آتا جاتا ہوں۔ لوگ مجھے پہچانتے ہیں اور میں لوگوں کو جانتا ہوں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ یہاں کی رہنے والی نہیں ہیں۔“

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”فرض کیا آپ شرط جیت گئے... پھر؟“

میں زیادہ اعتماد کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھا۔ ”پہلے تو چلیے... یہاں رک کے آپ سے بات کرنا خود میرے لیے شک کو جنم دے گا۔ آپ تو پھر لڑکی ہیں۔ یہ بس کنڈیکٹر اور ڈرائیور اس علاقے کے مسافروں کو جانتے ہیں۔ ان کی نظر بڑی مردم شناس ہوتی ہے کیونکہ ہر روز یہ سیکڑوں ہزاروں چہرے پڑھتے ہیں۔“

وہ اب میرے ساتھ چلنے لگی تھی۔ ”آپ کیا کرتے ہیں... پروفیسر ہیں؟“

میں نے خفت سے کہا۔ ”صورت تو میری ایسی

نہیں... شاید میرے لیکچر سے آپ نے اندازہ کیا... مگر خاتون! میں صرف آپ کو سمجھا رہا تھا۔ بتایئے آپ کو کس کے گھر جانا ہے، میں پہنچا دوں۔“

”کس کے گھر جانا ہے مجھے؟“ اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

میں رک گیا اور اسے اسٹریٹ لائٹ میں غور سے دیکھا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ کپڑے میلے اور چہرہ ویران تھا لیکن اس کے باوجود اس کے حسن کی دلکشی برقرار تھی۔ نہ میرا ایسا کوئی تجربہ ہے کہ میں رات کو گاہک پھنسانے کے لیے نکلنے والی بدکردار عورتوں کو ایک نظر دیکھوں تو پہچان لوں اور نہ ایم بی اے کرنے تک میں نے قیافہ شناسی پر کوئی کتاب پڑھی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کے میں نے پورے یقین کے ساتھ مان لیا کہ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ بے شک چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں لیکن اس کا چہرہ ایسا نہیں تھا۔ میری عقل نے اور وجدان نے متفقہ فیصلہ کیا۔ اس کا مسئلہ کچھ اور تھا۔ ذاتی... معاشرتی... نفسیاتی۔

”اس وقت یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کے میں آپ سے کچھ پوچھ سکوں یا میں اپنے بارے میں بتا سکوں۔ صرف پان سگریٹ کی دکانیں اور دودھ دہی کے ہوٹل کھلے رہ گئے ہیں۔ اس لیے میرے ساتھ چلتی رہیے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا... کوئی پرابلم ہے تو بتا دیں پلیز۔“

وہ پھر میرے ساتھ چلنے لگی۔ ”کوئی پرابلم نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور پھر لڑکھڑائی۔

میں نے غیر ارادی طور پر اسے نہ سنبھالا ہوتا تو شاید وہ گر جاتی۔ ”جھوٹ نہ بولیں۔ بیمار نہیں ہیں تو پھر ایسی حالت کیوں ہے آپ کی؟“

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں... میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

”اوہ مائی گاڈ...“ اس کے جواب سے جیسے میرا دماغ گھوم گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے احساس ہوا کہ بلاوجہ میں نے خود کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اب اس جوان لڑکی کو لے کر میں کہاں جاؤں۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ یہاں تک آنے کے بعد اس سے کہوں کہ بی بی مجھے معاف کرو۔ جہاں دل چاہے جاؤ... میں نے بڑی بے وقوفی کی جو تم سے ہمدردی کی۔ لیکن دوسرے لمحے مجھے اپنے اس خیال پر سخت شرمندگی ہوئی۔ اب مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ایک مہذب تعلیم یافتہ شریف آدمی... اتنا کمینہ اور خودغرض کیسے بن سکتا ہوں۔ میرا انجام جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس لڑکی کا کیا انجام ہوگا، اگر میں اسے چھوڑ گیا۔ یہ زیادہ اہم ہے۔

وہ پھر گرنے والی تھی کہ میں نے اسے سنبھال لیا۔ اب اس کا ایک ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ ”کہاں رہتے ہیں آپ؟“

میں نے مضبوط لہجے میں اسے تسلی دی۔ ”بس چند قدم اور... آگے میرا گھر ہے۔ میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا نام جمال احمد ہے۔ اس گھر میں ہی میری پیدائش بھی ہوئی تھی۔ یعنی تیس سال ہو گئے۔ آس پاس رہنے والے سب مجھے جانتے ہیں۔ میں ان گلیوں میں کھیل کے بڑا ہوا ہوں۔ میرے والد کو بھی جانتے تھے لوگ... ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“ وہ بولی۔

”تاکہ آپ کا اعتماد بحال ہو سکے۔ آپ کو یہ خطرہ نہ ہو...“

”ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار ہوں میں۔ ایک عورت کو آخر کسی مرد سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر تم اکیلے ہوتے... تب بھی میں تمہارے ساتھ جاتی اور مدد کرنے کے بعد... تم جو معاوضہ طلب کرتے...“

”پلیز شٹ اَپ... اگر ایسا کوئی تجربہ ہے تمہارا تو اسے سب پر مت تھوپو... سب بدمعاش اور ہوس پرست جانور نہیں ہوتے۔ ان میں انسان بھی ہوتے ہیں... لو... میرا گھر آ گیا۔“

رات کے وقت گلیاں سنسان تھیں۔ اس کے باوجود اپنے گھر کے قریب میں نے سامنے سے آنے والے دو افراد کو سلام کیا۔ انہوں نے ایک اچٹتی نظر اس لڑکی پر ڈالی جس کو میں نے کمر کے گرد ہاتھ ڈال کے سہارا دے رکھا تھا اور جو ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بیماروں کی طرح چل رہی تھی۔ انہوں نے میری طرف شک کے ساتھ نہیں، ہمدردی سے دیکھا مگر کوئی سوال پوچھنے سے گریز کیا۔ اس اعتماد کی وجہ سے کہ میرے ساتھ میرے گھر کی عورت ہی ہو سکتی تھی۔

”ماں نے پہلی دستک پر کنڈی کھولی اور پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا کیونکہ انتہائی حیرت کے ساتھ شک اور تشویش نے اس کی آنکھوں میں ایک سے زیادہ سوالات بھر دیے تھے۔

میں نے کہا۔ ”اماں! اس لڑکی کو اندر لے جا کے لٹائیں... اور فوراً کچھ کھانے کو دیں۔ یہ کل سے بھوکی ہے۔“

اماں نے اسے سنبھال لیا مگر سوال کو نہ روک سکی۔

”کون ہے یہ چھال؟“

میں نے کہا۔ ”یہ آپ اسی سے پوچھیے گا بعد میں... مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

مائیں وہمی، شکی مزاج یا بزدل سب کچھ ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً میری ماں جیسی جن کا آسرا خدا کے بعد صرف ایک بیٹے پر ہو لیکن وہ بیٹوں کے چہرے... الفاظ اور لہجے سے جھوٹ اور سچ کو اتنی ہی آسانی سے پرکھ لیتی ہیں جیسے سنار کسوٹی پر سونے کو پرکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اماں نے میری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر اعتبار کر لیا ہے اور اس کے لیے بھی تفصیلات غیر اہم ہو گئی تھیں۔ سب سے پہلے تو اس لاوارث، بیمار، زخم خوردہ اور پریشان حال... اور آہوئے صیاد دیدہ جیسی لڑکی کو صحت اور سلامتی اور یقین دینا اہم ہوگا۔

مجھے کچھ بھی بتانا نہیں پڑا۔ میں نے جتنی دیر میں کپڑے بدلے اور غسل خانے میں منہ دھو کے دن بھر کی تھکن اتاری... اتنی دیر میں اماں نے اسے اپنے بستر پر لٹا کے اس کے ہاتھ پیر گیلے تولیے سے صاف کر دیے تھے۔ پھر میں نے دیکھا، وہ اسے ایک کپ ہاتھ میں تھامے دوسرے سے سہارا دے گرم دودھ پلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”تھوڑا تھوڑا بیٹی... آہستہ آہستہ۔“ میں عمداً ادھر نہیں گیا اور اماں کو جیسے یاد ہی نہیں رہا کہ ہر روز کی طرح آج بھی میں سارا دن جوتیاں چٹخا کے آیا ہوں تو بھوکا بھی ہوں۔ میں نے خود ہی کچن میں جا کے کھانا گرم کیا اور کھا لیا۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹا تھا کیونکہ ذہنی طور پر میں اماں کے بہت سے سوالوں کے لیے تیار تھا جن کا خود میرے پاس جواب نہیں تھا۔ مجھے صبح آنکھ کھلنے پر حیرانی ہوئی کہ مجھے نیند کیسے آ گئی اور اماں نے بھی مجھے سونے دیا۔ جیسے ایک اجنبی لڑکی کا میرے ساتھ گھر میں آ جانا اتنا ہی غیر اہم واقعہ تھا جیسے پڑوس والوں کی پالتو بلی کا کسی بھی وقت گھر میں آنا اور اماں کے نماز والے تخت کے نیچے سو جانا۔

صبح اماں نے مجھے بتایا۔ ”اس کا نام مہرین نسیم ہے جو اس نے بتایا ہے۔“

میں نے چائے کا مگ پکڑتے ہوئے سر ہلایا۔ ”ہوگا پھر یہی نام۔“

”ابھی سو رہی ہے۔“ اماں نے مجھے مطلع کیا۔ ”میں نے نیچے بستر بچھا لیا تھا۔“

”رات میں بہت تھکا ہوا تھا۔ نیند آ گئی۔ آپ نے کچھ پوچھا نہیں مجھ سے؟“

”کیا پوچھتی... کہہ دیا تھا تو نے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم... یہ جھوٹ ہوتا تو اتنے آرام سے کیسے سوتا تو... اور وہ بھی... پتا نہیں کون ہے بے چاری مصیبت کی ماری... مگر کوئی ایسی ویسی ہوتی تو ہاتھ صاف کر کے نکل گئی ہوتی اب تک۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ ”اندر کیا ہے اماں جو وہ لے جاتی؟ تمہارا یہ وضو کا لوٹا... جو تم جہیز میں لائی تھیں۔ سب سے قیمتی چیز تو تھا تمہارا یہ ہونہار آخری لختِ جگر... مجھے وہ باہر سے ہی لے جاتی۔“

اماں نے کہا۔ ”کہاں سے لایا تھا اسے تو... اور جانتا نہیں تھا تو یہ کیسے چل پڑی تیرے ساتھ... دیکھا ہوگا کسی نے تمہیں اس حالت میں تو کیا سمجھا ہوگا؟“

”یہ تم انہی سے پوچھنا۔ مجھے ایک تو چچا ڈھکن ملے تھے، ایک صوبیدار صاحب... باقی اسٹوری کچھ یوں ہے۔“

اماں نے میری کہانی سنی اور اس پر اعتبار بھی کیا۔ پھر ہم دونوں تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ آخر یہ جائے گی کہاں؟ گھر سے بھاگی ہے تو سنائے گی کوئی جھوٹی سچی کہانی۔ واپس تو جانے سے رہی ہمارے کہنے سے۔ پھر کیا کریں؟ اس سے کہیں کہ چلو اب جاؤ جہاں چاہو... تھوڑی بہت مدد کر دیں... لیکن اپنے گھر میں کیسے رکھ لیں جوان جہان لڑکی کو... کتنی بدنامی ہوگی اگر ہم پکڑے گئے... اور کون یقین کرے گا ہماری بات کا... بہتر یہی ہوگا کہ اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔

میں نے کہا۔ ’اماں! تم اپنی بیٹی کو چھوڑو گی پولیس کی تحویل میں؟“

اسی وقت وہ اندر آ گئی اور اماں کے ساتھ دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں نے سب سنا آپ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے... میرے بارے میں۔“

میں نے اماں کو روک دیا۔ ”اچھا... پھر کیا سوچا... کچھ بتانا چاہو گی یا میں تمہیں وہیں چھوڑ آؤں... بس کے اڈے پر۔“ خلافِ توقع اماں نے مجھے ٹوکا۔

”عقل ماری گئی ہے تیری لڑکے... وہ سو کے اٹھی ہے ابھی... ایسی جلدی کیا ہے... میں ناشتا بناتی ہوں... تم بھی چاہو تو نہا لو ورنہ منہ دھو لو مہرین... اور یہ کپڑے بدل لو۔ میرا کوئی جوڑا پورا ہونا چاہیے تمہیں۔“

یہ تھی مہرین کی میرے گھر میں آمد... اماں نے اسے اپنا ایک جوڑا نکال کے دیا جو تقریباً نیا ہی تھا۔ یہ مہرین نے

غسل کے بعد پہن لیا۔ ماں کا اندازہ بھی ٹھیک رہا۔ مہرین جسامت اور قدوقامت میں ماں جیسی ہی تھی لیکن میں نے اسے چار افراد کے لیے کھانے کی میز پر دیکھا تو میری عقل خبط ہو گئی۔ مجھے یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ رات والی بیمار صورت مخبوط الحواس نظر آنے والی لڑکی ہے۔ بہ زبانِ شاعر... رات میں نے اسے دیکھا تو وہ کیچڑ میں کھلنے والا گلاب تھی اور اب صبح بہار کی شبنم میں دھل کر اس کا رنگ روپ، شگفتگی اور رعنائی یوں نکھر کر سامنے آئی تھی کہ نظر اس کے جلوۂ حسن کی تابانی پر ٹھہرتی نہ تھی۔

اس نے کہا۔ ”آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ میں گھر سے بھاگ آئی ہوں۔ میرا گھر گزری شاہو میں ہے۔ کل صبح سے رات تک میں بسوں میں پھرتی رہی۔ ایک بس سے اترتی تھی تو دوسری میں سوار ہو جاتی تھی۔“

ماں نے کہا۔ ”بڑی عقل مندی کی تم نے... سوچو ذرا جمال نہ ملتا تمہیں... کوئی اٹھائی گیرا مل جاتا... جو لے جاتے ہیں راہ چلتی لڑکیوں کو اور بیچ دیتے ہیں... پھر...؟“

میں نے مہرین کو جواب کی خفت سے بچالیا۔ ”آگے کا پروگرام کیا ہے؟ ایسے ہی صبح سے شام تک بسوں میں سفر کرتے زندگی گزاردو گی... بس میں بھی ٹکٹ تو لگتا ہے۔“

ماں نے ناراضی سے کہا۔ ”تو مذاق کر رہا ہے جمال احمد؟“ وہ جب خفا ہوتی تھیں تو میرا پورا نام لیتی تھیں۔ ”اس کی تو عقل ماری گئی ہے۔ اسے اندازہ نہیں ہے ابھی دنیا کا... عقل تو کل ہی ٹھکانے آگئی ہوگی۔ پتا چل گیا ہوگا کہ ماں باپ کا گھر ہی اپنا ہوتا ہے۔ وہ کیسی بھی زیادتی کریں... اولاد کے حق میں برا نہیں کرتے۔ سوچو ذرا ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟“

مہرین زیرِ لب مسکرائی۔ ”امی! وہ میرے ماں باپ کا گھر نہیں تھا۔ وہ تو دنیا میں ہی نہیں ہیں۔“

اماں کو کچھ حیرانی کا جھٹکا لگا۔ ”پھر... کیا شوہر کا گھر تھا... وہ کیا کرتا تھا؟ مارتا پیٹتا تھا... شرابی جواری تھا؟“

اب مہرین کو ہنسی آگئی۔ ”ابھی شادی نہیں ہوئی میری... وہ گھر تھا میرے چچا کا۔ چچا بھی سگا نہیں تھا۔ میرے والد کا کزن تھا۔ میری پرورش اسی نے کی تھی۔ اب زیادہ کیا بتاؤں... اپنے ماں باپ نہ ہوں تو پھر سب سوتیلے ہوتے ہیں۔ سوتیلے جو بدترین ظلم کر سکتے ہیں۔ وہ میں نے برداشت کیا۔ چودہ سال تک... کوئی کم ہمت لڑکی ہوتی تو خودکشی کو ترجیح دیتی لیکن میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔ ایک وہی گھر تھا سر چھپانے کے لیے... اس چچا نے پرورش کے نام پر سب ہتھیا لیا۔ ایک مکان تھا، اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ میری ماں کا زیور کافی تھا۔“

”والد کیا کرتے تھے تمہارے بیٹی؟“ اماں کا دل اب پگھل چکا تھا۔

”وہ ٹرانسپورٹر تھے۔ ابتدا انہوں نے ایک سوزوکی پک اپ سے کی تھی۔ پھر دو ہو گئیں... ایک وہ خود سامان ڈھونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور کچھ پیسے آئے تو انہوں نے بولان لے لی جسے کیری ڈبا کہتے ہیں۔ اس میں اسکول کے بچوں کو لانے لے جانے لگے۔ آمدنی کے ساتھ یہ بھی ایک سے دو ہوئے۔ پھر انہوں نے بڑی گاڑی لے لی ہائی ایس۔ کالج کی لڑکیوں کو لانے لے جانے لگے۔ دس سال بعد ہائی ایس بھی دو تھیں جب اس وین کا ایکسیڈنٹ ہوا جو وہ خود چلا رہے تھے۔ شفٹ چھوڑ کے واپس آتے ہوئے ایک ڈمپر رانگ سائڈ سے آیا اور بس... وین کا چورا ہو گیا۔ ابا کو ٹکڑے کر کے نکالا گیا۔ اماں ہوش کھو بیٹھی تھیں۔ میرا خیال ہے اسی حالت میں چچا نے ان سے کاغذات پر انگوٹھے لگوا لیے اور مل ملا کے ہمارا مکان اپنے نام کرا لیا۔ پھر اماں کو پہنچا دیا پاگل خانے میں... علاج کرانے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی اس نے... میں بہت چھوٹی تھی جب وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دو سال بعد اپنا گھر بیچا اور اسی گھر میں آگیا جو دراصل میرا تھا لیکن اب تو اس کے نام پر ہے۔ اماں کا انتقال پاگل خانے میں ہی ہوا تھا جب میں میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ پڑھوں گی۔ ڈاکٹر بننا تو ناممکن تھا بی اے پاس کر کے میں نے بی ایڈ کا امتحان دیا۔ ابھی اس کا نتیجہ نہیں آیا۔ چچا نے یہ سب اس لیے کیا کہ میری شادی اپنے بیٹے سے کرے جو ذہنی پسماندگی میں مبتلا ہے۔ آدھا پاگل ہے۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ مہرین کا کیس سننے والی دو رکنی بینچ میں اماں کو چیف جسٹس سمجھا جا سکتا تھا چنانچہ میں خاموش رہا۔ مہرین کا غصے میں ہونا جائز تھا لیکن اس نے کسی جذباتی کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنسو نہیں بہائے۔ اس نے جو کہا، پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

اماں نے کہا۔ ”یہ سب سن کر افسوس ہوا لیکن تمہارا یہ چچا نہ چاہتا تو تمہیں اسکول سے اٹھا لیتا۔ کالج جانے ہی نہ دیتا۔“

”وہ ایسا ہی کرتا... لیکن میں نے اسے دھمکی دے دی تھی کہ میں کسی یتیم خانے میں چلی جاؤں گی۔ اخبار کے دفتر پہنچ جاؤں گی اور اپیل شائع کرا دوں گی کہ مجھے پناہ

چاہیے... پھر وہ کیا کرے گا... کس کس کے سوال کا جواب دے گا... وہ ڈر گیا تھا۔“

میں نے اس مرحلے پر ایک سوال کرنے میں حرج نہ سمجھا۔ ”تمہیں اعتراض صرف اس کے بیٹے سے شادی پر تھا جو تمہارے کہنے کے مطابق نیم پاگل ہے... اور کوئی بات نہیں؟“

وہ بھڑک اٹھی۔ ”آخر کس نے دیا ہے اسے یہ اختیار... سب کچھ لے لیا اس نے... اب میری زندگی بھی تباہ کرنا چاہتا ہے... کیوں...؟“

اماں نے کہا۔ ”تمہیں انکار کا حق تھا۔ اس کے لیے گھر سے نکلنا ضروری نہیں تھا۔“

”انہوں نے زبردستی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو جمع کر کے میرا نکاح بھی پڑھوا دیتے۔ کون سنتا ہے ایک مجبور لڑکی کی آواز؟ میں کسی عدالت میں فریاد لے کر جاتی تو کیسے؟“

”تمہارے پاس تو اب کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ مکان، نہ کوئی سونا چاندی... پھر چچا کو کیا لالچ تھا؟“

”لالچ نہیں امی... خوف تھا۔ اسے ڈر تھا کہ خودمختاری حاصل کرنے کے بعد کہیں میں اسے کورٹ میں نہ گھسیٹ لوں، اپنا سب کچھ واپس لینے کے لیے۔ ان کے بیٹے کی بیوی بن جانے کے بعد میرے پیروں میں زنجیر پڑ جاتی۔ اس پاگل کے ساتھ ساری زندگی گزارنے سے تو بہتر ہوتا کہ میں اسے قتل کر کے جیل چلی جاتی۔“

”یہ کہنا بہت آسان ہے۔ تم نے جیل دیکھی نہیں ہے۔ تم جیسی لڑکی اس جہنم میں پہنچ جاتی تو چار دن میں اندازہ ہو جاتا کہ ایک پاگل کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا آسان تھا۔“ میں نے سخت اور تلخ لہجے میں کہا۔

”خود کو میری جگہ رکھ کے بات کرو مسٹر جمال! کیا آسان ہے اور کیا مشکل؟“

پھر اماں نے وہ سوال داغ دیا جو بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ ”کیا تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھیں؟ تم مجھے بتا سکتی ہو۔“

مہرین کا رنگ تیزی سے بدلا مگر اس نے خود پر قابو پالیا۔ ”امی! یہ ہوتا تو میں یہاں کیوں آتی؟ سیدھی اسی کے پاس نہ چلی جاتی اور یہاں بھی میں پناہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں اپنی زندگی خود گزار سکتی ہوں۔ مجھے کہیں نہ کہیں ٹیچر کی جاب بھی مل جائے گی۔ میں کسی ورکنگ ویمن ہاسٹل میں رہوں گی۔“ اور اس وقت پہلی مرتبہ مہرین کی آنکھوں میں آنسو آئے۔

اماں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”اتنا دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔ ہم دو ہی لوگ رہتے ہیں یہاں۔ تمہارے لیے بھی جگہ نکل آئے گی۔ اگر چاہو تو اسے ہی اپنا گھر سمجھو... اور مجھے اپنی ماں... یہاں تم اتنی ہی محفوظ ہو۔“

میں نے کہا۔ ”اماں... ایک منٹ... جو آپ نے کہا اپنی جگہ... لیکن مسئلے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ مہرین کا ہم سے کیا رشتہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ رہے... اس کے چچا نے رپورٹ لکھوا دی ہوگی اس کے گھر سے فرار ہونے کی۔ معلوم نہیں اس رپورٹ میں کیا جھوٹے سچے الزامات لگائے ہوں گے۔ الزام ہم پر آجائے گا کہ اسے ورغلانے والے ہم تھے۔ آپ سے کوئی کیا کہے گا... مجرم میں بن جاؤں گا۔“

اماں کا رنگ فق ہو گیا۔ ”پھر... کیا کریں... اسے گھر سے کیسے نکالوں میں... وارث بچی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جذباتی مت ہوں اماں! میں کرتا ہوں کچھ... میرا ایک دوست صحافی ہے۔ اس سے کہتا ہوں کسی وکیل سے مشورہ کر کے مجھے مسئلے کا آسان حل بتائے۔“

مجھے مہرین کی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات نظر آئے۔ ”پلیز! میں بڑی مشکل میں ہوں... مجھے مدد چاہیے۔“

”میرا خیال ہے کہ کل رات سے میں یہی کر رہا ہوں۔“

میرا صحافی دوست بھی ایک قابلِ دید چیز ہے۔ ایک چلتا پھرتا عجائب خانہ... نام تو اس کا شبیر احمد عثمانی ہے لیکن دوست دشمن سب میں وہ مولا جٹ مشہور ہے۔ حلیہ اس کا ایسا ہے کہ لوگ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ چھ فٹ تین انچ قد کا تخیم شحیم دیوزاد آپ کی طرف بڑھے جس کے لمبے لمبے پٹے والے بال ہوں... سینے پر پھیلی ہوئی جھاڑ جھنکاڑ سیاہ داڑھی... ڈھیلا ڈھالا کرتا اور دس گز کی گھیردار شلوار تو یہ شک گزرنا کہ نیچے اس نے خودکش جیکٹ نہ پہن رکھی ہو، ایک فطری بات ہے۔ اس پر مستزاد اس کی شاہی سواری... پیٹرول پی کے دوڑتے ہوئے اپنے پیچھے دھوئیں اور شور کا طوفان چھوڑنے والی عجیب الخلقت مشین جسے دوسری جنگِ عظیم میں پھٹ پھٹی کہا جاتا تھا اور جو انگریز جاتے وقت بیکار سمجھ کے چھوڑ گئے تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ مولا جٹ کے ڈر سے اور کچھ قوتِ ارادی کے بل پر چل رہی ہے۔

مولا جٹ اپنے اصل نام کو بدنام کرتا ہے۔ اللہ

مغفرت کرے۔ مرحوم تو بڑے جید عالم تھے اور قائداعظم کی نماز جنازہ بھی انہوں نے پڑھائی تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کی وجۂ شہرت بننے والا نام بالکل اس کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ میرے فون پر اس نے غرا کے پوچھا۔ ''ابے کون ہے صبح صبح؟''

مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت وہ رات کی ڈیوٹی کے بعد شاید صرف ایک کا چھا زیب تن کیے کسی ریچھ کی طرح سویا پڑا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ''مولا جٹ! میں فرشتۂ اجل ہوں۔ آرہا ہوں ساڑھے سات منٹ میں تیری روح قبض کرنے۔'' اور فون بند کر دیا۔ مجھے صرف اپنے گھر میں اس کی موجودگی کا یقین حاصل کرنا تھا۔ اب مولا جٹ کے لیے کسی جھوٹ اور بہانے سے جان بچانا مشکل تھا۔ مہلت کی بات بے معنی تھی۔ بس سے سفر کرنے والے کو منٹوں کی نہیں گھنٹوں کی بات کرنی چاہیے۔ میں حسب توقع ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کے گھر کے دروازے پر باکسنگ کر رہا تھا اور گزرنے والے مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ آخر میں دروازے سے کس بات کا بدلہ لے رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح دروازہ ٹوٹنے سے پہلے ہی مولا جٹ اٹھ کے آ گیا۔ ہم نے خوش مزاجی سے ایک دوسرے کا حال احوال گالیاں دے کے پوچھا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد اپنے کچن میں اپنا بنایا ہوا ناشتا نوش فرماتے ہوئے مولا جٹ نے کہا۔ ''معاملہ گمبھیر ہے۔''

میں نے تین ٹانگوں پر قائم کرسی پر آگے جھک کر چائے پیتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ''اچھا؟''

''لڑکی بہت خوب صورت ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

میں نے چلا کے کہا۔ ''ہاں، اس سے زیادہ حسین لڑکی نہ تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''چل پھر کلمہ پڑھ کے بیٹھ جا ڈرون پر۔ آج اس مردود چاچا کو نشانہ بناتے ہیں۔'' اس نے نیچے آ کے اپنی پھٹ پھٹی کو اسٹارٹ کیا۔ ''کوئی وصیت کرنی ہے تو کر لے میرے حق میں۔''

میں نے کہا۔ ''میرے پاس کیا ہے جو میں تیرے لیے چھوڑوں؟'' میں پیچھے بیٹھ گیا۔

''یہ لڑکی ہے نا... کیا نام بتایا تو نے؟'' اس نے موٹر سائیکل کو دوڑانا شروع کیا۔ ہارن کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی۔ لوگ خود ہی ڈر کے اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

وہ تھانے میں بھی مولا جٹ تھا۔ سفید بالوں، بھووں اور پلکوں والے ایک عمر رسیدہ محرر نے روزنامچہ دکھانے میں کچھ پس و پیش کیا۔ ''دراصل سرکاری ریکارڈ کے لیے انچارج صاحب کی اجازت مطلوب ہے۔''

مولا جٹ نے کہا۔ ''مطلوب صاحب... کیا آپ کو معلوم ہے... آج کل کلائی کی ہڈی کا معائنہ کرنے سے بالکل صحیح عمر کا پتا بھی چل جاتا ہے۔''

منشی نے روزنامچہ سامنے رکھ دیا۔ ''اسی سال ریٹائر ہو جانا ہے میں نے جناب عالی۔''

''اگر تم نے صحیح عمر میں دس سال کی ڈنڈی نہ ماری ہوتی تو ریٹائر نہیں... اب تک فوت ہو جاتے۔'' مولا جٹ نے روزنامچے کے صفحات پلٹے اور ایک جگہ رک گیا۔ وہ مسلسل کرائم رپورٹنگ کرنے سے ایف آئی آر کی جناتی زبان اور تحریر پڑھنے پر قادر ہو چکا تھا۔ مہرین کے فرار کی رپورٹ اس کے چچا کی طرف سے لکھوائی گئی تھی اور زیب داستان کے لیے یہ بھی لکھا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ دو لاکھ کے طلائی زیورات اور کثیر نقد رقم لے گئی ہے۔

دوپہر کے قریب ہم ایک وکیل سے ملے۔ میں، شہر یار زیدی سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ نیک نام ہے۔ مولا جٹ سے اس کے مراسم دوستانہ تھے چنانچہ اس نے تمام صورت حال سمجھنے کے بعد جو مشورہ دیا، وہ بے حد عملی تھا۔ قانونی حل خود ہمارے لیے مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ میں نے شام سے پہلے مولا جٹ کے ساتھ گڑھی شاہو کا دورہ کر کے مہرین کا گھر بھی تلاش کر لیا۔ اس معاملے میں تاخیر کسی صورت فائدہ مند نہیں تھی۔

ڈراما رات کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ میں نے اماں کو مہرین کے ساتھ گڑھی شاہو پہنچایا۔ مہرین کو عمداً برقع میں رکھا گیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جن کے بد باطن چچا نے مہرین کے فرار کی اطلاع پولیس کو دینے کے بعد یہ خبر اپنے محلے میں بھی پھیلا دی ہو۔ ایسے میں مہرین کے نظر آنے سے کچھ تجسس آمیز سنسنی پھیلنے کا امکان ضرور تھا۔ مہرین خود ہی اماں کو اپنے گھر کے دروازے تک لے گئی اور دستک دینے کے بعد جیسے ہی دروازہ کھلا، اماں اندر داخل ہو گئیں۔ مہرین ان کے پیچھے پیچھے گئی اور پہلا کام یہ کیا کہ برقع اتار کے اماں کو تھما دیا۔

اب اندر کیا ہوا، اس کی رپورٹ بعد میں اماں نے دی۔ دروازہ کھولنے کے لیے چچی آئی تھی مگر اس پرانی طرز کے گھر کی ڈیوڑھی کو پار کرتے ہی مختصر سے صحن میں مہرین کا چچا کھڑا نظر آیا۔ وہ مہندی کے رنگ کی بکھوئی داڑھی والا ستر سال کا خمیدہ عمر بوڑھا تھا جس نے چار خانے کی دھوتی پر بنیان پہن رکھی تھی۔ چچی کے کچھ کہنے سے پہلے اماں صحن کے وسط میں پہنچ چکی تھیں۔ پہلے چچا نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور چلایا۔ ''آ گئی ذلوٹ کے بے حیا۔''

پھر چچی نے سوال کیا۔ ''اور تم کون ہو جی... ایسے دندناتی گھر میں گھسنے والی؟''

اماں اطمینان سے ایک چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ''زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ اونچا بولنا مجھے بھی آتا ہے۔ مہرین نے مجھے سب بتا دیا ہے۔''

''کیا بتا دیا ہے؟ بتائے گی تو پولیس کو یہ کیا کچھ لے کر گئی تھی یہاں سے... اور یہ تمہارے پاس گئی تھی تو تم بھی پیٹ میں آ ڈو گی... آخر کون ہو تم...؟''

''بڑے میاں... ابھی سارا محلہ تمہیں بتائے گا کہ میں کون ہوں۔ تم جس گھر پر قبضہ کیے بیٹھے ہو نا... یہ تھا مہرین کے باپ کا... اور اس وقت میں رہتی تھی ساتھ والے چوتھے گھر میں... آج بھی آدھے سے زیادہ پرانے لوگ ہوں گے جو تمہیں خود بتائیں گے کہ میں کون ہوں... شوہر میرا نہ مرتا تو آج تھانے دار کے اوپر کسی عہدے پر ہوتا... ڈی ایس پی یا ایس پی... تم کیسے پہچانو گے مجھے... تم یہاں نہیں دھرم پورے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ چوہدری صاحب کے پاس... اور یہ لڑکی پیدا ہوئی تو میلاد میں نے پڑھی تھی اس گھر میں۔''

اماں نے بتایا کہ اس تقریر کے بعد تو میاں بیوی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اماں نے موقع دیکھ کے مہرین سے کہا۔ ''تو جا بیٹا اندر... مجھے ان سے کچھ بات کرنا ہے۔'' اور مہرین بڑی فرماں برداری سے اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی چچی نے اماں کے ساتھ جگہ بنائی۔ چچا ایک اسٹول لے آیا۔ ''تمہارے پاس گئی تھی مہرین؟'' وہ بولا۔

''میاں جی شکر کرو کہ بچی سمجھ دار تھی۔ اسے میرا خیال آ گیا ورنہ پڑ جاتی ایسے ویسے کے ہاتھوں میں تو تم کیا کرتے... کیا منہ دکھاتے قیامت والے روز اس کے ماں باپ کو؟''

''اگر وہ فون کر کے ہمیں بتا دیتی...'' چچی نے زیرِ لب کہا۔

''ہاں، ہم نے تو رپورٹ بھی لکھوا دی پولیس میں۔'' چچا بولا۔

اسی وقت مولا جٹ کے ساتھ جانے والے اے ایس آئی نے دروازہ بجایا۔ ''ہم تھانے سے تفتیش کرنے آئے تھے۔ یہ میرے ساتھ اخباری رپورٹر ہے۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔

چچا کا رنگ اڑ گیا۔ ''اخباری رپورٹر... اس کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

مولا جٹ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ''گلی میں کھڑے ہو کے بات کرو گے تو نقصان میرا نہیں ہوگا۔''

مجبوراً چچا انہیں باہر والا دروازہ کھول کے بیٹھک میں لایا۔ چچی تک یہ اطلاع پہنچ گئی تھی کہ پولیس کے ساتھ کوئی اخبار والا بھی آیا ہے۔ اس کا فائدہ اماں نے اٹھایا۔ انہیں کون روک سکتا تھا۔ وہ سیدھی بیٹھک میں پہنچ گئیں اور بدحواس چچا کے سامنے والی کرسی پکڑی۔

مولا جٹ نے مہرین کے چچا سے پوچھا۔ ''یہ آپ کی گھر والی ہیں؟''

اماں نے چیخ کے جواب دیا۔ ''ارے اللہ نہ کرے جو میرا اس بے ایمان شیطان سے کوئی تعلق ہو... میں تو رہتی تھی اسی محلے میں... ابھی چھ سات سال پہلے تک۔''

''پھر تو آپ مہرین اور اس کے والدین کے بارے میں جانتی ہوں گی؟'' سب انسپکٹر نے کہا۔

''اے لو، ایسا بہنا پا تھا ہمارا... آج بھی مہرین سے ملنے آئی تھی میں۔''

''مگر وہ تو نہیں ملی ہوگی آپ کو گھر میں؟'' انسپکٹر بولا۔

''کیوں بیٹا... کیوں نہیں ملے گی؟''

''اس کے بارے میں انہوں نے رپورٹ لکھوائی ہے کہ وہ گھر سے فرار ہو گئی ہے۔ بہت سا نقد اور زیور لے کر۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔

اماں نے ایک چیخ ماری۔ ''ہائے تمہارے منہ میں خاک... کیسی بات کرتے ہو... مہرین ایسا کیوں کرنے لگی؟ وہ تو خیر سے گھر میں ہی موجود ہے... دیکھ لو اندر جا کے۔''

چچا نے واویلا کیا۔ ''ابھی آئی ہے وہ تمہارے ساتھ۔''

اماں نے چلا کے کہا۔ ''میرے ساتھ... بڈھے پاگل تو نہیں ہو گیا ہے... میں تو آئی تھی مہرین کے بلانے سے... اس نے فون کیا تھا مجھے کہ یہ بڈھا میری شادی زبردستی اپنے پاگل بیٹے سے کرنا چاہتا ہے۔''

''ایک منٹ اماں... آپ کہتی ہو کہ مہرین گھر میں ہے... کہیں نہیں گئی؟''

''ارے بیٹا! قسم لے لو مجھ سے۔''

چچا چلایا۔ ''جھوٹ بولتی ہے یہ بڑھیا۔''

”لعنت تیری شکل پر بڈھے۔ میں کیوں جھوٹ بولنے لگی؟ ارے بیٹا! تم نے نام تو سنا ہوگا قاضی صاحب کا۔ لاہور کے ہر تھانے میں رہے... اللہ مغفرت کرے... ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ کوئی بیٹا ہوتا تو پولیس میں بھرتی کرادیتی... تمہارے جیسا ہوتا...“ اماں نے خشک آنکھوں کو دوپٹے سے صاف کیا۔

انسپکٹر بڑی عقیدت سے اٹھا اور بیٹھ گیا۔ ”آپ... قاضی صاحب آپ کے شوہر تھے... میرے استاد تھے... سب انہی سے سیکھا ہے میں نے۔“

اب مولاجٹ نے مداخلت کی۔ ”یہ کیا پُراسرار معاملہ ہے صوفی کریم صاحب... لڑکی گھر میں ہے اور آپ نے فرار ہونے کی اور لاکھوں کی چوری کا الزام لگا کے تھانے میں رپورٹ لکھوادی؟“

چچا کی حالت غیر ہوگئی۔ ”خدا کی قسم یہ جھوٹ ہے... سازش ہے۔“

اماں نے اندر والے دروازے سے ہانک لگائی۔

”مہرین... او مہرین... ذرا ادھر تو آ۔“

مہرین بڑی سعادت مندی سے آئی اور بڑی اچھی اداکاری کے ساتھ سوال کیا۔ ”میرے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے چچا نے... میں تو کہیں بھی نہیں گئی... جاؤں گی کہاں... یہی گھر تھا میرا، سب جانتے ہیں۔“

اب بازی ایک دم پلٹ گئی۔ مولاجٹ نے سب انسپکٹر کو دھمکی دی۔ ”تم نے اس خبیث بڈھے کے خلاف کارروائی نہ کی تو میں تھانے کو بم سے اڑا دوں گا۔ جھوٹی رپورٹ لکھوائی تھی اس نے۔“

چچا رونے پر آگیا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کے حقائق بتانا شروع کیے لیکن اس پر یقین کوئی کیسے کرتا۔ مہرین نے مزید الزام لگادیا کہ یہ حرکت بھی مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے ہے۔ پہلے میرا گھر چھینا... اب یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاگل بیٹے سے شادی کرلوں تاکہ ان کا قبضہ پکا ہوجائے۔ مولاجٹ نے اپنا ڈراما کیا کہ یہ تو اسٹوری ہی کچھ اور ہے۔ اماں نے جلتی پر تیل ڈالا۔ مہرین نے کہا کہ وہ قسم اٹھانے کو تیار ہے کہ اس گھر سے اس نے قدم باہر نہیں نکالا۔ انسپکٹر نے چچا کے خلاف جھوٹا مقدمہ درج کرانے پر کارروائی شروع کی۔

بالآخر فریقین کے درمیان ایک باعزت سمجھوتا طے پاگیا۔ تھانے دار نے کہا کہ جھوٹی رپورٹ کے معاملے کو دبا دے گا۔ بشرطیکہ... ظالم چچا اپنی بھتیجی مہرین کو اپنے پاگل بیٹے کے نکاح میں لانے کے خیال سے توبہ کرے اور ایسا سوچے بھی نہیں۔ مہرین بھی مکان پر حق ملکیت کا دعویٰ نہیں اٹھائے گی۔ اخباری رپورٹر نے صلح کرانے والے کا کردار خوب کیا۔ گھر کی بات گھر میں رہے تو اچھا ہے صاحب... اماں نے بھی کہا کہ ان کے جیتے جی یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی مہرین کو کسی پاگل کے پلے باندھ دے۔ چچا کی دبی دبی مخالفت کے باوجود یہ معاہدہ لکھا گیا اور پھر ... کرانے کے بعد چچا نے بھی اس پر دستخط کیے۔ مولاجٹ نے بھی اور اماں نے بھی۔ تھانے دار نے مجبوری کے عذر پر خود کو الگ رکھا اور معاملہ دبانے کے نذرانے پر اکتفا کیا۔ مولاجٹ نے بعد میں مجھے بتایا کہ سب سے زیادہ فائدے میں وہی رہا۔ اس کی جیب میں پانچ ہزار نقد گئے۔

بے وقوف اور بدحواس چچا نے معاہدے پر دستخط کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ اس نے گویا تمام جرم کا اعتراف کرلیا۔ پاگل بیٹے سے زبردستی شادی کے ارادے کا... حق ملکیت کا معاملہ نہ اٹھانے کی بات بھی اس معاہدے کا وجود تسلیم کرنے کے مترادف تھی۔ فرار کی جھوٹی رپورٹ پر تھانے دار کی جھوٹی تسلی سے مطمئن ہوکے بیٹھ گیا کہ پانچ ہزار میں دب گئی۔ رپورٹ آج بھی موجود ہے۔ قانون کو سمجھنے والے ایک وکیل اور ایک صحافی کی عقل نے بازی الٹ دی۔ اس ڈرامے کی کامیابی میں سب سے اہم کردار اماں نے ادا کیا تھا۔ وہ مہرین کو کسی خوف اور خطرے کے بغیر واپس اپنے گھر چھوڑ آئی تھیں۔ اب وہ پہلے سے زیادہ محفوظ اور مضبوط تھی۔ اماں اس کی ایک پرانی خیرخواہ بن کے یوں سامنے آئی تھیں جیسے ہر خطرے کی گھڑی میں چین اپنے دوست پاکستان کے ساتھ آکھڑا ہوتا ہے۔ ہم سب جو اس ڈرامے کا کردار تھے، بعد میں بہت ہنسے۔

اماں نے ابتدا میں ہفتے دو ہفتے بعد مہرین کی خیریت دریافت کرنے کے لیے جانا شروع کیا۔ انہی دنوں میری فکرِ معاش بھی ختم ہوئی۔ مجھے بڑی معقول تنخواہ پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے منیجر ایچ آر کے طور پر ہائر کرلیا۔ ابتدائی تین مہینے مجھے پروبیشن پر اپنی استعداد ثابت کرنا تھی چنانچہ میں نے دن رات ایک کیا۔ نوکریاں عنقا تھیں۔ اچھی نوکری کے لیے معمولی سفارش یا معمولی رشوت بے سود تھی۔ سفارش ہو تو وزیر کی... رشوت لاکھوں میں... میرے سلیکشن میں قسمت نے ساتھ دیا۔ کمپنی کا چیف کانگو کا باشندہ اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا تھا۔ فرض شناسی اور ایمانداری کے جرم میں اسے "ناپسندیدہ" قرار دے کر شکریے کے ساتھ واپس کیا گیا ...

میری اپائنٹمنٹ کے کافی دن بعد۔
مجھ تک یہ اطلاع بھی پہنچی کہ مہرین نے مولاجٹ کی سفارش پر کسی بیوروکریٹ کے اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا ہے جس کی کرتا دھرتا اس کی احمق اور جاہل بیوی تھی۔ مولاجٹ نے اس کے اسکول کا ایک فنکشن کور کیا اور (پیسے لے کر) خاتون کا باتصویر انٹرویو بھی چھاپا۔ اس میں اس کی تعلیم، قابلیت کا ذکر چھیڑے بغیر اس کی انتظامی صلاحیت کو زبردست قرار دیا گیا تھا۔ باقی کام خود مہرین نے کیا۔ ایک بے وقوف کو بے وقوف بنانا کیا مشکل ہے۔ یہ نکتہ میرے ذریعے مولاجٹ نے اسے سکھایا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ والدہ محترمہ کا مہرین کے گھر خیرسگالی کے دورے پر جانا بڑھ گیا ہے۔ ہفتے دو ہفتے کے بجائے اب وہ ہفتے میں دو بار بھی ادھر ہو آتی تھیں، صرف "خیریت" پوچھنے حالانکہ اس کی خیریت کو اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ دو چار مرتبہ انہوں نے مجھ سے بھی کہا کہ مجھے کسی کی فکر نہیں رہی۔ اس لڑکی کو بچا لایا اور اس کے بعد بھول گیا۔

میں نے عاجزی سے کہا۔ ”اماں... نئی نوکری ہے... مجھے فرصت کہاں ملتی ہے۔“

یہ جھوٹ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مہرین مجھے اکثر یاد آتی تھی۔ اس کے کچھ انداز تھے جو میرے ذہن میں نقش ہوگئے تھے۔ وہ انداز جب میں نے اسے بس کے ٹرمینل پر دیکھا تھا۔ جب میں اس کے ساتھ اپنے گھر پہنچا تھا تو میرا ہاتھ اس کی نازک کمر کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور اس کا ہاتھ میرے شانے پر تھا... کیا رومانٹک پوز تھا۔ اس کی ریشمی کمر کا لمس مجھے شرٹ کے نیچے محسوس ہوا تھا۔ پھر جب وہ رات بھر کی نیند کے بعد سو کے اٹھی تھی اور وہ وقت جب میں نے اسے اپنی اماں کے دیے ہوئے ریشمی سوٹ میں ناشتے کی میز پر دیکھا تھا... کیا ادائے حسن تھی۔ کیا فتنہ گر شباب تھا۔ کیا قاتل معصومیت تھی۔ میں نے ایک بار اسے خواب میں بھی دیکھا۔ وہ دلہن بنی میرے... ساتھ اگنی کنڈ کے گرد سات پھیرے لے رہی تھی اور اس کا چچا پنڈت بنا کچھ بڑبڑاتے ہوئے آگ میں نہ جانے کیا پھینک رہا تھا۔ یہ اسٹار پلس ٹائپ ڈراموں کا اثر تھا اور ان جذبات کا جن کو میں نے مصلحت یا شرافت کے تقاضوں میں دفن کردیا تھا یا دفن کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ خود اس کے گھر جا سکوں یا اماں سے اس خواہش کا اظہار کروں... باقی کسر میری مصروفیت پوری کردیتی تھی۔

ایک دن میرے کیبن کا دروازہ کھلا اور وہ آ کے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں بھونچکا رہ گیا اور اسے یوں دیکھتا رہا جیسے وہ میرا واہمہ ہے اور پلک جھپکنے میں غائب ہوجائے گی۔

اس نے کہا۔ ”آپ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں مہرین ہوں۔“

میں سخت شرمندہ ہوا۔ ”میں... میں بہت شرمسار... اور اس سے زیادہ حیران ہوں... آپ کو یہاں دیکھ کر۔“

”میں ایسی بے شرمی کا مظاہرہ نہ کرتی تو آپ کبھی نہ پوچھتے خود آکے۔“

”یہ... یہ بات نہیں... اماں بتاتی رہی ہیں... تم کسی اسکول میں پڑھا رہی ہو... اینڈ یو آر لُکنگ ریئلی سو ڈفرنٹ... میرا مطلب ہے... بیوٹی فل۔“ ہمت کرکے میں نے سچ بول دیا۔

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”امی نے بتایا تھا آپ کی اس جاب کے بارے میں... لیکن آپ گول کرگئے۔“

”کیا گول کرگیا؟“

”پارٹی اور کیا... باقی سب کو ضرور دی ہوگی... ہم تو غیر ہوئے نا۔“

میں سنبھل گیا۔ ”دیکھو... جاب پہلے تمہیں ملی تھی... تم نے تو مٹھائی تک نہیں بھیجی تھی... پارٹی تو دور کی بات ہے۔“

وہ مسکرائی۔ ”اوکے... اگر میں ابھی اسی وقت تمہیں لنچ پر انوائٹ کرلوں... تو شکایت ختم؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شکایت تب ختم ہوگی جب تم میری پارٹی کے لیے ڈنر میں آؤ گی... آج ہی۔“

خلاف توقع اس نے اپنا نازک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”اٹ از اے ڈیل۔“

میں نے وہ ہاتھ تھام لیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ مائیں ایکسرے مشین کی طرح بیٹوں کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں۔ اماں نے بھی اس تبدیلی کو تاڑ لیا جو مہرین سے ملاقاتوں کے نتیجے میں میرے اندر رونما ہوچکی تھی۔ انہوں نے دوسری طرف بھی آگ برابر لگی ہوئی دیکھی ہوگی۔ ایک دن انہوں نے ایٹم بم داغ دیا۔

ناشتے کی میز پر انہوں نے کہا۔ ”میں آج جارہی ہوں مہرین کے چچا سے... مہرین کا ہاتھ مانگنے۔“

میں اچھل پڑا۔ چائے کا کپ میرے ہاتھ سے گر گیا اور مجھے پھندا لگ گیا۔ میرے کپڑے خراب ہوگئے۔

"یہ... آپ نے اچانک فیصلہ کرلیا؟"

"اچانک کہاں۔ دیکھ بھال کے کیا ہے۔ مجھے پتا ہے اب تو انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

مہرین کے چچا کی کیا مجال تھی کہ اماں کو انکار کرتا۔ اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ مہرین اس گھر سے نکلی اور اماں سے جان چھوٹی۔ وہ بدنیت آدمی کچھ خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جہیز کی بات تو اماں نے کی ہی نہیں۔ سادگی سے شادی کی تجویز مسترد کردی۔ "میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کی شادی دھوم دھام سے کیوں نہ کروں۔" انہوں نے کہا اور ایسا ہی کیا۔ میرا پروبیشن کا زمانہ گزر گیا تھا۔ مجھے کنفرم کرنے کے ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ مجھے شادی کے لیے ایک مہینے کی چھٹی ملی تو مجھے کچھ حیرانی ہوئی مگر میرا انیا پاکستانی باس اس معاملے میں فراخ دل تھا۔ اس نے کہا... کام کی خیر ہے شادی کون سی روز روز ہوتی ہے... پرانا باس شاید کہتا کہ کام تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کیا سیٹرڈے سنڈے دو دن کی چھٹی شادی کے لیے کافی نہیں؟

تیسرے دن اچانک اماں نے خود وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔ "تم کیا مہینے بھر بیٹھے رہو گے گھر میں... جاؤ کہیں گھوم پھر آؤ... بعد میں کہاں وقت ملتا ہے۔"

"پھر آپ اکیلی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"میں تو تیرے ابا کے مرنے کے بعد سے اکیلی ہوں۔ پچاس برس بیت گئے اسی گھر میں... آس پاس سب اپنے ہی ہیں۔ تم جاؤ۔"

ان کے اصرار پر میں اور مہرین ایک طویل ہنی مون کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ اس کے لیے مجھے آفس سے اپنی کار مل گئی تھی۔ لاہور سے اسلام آباد ہوتے ہم مری گئے۔ پھر نتھیا گلی سے ایبٹ آباد... اور بالاکوٹ سے ہوتے ناران... سفر کی آخری منزل جھیل سیف الملوک تھی۔ آج کل ہنی مون کے لیے نکلنے والوں کا یہی روٹ بن گیا ہے۔ ان پہاڑی راستوں پر موبائل فون کے سگنل کی پرابلم رہتی تھی۔ اماں سے شروع میں بات ہوئی۔ کبھی انہیں ہماری آواز سنائی نہ دیتی تھی، کبھی ہمیں ان کی... کبھی دن میں خیال نہیں آتا تھا تو رات کو لائن نہیں ملتی تھی۔

چھٹی کے بعد مجھے پیر سے واپس ڈیوٹی پر جانا تھا اور کچھ ایسی ہی صورت حال مہرین کو درپیش تھی۔ میری تنخواہ معقول تھی۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مہرین کو اسکول میں پڑھانے کا دردِسر مول لینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ شاید کچھ دن بعد اسے میٹرنٹی لیو لینی ہی پڑے۔ ادھر امی بھی گھر پر اکیلی رہتی ہیں۔ ان کی عمر بھی کافی ہوگئی تھی اور کسی خاص بیماری کی علامت نہ ہونے کے باوجود وہ بہت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی جارہی تھیں۔ ایسے میں مہرین ان کی تنہائی بھی دور کرسکتی تھی اور انہیں آرام بھی دے سکتی تھی۔ لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ مہرین سے شادی کے صرف ایک ماہ بعد نوکری چھوڑنے کی بات کروں۔ شاید وہ محسوس کرے کہ میں بھی روایتی شوہر بن کے اس کی خودمختاری کو محدود کررہا ہوں۔

قریباً چوبیس دن کی مسلسل تفریح کے سفر سے بری طرح تھکے ہوئے ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو تالا دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ گزشتہ دو تین دن سے گھر کے فون کی گھنٹی بجتی رہی تھی مگر اماں نے ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ موبائل فون سے انہیں الجھن ہوتی تھی کیونکہ اس کے نمبر نہ ان سے ملائے جاتے تھے اور نہ پڑھے جاتے تھے۔ میں اور مہرین اپنے اپنے سوٹ کیس کے ساتھ کھڑے تھے کہ ساتھ والے گھر سے مرزا صاحب برآمد ہوئے اور ہمیں دیکھ کر کچھ ٹھٹکے۔ میرے سوال پر انہوں نے کہا۔ "بھئی ادھر آجاؤ ہماری طرف... میں بتاتا ہوں۔"

ان کی صورت کے تاثرات نے میرے دل میں ایک انجانے خوف کو جنم دیا۔ ان کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے میں نے اپنی زندگی کی سب سے منحوس خبر سنی۔

"دس دن ہوگئے جمال میاں تمہاری اماں کو گزرے ہوئے۔ کچھ پتا نہیں کہ انہیں کیا ہوا تھا۔ میری بیگم ایسے ہی ملنے گئیں تو انہوں نے کہا کہ رات سے طبیعت گھبرا رہی ہے۔ نہ کھڑا ہوا جاتا ہے نہ کچھ کھانے کو جی کرتا ہے۔ کسی طرح جمال کو فون کر کے بتادو کہ واپس آجائے۔ ہم نے بھی فون کیا مگر نہ تمہارا نمبر ملتا تھا، نہ مہرین کا۔ ہم انہیں اسپتال لے گئے۔ وہ دو دن رہیں آئی سی یو میں۔ بلڈ پریشر بہت کم تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کچھ نہیں بس عمر کے مسائل ہیں۔ تیسرے دن ان کا انتقال ہوگیا۔ تم سے رابطے کی سب نے کوشش کی۔ معلوم نہیں تم کہاں تھے۔ ایک ہی جواب ملتا تھا کہ رابطہ ممکن نہیں۔"

میرا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ میری نیند، بھوک اڑ گئی۔ ہر وقت ہی احساسِ جرم و گناہ مجھے ڈستا رہتا تھا کہ ادھر ہم سیر سپاٹے کررہے تھے، ادھر ماں زندگی کی آخری سانس تک ہماری واپسی کا انتظار کرتے کرتے زیرِزمین جاسوئی۔ مہرین نے مجھے سنبھالا۔ ایک ہفتے تک اسپتال میں رہنے کے بعد میری حالت سنبھلی۔ سکون آور دواؤں کا سلسلہ کچھ عرصہ اور چلا لیکن ڈاکٹرز کے مشورے پر میں نے ڈیوٹی جوائن کرلی۔ سب کا کہنا تھا کہ جتنی جلد ہوسکے، زندگی کے معمولات کو بحال کرو اور مصروفیت اختیار کرو۔ اس کا فائدہ ہوا۔ صرف ایک مہینے بعد میں نارمل ہوگیا۔ گو کبھی کبھی اچانک اماں کا خیال میری نیند اڑا دیتا تھا۔

اس وقت مہرین نے ایک اور اہم اور صحیح فیصلہ کیا۔ "جمال! ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے اس گھر میں۔" اس نے ایک دن اچانک کہا۔

"میری ساری زندگی اسی گھر میں گزری ہے۔ یہ میرے والد نے بنایا تھا۔"

"سب معلوم ہے مجھے... اور میں جانتی تھی کہ تم جواب میں یہی کہو گے۔ لیکن جمال! ہمیں ماضی کی طرف نہیں مستقبل کی طرف بڑھنا ہے۔ تم یہاں رہو گے تو ماضی کی یادیں تمہارے پیروں کی زنجیر بن جائے گی۔ دیکھو... ایک نئی زندگی شروع کی ہے ہم نے۔ میری کوئی بات نہیں... اس گھر میں تم سے پہلی بار ملی تھی میں۔ اپنے گھر کے باہر اسی گھر میں ایک رات گزاری تھی میں نے۔ لیکن کیا میں صرف اپنے بارے میں سوچوں... اس کے بارے میں نہ سوچوں جو آنے والا ہے؟"

میں نے چونک کے کہا۔ "آنے والا ہے؟"

"ہاں، ہم ذمے دار ہوں گے اس کی آنے والی زندگی کے... اس کے مستقبل کے... کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ کسی بہتر ماحول میں پرورش پائے؟ اسے وہ ماحول ملے جو مجھے اور تمہیں نہیں ملا کیونکہ ہمارے والدین افورڈ نہیں کرسکتے تھے... لیکن ہم افورڈ کرسکتے ہیں۔"

اس کی بات نے مجھے ایک دم قائل کرلیا۔ دو مہینے بعد میں نے وہ گھر فروخت کردیا۔ ہم گلشن آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل ہوگئے۔ ہم یہ پانچ مرلے کا مکان ہی خرید سکتے تھے لیکن مہرین بہت خوش تھی۔ اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا۔ "تم دیکھنا جمال! ہم یہاں سے گلبرگ جائیں گے انشاء اللہ... یا ڈی ایچ اے... کیولری گراؤنڈ۔"

میں نے اسے چوم کے کہا۔ "اللہ تمہاری زبان مبارک کرے مگر خواب میں اتنا اونچا نہ اڑو۔"

"کیوں نہ اڑوں... ملے گا وہی جو نصیب میں ہوگا لیکن خواہش کر کے دعا کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔" وہ بولی۔

صرف چھ ماہ میں مہرین نے اس گھر کو ایسے آرٹسٹک انداز میں سجایا کہ مجھے اپنی خوش نصیبی پر رشک آنے لگا۔ مہرین نے اسکول کی ملازمت چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی ساری آمدنی گھر کو فرنش اور ڈیکوریٹ کرنے پر صرف کرنے گی۔ گھر میری آمدنی میں چلے گا۔ وہ دگنا کام کرتی تھی۔ وہ ایک عام عورت کی طرح گھر کو دیکھتی تھی اور اسکول کے کام الگ تھے۔ اسی زمانے میں مہرین پر تیسری اضافی ذمے داری کا بوجھ آیا جب ڈاکٹر نے اسے پازیٹو رپورٹ دی۔ اب صبح سے شام تک اس کے لیے نئے مہمان کے استقبال کی تیاری ایک خوش گوار مصروفیت بن گئی۔ میں اس کی خوشیوں میں برابر کا شریک تھا مگر اس کے خوابوں میں کیسے اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ خواب جو صرف ایک ماں دیکھ سکتی ہے۔ جو ممتا کے جذبات کا ہر رنگ رکھتے ہیں۔

تیسرے مہینے میں یہ خواب ٹوٹ کے بکھر گئے۔ اس کی کوئی وجہ مجھے معلوم نہ ہوسکی۔ نہ مجھے ڈاکٹر نے بتائی اور نہ خود مہرین نے۔ اس کی ساری رپورٹیں نارمل تھیں۔ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس نے یہ صدمہ بڑے صبر اور سکون سے جھیلا۔ "اللہ کو یہی منظور تھا جمال۔" الٹا وہ مجھے تسلی دیتی رہی۔ "مستقبل سے مایوس ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔"

میرا خیال ہے کہ شادی کے ایک سال بعد وہ بالکل نارمل، مطمئن اور خوش و خرم تھی۔

☆☆☆

قدرتی طور پر مولاجٹ سب سے پہلے حیرانی اور پریشانی کا اظہار کرنے اور تشویش و تفتیش میں میرا ساتھ دینے پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں۔

میں نے دکھ اور برہمی سے کہا۔ "یار! آخر کیا مطلب ہے اس فضول بات کا... کیوں چھپاؤں گا میں کچھ تجھ سے...؟"

"دراصل بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"جب میری سمجھ میں نہیں آئی... صبح سے میں سر کھپا رہا ہوں اور سوچتے سوچتے گھن چکر بن گیا ہوں تو تیری سمجھ میں کیسے آئے گی مولاجٹ... تجھے تو آدھا گھنٹا ہوا ہے یہاں آئے ہوئے۔"

اس نے کھنکھار کے داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ "جمال پترا میری بات ایک اشارہ تھی لیکن تو سمجھا نہیں۔ میں تو ہوں تیرا یار... لیکن میرے بعد یہ معاملہ جائے گا پولیس کے پاس جو کسی کی یار نہیں ہوتی۔ مجھے اعتبار ہے تجھ پر کہ تو جھوٹ نہیں بول رہا لیکن ان کی نظر سے دیکھ تو یہ سارا معاملہ بے حد مشکوک نظر آئے گا۔"

''اس میں کیا بات ہے مشکوک... وہ میری بیوی تھی۔ میں محبت کرتا تھا اس سے... اب اگر کسی وجہ کے بغیر وہ غائب ہوگئی ہے...''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ہاں... یہی تو وہ نہیں مانتے... کسی کا یقین جن بھوت پر ہو وہ بھی نہیں مانے گا کہ ایک پانچ فٹ پانچ انچ اور ایک سو دس پونڈ وزن کی صحیح الدماغ عورت اس دنیا سے یوں غائب ہوگئی جیسے وہ انسان نہیں تھی، خیالی مخلوق تھی۔ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ تُو لاکھ کہے کہ وجہ کوئی نہیں مگر وہ وجہ تلاش کریں گے۔''

''اچھا ہے اگر وجہ معلوم ہوجائے۔''

''وجہ وہ تجھ سے پوچھیں گے نورِ چشم... جب بیویاں غائب ہوتی ہیں تو شوہروں کو ہی بتانا پڑتا ہے کہ وہ کہاں جاسکتی ہیں۔ اپنے میکے... میکے نہیں تو کسی سہیلی کے گھر... وہ بھی نہیں تو کسی آشنا کے ساتھ...''

میں اچھل پڑا۔ ''کیا بکواس ہے یہ... وہ اتنی محبت کرتی تھی مجھ سے...''

''غصہ مت ہو۔ میں تجھے آنے والے وقت کے لیے تیار کررہا ہوں۔ جب تو ایسے بہت سے سوالوں کا جواب دینے پر مجبور ہوگا جو بہت ناخوشگوار ہوں گے۔ ایک عورت مہرین جیسی حسین اور پُرکشش... تیرے لیے اپنا گھر چھوڑ دیتی ہے... بلکہ صحیح تو یہ کہنا ہوگا کہ پہلے اپنا گھر چھوڑتی ہے اور پھر اتفاق سے تجھے مل جاتی ہے... پراسرار حالات میں جو مشکوک بھی سمجھے جاسکتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں اس شہر میں آج تک کسی کو ایسے گھومتی پھرتی بسوں میں نہیں ملیں۔ اس کا چشم دید گواہ ہے کوئی؟''

میں چونکا۔ ''چشم دید گواہ؟ وہ تو اماں تھیں... اور کون ہوتا۔''

''بس کون سی تھی... اس کا کنڈیکٹر، ڈرائیور؟''

''یار! ایک سال بعد میں کیا بتاؤں؟''

''چل جانے دے۔ وہ لڑکی تیرے ساتھ تیرے گھر آگئی رات گزارنے... جب گھر میں کوئی نہیں تھا۔''

''تو جانتا ہے اماں تھیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''یہ تو نے بتایا ہے مجھے... اماں نہیں ہے تیرے بیان کی تصدیق کے لیے... پولیس کے نزدیک وہ ایک آوارہ، بدکردار لڑکی ٹھہرتی ہے جو ایسا نہ جانے کب سے کررہی ہوگی۔ اس فلمی ملاقات کے نتیجے میں اسے تجھ سے محبت ہوجاتی ہے۔ اتنی کہ تم دونوں شادی کرلیتے ہو لیکن کیا یہ ناممکن ہے کہ سال بھر بعد اس کا تجھ سے دل بھر گیا یا اسے کسی اور سے زیادہ محبت ہوگئی؟''

''کیا تو مہرین کی تذلیل کرنے آیا ہے الو کے پٹھے۔'' میں نے بگڑ کے کہا۔

''میں تجھے پولیس کا نقطۂ نظر سمجھا رہا ہوں... پیشگی۔ وہ کہیں گے کہ ایسی لاوارث گھومتی پھرتی لڑکیوں کی محبت کیا، آج اس سے کل اس سے۔ کہیں اور جا کے اس نے کسی بھولے بھالے اجنبی کے ساتھ نیا ڈراما کیا ہوگا۔''

''میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ وہ کتنی شریف النفس لڑکی تھی۔ کیسی وفا شعار بیوی۔ وہ ماں بنتے بنتے رہ گئی۔ سال بھر سے وہ جس اسکول میں پڑھا رہی تھی، وہاں سب اس کی شرافت کی قسم کھانے کو تیار ہوں گے۔ یہ تو کیسی باتیں کررہا ہے؟''

''ہمیں یہ مسئلہ حل کرنا ہے جمال صاحب۔'' اس نے مجھے ڈانٹا۔ ''میں سات سال سے کرائم رپورٹنگ کررہا ہوں۔ مجرموں کی نفسیات پر بھی پی ایچ ڈی کرسکتا ہوں اور پولیس کی تفتیش کے انداز پر بھی۔ اسکول والوں کا بیان تو بہت بعد میں آئے گا۔ ابھی سارے سوالوں کا جواب تو دے گا۔ فرض کرو وہ یقین کرلیتے ہیں کہ مہرین کو تجھ سے اتنی ہی محبت تھی اور وہ واقعی بڑی نیک اور مثالی بیوی تھی۔ بال چلی جائے گی تیرے کورٹ میں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب آپ خود کو بھی ایسا ہی ثابت کریں... کہ آپ کو آج بھی اس سے اتنی ہی محبت تھی۔ آپ اس سے بالکل بدگمان نہیں ہوئے تھے۔ آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ واضح رہے کہ ہر بیان کے لیے ثبوت اور گواہ لازمی ہیں۔ صرف آپ کا کچھ فرما دینا کافی نہیں سمجھا جائے گا۔ آپ بتائیے کہ آپ کا تو کسی سے افیئر نہیں ہوگیا تھا۔''

''لاحول ولاقوۃ۔''

''لاحول پڑھنے سے شیطان بھاگتا ہے، پولیس نہیں جاتی۔ ان کا پہلا شک یہی ہوگا کہ تُو نے اسے ٹھکانے لگا دیا کیونکہ تو اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ایک سو ایک اسباب ہوسکتے ہیں مگر سرِفہرست وہی ہے۔ اس کا کسی سے افیئر یا پھر تیرا... دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی زیادہ خوب صورت لڑکی مل جاتی ہے... یا اسے کوئی زیادہ دولت مند آدمی مل جاتا ہے... جس کے پاس پانچ کاف ہوں۔''

''پانچ کاف؟ وہ تو سکھوں کے ہوتے ہیں۔''

''کوٹھی... کار... کیش... کاروبار اور کم عقل... تیرے پاس کیا ہے اس پانچ مرلے کے مکان کے سوا... محبت... اس سے سال بھر میں دل بھر جاتا ہے اور زندگی کے تقاضے کیا ہیں... یہ سمجھ میں آجاتا ہے... کسی اور کی نہیں، میں تجھے اپنی بات بتاتا ہوں... جب میں بی اے کررہا تھا تو ایک لڑکی پر فریفتہ تھا۔ اور بھی بہت تھے محبت کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی ورنہ عمر کے اس دور میں محاورے کے مطابق... گدھی بھی حسین لگتی ہے... مگر وہ تھی بڑی سیانی... بے وقوف اور جذباتی ہوتی تو مجھ سے پھنس جاتی... دانہ سب ڈالتے تھے اسے مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ دو چار اسکینڈل مشہور ہوئے اس کے جو سچ بھی ہوسکتے تھے اور جھوٹ بھی۔ بعد میں پتا چلا یعنی کالج سے نکلنے کے بعد... کہ اس بائیس سال کی لڑکی نے ایک بہتر سال کے بزرگوار کو پھانس لیا۔ ان کے پاس پانچوں کاف تھے۔ علاوہ ایک بیوی اور چار بچوں کے... اس کے دادا جان کی عمر بہتر سے کم ہوگی۔ ظاہر ہے مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں طرف... بزرگوار کی عقل تو بڑھاپے میں بالکل ہی خبط ہوچکی تھی۔ اس لڑکی نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ بیوی، بچے انہیں قتل کردیتے یا کرادیتے تو بڑے فائدے میں رہتے مگر انہوں نے احتجاج کا راستہ اختیار کیا اور ابا میاں کا جو تیرے نانا دادا بھی تھے، حقہ پانی بند کردیا۔ سارے خاندان نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ لڑکی بہت خوش ہوئی۔ یہی وہ بھی چاہتی تھی۔ سنا ہے اس نے اپنے گھر والوں کو ایک تو اپنے قانونی اور شرعی حق سے آگاہ کیا کہ وہ بالغ ہے اور جس سے چاہے شادی کرسکتی ہے۔ ماں کو اس نے رازداری سے بتایا کہ خبیث بڈھے کو تمام امراضِ خبیثہ لاحق ہیں... وہ قبر میں پاؤں لٹکائے نہیں بیٹھا ہے قبر میں اتر چکا ہے۔ مجھے تھوڑی سی مہلت مل جائے تو میں سب ہتھیا لوں گی اس سے۔ اور سال بھر میں بیوہ نہ ہو جاؤں تو میرا نام بدل دینا۔ اس کے بعد زندگی اپنی ہے۔ عیش ہی عیش۔ ظاہر ہے گھر والے اور خصوصاً ماں باپ کہاں مانتے ہیں۔ اس نے اپنی مرضی کی اور یار... جیسا کہا تھا کر دکھایا۔ اس نے قتل کر دیا شوہر کو لیکن اس پر کوئی الزام نہیں آیا۔ بڈھا بلڈ پریشر اور شوگر کا مریض تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے دیسی گھی کے پراٹھے، پائے اور بریانی کھلائی... حلوے پکائے... جو بڑے میاں نے بہت شوق سے کھائے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو محبت اور خدمت کرنے والی بیوی چاہتی تھی۔ وہ براستہ اسپتال اوپر گئے۔ آخری چہیتی بیوی کے لیے چار کنال کی کوٹھی، ایک کار اور ایک کروڑ کا بینک بیلنس چھوڑا اور اس نے عدت کا زمانہ پورا ہوتے ہی اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلی۔''

میں نے بے وقوفوں کی طرح سوال کیا۔ ''کس سے؟''

''مجھ سے اور کس سے یار... میرے دو بچوں کی اماں ہے وہ۔''

میں اچھل پڑا۔ ''تجھ سے؟ پھر تُو یہ ملازمت کیوں کررہا ہے خواری والی؟''

''وقت گزاری کے لیے یار! بیکار بیٹھا کیا کروں... وہ اپنا بوتیک چلا رہی ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ میں نے کرائم رپورٹر بن کے مال بنایا ہے... سمجھنے دے دنیا کو کچھ بھی... گلبرگ میں رہتا ہوں میں... کسی روز گھر لے جا کے اس سے ملواؤں گا۔''

''دیکھ یار مولاجٹ! بے شک تیری میری دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن تو جانتا ہے مجھے... میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''کیوں نہیں کرسکتا؟ اچھا خاصا سیانا ہے تُو بھی... اور نہ کوئی فرشتہ ہے۔''

''یار مولاجٹ! تو بھی...''

''یار! کچھ سمجھا کر... میں تجھے ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار کررہا ہوں۔ اس تھانے میں جہاں ہم بھابی کی پراسرار گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے جائیں گے، ایک تھانے دار ہے۔ وہ ایسے ہی کسی کیس کی تفتیش کے لیے گیا تھا۔ کوئی عورت آئی تھی روتی پیٹتی کہ اس کا میاں لاپتا ہے۔ پہلے تو اس نے روایتی انداز میں تفتیش کی۔ کچھ تو یہ لوگ ہوتے ہیں قیافہ شناس... جھوٹ سچ کے درمیان فرق کو تاڑ جاتے ہیں مگر اس کیس میں نہ جانے کس نے عورت کو بچالیا۔ اس سے پہلے کہ وہ عورت کو تھانے لے جا کے رات بھر میں یہ معلوم کرتے کہ اپنے آشنا کا نام بتا جس کے ساتھ مل کے تو نے اپنے شوہر کو ٹھکانے لگایا ہے... کسی کا فون آگیا۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا... یہ کہا کہ بندہ دبئی میں ہے... وہ کوئی سیلز مین تھا اور فون بھی کمپنی سے آیا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں اکثر دبئی جاتا تھا۔ وہاں ان کے کاروباری مراسم کسی انڈین کمپنی سے تھے۔ انڈیا کا مال براہِ راست نہیں، دبئی کے ذریعے پاکستان میں امپورٹ ہوتا ہے۔ اس کا مالک کوئی سکھ تھا۔ سکھ نے کسی کو قتل کیا اور قصاص میں اس کا جھٹکا ہوگیا۔ اس کی گردن ماردی گئی۔ بیوہ کمپنی کے کاروبار کے بارے میں کچھ

نہیں جانتی تھی۔ اس سیلز مین نے اسے پہلے سے امپریس کر رکھا تھا۔ وقت آیا تو اس نے خود کو پیش کر دیا اور اپنی کارکردگی سے مسٹسی کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ چکر دبئی میں چلتا رہا۔ بالآخر مسٹسی مسلمان ہو گئی اور انہوں نے شادی کر لی۔ پرانی بیوی جائے جہنم میں۔ خیر، جب پتا چلا تو اس نے واپس آنے سے بہتر سمجھا کہ تین حرف لکھ کر بھیج دے۔ اب اس تفتیش کے دوران ہی تھانے دار کی ہمدردی بے چاری پاکستانی بیوی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ بعد میں یہ ہمدردی محبت میں بدل گئی۔ چونکنے کی ضرورت نہیں۔ تھانے دار بھی محبت کر سکتا ہے۔ اب وہ عورت اس تھانے دار کی بیوی ہے اور بس... اس کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ ایک سیلز مین اسے کیا دیتا جو ایک تھانے دار نے دیا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "مجھے بتا میں کیا کروں؟"

"تو بتا کافی... میں ذرا سراغ رسی کرتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ مل کے اپنے گھر کو چھان مارا۔ کپڑوں کی الماری، درازیں... کہیں کچھ مل جائے، کوئی خط، کوئی تصویر، کوئی شک پیدا کرنے والی چیز... وہ اپنا موبائل فون بھی چھوڑ گئی تھی۔ مولا جٹ نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ "پولیس کو اس کے بارے میں بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"سم ویسے بھی میرے نام پر تھی۔" میں نے کہا۔

"میں اس کا سارا ریکارڈ نکلوا لوں گا بعد میں... اگر ایسی کوئی فون کال ہوگی تو پتا چل جائے گا۔"

ایک گھنٹے بعد ہم تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ "اب کیا کریں یار! تھانے چلیں؟"

"اس کے ظالم چچا کا فون نمبر نہیں ہے تیرے پاس؟" مولا جٹ نے کہا۔

"مہرین ہرگز وہاں نہیں جا سکتی۔"

"وہ مہرین کو اغوا تو کرا سکتا ہے، اور قتل بھی... بدلہ لینے کے لیے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "ہو سکتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک چوہا ہے۔ کاکروچ نہیں مار سکتا... اور سال بھر میں اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی... مگر میں اسے ناممکن قرار نہیں دیتا۔"

آدھے گھنٹے بعد میں مولا جٹ کی جنگلی موٹر سائیکل پر بیٹھا مہرین کے چچا کے گھر کی طرف رواں تھا جو درحقیقت مہرین کی ملکیت تھا۔ میرے ذہن میں انتقام کی تھیوری جڑ پکڑ رہی تھی۔ مہرین نے اس کے بیٹے کو پاگل کہہ کے اور شادی سے انکار کر کے یقیناً اسے بے عزت کیا تھا۔ مہرین کو قتل کر کے وہ اس خوف سے بھی نجات پا سکتا تھا کہ ایسا نہ ہو کسی دن وہ اپنا مکان واپس لینے کے لیے اسے کورٹ میں کھینچ لے۔

میری ساری خوش فہمی اس گھر کے دروازے پر پہنچ کے ایسے ختم ہو گئی جیسے پن چبھوتے ہی غبارہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس گھر میں اب کوئی اور تھا۔ مہرین کا چچا وہ مکان بیچ کر افراتفری میں بیچ کے نکل گیا تھا۔ شاید وہ بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ ایک خیال نے پھر مجھے پُرامید کیا۔ مہرین کو قتل کرانے کے لیے بھی تو وہ اپنا پتا ٹھکانا بدل سکتا ہے۔ یہ بڑے دور کی بات تھی مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

اسی لاحاصل تگ و دو میں دن گزر گیا تھا۔ مہرین کی صورت ایک سوال بن کے میرے خیال میں ٹھہر گئی تھی، وہ ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ گرم ہو گیا تھا لیکن مجھے کسی ایک سوال کا جواب نہیں ملا تھا جو ہر لحظہ ایک تسلسل کے ساتھ خود کو دہراتے تھے۔ بار بار... اسی یکسانیت سے اپنی تکرار جاری رکھتے تھے۔ جیسے گول گھومنے والا جھولا جس میں دس یا پندرہ یا بیس پنگھوڑے ہوں اور پوری رفتار سے چکر لگاتے ہوئے آپ کی نظر کے سامنے سے وہی بار بار گزر رہے۔ مجھے الجھن تھی، پریشانی تھی، حیرانی تھی، خوف تھا، بے یقینی تھی، ناامیدی تھی اور تذلیل کی خفت تھی کہ وہ مجھے چھوڑ گئی... کیوں؟ کس کے لیے...؟ کہاں ہو گی؟ کس حال میں... زندہ یا مردہ؟ بے بس اور مجبور یا آزاد اور خودمختار... دکھی اور نادم یا اپنے کیے پر خوش وخرم اور مطمئن؟

رات کا اندھیرا ڈھلنے لگا تو ہم ایک ریسٹورنٹ میں تھے۔ مولا جٹ دن میں سوتا تھا اور کھاتا رات کو ایک ہی بار کھاتا تھا۔ سارا دن ہم چائے کافی پیتے رہے تھے۔ اب اس نے کہا۔ "زیادہ مت سوچ... پاگل ہو جائے گا... کھانا کھا۔"

"نہ سوچنا میرے اختیار کی بات نہیں... میرا خیال ہے کہ اب پولیس کو بتا دینا چاہیے۔"

"اپنے خیال کو رکھ اپنے پاس... چوبیس گھنٹے سے پہلے پولیس بھی کسی کو لاپتا یا گمشدہ قرار نہیں دیتی... یہ معاملہ ذرا مختلف ہے... نہ یہ اغوا کا کیس ہے اور نہ گمشدگی کا... وہ بازار یا اسکول جاتی اور پھر پتا نہ چلتا کہ کہاں گئی... کسی بس یا ٹرین میں سوار ہوتی اور منزل پر اس کا سراغ نہ ملتا... وہ شہر میں اجنبی ہوتی یا دماغ کی کمزور... ایسی تو کوئی بات نہیں... وہ تو گھر میں تھی اور ایسے غائب ہو گئی جیسے کوئی پن تھی کہ کہیں گر گئی اور مل نہیں رہی... تیرے لیے وقت بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگی۔"

"پھر... کیا کروں میں؟"

"یہ سب مجھے سوچنے دے... سچ سے تُو مشکل میں پڑ جائے گا... جھوٹ تو بولنا پڑے گا۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"ایسا جھوٹ جو سچ لگے... نپا تلا... مثلاً تُو کہے کہ رات ہماری لڑائی ہوئی تھی۔"

"کس بات پر...؟"

"یار، میاں بیوی جب لڑتے ہیں تو اس کی وجہ کوئی نہیں ہوتی۔ ایک ہزار ایک وجوہات ہوتی ہیں... ہر محبت کرنے والی بیوی شکی مزاج ہوتی ہے۔ بہت زیادہ احساسِ ملکیت کا جنون رکھنے والی پوزیسیو... اس نے کسی فون کال پر یا تیرے دیر سے آنے پر شک کیا تو تُو نے پلٹ کے غصے میں کہہ دیا کہ ہاں میں تھا کسی کے ساتھ... صبح وہ ناراض ہو کے نکل گئی... مگر اس میں تو فوراً پھنس جائے گا۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے جو سوچ رہا تھا، وہ بول رہا تھا۔

"اپنا پھنسنا تو مجھے یقینی نظر آنے لگا ہے۔"

"ابھی کل صبح تک انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے کہا۔ "پولیس کہے گی کہ چوبیس گھنٹے تک کیا کرتے رہے؟"

"دیکھ میری بات دھیان سے سن... اگر تُو کہے کہ میں نے آج کا سارا دن آفس میں گزارا... کام زیادہ تھا... دیر سے گھر پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا ملا۔ مہرین اندر نہیں تھی۔ میں نے سوچا اِدھر اُدھر کسی کے گھر گئی ہوگی۔ جب وہ رات تک نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ رات بھر جاننے والوں سے پوچھتا رہا۔ اسپتالوں اور مردہ خانوں میں دیکھا۔ اس کی گواہی میں دوں گا کہ تُو نے مجھے بلا لیا تھا اور ہم ساتھ ہی ہر جگہ گئے تھے۔ دفتر میں تیرا باس تیرے لیے جھوٹ بولے گا کہ تو آج معمول کے مطابق حاضر تھا اور کام میں مصروف رہا۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ پر یقین کر لے تو مجھے بچانے کے لیے ایسا کہہ دے۔"

"اس سے آج رات بلکہ ابھی بات کر لے۔ فون پر نہیں... اس کے گھر جا... اس کی بیوی کے سامنے سارا زور بیان صرف کر دے کہ تجھے بیوی سے کتنی محبت تھی اور اس کے بغیر تو ویسے ہی مر جائے گا۔ بالکل سچ سچ اسے سب بتا دے۔ وہ سب جو مجھے بتایا ہے۔ وہ یقین کرے گا۔ کل صبح میں تیرے ساتھ جا کے رپورٹ لکھواؤں گا۔ اس کے ظالم چچا پر شک کا اظہار کرنے میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس کہانی میں وہی ایک ولن ہے۔"

"پولیس مجھ پر یقین کرے گی؟"

"بالکل نہیں لیکن میں ہوں تیرے پیچھے... ایسے معاملات آسان ہوتے ہیں یا رشوت سے یا سفارش سے... جیسا ایسے کیس میں بہت چاہیے جو تیرے پاس ہے نہیں... لیکن مولا جٹ ہے خدا کے بعد۔ تجھے بچانے والا۔ پولیس اپنی تفتیش ضرور کرے گی مگر شرافت سے۔ تجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کے نہیں۔ مہلت بھی ملے گی تجھے دو چار دن کی۔ اس میں تو ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر سکتا ہے کہ پولیس قتل کے شبہے میں مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے... وہ شک بھی کریں گے اور تفتیش کے لیے ریمانڈ بھی مانگیں گے مگر تو گرفتاری سے بچ جائے گا اور سختی سے بھی۔ اگر دو چار دن میں بھابی واپس نہیں آئیں... تو پھر کچھ کریں گے۔"

"کیا کریں گے؟"

"اخبار میں تصویر شائع کرائیں گے اور اپنی تفتیش کریں گے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ تُو فکر نہ کر۔ مجھے اب جانا ہے اپنے آفس... بیوی کو آفس جا کے فون کروں گا... سارا دن موبائل بند رکھا تھا... اسے بھی کچھ تیری بپتا سناؤں گا... اور چھٹی لے کے جلدی گھر چلا جاؤں گا تاکہ کچھ سوچ سکوں۔" اس نے ویٹر کو بلایا اور کھانے کا بل ادا کر دیا۔

گھر لوٹ کے جانے پر اب میری طبیعت ہی مائل نہ ہوتی تھی۔ کیا ہوگا وہاں میرے لیے سوائے ہولناک تاریکی، ڈسنے والی ویرانی اور پُرآسیب سناٹے کے۔ نہ مہرین کے ماہتاب حسن کی چاندنی تھی، نہ اس کی مسکراہٹ کی اجلی دھوپ۔ نہ اس کی قربت سے اٹھنے والی محبت کی خوشبو تھی اور نہ اعتماد دینے والی رفاقت کا مہرباں احساس... مولا جٹ مجھے گھر ڈراپ کرنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا۔ "ابھی سے گھر جا کے کیا کروں گا؟"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "خود سے کہاں تک بھاگے گا بچے... جینا تو ہے نا۔"

وہ مجھے سڑک کے کنارے کھڑا چھوڑ کے موٹر سائیکل کو کسی منہ زور گھوڑے کی طرح دوڑاتا ہوا ٹریفک میں گم ہو گیا۔ میں نہ جانے کتنی دیر چلتا رہا۔ ان سڑکوں پر جہاں سے میں مہرین کے ساتھ گزرا تھا۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں بھی بیٹھا رہا جو اس کا فیورٹ تھا۔ ایک گوشے کی اپنی مخصوص

میز پر... یادوں کی یلغار میں اکیلا... یہ کھانے کا وقت تھا۔ مجبوراً میں نے کافی پی۔ میرا موبائل خاموش تھا۔ یہ امید اب دم توڑ چکی تھی کہ کسی بھی لمحہ اس کی رنگ سے مہرین کے لبوں کا نغمۂ جاں فزا پھوٹے گا۔ میرے دل نے جیسے اس اندوہناک حقیقت سے سمجھوتا کرلیا تھا کہ وہ اب نہیں ہے۔ جیسے ائرکریش میں مرنے والوں کے لواحقین بالآخر مایوس ہو کے تسلیم کرلیتے ہیں کہ انہیں جس کا انتظار تھا، وہ اب نہیں آسکتا۔

میں اٹھا ہی تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پر اپنے باس کا نمبر دیکھا اور کال ریسیو کرلی۔ ''بھئی جمال! کہاں ہو تم... آج شاید آفس نہیں آئے تھے تم... خیریت تو ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں سر! خیریت نہیں ہے۔ آپ کہاں ہیں اس وقت؟''

''بھئی شریف آدمی اس وقت کہاں ہوتا ہے... اپنے گھر میں۔''

''کیا میں آپ سے ملنے کے لیے آسکتا ہوں؟ اگر اتنا ضروری نہ ہوتا تو میں ہرگز آپ کو ڈسٹرب نہ کرتا۔''

''نہیں، نہیں... میں فارغ ہوں... تم آجاؤ۔''

''سر! مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے اور میری پریشانی ایسی ہے کہ آپ ہی دور کرسکتے ہیں۔''

''بس یار! کیا سب فون پر ہی بتادو گے؟ ٹیک اٹ ایزی... زندگی میں سب کے لیے پریشانیاں بھی آتی ہیں۔ یو آر اے ینگ مین۔ اتنا ڈپریس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

باس کے گھر جا کے مجھے احساس ہوا کہ ہماری معاشرتی قدریں کتنی مربوط اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں۔ باس پچپن سال کا خوش مزاج اور شفیق آدمی تھا۔ اس کی بیوی نے بھی مجھے یوں ریسیو کیا جیسے میں ان کے خاندان کا فرد ہوں۔ ان کی جگہ میرا غیر ملکی باس ہوتا تو میں اپنا ذاتی مسئلہ لے کر اس کے گھر جانے کی ہمت ہی نہ کرتا۔ اس کا صاف جواب یہ ہوتا کہ تمہارے ذاتی معاملات سے میرا کیا تعلق؟ تم نے مجھے گھر فون کیوں کیا؟ اس کے بعد بھی میں دفتر میں اس سے مدد مانگتا تو اس کا جواب یہی ہوتا کہ آفس کے باہر تم جو کرتے ہو، اس کے ذمے دار خود ہو۔ یہ معاملہ تمہارے اور قانون کے درمیان ہے۔ میں ایک جھوٹ بول کے خود بھی مجرم بنوں؟

لیکن باس پاکستانی تھا اور زندگی کے مسائل کی جذباتی اہمیت کو بھی سمجھتا تھا اور عملی صورتِ حال کو بھی۔ دونوں میاں بیوی کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

''ایک بیٹا رہتا ہے ہمارے ساتھ۔ وہ کہیں مدعو تھے۔ بر کیا جو تم آگئے۔'' باس نے مجھے بٹھانے کے بعد کہا۔

میں نے کہا۔ ''سر! مجھے یہ بہت نامناسب محسوس ہو رہا ہے کہ میں پہلی بار آپ کے گھر آیا ہوں تو ایک ذاتی مسئلہ لے کر... لیکن میں کیا کروں... میرا کوئی بڑا نہیں... نہ ماں باپ، نہ چچا تایا... میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں... ایک دوست کے مشورے پر میں نے یہ جسارت کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سے میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں۔ میں صرف آپ کا ملازم ہوں۔''

باس مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ ''بہت ہوگئی تمہید... پرابلم بتاؤ... اور تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاؤ کہ ہم باس اور ماتحت ہیں۔ ہم پڑھے لکھے مہذب انسان بھی تو ہیں۔ تمہاری طرح مجھے بھی زندگی میں ایسے لوگوں سے مدد ملی... جن سے میرا کوئی بلڈ ریلیشن نہیں تھا۔''

اس موقع پر ان کی بیگم نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنی پریشانی میں تم کھانا، پینا، سونا سب بھولے ہوئے ہو۔''

''ابھی مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ میرا مسئلہ آپ بھی سن لیں۔ اس کا تعلق میری بیوی سے ہے۔''

وہ بیٹھ گئیں۔ ''کیا ہوا؟ لڑائی جھگڑا... وہ ماں باپ کے گھر جا بیٹھی ہے یا خدانخواستہ علیحدگی چاہتی ہے۔ تمہاری حالت مجنوں جیسی ہو رہی ہے۔ شادی کے بعد پہلے سال میں سب ہوتا ہے۔ کتنا عرصہ ہوا ہے تمہاری شادی کو؟ گھر میں بڑے نہ ہوں تو...''

باس نے اسے ٹوکا۔ ''اب کچھ اس غریب کی بھی سن لو۔''

میں نے مہرین سے ملاقات سے لے کر اس کے جانے تک کے تمام واقعات انہیں تفصیل سے بتادیے۔ انہوں نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے سب سنا۔ میری جذباتی کیفیت کا خاتون کے دل پر بہت زیادہ اثر ہوا تھا۔ باس کسی سوچ میں ڈوبا ہوا اور قدرے متذبذب نظر آتا تھا۔

''یہ تو تم نے بڑی عجیب بات بتائی بیٹا!'' بیگم نے دکھی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''صبح سے میں باہر ہوں اور اس وقت بھی میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جو دوست میرے ساتھ تھا، وہ رات کی ڈیوٹی پر چلا گیا ورنہ اس کے گھر جا کے سو جاتا۔''

''سونے کا کیا مسئلہ ہے... تم یہاں سو جاؤ۔ ایسی حالت میں اکیلا کون رہ سکتا ہے۔''

باس نے بیگم کو جذبات کے اس مظاہرے پر گھورا مگر ان کی عمر کی عورت کے جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تاہم میں نے شکریے کے ساتھ یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ ''میں باہر بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ خیال پریشان کرے گا کہ وہ لوٹ آئی... پر... حالانکہ امکان نہیں ہے۔''

باس کو شاید میری سچائی پر اعتبار آگیا تھا۔ ''دفتر کی تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں بچا لیں گے جہاں تک ممکن ہوا۔''

جہاں تک ممکن ہوا... اپنی بیوی کے جذباتی ردِعمل کے برعکس باس نے بڑے محتاط انداز میں میری مدد کے امکانات کو محدود رکھا تھا۔ باقی بات میرے سمجھنے کی تھی کہ میں جو بتا رہا ہوں وہی حقیقت ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس روز... غم زدہ شوہر آفس میں سارا دن موجود رہا تھا اور اس کے برعکس پولیس نے ابتدائی تفتیش میں ہی مجھے قاتل قرار دے دیا اور ثبوت بھی حاصل کرلیے تو پھر ظاہر ہے میری مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مجرم کو بچانا بھی جرم میں شراکت مانا جاتا ہے۔

مولاجٹ بہت پریکٹیکل آدمی تھا۔ وہ چاہتا تو مجھے اس رات اپنے گھر انوائٹ کرسکتا تھا لیکن وہ میرے اندر حالات سے لڑنے اور صدمہ برداشت کرنے کی صلاحیت اور قوت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ فرار کسی بھی آزمائش سے نمٹنے کا طریقہ نہیں ہوتا۔ اس رات اپنے گھر میں اکیلا ہونا ایک جان کنی جیسی آزمائش سے کم نہ تھا لیکن پھر صبح ہوگئی اور میں نے خود کو آنے والے دن کے لیے تیار کیا۔ میرے پاس نہ سکون آور گولی تھی اور نہ خواب آور چنانچہ میں رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ نیند کے مختصر وقفے کم تھے۔ ہر بار میں کسی وجہ کے بغیر چونک کے جاگ اٹھتا تھا۔ بار بار مجھے مہرین کے وجود کی خوشبو، حرارت اور لمس کا احساس ہوتا تھا۔ ایک بار میں چونک کے اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے بھیگے بدن کی خوشبو کے ساتھ گیلے بالوں سے ایک قطرۂ شبنم مجھ پر گرا ہے۔

میرے لیے ہر طرف سناٹا تھا۔ گھر میں... گھر سے باہر... میرا ٹی وی خاموش تھا۔ موبائل فون خاموش تھا۔ غسل بھی میں نے تھکن اور پژمردگی کے احساس کو کم کرنے کے لیے کیا۔ شیو کرنے کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ رات کو میں انہی کپڑوں میں سو گیا تھا جو دن بھر پہنے تھے اور اس وقت بھی انہی کپڑوں میں تھا۔ گھر میں ہر طرف مہرین کے ذاتی استعمال کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ میں کس کس سے نظر چراتا؟ اب چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ میرے اور مہرین کے درمیان ایک دن کی دوری حائل ہوچکی تھی۔ یہ دوری ایک دن سے ایک ہفتہ ہو جائے گی پھر ایک ماہ... ایک سال... لوگ مرنے والوں کو بھی ایسے ہی بھولتے ہیں۔ مہرین بھی میرے لیے ضرور مر گئی تھی۔ اس کے واپس آنے کی امید کو زندہ رکھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اسے آنا ہوتا تو وہ یوں جاتی ہی کیوں... ایسے آثار یکسر ناپید تھے کہ اسے کوئی زبردستی اپنی مرضی کے خلاف اٹھا کرلے گیا ہو۔

دس بجے مولاجٹ نے فون کر کے مجھے اپنی طرف بلا لیا۔ ''رات مجھے جلدی آنا نصیب نہیں ہوا۔ ابھی اٹھا ہوں۔ تو ادھر آجا تو ناشتا کر کے چلتے ہیں۔'' اس نے سوال ہی نہیں کیا کہ بھابی کی کوئی خبر یا ناشتا کیا ہے تو نے یا نہیں۔ اس کا اندازہ جیسے یقین تھا کہ دونوں کا جواب میں نفی میں دوں گا۔ میں ٹیکسی میں اس کی عالی شان کوٹھی پہنچا جو اس کی بیوی کے سابق شوہر کا عطیہ تھی۔ اس کی بیوی سے میں دو چار مرتبہ مل چکا تھا۔ کسی دعوت میں اور دو بار اس کے گھر میں بھی۔ وہ کوئی پری چہرہ حسن کی عورت نہیں تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا مگر نقوش بہت تیکھے تھے اور اس کی روشن سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی غیر معمولی چمک تھی۔ سانولی رنگت والی بہت سی حسیناؤں نے بالی ووڈ پر راج کیا ہے اور کروڑوں کو دیوانہ بنائے رکھا ہے۔ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ بے حد متناسب جسم کی مالک تھی۔ اس کے لیے وہ کوئی جتن نہیں کرتی تھی۔ یہ قدرت کا انعام تھا۔ اس کی خاص بات خود کو شوہر کی محبت اور خدمت تک محدود رکھنا تھا۔ وہ کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے... کیوں جاتا ہے... اس کے دوست کون ہیں... مصروفیات کیا ہیں... اس سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ خود مولاجٹ کہتا تھا۔ ''ایسی بیوی تو بس لاٹری میں نکلتی ہے یار! جو شوہر سے یک طرفہ محبت کرتی جائے اور اس پر شک ہی نہ کرے اور نہ حق جتائے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس سے دوسری شادی کی اجازت مانگوں تو وہ کہے گی کہ اس کے بغیر گزارہ نہیں تو کرلو۔ مطلب یہ کہ چلا سکتے ہو تو ایسے ہی چلاتے رہو ورنہ ٹھیک ہے اسے بھی لے آؤ یہاں... فرح عجیب عورت ہے یار۔''

فرح بھابی نے مجھے اندر براہِ راست کھانے کی میز پر لے جا کے بٹھا دیا۔ ''وہ آرہے ہیں دو منٹ میں غسل سے فارغ ہو کے۔'' وہ خود میرے سامنے بیٹھ گئیں اور ایک ملازمہ نے ناشتا لگانا شروع کیا۔

''آپ کو سب معلوم تو ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں لیکن جمال بھائی! آپ نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا

ہے؟ دنیا کو دکھانے کے لیے کہ آپ کتنے دکھی ہیں؟"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "یہ آپ کیسی بات کر رہی ہیں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں... شیو نہ کرنے اور کپڑے نہ بدلنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا یا غم کا احساس کم ہو جائے گا؟ آپ کھانا پینا چھوڑ دیں گے اور ہر وقت آنسو بہاتے رہیں گے اس کی یاد میں تو کیا اس سے وہ واپس آجائے گی؟"

"بھابی! یہ میری ذہنی اور جذباتی کیفیت ہے۔ کوئی اداکاری نہیں ہے۔"

"مشکل اور آزمائش کی گھڑی میں عقل کام آتی ہے۔ دماغ ٹھکانے رہنا چاہیے... خود کو اتنا کم ہمت کیوں ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ... مسئلے ایسے حل نہیں ہوتے۔ آپ کو حالات سے مقابلے کے لیے پہلے سے زیادہ ذہنی اور جسمانی توانائی کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔ میرے سامنے وہ عورت تھی جس نے اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھا تھا۔ وہ بہت اطمینان اور سکون سے مجھے سمجھا رہی تھیں اور اب مجھے ان پر غصہ نہیں آرہا تھا۔ "شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔"

"ایک گر کی بات بتاؤں؟ مان لیجیے کہ اب مہرین نہیں آئے گی۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ اسے کسی نے اغوا یا قتل کر دیا ہو یا وہ اپنی مرضی سے چلی گئی ہو... پھر؟ کیا یہ ناممکن ہے؟ ایسا دنیا میں پہلی بار آپ کے ساتھ ہوا ہے؟ اس حقیقت کو ایک بار ہی تسلیم کر لینے میں فائدہ ہے۔ آپ کو صبر اور حوصلہ مل جائے گا۔ اس کے بعد بفرضِ محال وہ لوٹ آتی ہے پھر مل جاتی ہے... تو اپنی خوشی کا اندازہ کیجیے۔"

مولا جٹ خاموشی سے آکے میز پر بیٹھ گیا تھا۔ "میں نے بیوی کو سمجھایا تھا کہ اسے صبح صبح بلا کے خالی پیٹ لیکچر دے... چل اب ناشتا کر... پھر چلتے ہیں تھانے۔"

فرح بھابی نے مسکرا کے کہا۔ "اپنی ساری توجہ خود کو مزید پریشانی سے بچانے پر صرف کریں جمال بھائی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ کسی ہیپناٹائز ہونے والے معمول کی طرح میرے ذہن نے فرح بھابی کی ہر بات کو عامل کی ہدایات کی طرح قبول کر لیا ہے۔ مجھے اس بہتر سالہ بوڑھے کا خیال آیا جس پر فرح نے ایسا جادو کیا تھا کہ اس نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کیا اور جب اس نے کہا کہ اب مر جاؤ تو وہ مر گیا۔ لیکن ہر فرعونے را موسیٰ... مولا جٹ جیسے وحشی اور بن مانس جیسے شخص نے اس عورت کی قوتِ تسخیر کو شکست دے دی تھی۔ محبت کو کسی نے سمجھا ہے کہ کیوں ہوتی ہے۔

گھر سے نکلتے وقت فرح بھابی نے نرمی سے کہا۔ "گاڑی لے جائیے... آپ اکیلے نہیں ہیں اور معلوم نہیں آپ کو کہاں کہاں جانا پڑے۔" اور مولا جٹ نے جسے میں خرد ماغ، ضدی اور وحشی سمجھتا تھا خاموشی سے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

فرح کے سابق شوہر کے وقتوں کے جو ملازم کوٹھی میں تھے اب فرح کے ساتھ... ان میں شوفر بھی تھا اور ایک مالی بھی۔ دونوں کی بیویاں گھر کے اندر کام کرتی تھیں اور انہیں رہائش کے لیے سرونٹ کوارٹرز بھی ملے ہوئے تھے۔

مولا جٹ نے پیچھے بیٹھ کے کہا۔ "میں نے صبح پھر معلوم کیا۔ تمام تھانوں سے اور اسپتالوں سے۔ ایکسیڈنٹ کا ایسا کوئی کیس نہیں... نہ اسپتال کے کسی کولڈ اسٹوریج میں ایک ڈیڈ باڈی پہنچی ہے۔"

میرے دل میں درد کا ایک خنجر سا اتر گیا۔ یہ مہرین کے بارے میں کہا جا رہا تھا جو میرے تصور میں کوئی زخم خوردہ ٹوٹی پھوٹی یا منجمد لاش نہیں تھی۔ ہنوز اپنے حسن و جمال کی ساری توانائی کے ساتھ زندہ تھی۔ حقائق کی دنیا بہت مختلف تھی۔ اس میں یہ سب پہلے ہی ہوا تھا مگر دوسروں کے ساتھ۔

مولا جٹ نے میری یہ مدد کی تھی کہ مجھے ہر تھانے اور مردہ خانے کا چکر لگانے اور لاشوں کی شناخت کرنے کے ذہنی عذاب سے بچا لیا تھا۔ "اب تو کوئی چارہ نہیں رپورٹ لکھوانے کے سوا۔"

"تیرے باس نے کیا کہا... تو گیا تھا اس سے بات کرنے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں یقین تو اسے آگیا مگر قانونی مسئلہ ہے۔ اس نے صاف انکار بھی نہیں کیا اور اقرار بھی نہیں کیا۔"

"میری کچھ باتیں پلے سے باندھ لے۔ ویسے تو میں نے ساری ڈوریاں ہلا دی ہیں مگر یہ پولیس والے صرف پیسے کے یار ہوتے ہیں۔ سفارش بھی اب کم چلتی ہے۔ تو جو بیان دے سو فیصد حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ ایسا کہ وہ دس بار نہیں سو بار پوچھیں تو ذرا فرق نہ آئے ورنہ وہ پکڑ لیں گے۔"

"وہ یقین کریں گے؟"

"بالکل نہیں۔ ان کی تو بسم اللہ ہی شک سے ہوتی ہے۔ مگر تو وہی بولے گا جو ہوا۔ ابھی وہ بیان لکھیں گے اور بس... مگر دو چار دن میں تجھے شاملِ تفتیش کریں گے، شک کی بنیاد پر... اطمینان رکھ کہ تھرڈ ڈگری سے تو محفوظ ہے۔

بدزبانی اور گالی گلوچ تو ان کی فطرت بن جاتی ہے۔ مشتعل کسی بات پر نہ ہونا۔ ارشاد سے میری فون پر بات ہوئی ہے۔ شام کو اس سے ملیں گے۔ کل وہ اے ڈی جے کے پاس ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست لگا دے گا۔ لیکن پراسیکیوٹر کو کچھ دینا پڑے گا۔ جج شریف اور ایماندار ہے... امید ہے کہ کم سے کم رقم کے بانڈ پر ضمانت ہو جائے گی۔"

"یہ کم سے کم رقم کتنی ہوگی؟"

"پچاس ہزار سے ایک لاکھ... نہیں ہے تیرے پاس تو میں کر دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "اب اتنا بھی پھکڑ نہیں ہوں میں۔"

"پولیس والے ضرور پوچھیں گے کہ شک کس پر ہے۔ اس کا کوئی سابق شوہر یا منگیتر تھا جس نے اسے اغوا کیا ہو اور تجھے پتا نہ چلا ہو کیونکہ تو بعد میں جاگا تھا۔ وہ تیرے گھر جا کے بھی دیکھیں گے۔"

میں نے کہا۔ "کیا حرج ہے اگر میں مہرین کے چچا اور اس کے بیٹے کا ذکر کر دوں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ پولیس خود سراغ لگائے گی کہ وہ کہاں ہیں۔ تو کہے تو رگڑا لگوا دوں انہیں۔"

"چھوڑ یار! ان کا معاملہ چھوڑ اللہ پر۔"

تھانے میں وہی دہشت ناک، عبرت ناک ماحول تھا جو ہر تھانے کی خصوصیت ہے۔ قانون کی مدد اور سہارا لینے کی غلطی کرنے والا وہاں پہنچ کے محسوس کرتا ہے کہ زندگی میں اس سے بڑی غلطی اس نے نہیں کی تھی۔ مولا جٹ بدمعاشوں کا بدمعاش سمجھا جاتا تھا اور ایسا بن کے رہنا اس کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی۔ حلیے سے وہ پیری فقیری یا شرپسندوں کی قیادت کے لیے زیادہ موزوں لگتا تھا اور مزاج کے اعتبار سے درویش تھا۔ پڑھنے پڑھانے والا۔ صوفیانہ موسیقی کا شوقین... یار باش... تھانے میں نیا آنے والا محرر شاید اس سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ جب ہم بلا اجازت کرسی کھینچ کے بیٹھ گئے تو اس نے خاصا برا مانا۔ "بولو جناب کی کیا خدمت کروں؟" اس نے طنز سے پوچھا۔

مولا جٹ نے کہا۔ "ایک رپورٹ لکھوانی ہے۔ اس کی بیوی کے لاپتا ہونے کی۔"

حوالدار نے بدخوئی سے کہا۔ "کیا وہ تمہاری بھی بیوی تھی؟ یا یہ گونگا شوہر ہے؟"

مولا جٹ نے اپنی داڑھی کھجائی۔ "دیکھ بچے! تو نے ابھی پوسٹنگ لی ہے اس تھانے میں... کتنے پیسے خرچ ہوئے؟ مجھے پتا ہے... یہ بھی پتا ہے کہ اس تھانے کی حدود میں تیری سسرال ہے... اور تیرے سالے کی مقدمے بازی چل رہی ہے۔ وہ کسی کے مکان پر ناجائز قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ اب اس تھانے سے تیری پوسٹنگ کہیں اور ہوگئی تو سوچ لے نقصان کس کا ہے... تیرا کہ میرا۔"

محرر کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ عمر میں مولا جٹ سے زیادہ ہی ہوگا جسے اس نے "بچے" کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ اس کا منہ حیرانی سے کھل گیا تھا اور آنکھیں مولا جٹ پر ٹھہر گئی تھیں۔

"سر جی! آپ تو بلاوجہ ناراض ہو گئے۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔" محرر نے بڑی بے غیرتی سے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔

اس نے بڑی تابعداری سے رپورٹ میں وہی لکھا جو میں نے بولا۔ رپورٹ لکھی جا چکی تھی کہ تھانہ انچارج گھومتا پھرتا آگیا۔ دن میں عموماً وہ "گشت" پر بتائے جاتے ہیں اور اکثر ان کے ملنے کے اوقات دن کے بارہ بجے یا پھر رات کے بارہ بجے ہوتے ہیں۔ دن کا پھیرا بس پھیرا ہوتا ہے۔ رات کی شفٹ بزنس کے لیے اور تفتیش کے لیے... اس نے مولا جٹ کو بڑی سرد مہری سے ریسیو کیا اور محرر پر برس پڑا۔

"یہ کیا رپورٹ لکھی ہے تم نے... ایسے لکھی جاتی ہے رپورٹ؟" اور اسے بے عزت کر کے نکالنے کے بعد مولا جٹ سے مخاطب ہوا۔ "اچھا جی! اب آپ جاؤ... آپ کے بندے سے ہم نے کچھ پوچھنا ہے۔"

کسی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر مولا جٹ نے اپنی گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں، بارہ بجے آپ کے آئی جی صاحب پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔ اس مہینے تو خیر سے آپ کا تھانہ ہی اوّل آیا ہے۔"

مولا جٹ نے دو حوالے بڑے سلیقے سے دیے تھے۔ ایک یہ کہ کسی طرم خانی میں نہ رہنا۔ آئی جی صاحب سے بات کرنا میرے لیے مشکل نہیں اور دوسرے جرائم میں اس تھانے کے سرِفہرست ہونے کا تذکرہ... تھانے دار کی پھوں پھاں کا غبارہ ایسے نیچے آگیا جیسے گیس کم ہو جائے تو چھت سے لگا ہوا غبارہ فرش پر لڑھکنے لگتا ہے۔ اس کے باوجود تھانے دار نے مجھے تقریباً سارا دن مجرم بنا کے بٹھائے رکھا۔ میں اس کے کمرے کے باہر والی بینچ پر بیٹھا جمائیاں لیتا رہا۔ دوپہر کے بعد تھانے دار چلا گیا اور مجھے تفتیشی افسر کے سپرد کر گیا۔ وہ مولا جٹ کا پرانا واقف کار تھا۔ دوپہر کا لنچ میں نے اسی کے ساتھ کیا۔ وہ مجھ سے میرے اور مہرین کے ماضی کے بارے میں سوالات بھی کرتا رہا۔ خاصے شک آمیز انداز میں اس نے مہرین کے غائب ہو جانے پر تبصرہ کیا۔ "لگتا ہے وہ

کوئی روح تھی۔ ہیں جی۔ آپ پر عاشق ہوگئی تھی۔ ہم نے تو نہیں سنا ایسے کسی کو غائب ہوتے... بائیس سال کی سروس ہو گئی... خیر، یہ اس کا چاچا جاب کدھر ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم... وہ مکان بیچ کے کہیں چلا گیا ہے۔"

"اچھا جی... ابھی آپ کے ساتھ چل کر وقوعہ کا معائنہ کرتے ہیں۔ انچارج صاحب کو رپورٹ دینی ہوگی۔"

مجھے روکنے اور سوالوں سے ہراساں کرنے کا مقصد صرف پیسا بٹورنے کی کوشش تھی جو ظاہر ہے کہ ناکام رہی۔ مولا جٹ کے غیر ضروری طور پر رعب جھاڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر شک کا اظہار ضرور کیا گیا لیکن رپورٹ درج کرنے کی کاغذی کارروائی کے بعد تفتیش ختم ہوگئی۔ معاملہ سرد خانے میں چلا گیا۔ پولیس کارکردگی وہاں دکھاتی ہے جہاں دونوں کا فائدہ ہو۔ مدعی کا بھی اور پولیس کا بھی... مہرین کے ماں باپ یا بہن بھائی ہوتے تو اس کیس میں مدعی بن کے براہِ راست مجھے قاتل نامزد کر دیتے۔ ان کا موقف یہی ہوتا کہ ہماری بیٹی غائب کیسے ہو سکتی ہے اور جیسے یہ شخص کہہ رہا ہے... بغیر کسی وجہ کے... اسی سے معلوم کریں سچ کیا ہے... یہاں مدعی بھی صرف میں تھا اور مجھے پورا تحفظ حاصل تھا... نہ وہ مجھ سے اعترافِ جرم کرا سکتے تھے اور نہ معاملے کو دبانے کی قیمت مانگ سکتے تھے... دباؤ اوپر سے تھا کہ صرف زبانی پوچھ گچھ کی جائے۔ ایسی تفتیش نے کسی کو خاک دلچسپی ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ پہلے دن ہی معاملہ جہاں تھا وہیں رکا رہا۔ ایک عورت گم گئی تو گم گئی۔ ہم کیوں بلاوجہ تلاش میں سر کھپائیں۔ جیب نہ لینا ایک نہ دینا دو... ہماری کون سی چاچے کی بیٹی تھی۔

"مجھے اندازہ تھا کہ یہی ہوگا۔" مولا جٹ نے میری مایوسی پر کہا۔

"مطلب یہ کہ میں صبر کر لوں۔ مایوس ہو کے بیٹھ جاؤں... پولیس کچھ نہیں کرے گی؟"

"دیکھ پتر جمال! یہ پاکستان ہے... تو نے خبروں، جاسوسی ناولوں اور فلموں میں جو پولیس دیکھی ہے ولایتی... وہ بھی یہاں کچھ نہیں کر سکتی۔ آئے تھے اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی... کیا ہوا؟ کبھی انگلیوں پر حساب لگا کہ لیاقت علی خاں سے آج تک کتنے سیاسی قتل ہوئے ہیں... ان میں وزیرِ اعظم سے گورنر تک سب شامل ہیں... ایک قتل کا بھی سراغ ملا؟ تو کس کھیت کی مولی ہے۔ سیاسی قتل ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مگر انڈیا میں تو گاندھی سے راجیو گاندھی تک سب کے قاتل پکڑے گئے۔ ان پر عام عدالتوں میں مقدمہ چلا اور سزا بھی ہوئی۔ گاندھی کے قاتل دو بھائی تھے۔ ایک نتھو رام گوڈسے کو پھانسی ہوئی۔ دوسرے نے عمر قید کاٹی اور جیل سے نکل کر طبعی موت مرا... ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"یعنی میں اور تو... اپنا کام چھوڑ کے جاسوسی کریں گے؟ مہرین کا سراغ لگائیں گے؟"

"یار کوشش ضرور کریں گے۔ عقل تو تھوڑی بہت تیرے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی۔"

یہ بڑی مایوس کن صورتِ حال تھی۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ گھر سے دور رہنے کے لیے میں آفس چلا جاتا تھا اور خود کو مصروف رکھتا تھا۔ واپسی پر میں دیر سے لوٹتا تھا تو صرف سونے کے لیے... ڈاکٹر کے مشورے سے میں نے خواب آور یا سکون آور دوا شروع کر دی تھی جس سے فرق پڑا تھا۔ میری رات آرام سے گزر جاتی تھی۔ میں نے گھر کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی۔ جو چیز جہاں تھی، وہیں پڑی تھی۔ میں صبح ناشتا بھی آفس جا کے کرتا تھا۔ دوپہر کا اور رات کا کھانا تو باہر ہوتا ہی تھا۔ پھر ایک روز مولا جٹ مجھ سے چابی لے گیا۔ دن بھر میں اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کے میرے گھر کا نقشہ بدل دیا۔ وہ مہرین کی ایک ایک چیز اٹھا کے لے گئے۔ انہوں نے میرا بیڈ دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا اور فرنیچر کی سیٹنگ تک بدل ڈالی۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مہرین کو بھلا دینا اتنا آسان نہ تھا۔

چار دن بعد فرح بھابی شوفر کے ساتھ آگئیں۔ میں نے پوچھا۔ "مولا جٹ کہاں ہے؟"

"وہ سو رہے ہیں گھوڑے گدھے بیچ کے... حسبِ معمول شام کو اٹھیں گے۔"

"آپ نے گھر کا نقشہ بدل دیا۔ کیا فائدہ ہوا؟"

وہ بولیں۔ "کچھ کام نفع نقصان دیکھے بغیر بھی کرنے پڑتے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں آپ اس وقت؟"

"دفتر جانے کی تیاری... آپ نے کیسے زحمت کی اس وقت؟"

انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "آپ ذرا چلیں میرے ساتھ... مہرین کے اسکول۔"

فرح بھابی کو انکار کرنا میرے لیے بھی مشکل ثابت ہوا۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم اس اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں پہنچ گئے جہاں مہرین پڑھاتی تھی۔ پرنسپل نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہم مہرین جمال کے بارے میں کچھ معلومات لینے

آئے ہیں۔" فرح بھابی نے کہا۔

"وہ تو شاید ایک ہفتے سے نہیں آ رہیں۔" پرنسپل نے کہا۔

"جی... وہ میری بھابی تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہیں... اور یہ میرے بھائی جمال، ان کے شوہر... وہ بڑے پراسرار حالات میں لاپتا ہو گئی ہیں... کسی کو کچھ بتائے بغیر۔"

"تو آپ پولیس کے پاس جائیں نا... میں کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی؟" پرنسپل نے کہا۔

"آپ کے خیال میں وہ کیسی لڑکی تھی؟"

پرنسپل نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ "اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا یہاں... شاید سال بھر... میرا اس سے اتنا ہی ربط تھا جتنا دوسری سب ٹیچرز سے... وہ بہت مہذب اور خوش اخلاق تھی۔ ریگولر تھی۔ پڑھاتی اچھا تھی۔ میں نے اس کی شکایت کسی سے نہیں سنی تھی۔ مجھے افسوس ہوا یہ جان کر... پولیس کی تفتیش کیا کہتی ہے؟"

"ہماری پولیس کی بات نہ ہی کریں تو اچھا ہے میڈم... وہ اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ ان سے کچھ توقع رکھنا عبث ہے۔ شریف آدمی ان سے مدد مانگ کر پچھتاتا ہے۔"

"پھر میں کیا کر سکتی ہوں بتائیے؟"

فرح بھابی نے کہا۔ "یہاں کسی ٹیچر سے ان کی زیادہ دوستی ہو گی۔ ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے دل مل جائے تو اعتماد کا رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔"

"میں سمجھ گئی آپ کی بات... میں مس نور جہاں کو بلوا دیتی ہوں۔ آپ ان سے اکیلے میں بات کر لیں۔ اسٹاف روم میں مناسب نہیں لگتا۔" پرنسپل نے گھڑی دیکھی۔ "ان کا پیریڈ آف ہوگا آدھے گھنٹے بعد۔"

فرح بھابی نے میری طرف دیکھا۔ "آپ جائیں بھائی... ڈرائیور آپ کو آفس چھوڑ کے واپس آ جائے گا۔"

میں نے تعمیل کی۔ اس عورت میں کوئی بات تھی۔ کوئی پراسرار صلاحیت تھی جو نظر نہیں آتی تھی۔ محسوس ہوتی تھی۔ اپنا بنانے کی... اپنی بات منوانے کی۔ قائل کرانے والی اور جادو اثر... چند منٹ میں پرنسپل کا درشت اور عدم تعاون کا رویّہ تبدیل ہو کے تعاون اور ہمدردی کا ہو گیا تھا۔ میں خاموشی سے کیسے نہ اٹھتا۔ وہ میری مدد بھی تو کر رہی تھیں اور نہ جانے کیوں ابھی سے میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کی کوشش بار آور ثابت ہوگی۔ ایسا انہوں نے خود سوچا تھا یا انہیں تفتیش کی یہ راہ ان کے کرائم رپورٹر شوہر نے دکھائی تھی، اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

باس کا رویّہ اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ مہربانی کا تھا۔ اس کی ظاہری وجہ انسانی ہمدردی کا جذبہ لگتی تھی۔ مہرین کے خیال کو دور رکھنے کے لیے میں نے خود کو کام میں غرق کر دیا تھا۔ جذباتی انتشار سے میری کارکردگی خراب ہونے کے بجائے پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن ایک وجہ کا نام زارا تھا۔ انہی دنوں وہ کیمبرج سے انگلش لٹریچر میں گریجویشن کر کے لوٹی تھی۔ میں آفس پہنچا تو وہ باس کے کمرے میں اس کی کرسی پر براجمان تھی۔ ایک ماڈل ٹائپ سلم اور خاصی حسین لڑکی جو ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھی اور تراشیدہ بالوں کو محض ادائے ناز کے طور پر سر جھٹک کے پیچھے ہٹاتی رہتی تھی۔

میں سوری کہہ کے پلٹا تو وہ ہنسی۔ "جمال صاحب! آپ تو مجھے دیکھ کے ایسے بھاگ رہے ہیں جیسے میں کوئی خطرناک چیز ہوں... آدم خور۔"

میں نے کہا۔ "میں باس کو دیر سے آنے کی وجہ بتانا چاہتا تھا۔"

اس نے کہا۔ "فرض کریں باس میں ہوں۔ آج نہیں تو کل ایسا ہوگا۔ آپ مجھے بتائیں یہاں بیٹھ کے۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "... میں مہرین کے لاپتا ہونے کی تفتیش میں شامل تھا۔"

"آئی ایم رئیلی سوری اباؤٹ ہر... مجھے اس کے بارے میں پاپا نے بتایا۔"

اسی وقت پاپا نمودار ہوئے۔ "جمال! میں تمہیں ہی دیکھنے گیا تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں... زارا! آپ میری کرسی خالی کریں گی؟"

وہ اٹھ کے میرے ساتھ آ بیٹھی۔ "پاپا! واٹ از ڈھنڈورا۔"

"یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے۔ تم کافی پیو اور جاؤ... میں سب کر لوں گا۔"

"مسٹر جمال کو بھی انوائٹ کریں گے؟ یہ بہت لونلی فیل کر رہے ہوں گے۔ ہی نیڈز کمپنی۔"

"یہ کام تم خود بھی کر سکتی ہو جب یہاں موجود ہو۔ جمال! تم ملے ہو نا زارا سے؟"

زارا نے کہا۔ "شام کو میری برتھ ڈے پارٹی ہے۔ وہاں ملیں گے۔ آفس میں کیا ملنا۔"

جب وہ کافی پی کے چلی گئی تو باس نے اس کے بارے میں بتایا۔ ان کا خیال تھا کہ میں بڑے غور سے سن رہا ہوں لیکن میں آنے والے دنوں میں حالات کا موسم بدلتا دیکھ

کے پریشان تھا۔ لڑکیوں کے معاملے میں مجھے اپنے تجربے پر اتنا اعتماد نہیں کہ میں صورت دیکھ کے دل کا حال جان سکوں مگر زارا کی مجھ میں دلچسپی اس کی عادت نہیں تھی تو خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ باس کے پاس میں خود مدد مانگنے گیا تھا ایک ذاتی مسئلے میں۔ غیر قانونی مدد۔ آج وہ اس کے لیے تیار تھا تو میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ مسئلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

شام کو مولاجٹ کا فون موصول ہوا۔ ”عزیز من سلامت باشد۔ فرح کو آج کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔“

”یار! میں بھائی کا احسان مند ہوں۔ اتنا تردد کون کرتا ہے کسی کے لیے۔“

”واپس آنے کے بعد سے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا مگر اس کے خیالوں کا عکس اس کی آنکھوں میں آتا ہے۔ تو ایسا کر شام کو ادھر آجا۔“

میں نے کہا۔ ”سوری یار! مجھے باس نے بلایا ہے۔ جلدی فراغت ہوگئی تو آجاؤں گا ورنہ کل۔“

باس کے گھر میں بڑی محدود تعداد میں لوگ بلائے گئے تھے۔ کچھ رشتے دار... کچھ زارا کے دوست۔ میں نے محسوس کیا کہ تعلقات کی نوعیت کے اعتبار سے وہاں میری جگہ بنتی نہیں تھی لیکن مجھے بڑا پروٹوکول ملا۔ اجنبی لوگوں سے میرا تعارف بڑے اچھے انداز میں کرایا گیا اور یہ سب باس نے کیا یا ان کی بیگم نے۔ میں نے زارا کو بڑے زرق برق انداز میں دیکھا۔ مجھے شک ہوا کہ اس کی ایک دو سہیلیاں مجھے غیر معمولی توجہ سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ میرا شک بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے خود کو خاصا ریزرو رکھا۔

خلافِ امید وہاں سالگرہ کی تقریب ڈنر پر ختم نہیں ہوئی... اس کے بعد ایک محفل موسیقی تھی جس میں ناقابلِ برداشت غل غپاڑا کرنے والے دو پاپ میوزک بینڈ شریک تھے۔ وہ مشہور پاپ سنگر تھے اور یقیناً اس محفل میں پرفارمنس کی انہوں نے بہت بڑی قیمت وصول کی ہوگی۔ لیکن باس افورڈ کرسکتے تھے۔ یہ زارا کے واپس آنے کی ویلکم پارٹی بھی تھی۔ جسمانی طور پر وہاں موجود ہونے کے باوجود میں ذہنی طور پر غیر حاضر بلکہ شدید اذیت کا شکار تھا۔ یہ احساسِ جرم مسلسل میرے دل میں نشتر چبھو رہا تھا اور میرے ضمیر کے لیے باعثِ ندامت بنا ہوا تھا کہ ابھی مہرین کو مجھ سے جدا ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا ہے اور میں اس دعوت اور محفلِ طرب میں شریک ہوں... دوسری طرف میزبانی کے اخلاق و آداب نبھانے ضروری تھے۔ یہ کوئی ایسی پارٹی نہیں تھی جس سے میں احتجاجاً واک آؤٹ کرجاؤں۔ سوال میرے مستقبل کا تھا۔ کہنے کو یہ پاکستانی کمپنی تھی لیکن کسی ملٹی نیشنل سے کم نہ تھی کیونکہ اس کے کاروباری مراسم دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک سے تھے۔ دبئی، سنگاپور، لندن، نیویارک جیسے تجارتی مراکز میں ان کے سب آفس تھے جہاں سے سالانہ کروڑوں ڈالرز یا اربوں روپے کا منافع اور کنزیومر گڈز ہر سال پاکستان بھیجا جاتا تھا اور اس سے زیادہ مالیت کا مال ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ایک اصول پرست خالص کاروباری ذہن رکھنے والے چیف ایگزیکٹو نے مجھے صلاحیت کی بنا پر منتخب کرلیا ورنہ یہ عہدہ سیاسی بنیادوں پر کسی ایسے شخص کو ملتا جو کمپنی کو مزید فائدہ پہنچا سکتا... میں کسی صورت اس موقع کو گنوانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

باس پاکستانی تھا اور کمپنی کا مالک... اس نے ورلڈ بینک کے ایک سابق ڈائریکٹر کو چیف ایگزیکٹو بنا کے نہ صرف کاروبار کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور پھیلانے میں مدد لی بلکہ اس کے نام کی ساکھ سے بھی فائدہ اٹھایا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب اتنی بڑی تنخواہ پر کسی غیر ملکی کو چیف ایگزیکٹو رکھنے سے مزید کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا تو اس نے یہ عہدہ پھر خود سنبھال لیا۔ اس میں صلاحیت کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس میں لوگوں سے فائدہ اٹھانے کا ہنر بھی شامل تھا۔ اس میں پی آر کی زبردست صلاحیت تھی۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے کیونکہ اپنے ملازموں اور ماتحتوں کو وہ اپنی فیملی کہتا تھا اور ان کے چھوٹے موٹے مسائل حل کردیتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ دل لگا کے کام کرتے تھے اور جب اسے باس کہتے تھے تو اس میں وہی عزت اور پیار ہوتا تھا جو باپ سے کم نہ تھا۔ میں خود اس اعتماد کے بھروسے باس کے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ پہلے بھی لوگ مصیبت کے وقت دن رات دیکھے بغیر اس کے گھر جا پہنچے تھے اور اس نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔

”آپ کہاں گم ہیں سر؟ مہرین کے تصور میں...“ زارا نے اچانک میرے ساتھ بیٹھ کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں چونکا۔ زارا کی بات بے محل تھی مگر میں ٹال گیا۔ ”جی نہیں... میں پوری طرح انجوائے کررہا ہوں۔“

”ریئلی؟“ اس نے بے یقینی اور شوخی سے کہا۔ ”یو لائک دس بینڈ؟... باسٹرڈز... انہوں نے پانچ لاکھ چارج کیے ایک پرفارمنس کے... بلیک میلرز... فنکشن کیسا رہا؟“

”سوپر۔“

اس نے بڑی ادا سے بیک وقت خوشی اور ناراضی کا اظہار کیا۔ ”مگر ایک جملہ میرے لیے بھی بول دیتے تو کیا تمہاری شان میں فرق آجاتا... ہر چیز کی تعریف کررہے ہو سوائے میرے۔“

میں نے خفت سے سر کھجایا۔ ”یو ڈونٹ نیڈ پریز... تمہارے دم سے ہی تو تقریب کا حسن ہے... یہ کوئی کہنے کی بات ہے کہ یو آر لکنگ بیوٹی فل اور یہ ڈریس بھی تم پر اتنا گلیمرس لگ رہا ہے۔“

وہ خوش ہوگئی۔ شاید یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اپنی غلطی کا کفارہ لفاظی سے ادا کررہا ہوں۔ ”تم خود کو اتنا اجنبی کیوں محسوس کررہے ہو آخر... ڈرنک نہ کرو مگر ہلا گلا تو کرو... گانا آتا ہے تمہیں؟“

”بالکل بھی نہیں... دراصل میں بہت تھکا ہوا ہوں... صبح پھر آفس...“

”تو ہیل ود آفس... دیر سے آجانا یا مت آنا... لیکن ابھی تم جا نہیں سکتے... پاپا ایک بہت زبردست اناؤنسمنٹ کرنے والے ہیں... میرے اور تمہارے بارے میں۔“

ایک لمحے کے لیے تو میرا سانس ہی رک گیا۔ ”میرے اور تمہارے بارے میں؟“ میں نے کہا مگر وہ اتنی دیر میں اٹھ کے جاچکی تھی۔ پاپا نے اشارے سے اسے طلب کیا تھا۔ کیا ہوگی آخر یہ اناؤنسمنٹ... یا میرے خدا... میں اس الٹرا ماڈرن مغربی تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے قبیلے میں کہاں پھنس گیا؟ اگر پاپا نے ابھی میری اور زارا کی انگیج منٹ کردی یا اس کا اشارہ ہی دے دیا تو میں کیا کروں گا... یہاں تو انکار ناممکن ہوگا مگر صبح مجھے اپنا استعفا بھجوانا پڑے گا۔

پاپا نے تقریباً پچاس افراد کے مجمع کو بہ آوازِ بلند مخاطب کیا۔ ”لیڈیز اینڈ جنٹلمین... مجھے ایک بہت امپورٹنٹ اناؤنسمنٹ کرنی ہے جس کا تعلق میری بیٹی زارا... اور مسٹر جمال سے ہے... جمال! کم ہیئر۔“

میں مجبوراً اٹھا اور باس کے ساتھ بائیں ہاتھ پر جاکر کھڑا ہوا۔ دائیں ہاتھ پر ان کی اکلوتی بیٹی زارا تھی۔ لوگ شاید مجھ سے زیادہ حیران تھے اور غالباً یہی سمجھے ہوں گے کہ اعلان کا تعلق میرے اور زارا کے مستقبل سے ہوگا۔ مجھے وہاں کوئی مہرین کے شوہر کی حیثیت سے جانتا تھا تو وہ باس اور اس کی بیوی تھے یا زارا... باقی سب نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں زارا کی پسند ہوں۔ میرے اندیشے ایک حقیقت کا روپ دھار چکے تھے اور صبح میرے لیے مستعفی ہونا ہی اس مسئلے کا واحد حل ہوگیا تھا۔

”میں نے اپنی بیٹی زارا کو کمپنی میں اپنے بعد دوسری انتظامی پوزیشن دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“ (تالیاں) ”زارا ہی بالآخر میرے کاروبار کو سنبھالے گی اور اس کی مالک ہوگی۔“ (مزید تالیاں)

”لیکن اس نے لٹریچر پڑھا ہے۔ کاروبار سے اس کا تعلق اب شروع ہوگا۔ زارا بہت ذہین اور محنتی ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ ایک سال میں مجھ سے زیادہ باصلاحیت ثابت ہوگی۔ کیونکہ اسے کاروبار کے تمام اصول اور معاملات سے عملی طور پر آگاہ کرنے والا ہوگا جمال... جو ابھی میرا اسسٹنٹ ہے۔“ (تالیاں)

”جمال انتہائی محنتی، ذہین اور فرض شناس آدمی ہے۔ میں اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے زارا کو ایک سال کے لیے جمال کا ایڈوائزر مقرر کیا ہے۔“ (مزید تالیاں)

”یہ عہدہ میرے نزدیک بہت اہم ہے۔ اسے پوری عزت اور اہمیت ملنی چاہیے۔ چنانچہ زارا اگر آن پیپر ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر ہوگی تو جمال کا بھی یہی عہدہ ہوگا۔“ (بے شمار تالیاں)

”اور اسی عہدے کے مطابق ان کی مراعات بھی ہوں گی... مسٹر جمال کو رہائش اور شوفر والی کار بھی ملے گی۔“

میں ایسا محسوس کررہا تھا جیسے ان احسانات کے بار تلے دب کر میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہورہا ہے۔ باس بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ وہ ایک دم زارا کو مجھ سے منسوب کرتا تو لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملتا۔ سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ پہلا قدم کس منزل کی طرف ہے۔ خود میں بھی یہی سمجھ رہا تھا لیکن فوری طور پر اپنے خدشے پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرتا تو ذلت اٹھاتا۔ شاید مجھ سے اسی وقت سب کے سامنے کہہ دیا جاتا کہ کس خوش فہمی کا شکار ہو مسٹر جمال! تم ایک معمولی حیثیت کے منیجر... ہمارے ملازم... ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے... تمہاری جرأت کیسے ہوئی ایسا سمجھنے کی۔ ہم نے تو عزت دی تھی تمہیں... تمہارے میرٹ پر... تم نے ہمیں بے عزت کیا ہے... اب بہتر یہی ہے کہ چلتے بنو... میں وقت پر سنبھل گیا۔ میں نے باس کا بہترین الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور سب سے ہاتھ ملا کے مبارک باد لیتے ہوئے ایسا محسوس کیا جیسے میں نے رشوت قبول کرلی ہے۔ اپنی قیمت وصول کرلی ہے۔ حاسد اور زارا کے خواب دیکھنے

والے جائیں بھاڑ میں۔

اور اندر سے میرا ضمیر چیخ چیخ کے رو رہا تھا۔ اب تم صبح استعفا نہیں دو گے۔ اب تم ڈی ایم ڈی ہو۔ تمہیں کوٹھی ملے گی اور شاندار کار جسے وردی والا ڈرائیور چلائے گا۔ تمہاری تنخواہ کئی گنا بڑھ کے پانچ لاکھ ہوگی۔۔۔ پھر جانتے ہو کیا ہوگا؟ تم زر خرید غلام بن جاؤ گے۔ ابھی تو صرف ایک ہفتہ گزرا ہے مہرین سے جدائی کا۔۔۔ سال گزرنے دو۔۔۔ پھر شاید تم سوچ کے کہو گے کہ ہاں۔۔۔ وہ کچھ عرصہ میری بیوی رہی تھی۔ ایک معمولی سی لڑکی۔ اس نے مجھے ٹریپ کرلیا تھا۔ یوں۔۔۔ جوانی کے جذبات میں ایسی بے وقوفی ہو جاتی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ آئی ڈونٹ نو کہاں۔۔۔ میں نے معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

تقریب رات کے بارہ بجے ختم ہوئی تو باس نے پوچھا۔ ”تم کیسے آئے تھے؟“

میں نے خفت سے کہا۔ ”میں چلا جاؤں گا۔“

”او نو۔۔۔ گاڑی تمہیں چھوڑ کے آئے گی۔“ انہوں نے دور کھڑے ایک شوفر کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ”ناصر! دس ول بی یور کار۔۔۔ یہ شوفر بھی تمہارے ڈسپوزل پر ہے آج اور اسی وقت سے۔۔۔ اسے بتا دینا صبح کس وقت آئے۔“

میں کوشش کے باوجود بول نہ سکا۔ مجھے اپنے سینے میں شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

”کل تمہارے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ کہیں قریب ہی۔۔۔ گڈ نائٹ۔“ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا مگر زارا مجھے ان کے اشارے پر وہاں تک چھوڑنے آئی جہاں ایک تقریباً نئی جگمگ کرتی سلیٹی رنگ کی ہنڈا اسوک کھڑی تھی۔ ایک بوجھل دل اور شدید احساس جرم کے ساتھ میں رات کے ساڑھے بارہ بجے مولا جٹ کے گھر گیا۔۔۔ سیکیورٹی گارڈ نے مجھے روکا اور پھر پہچان کے دروازہ کھول دیا۔ کار سیدھی اندر پورچ میں جا رکی۔ مولا جٹ عموماً رات کو دو ڈھائی بجے آخری کاپی پریس میں جانے کے بعد آتا تھا۔ اس کے ساتھ فرح بھابی نے بھی یہی معمول اپنا لیا تھا۔ وہ دیر تک جاگتی تھیں اور پڑھتی رہتی تھیں یا ٹی وی دیکھتی تھیں۔

کار کے ہارن پر وہ باہر آئیں اور مجھے دیکھ کے حیران ہوئیں۔ ”جمال بھائی! آپ اس وقت؟“

میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”تم جاؤ۔۔۔ صبح مجھے یہیں سے لینے آجانا۔“ پھر میں بھابی سے مخاطب ہوا۔ ”دراصل میں اس وقت اپنے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ کیوں نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ یہ میں صبح بتاؤں گا۔“

صبح میں گیسٹ بیڈ سے نکلا تو کار مجھے لینے آچکی تھی مگر میں لان پر ٹہلتا رہا اور پھر میں بیٹھ کے کافی پیتا رہا۔ دس بجے کے قریب فرح بھابی نے بیڈ روم کی کھڑکی سے جھانک کر مجھے دیکھا اور مولا جٹ کو جگایا۔ ناشتے کے دوران میں نے انہیں گزشتہ شب کی روداد سنائی۔ ”میرا خیال ہے کہ استعفے کے سوا میرے سامنے کوئی راستہ نہیں۔“

مولا جٹ کچھ نہیں بولا مگر فرح بھابی نے سوال کیا۔ ”میرے خیال میں یہ بڑی جذباتی غلطی۔۔۔ بلکہ بے وقوفی ہوگی اگر آپ نے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔۔۔ جمال بھائی۔۔۔ کیا آپ کو خود پر اعتماد نہیں ہے؟“

”کیا یہ اعتماد کی بات ہے؟“

”ہاں، آپ کو اعتماد ہونا چاہیے خود پر۔۔۔ جو ذمے داری آپ کو دی گئی ہے پوری کریں۔ کیا پتا آپ کے خدشات بے بنیاد ہوں اور ایسا ہوتا ہے تو کیا آپ ڈرتے ہیں کہ انکار نہ کر سکیں گے؟ استعفا تو آپ بعد میں کسی وقت بھی دے سکتے ہیں جب آپ کو محسوس ہو کہ اب واقعی سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔ ورنہ اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ کو کسی اور کمپنی میں محض اس پوزیشن کی بنیاد پر چانس مل سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں بھابی! سال بھر بعد آپ کہیں گی کہ اب مہرین تو ماضی کی بات ہوگئی۔ اپنا مستقبل دیکھو۔“

”کیا ایسا سوچنا گناہ ہے یا جرم ہے؟ کون نہیں سوچتا بہتر مستقبل کے لیے۔۔۔ کیا آپ نہیں سوچتے؟“

”لیکن۔۔۔ اس کی جو قیمت مجھے ادا کرنی پڑے گی۔۔۔“

”جلد بازی سے کام نہ لیں جمال بھائی۔۔۔ آپ ابھی کتنا جانتے ہیں زارا کو؟“

”وہ مہرین کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔۔۔ اور اتنی جلدی۔۔۔“

”جلدی کرنے کے لیے میں بھی اصرار نہیں کر رہی ہوں۔ وقت کو مہلت دیں۔۔۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مہرین کا سراغ مل جائے۔ معلوم ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ زندہ ہے تو آپ کو چھوڑ کے کیوں گئی تھی۔ کیا پتا اب وہ واپس نہ آنا چاہے۔۔۔ یا آئے تو آپ اسے قبول نہ کریں۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”آپ جانتے ہیں نا کہ میں کتنی حقیقت پسند ہوں۔۔۔ پریکٹیکل۔۔۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ امکانات کی دنیا ہے۔۔۔ برا نہیں رہنے کا۔۔۔ ایک منٹ کے لیے فرض کریں۔۔۔ فرض کریں کہ وہ آپ کو ملتی ہے۔۔۔ کسی کوٹھے پر۔۔۔ کسی کال گرل کے روپ میں۔۔۔ اغوا کرنے والے ان سے شادی نہیں کرتے۔۔۔ ان کو بہن بنا کے نہیں بٹھاتے۔۔۔ پھر کیا ہوں گے آپ کے جذبات؟“

”آپ سے کون بحث کر سکتا ہے۔“

”مجھے جواب دیں۔ ایک سیدھا سا سوال ہے۔۔۔ اگر مہرین نہ ملی۔۔۔ تو کیا زارا یا دنیا کی کوئی اور لڑکی اس کی جگہ نہیں لے سکتی؟ صرف ایک سال کی یادوں پر آپ اپنی پوری زندگی قربان کر سکتے ہیں؟ نہیں، جواب ہاں میں دیں گے تو جھوٹ ہوگا۔ ابھی دیکھیں۔۔۔ انتظار کریں۔۔۔ میری بھی خواہش ہے کہ مہرین مل جائے۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے ملی تھی۔ اور آپ دونوں ویسے ہی رہنے لگیں جیسے پہلے رہتے تھے مگر ایسا نہ ہوا پھر؟۔۔۔ زارا کو بھی دیکھیں۔۔۔ پرکھیں۔۔۔ بغیر جانے مسترد مت کریں۔ جلدی کیا ہے آپ کو آخر؟“

مولا جٹ زیر لب مسکرایا کیونکہ میں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ”فرح ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”ہاں کیونکہ وہ تیری بیوی ہے۔ تیرے سامنے بیٹھی ہے اور اس کے پاس دل ہے ہی نہیں۔ صرف دماغ ہے۔ تقدیر کو میں کیا کہوں۔۔۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ حالات نے میرے خلاف سازش کرلی ہے۔ صرف زارا اور اس کے پاپا ہی نہیں۔۔۔ تم بھی چاہتے ہو کہ میں مہرین کو فوراً بھلا دوں۔ جیسے موبائل فون پر سے نمبر اور نام ڈیلیٹ کیا جاتا ہے، اسے میں اپنی زندگی سے ڈیلیٹ کر دوں۔۔۔ میری میموری میں بھی اس کا وجود نہ رہے۔“

فرح بھابی پُرسکون بیٹھی سب سنتی رہیں۔ ”بس یا کچھ اور۔۔۔ آپ کہیں۔۔۔ نہیں تو میری بھی سن لیں۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ مہرین کا زخم ابھی رس رہا ہے۔ آپ کو کتنی اذیت ہوتی ہے اس کے ذکر سے۔۔۔ مجھے اس کا بھی اندازہ ہے لیکن جیسا کہ آپ نے کہا ہے۔۔۔ میں انسان نہیں روبوٹ ہوں۔۔۔ جذبات نہیں رکھتی۔۔۔ کمپیوٹر کی طرح سوچتی ہوں۔“

میں نے خفت سے کہا۔ ”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“

وہ بولتی گئیں۔ ”کمپیوٹر جھوٹ نہیں بول سکتے۔ میں بھی آپ کو بتا دوں کہ مہرین کا پھر ملنا ناممکن نہیں ہے۔۔۔ لیکن مجھے اس کے امکانات نہ ہونے کے برابر لگتے ہیں کہ وہ آپ کو ملے تو زندہ ملے۔۔۔ اور ویسی ہی ملے جیسی تھی پھر بھی امکانات کو صفر کے برابر تسلیم نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ کتنے ہی کم ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ مہرین ہی ملے۔۔۔ تو ہم اس کی جستجو کریں گے۔ پوری تندہی سے اسے تلاش کریں گے جب تک کہ ہمیں حتمی ثبوت نہ مل جائے۔۔۔ ادھر یا اُدھر۔“

میں نے طنز سے کہا۔ ”شرلاک ہومز ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں آپ۔“

”میں امکانات دیکھ رہی ہوں۔ بالکل کسی کمپیوٹر کی طرح۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ جواب مجھے مل جائے گا۔۔۔ ابھی آپ بھی عقل سے کام لیں۔۔۔ جذبات کے گرداب سے بچیں جو اندر کھینچتا ہے۔“

”میں نے سنا تھا کہ عورت سے زیادہ جذباتی طور پر کمزور مخلوق کوئی نہیں۔“

”یہ پھر وہی امکانات کا چکر ہے۔ سو فیصد صرف حساب میں ہوتا ہے۔ سائنس بھی امکانات پر چلتی ہے۔ یہ تصویر دیکھ رہے ہیں آپ۔“ انہوں نے لاؤنج کے آخر میں ایک فریم کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ۔۔۔ آپ کے والد مرحوم ہیں؟“

وہ مسکرائیں۔ ”یہ میرے پہلے شوہر ہیں۔ حاجی قربان علی۔۔۔ زندگی میں بھی میں ان کے لیے جذباتی نہیں ہوئی تھی۔“

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ”آئی ایم سوری۔۔۔ مگر ان کی تصویر۔۔۔“

”میرے پاس آج جو کچھ ہے انہی کا دیا ہوا ہے۔ ان سے بڑا کوئی محسن نہیں میرے لیے۔“

مولا جٹ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ فرح کو جہیز میں کیا کچھ دے گئے۔ مجھے مرحوم سے کسی قسم کی رقابت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ صرف نام کے کاغذی شوہر ہی تو تھے۔“

مجھے فرح بھابی کی بات یوں لگی جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ مہرین کی ایک تصویر تم بھی لگوا لو اپنے گھر میں۔ تمام عمر لگائے رکھو۔۔۔ لیکن کیا تم زندگی اس تصویر کے ساتھ گزار سکو گے؟ میں نے بہتر سمجھا کہ وہاں سے بھاگ کے آفس چلا جاؤں۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد میں اپنی نئی رہائش گاہ میں شفٹ ہوا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں مہرین کی یادوں کو پیچھے چھوڑ کے فرار اختیار کر رہا ہوں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے اس الزام کو قبول کرلیا۔ آخر کوئی کب تک پیچھے دیکھ کر آگے چل سکتا ہے۔ زندگی اسی طرح جینا سکھاتی ہے۔ مہرین کا تصور اور اس کی یادیں میرے ساتھ تھیں لیکن دل کی خلش ایک سوال بن گئی

تھی۔ آخر وہ کہاں گئی اور کیوں؟ اس سوال کے جواب پر میرے مستقبل کے سکون کا انحصار تھا۔ فرح بھابی کی بات پر مجھے اعتبار آنے لگا تھا کہ شاید اب اس دنیا میں مہرین مجھے پھر نہ ملے گی۔

ایک ہفتے میں دو واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے مجھے اس فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی ورنہ میں باس سے کہہ چکا تھا کہ مجھے نئی رہائش کی ضرورت نہیں۔ میں جہاں ہوں خوش ہوں اور مزید احسانات کا بار اٹھانا نہیں چاہتا۔ زارا نے کچھ بُرا بھی مانا کہ میں نے احسان کی بات کیوں کی۔ لیکن میں نے اپنی خودی کو بلند رکھنا ضروری سمجھا۔

ایک رات میں آفس سے اٹھنے والا تھا کہ مجھے فرح بھابی کا فون ملا۔ ''آپ آفس میں ہیں ابھی تک؟'' پھر انہوں نے سوال کیا۔ ''کیا زارا بھی آپ کی طرح کام میں بے حد مصروف ہے؟''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''زارا تو آج آئی ہی نہیں۔ آپ تصدیق کرا لیں۔ زارا کا فون نمبر دوں؟''

''چلیں میں اعتبار کرتی ہوں۔ اب آپ سیدھے آجائیں ہماری طرف۔ کھانا کھا کے کہیں جانا ہے۔''

کھانے کی میز پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ مولاجٹ کا گھر اب میرا دوسرا گھر بن گیا تھا۔ میں یہاں اسی طرح آتا تھا جیسے ہر بھائی اپنی بہن کے گھر جاتا ہے۔ اس کے دونوں بچے اب مجھے چندا ماما کہنے لگے تھے۔ یہ خطاب مجھے مولاجٹ نے دلوایا تھا۔ لڑکا بڑا تھا اور مولاجٹ کی کاپی نظر آتا تھا۔ لڑکی اپنی ماں پر گئی تھی اور چھوٹی ہونے کے باوجود بڑے بھائی کو رعب میں رکھتی تھی۔ خلافِ معمول فرح بھابی سیریس اور کسی سوچ میں گم تھیں۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے ڈرائیونگ میرے سپرد کر دی۔ ''میں نے کچھ معلوم کیا ہے۔ میں مہرین کے کالج گئی تھی۔ اس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اب کالج میں نہیں ہیں۔ کچھ یونیورسٹی میں ہیں۔ کچھ کی شادی ہو گئی ہے اور کچھ فارغ بیٹھی ہیں۔ میں نے سب کے ایڈریس لے لیے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ مہرین کی سب سے عزیز سہیلی کون تھی۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کیسے کیا آپ نے یہ کام... اور کب؟''

''یہ کون سا مشکل کام تھا۔ جیسے ہم نے اس اسکول سے معلوم کیا تھا جہاں مہرین پڑھاتی تھی، ایسے ہی کالج سے پوچھنا ضروری تھا۔ کالج میں مہرین نے چار سال لگائے تھے۔ ان چار سالوں میں مہرین جیسی لڑکی کو کسی نے پسند نہ کیا ہو، یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ لڑکیاں ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کے بتاتی ہیں کہ ان پر مرنے والے کتنے ہیں۔ سچ میں جھوٹ کا تڑکا سب لگاتی ہیں لیکن ایک دو ایسی ضرور ہوتی ہیں جو اصل رازداں ہوتی ہیں۔''

''یہ آپ کا مشاہدہ ہے کہ تجربہ؟'' میں نے کہا۔

''دونوں... تفصیل نہیں بتاؤں گی۔ ٹائم نہیں ہے ابھی، اس لیے پھر کبھی سہی... یا اپنے دوست سے سن لینا۔ خیر، جب مجھے ایڈریس مل گئے تو میں نے ان لڑکیوں کو تلاش کیا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور اس تلاش کا مقصد کیا ہے؟ میں نے جھوٹ بول دیا کہ مہرین کے رشتے کا معاملہ ہے۔ رشتہ میرے بھائی کا ہے۔ یہ عام سی بات ہے۔ لڑکیوں کے بارے میں تفتیش زیادہ کی جاتی ہے۔ اس نے مجھے دو نام بتائے کہ یہ ہر وقت مہرین کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک کی تو شادی ہو چکی ہے، دوسری کا پتا نہیں۔ اس وقت ہم فرزانہ محبوب کے گھر جا رہے ہیں۔ محبوب اس کے شوہر کا نام ہے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ مہرین کے بارے میں سچ سچ بتا دے گی؟''

''سچ اگلوانا مجھے آتا ہے جمال بھائی!'' وہ بولیں۔

میں فرح بھابی کی ہدایات کے مطابق ڈرائیو کرتا رہا۔ میں نے رات دس بجے سے کچھ پہلے گلشن راوی کے ایک گھر کے سامنے گاڑی روک لی۔ یہ بالائی متوسط طبقے کا علاقہ تھا جہاں دس مرلے اور ایک کنال کے جدید اور خوب صورت گھر تھے۔ نچلے طبقے کے راج مستری، پلمبر اور الیکٹریشن یا گھر میں کام کرنے والی ماسیوں کے نزدیک یہ کوٹھیاں تھیں۔ اوسطاً ہر گھر میں ایک گاڑی ضرور تھی۔ وقت یوں بدلا تھا کہ ان گھروں میں رہنے والے خودبخود کروڑپتی شمار ہونے لگے تھے۔ اپر کلاس یا دولت مند کہلانے کے لیے اب ارب پتی ہونا ضروری تھا۔

تیس پینتیس سال کے ایک خوش اخلاق شخص نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چند منٹ میں اس کی بیوی بھی آگئی۔ وہ ہمارے منتظر تھے۔ تعارف کی رسمی باتوں کے بعد محبوب کی بیوی نے فرح بھابی سے پوچھا۔ ''آپ کب میری کلاس فیلو تھیں... کچھ یاد نہیں پڑتا؟''

ظاہر ہے فرح بھابی نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ ''فائنل ایئر میں میری شادی ہو گئی تھی۔ میں نے امتحان نہیں دیا تھا۔''

اس نے مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ ''کیا کرتے ہیں آپ کے شوہر؟''

فرح بھابی مسکرائیں۔ ''یہ میرا بھائی ہے۔ میرے شوہر ایک اخبار میں کرائم رپورٹر ہیں۔''

''آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔''

فرح بھابی نے کہا۔ ''مجھے ایک لڑکی مہرین نسیم کے بارے میں کچھ پوچھنا تھا۔ دراصل اس کا رشتہ آیا تھا میرے بھائی کے لیے...'' خلافِ توقع فرزانہ نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ ''کون مہرین نسیم... نام سے کچھ یاد نہیں آیا۔''

فرح بھابی نے مایوسی کو چھپا لیا۔ ''وہ آپ کی سب سے عزیز سہیلی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے۔''

فرزانہ کے لہجے میں ناراضی آگئی۔ ''کس سے معلوم ہوا ہے؟ مجھے تو نام یاد نہیں۔ آپ کہتی ہیں رازدار سہیلی تھی۔''

''میں یونیورسٹی گئی تھی۔ آپ کی تین کلاس فیلوز ہیں وہاں۔ سب نے یہی کہا۔''

فرزانہ کا رویہ مزید درشت ہو گیا۔ ''معلوم نہیں ایسا کیوں کہا انہوں نے۔ میری ایک قریبی سہیلی سائرہ بانو تھی۔ میرا اس سے آج بھی ملنا جلنا ہے۔ مجھے کوئی مہرین یاد نہیں... آپ نے بلاوجہ زحمت کی... مجھے فون پر ہی بتا دیا ہوتا۔''

اس کے شوہر نے فوراً صورتِ حال کو سنبھالا۔ ''بھئی غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ فرزانہ کوئی اور ہو۔ چلو تم چائے لاؤ مہمانوں کے لیے۔ گولی مارو مہرین کو... میرا مطلب ہے اس کے ذکر کو۔'' اس نے منہ سے نکل جانے والے غلط الفاظ کا ردِعمل فوراً دیکھ لیا تھا۔

فرزانہ مستعدی سے اٹھی۔ ''مجھے تو افسوس ہے یہ اتنی دور سے آئے اور ہم ان کی مدد نہ کر سکے۔''

فرح بھابی کے ساتھ میں بھی اٹھ گیا۔ ''ہم یہاں چائے پینے نہیں آئے تھے۔''

فرزانہ نے بڑی محبت سے فرح بھابی کا ہاتھ پکڑا اور انہیں زبردستی بٹھا دیا۔ ''اگر میرا لہجہ آپ کو برا لگا تو میں معافی چاہتی ہوں لیکن آپ گھر آئے ہیں تو مہمان ہیں۔ چائے پیے بغیر کیسے جا سکتے ہیں۔''

محبوب نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹھیے جناب۔ کام تو ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے بتائیے کرتے کیا ہیں آپ؟''

آدھے گھنٹے بعد جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں نے کہا۔ ''فرح بھابی! آپ کا یقین آج کام نہ آیا۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ مجھے سچ اگلوانا آتا ہے۔''

فرح بھابی ہنسیں۔ ''سچ کا پتا چل جائے گا... کل۔'' انہوں نے اپنی مٹھی کھول کے دکھائی۔

یہ ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر کوئی نمبر لکھا ہوا تھا۔ ''یہ نمبر اس نے دیا ہے، فرزانہ نے؟''

''جی جناب... یا اس وقت محبوب صاحب خلافِ توقع موجود تھے یا فرزانہ کو بعد میں خیال آیا کہ شوہر کے سامنے سہیلی کے راز کھولنا نامناسب ہوگا۔ یہ نہ ہو وہ فرزانہ کے راز معلوم کرنے اس سہیلی کا پتا پوچھ لیں کہ جس لڑکی کا رشتہ آیا ہے وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے؟''

''ایسا کیا راز ہو سکتا ہے فرح بھابی؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''راز سب کے ماضی کا حصہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنی کہیں۔ کالج سے یونیورسٹی تک کیا صرف نمازیں پڑھتے رہے تھے؟'' وہ ہنسیں۔

مجھے فرح بھابی کی جاسوسی میں دلچسپی لاحاصل لگتی تھی۔ پہلے انہوں نے ہی مجھے حقائق کو تسلیم کرنے کا درس دیا۔ یہ کہا کہ مہرین کو میں زندگی کی ایک خوش گوار یاد اور ناخوش گوار حادثہ سمجھ کے بھول جاؤں۔ جیسے میں کوئی بچہ ہوں کہ سالگرہ پر ایک کھلونا ملے تو خوشی سے دیوانہ ہو جاؤں لیکن اگلی سالگرہ پر نئے کھلونے پر اتنی ہی خوشی مناتے ہوئے یاد بھی نہ کروں کہ پچھلا کھلونا کب ٹوٹا تھا اور کہاں پھینک دیا گیا تھا۔ وہ خود مہرین کے لاپتا ہونے کے مسئلے کو پولیس سے زیادہ سیریس لے رہی تھیں۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ میرے دل میں امید کا آخری دیا بھی روشن نہ رہے اور میں ایک نئی زندگی کی طرف اسی طرح پیش قدمی کروں جیسے مہرین کی طرف کی تھی۔

اگلے دو دن میں زارا کو بزنس کے اسرار و رموز سکھاتا رہا۔ کمپنی میں سب سمجھ رہے تھے کہ میری پروموشن کا راز کیا ہے لیکن وہ طنزیہ نظروں سے دیکھنے اور میری عدم موجودگی میں میری ''فروخت'' پر تبصرہ کرنے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ سامنے وہ مجھے باس کے برابر عزت و احترام دینے پر مجبور تھے اور آہ بھرتے تھے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے... کل تک ہمارے ساتھ بیٹھنے والا کمپنی کا مالک بننے جا رہا ہے۔ کوالیفکیشن کی بات نہیں ہے بھائی... بس دل آگیا ہے لونڈیا کا... زارا بہت باتونی تھی اور مجھے بتاتی رہتی تھی کہ اس نے لندن میں تعلیم کے علاوہ اپنا وقت کس قسم کی سرگرمیوں میں صرف کیا تھا۔ باپ کے نزدیک وہ غیراخلاقی ہوں گی مگر آدمی لندن جاتا ہے کیا اخلاق سیکھنے... اور جو زندگی کے تجربات وہاں حاصل ہوتے ہیں، کیا وہ یہاں ہو سکتے

ہیں؟ میں نے اس سے اتفاق کیا کیونکہ خود میں لندن میں بقول فرح بھابی کے "نمازیں نہیں پڑھتا رہا تھا۔" تاہم عام مردوں کی طرح میں سمجھتا تھا کہ لڑکیوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

زارا کی مجھ پر مہربانیوں کے ڈرون حملے بڑھتے جارہے تھے۔ لنچ پر حکم دے کر ساتھ لے جانا تو روز کا معمول تھا۔ ویک اینڈ پر یہ میری اخلاقی ذمے داری بن جاتی تھی کہ میں اسے ڈنر پر لے جاؤں۔ اس کے ملبوسات ہرگز ایک ڈی ایم ڈی کے عہدے کے شایانِ شان نہیں ہوتے تھے۔ وہ کسی ماڈل کی طرح آفس آتی تھی جیسے ریمپ پر کیٹ واک کرتی ہو۔ میں نے اسے سمجھایا بھی مگر اس نے کہا۔ "چھوڑو یہ دقیانوسی ضابطے۔ کام اہم ہے۔ لباس ہر شخص کی ذاتی پسند کا معاملہ ہے۔ تم ایمان داری سے بتاؤ۔ کیسی لگ رہی ہوں میں...؟" اب اس سوال کے دو جواب ممکن ہی نہیں تھے۔ بیوٹی فل کہنا تو لازم تھا۔ میں بُرا کہہ دیتا تو اگلے روز وہ مزید مختصر سامانی کے ساتھ آجاتی اور سوال پھر وہی ہوتا... اب کیا خیال ہے؟

ظاہر ہے پاپا یہ سب بہ نظرِ غائر دیکھ رہے تھے۔ یہ انہی کی مرضی اور منشا سے جو ہو رہا تھا۔ ان کا پلان کامیاب جارہا تھا۔ انگلش لٹریچر پڑھنے والی بے وقوف لڑکی کو سوچنا تھا کہ آگے اتنا بڑا بزنس چلانا ہے۔ خیر، اندھے کو لاٹھی مل گئی۔ ادھر میں محسوس کرتا تھا کہ آخری حد آنے والی ہے اور یہ منظر مجھے خوابوں میں بھی ڈراتا تھا کہ زارا حجلۂ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی ہے اور میں اپنا بھونپن بنا گا رہا ہوں... سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں میں... جس دن بالآخر پاپا نے سمجھا کہ فیصلے کی گھڑی آگئی اور مجھ سے کہا کہ چلو میاں، بسم اللہ... میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی... کیا قاضی کے سامنے میں کہوں گا "نہیں" اور اٹھ کے بھاگ لوں گا۔ نہیں... اس سے پہلے ہی مجھے ایک حوصلہ شکن، دل شکن اور عہد شکن رویّہ اختیار کرلینا چاہیے... لیکن پھر نوکری کا کیا ہوگا؟ جب مجھے کان سے پکڑ کے اور لات مار کے نکال دیا جائے گا۔ مجھ سے گاڑی بھی چھین لی جائے گی تو میں کہاں جاؤں گا اور کیسے؟

چوری چھپے میں نے دوسری جگہ ملازمت کی درخواستیں ارسال کی تھیں مگر جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ جواب آجاتا تب بھی میرا جانا غیر یقینی تھا کیونکہ قابلیت اور تجربے کے اعتبار سے مجھے اس کی ایک تہائی تنخواہ بھی نہیں مل سکتی تھی جو یہاں مل رہی تھی۔ رعب داب الگ تھا۔ مستقبل کا سارا راستہ ایوانِ صدر جانے والی سڑک کی طرح روشن نظر آتا تھا۔ مزید یہ کہ فرح بھابی مجھے الٹے راستے پر چلنے کے لیے دھکیلتی تھیں کہ زارا میں کیا خرابی ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ اور دولت مندی دیکھو تو کروڑوں میں ایک... تمہیں اور کیا چاہیے... افسوسناک بات یہ تھی کہ میری مزاحمت ہر طرف کی یلغار سے کمزور پڑ رہی تھی۔

پھر ایک دن رات کے وقت میں اپنے گھر پہنچا تو دروازے پر جیسے بم پھٹ گیا۔ وہاں دیوار سے ٹیک لگائے داڑھی اور ٹوپی والا ایک شخص بڑی مستقل مزاجی سے تشریف فرما تھا۔ میرے آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ روشن ہوتے ہی مجھ پر بجلی سی گری۔ یہ مہرین کا وہی ظالم چچا تھا۔ اس نے بڑی منافق مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں نے ہاتھ کی طرف دیکھے بغیر غرا کے پوچھا۔ "تم؟ کیا بات ہے... یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں مہرین سے ملنے آیا ہوں۔"

"وہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"لیکن میں اس کا چچا ہوں... وہ گھر میں ہوتی تو میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتی۔"

"ہاں، وہ تمہیں جوتے مار کے نکال دیتی۔ خیریت چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔"

وہ اڑ گیا۔ "تم مجھے اس سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔ وہ خود کہے گی تو میں چلا جاؤں گا۔"

مجھے تھوڑی سی پریشانی لاحق ہوئی۔ "دیکھو، وہ گھر میں نہیں ہے۔ وہ آئے گی تو خود تمہیں فون کرلے گی۔"

"تم مجھے اس کا فون نمبر دے سکتے ہو۔ موبائل کا یا گھر کا۔ آخر کب واپس آئے گی وہ؟"

"میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" میں نے غصے سے کہا۔

وہ اپنی جگہ کھڑا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتا رہا۔ "میں ابھی اگر چاہوں تو شور مچا کے سارا محلہ اکٹھا کرلوں کہ یہ شخص مجھے اپنی بیٹی سے نہیں ملنے دے رہا ہے۔"

"نہیں ہے وہ تمہاری بیٹی... تھوکتی ہے وہ تمہاری شکل پر... اور آئندہ ادھر مت آنا ورنہ گولی مار دوں گا تمہیں۔"

میں نے غصے میں اسے گالیاں دیں اور دھکا بھی دیا۔ یہ میری غلطی تھی۔ وہ نیچے گر گیا مگر پھر کراہتا ہوا اٹھا۔ اس نے مجھے بڑی خون آشام نظروں سے دیکھا اور کپڑے جھاڑتے ہوئے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے دھمکی دی کہ میں

نے اچھا نہیں کیا اور مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

میرا دماغ اندر جانے کے بعد چند منٹ میں ٹھکانے پر آگیا۔ بڈھے کے ساتھ یہ بدسلوکی میرے لیے سنگین مسائل بھی پیدا کرسکتی تھی۔ مہرین ملنے سے انکار کرتی وہ الگ بات تھی۔ میں اسے ملنے سے کیسے روک سکتا تھا؟ سگا باپ نہ سہی اس نے مہرین کو پالا تھا۔ یہ بات ساری دنیا جانتی تھی۔ اگر پولیس کے پاس جا کے اس نے میری شکایت کی تو... غصے میں اور اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مجھے اپنے داماد پر شک ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے۔ اس نے گھر بھی بدل لیا ہے اور آج کل وہ کمپنی کے مالک کی بیٹی کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے۔ او مائی گاڈ! میں نے مولا جٹ کو فون کرکے یہ سب بتایا۔

"یار، میں ایک رپورٹ فائل کرکے بات کرتا ہوں۔ یہ ارجنٹ ہے۔" وہ بولا۔

لیکن چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے فرح بھابی کا فون آگیا۔ "دیور جی! یہ کیا مسئلہ کھڑا کرلیا آپ نے اپنے لیے؟"

"بس بھابی... غصے میں ہوگیا۔ اچانک اس کی شکل دیکھ کے قابو نہیں رہا۔"

"دیری بیڈ! اتنا سمجھاتی ہوں کہ جذبات سے نہیں عقل سے کام لینا چاہیے۔"

"بھابی! سب آپ جیسے ہوتے تو دنیا میں اتنا خون خرابا کیوں ہوتا... یہ بتائیں اب کیا کروں؟"

"یہ تو وہی لطیفے والی بات ہے۔ اب تو جو کرنا ہے شیر کو کرنا ہے۔ شکاری کو نہیں۔ ویٹ اینڈ سی۔"

"اگر وہ سچ مچ پولیس کے پاس چلا گیا؟"

"اب وہ پولیس کے پاس ضرور جائے گا۔ آپ اپنا جواب سوچیں کہ کیا کہیں گے۔ میں ان سے کہتی ہوں معلوم کریں۔"

مولا جٹ نے مجھے آدھے گھنٹے بعد یہ روح فرسا خبر سنائی۔ "بڈھا تھانے میں بیٹھا ہے اور رپورٹ لکھوانے پر بضد ہے۔ الزامات بہت عائد کیے ہیں اس نے۔ تم نے مہرین کو مار کے لاش کہیں غائب کردی ہے۔ جب گمشدگی کی رپورٹ موجود ہے تو پولیس نے ابھی تک کارروائی کیوں نہیں کی؟ اس لیے کہ وہ بڑا آدمی ہے؟ اس نے بھاری رشوت دے کر معاملے کو دبا دیا ہے یا اس کے نئے ہونے والے سسر نے؟"

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ "یہ سب کہا ہے اس خبیث نے؟"

"اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا۔ بڑی آسانی سے تو اسے ٹال سکتا تھا اُلّو کے پٹھے۔ تیرے غصے نے کام خراب کیا۔"

"یہ بتا اب میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔ تھانے والے ایسے رپورٹ کہاں لکھتے ہیں اور اب تو میں نے بھی روک دیا ہے۔ وہ ڈرا دھمکا کے بھگا دیں گے۔ پاگل قرار دے کر یا کوئی کیس ڈالنے کی دھمکی دے کر۔ لیکن جمال پتر! زمانہ خراب ہے اور اسے خراب کیا ہے ہم نے۔ میڈیا والوں نے خبر کے چکر میں۔ وہ چلا گیا کسی اخبار کے دفتر میں تو تیرا کونڈا... وہ ایک کی دو لگا کے شائع کریں گے۔ کوئی چھوٹا موٹا چینل اسے پیش بھی کرسکتا ہے۔ تیری ایف آئی آر کے ساتھ۔ الزام پولیس کی نااہلی پر آئے گا کہ انہوں نے کیس کو دبایا اور تفتیش نہیں کی۔ اگر تو خود جا کے اسے منالائے... تو ہم اسے وقتی طور پر ٹال سکتے ہیں۔"

"وقتی طور پر؟"

"ظاہر ہے... ابھی تو دفع ہو وہ... وہ تیری بھابی سے قائل ہوسکتا ہے۔ یہ نہ تیرے بس کی بات ہے نہ میرے۔"

"یار! یہ شیطان اچانک کیسے نازل ہوگیا؟ اتنے عرصے بعد بیٹی کا باپ بن کے..."

"میری جاسوس بیوی کہتی ہے کہ اچانک کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کوئی پلان رکھتا ہے۔ اسے مہرین کے لاپتا ہونے کی خبر مل گئی ہوگی کسی سے۔ اسے موقع ملا بدلہ لینے کا۔"

"اب وہ مجھے جیل بھجوائے گا یا پھانسی کے تختے پر پہنچائے گا؟"

مولا جٹ ہنسا۔ "اس سے کیا ملے گا اسے... جانتا وہ بھی ہوگا کہ اس کیس میں تیرا جرم ثابت کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ عام مقدمات میں سالوں لگ جاتے ہیں جن میں عام آدمی ملوث ہوتا ہے۔ تُو عام آدمی نہیں رہا... چاند پر تھوکو تو منہ پر آتا ہے۔ یہ پرانی کہاوت آج بھی درست ہے۔ بالآخر وہ خود مارا جائے گا۔ وہ تو صرف تیرے لیے پریشانی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قانون کی دھمکی دے کر اور بدنامی سے ڈرا کے۔ وہ تجھے بلیک میل کرنے آیا ہے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "یار مولا جٹ... صحیح سمجھا تو۔"

"ہاں، بیوی نے سمجھایا اور میں نے سمجھ لیا۔ سمجھدار شوہر ایسے ہی کرتے ہیں۔ تھانے والوں سے میں نے کہا ہے

کہ اسے روک کے رکھیں۔ واپسی پر میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اپنے گھر۔ وہاں سہ فریقی کانفرنس میں ڈیل ہو جائے گی۔"

"تو نے میری آدھی فکریں دور کر دیں۔"

"باقی آدھی بھی دور ہو جائیں گی بیٹے... تو پہنچ میرے گھر۔ میں اسے لے کے آتا ہوں۔" مولا جٹ نے فون بند کر دیا۔

جب میں اس سے بات کر رہا تھا تو درمیان میں بار بار کوئی کال موصول ہونے کا سگنل آ رہا تھا۔ مولا جٹ کو ڈس کنکٹ کرتے ہی فون پھر بول پڑا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ یہ زارا کی کال تھی۔ "اتنی لمبی گپ شپ کس سے چل رہی تھی؟"

"گپ شپ کہاں... ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے خوامخواہ۔"

"کیسا مسئلہ... تم تو خاصے پریشان لگتے ہو۔" وہ بولی۔

اس کے اصرار پر مجھے مہرین کے چچا کی آمد کے بارے میں سب بتانا پڑا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ گھبراتے کیوں ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود فکرمند ہو گئی ہے۔ اور میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب میں باہر نکلنے کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اسی وقت دوسری گاڑی اندر آئی جسے باس چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ زارا تھی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ باس میرے گھر آیا تھا اور وہ بھی اپنی بیٹی کے ساتھ۔ میں انہیں اندر لے گیا۔

باس سیدھا اصل معاملے پر آ گیا۔ "مجھے اس بڈھے کے بارے میں بتاؤ۔ زارا! تم کافی بنا کے لاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ملازمہ بنا لائے گی۔"

"زارا سے اچھی کافی دنیا میں کوئی نہیں بنا سکتا... یہ میں مانتا ہوں... جاؤ زارا۔"

کسی فرماں بردار مشرقی روایات کے مطابق پرورش پانے والی بیٹی کی طرح زارا نے کچن کا رخ کیا۔ ایک اور زاویے سے اس نے بھی "مالکن" ہونے کا استحقاق حاصل کیا۔ آخر یہ میرا گھر ہے۔ تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ ظاہر ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں پاپا کو مہرین کے ظالم چاچا کی خونچکاں داستانِ ظلم و ستم سناتا رہا۔ وہ تمام واقعات خوب مرچ مسالا لگا کے بتاتا رہا جن میں مہرین پر کیے جانے والے تمام مظالم اور حق تلفی کا ذکر تھا۔ یہ سب زارا نے بھی فرمائش پر دوبارہ سنا۔ جب وہ کافی بنا رہی تھی تو ابتدائی واقعات کی رپورٹ اس نے مس کر دی تھی۔

ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولا جٹ کا فون پھر آ گیا۔ "تو گھر میں ہی بیٹھا ہے ابھی؟"

"سوری یار! کچھ مہمان آ گئے تھے۔" میں نے باس اور زارا کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔

"چل تو ان کی خاطر مدارات کر... تو گھر جاتا تو کوئی نہ ملتا۔ صرف بچے ہیں گھر میں۔"

"کیوں... فرح بھابی کہاں گئیں؟"

"وہ ہوا یوں کہ اس نے پھر مجھے فون کر کے کہا کہ مہرین کے چاچا کو تم اپنے ساتھ لے آؤ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جمال بھائی کے سامنے بات نہ کرے۔ ہم نفسیات میں تھے اس سے۔ میں جورو کا غلام تھانے گیا۔ اس سے کہا کہ میں مہرین کی ایک عزیز سہیلی کا شوہر ہوں۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ پتا نہیں وہ مجھ سے ڈر گیا یا میری موٹر سائیکل سے۔"

"دونوں ہی خطرناک ہیں۔ میں خود کلمۂ شہادت پڑھ کے بیٹھتا ہوں۔"

"اس نے انکار کیا تو میں نے پھر فرح کو بتایا۔ وہ کہنے لگی کہ اچھا تم ٹھہرو، میں آتی ہوں۔ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ آتی ہی ہوگی بلکہ آ گئی۔"

"مجھے بتانا اگر معاملات طے ہو جائیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم آج رات یہاں نہ رہو۔" باس نے پوری رپورٹ سن کے فرمایا۔

میں نے ہنس کے کہا۔ "سر! باہر مسلح سیکیورٹی گارڈ کھڑا ہے۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

"گن ہے تمہارے پاس؟ نہیں ہے تو یہ رکھ لو۔" انہوں نے جیب میں سے ایک بہت قیمتی قسم کا ریوالور نکالا۔

میں نے صاف انکار کر دیا۔ "آپ بلاوجہ پریشان ہیں۔ نہ مجھے کسی کو مارنا ہے اور نہ ریوالور چلانا آتا ہے۔"

"تمہیں رکھنا چاہیے۔ حالات دیکھ رہے ہو۔ اغوا برائے تاوان کو بھی بزنس بنا لیا ہے دہشت گردوں نے... اور تم اب عام آدمی نہیں ہو۔ لائسنس کا بندوبست ہو جائے گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"تمہیں پاپا کی بات مان لینی چاہیے۔" زارا نے کہا۔

"اوکے، آپ کا بھی یہی حکم ہے تو..." میری بات پھر فون بجنے سے ادھوری رہ گئی۔

مولا جٹ نے کہا۔ "تیرے مہمان گئے؟"

میں نے کہا۔ "ابھی نہیں۔ تو بتا اس سے بات ہوئی؟"

"ہاں، وہ تو بہت بودا ثابت ہوا فرح کے سامنے... جب تیرے جیسے بیٹھ جاتے ہیں جھاگ کی طرح تو وہ بڈھا کیا کرتا... مان گیا پانچ لاکھ میں۔ مان لیا کہ اسے ضرورت تھی۔ مہرین کے بارے میں پتا چلا تو اسے خیال آیا کہ تجھ سے بات کر کے دیکھے۔ پلان اس کا وہی تھا جو اسے کسی نے سمجھایا ہوگا۔ پولیس کچھ نہ کرے تو پریس کلب کے سامنے بھوک ہڑتال پر بیٹھ جانا۔ چینل والے خود ہی آ جائیں گے۔ فرح بھی کم نہیں ہے۔ اس سے کہا کہ بڑے میاں! فرض کرو ہم کیس کر دیں تم پر کہ تم نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے مہرین کو اغوا کیا اور قتل کرنے کے بعد آ گئے جمال کو بلیک میل کرنے... پھر کیا ہوگا؟ اس کی سٹی گم ہو گئی... منت سماجت پر آ گیا کہ بیوی مر گئی ہے۔ بیٹا ذہنی مریض ہے۔ مکان بیچ کے کرائے کے مکان میں گیا تھا۔ اب کرایہ دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔ فرح نے پوچھا کہ ایک سال میں وہ پیسا اڑ دیا جو مکان بیچ کے ملا تھا؟ تو رونے لگا کہ بیوی کے گردے فیل ہو گئے تھے۔ میرا گردہ بے کار تھا۔ بیٹے کا زبردستی کیسے لیتا۔ گردہ خریدا مگر فائدہ نہیں ہوا... وہ مر گئی۔ سارا پیسا نکل گیا۔ میں کمانے کے قابل ہوں نہیں... خیر یار! وہ ایک لاکھ ہی لینے کو تیار ہے۔ کل آئے گا تیرے پاس۔ اسے ایک لاکھ دے دینا۔ ابھی میں چیک دے رہا ہوں۔"

میں نے فون بند کر کے باس سے کہا۔ "سوری... وہ معاملہ ختم ہو گیا ایک لاکھ میں۔"

"ایک لاکھ میں... کیسے؟" باس نے پوچھا۔

میں نے وہ سب بتا دیا جو مجھے مولا جٹ نے بتایا تھا۔

"وہ مجھ سے کہہ دیتا... بے وقوف آدمی۔"

"اگر تم نے یقین کر لیا کہ بات ختم ہو گئی۔" باس مسکرائے۔ "تو تم بے وقوف ہو۔ یہ بلیک میلرز کے اصول کے خلاف ہے کہ وہ آمدنی کے کسی ذریعے سے فائدہ نہ اٹھائیں... زندگی بھر۔"

زارا نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔ "جمال! کیسے یقین کر لیا تم نے کہ وہ سچ بول رہا تھا... تصدیق کیے بغیر؟"

باس اٹھ کھڑے ہوئے۔ "یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

میں نے کہا۔ "سر! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے ہی ہینڈل کرنے دیں۔"

باس ہنستے ہوئے بولے۔ زارا نے ناگواری کا اظہار یوں کیا کہ آدھ گھنٹے کے اندر میں گاڑی میں جا بیٹھی لیکن میں

نے اپنی بات پر قائم رہنا مناسب سمجھا۔ ان کے جانے کے بعد میں سکون سے سو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اگلے دن مجھے زارا کو منانا پڑے گا لیکن وہ آفس آئی تو اس کا موڈ بالکل ٹھیک تھا۔ واپسی پر میں مولا جٹ کی طرف گیا۔ "آپ کا شکریہ میں کیسے ادا کروں؟"

"شکریہ کس بات کا... وہ بڈھا تو آیا ہی نہیں۔"

"نہ آئے، جہنم میں جائے۔" میں نے انہیں ایک لاکھ کا بیئرر چیک پیش کیا۔

"اسے رکھیں اپنے پاس... اس نے ہمارا بھی چیک لینے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید ڈرتا تھا کہ پھنس نہ جائے۔ میں نے کہا کہ اچھا صبح نقد لے لینا۔ اپنے گھر کا پتا بھی سمجھا دیا تھا۔ سارا دن میں انتظار کرتی رہی کیش کے ساتھ۔"

"آپ نے اسے جوابی دھمکی دی تھی۔ پانچ لاکھ سے وہ ایک لاکھ پر آ گیا تھا۔ شاید ڈر کے بھاگ گیا۔ دفع کریں۔ میرے لیے کھانا لگوائیں۔"

"میرا خیال ہے اس نے سب جھوٹ بولا۔ میں نے اس سے دو چار سوال ہی کیے تھے کہ بیوی کے گردے فیل ہوئے تو وہ کہاں لے گیا تھا اسے۔ کس ڈاکٹر نے دیکھا تھا۔ ڈائیلاسس کا نام نہیں سنا تھا اس نے... نہ وہ اسپتال کا بتا سکا۔ واپسی پر مجھے خیال آیا کہ میں نے جو بات اس کو ڈرانے کے لیے کہی تھی، وہ سچ بھی تو ہو سکتی ہے۔"

میں چونکا۔ "کیا مطلب؟"

"ہو سکتا ہے دیور جی کہ اس نے خود مہرین کو قتل کیا ہو۔ ایسے چونکنے کی ضرورت نہیں۔ ہر قتل کے پیچھے وجہ ہوتی ہے۔ یعنی MOTIVE اس کے پاس دو تھے۔ ایک انتقام کا... دوسرا بلیک میل کرنے کا... آخر اتنے یقین کے ساتھ وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ داماد نے میری بیٹی کو مارا اور لاش غائب کر دی؟ اسے کیوں یقین تھا کہ لاش نہیں مل سکتی؟ اس لیے کہ یہ کام تو اس نے خود کیا تھا۔ مہرین کو بھی تو سزا دینا تھی اور مستقبل کے خطرے سے جان بھی چھڑانا تھی کہ وہ پھر کہیں اپنا حق مانگنے نہ آ جائے۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ بلاشبہ فرح بھابی پاکستان کے بجائے لندن میں ہوتیں تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والے ان کی سراغ رسی کی خداداد صلاحیت سے بھرپور استفادہ کرتے... یہاں میرے یار مولا جٹ کے سوا اس کی قدر کرنے والا کون تھا۔ وہ ایک عام ہاؤس وائف تھی جو پوری طرح اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت کے لیے وقف تھی۔

"کیا اب آپ تصدیق فرمانے بھی جائیں گی...

گڑے مردے اکھاڑنے۔۔۔ پتا چلائیں گی کہ اس نے مہرین کو مارا تو اس کی لاش کہاں اور کیسے غائب کی؟"

فرح بھابی نے غور سے مجھے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ "نہیں۔۔۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔" انہوں نے اب پرزور دیا۔

میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ "دیکھ لیں، اب میں بھی نفع نقصان کی بات کرنے لگا ہوں۔ غیر جذباتی ہو کے۔"

انہوں نے کھانے کی میز پر کہا۔ "آج میں نے موقع پا کے فرزانہ سے بات کی۔ جس کے گھر گئے تھے ہم۔"

"میں تو بھول ہی گیا تھا اسے۔"

"میں نہیں بھولی تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔"

"ایسی کیا بات تھی فرح بھابی؟"

"وہ ایسی ہی بات تھی۔ یہ لڑکی فرزانہ اور مہرین ایک دوسرے کی رازدار بلکہ شریک کار تھیں۔ مہرین کے حسن نے کالج میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ چاہنے والے اس کی راہ میں دل بچھائے کھڑے رہتے تھے۔ فرزانہ اس کی مشیر تھی۔ اس نے مہرین کو پٹی پڑھائی کہ فائدہ اٹھائے۔ دو چار کھاتے پیتے گھرانوں کے شوقین مزاج لڑکوں میں سے انہوں نے ایک کو چن لیا۔ اس کی گاڑی میں گھومنا پھرنا۔۔۔ کھانا پینا عیش کرنا مگر کسی کے جال میں نہ پھنسنا۔۔۔ محافظ کے طور پر مہرین اسے ہر جگہ ساتھ لے جاتی تھی۔ وہ کباب میں ہڈی بنی رہتی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق کئی لڑکے ان پر ہزاروں لٹا کے بھی مہرین کے ساتھ تنہائی کے ایک لمحے سے بھی محروم رہے اور مایوس ہو کے میدان چھوڑ گئے۔ لیکن وہ تھرڈ ایئر میں تھی کہ شامتِ اعمال نے اسے پھنسا دیا اور فرزانہ کو بھی۔ وہ دیکھنے میں بڑا معصوم اور شریف تھا لیکن اس کی رگوں میں کسی وڈیرے کا ضدی خون تھا۔ اس نے دونوں کو ایک ہوٹل سے اٹھوایا۔ کسی ریسٹورنٹ سے۔۔۔ مالک، منیجر اور ویٹر سب اس کے اپنے آدمی تھے۔ اگر معاملہ آگے بڑھتا تو نہ کوئی گواہی دیتا اور نہ کسی پر حرف آتا۔"

میں بے وقوفوں کی طرح فرح بھابی کو دیکھتا رہا۔

"اغوا کرنے والے انہیں کہاں لے گئے؟"

"جہاں لے جانے کا حکم تھا۔ فرزانہ آج بھی نہیں جانتی کہ وہ کیا جگہ تھی جس گاڑی میں انہیں لے جایا گیا۔ وہ لینڈ کروزر یا پراڈو قسم کی تھی اور اس کے شیشے سیاہ تھے۔ اس میں سے باہر نظر نہیں آتا تھا اور نہ دروازے اندر سے کھولے جا سکتے تھے۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے گن مین جیسے گونگے بہرے تھے۔ ان پر دونوں کی آہ و زاری اور منت سماجت کا اتنا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا جتنا کسی پتھر کی مورت پر ہوتا۔ انہوں نے دونوں لڑکیوں کو ایک کوٹھی میں پہنچا دیا۔ وہاں مہرین کا پرستار اس کا نیا شکار موجود تھا۔ ان کی ساری شوخی طراری دھری رہ گئی۔ اس نے صاف کہا کہ وہ کوئی کھیل نہیں کر رہا تھا اور نہ بے وقوف تھا۔"

"آپ نے اس کا نام نہیں پوچھا؟"

"وہ راجن پور یا مظفر گڑھ کے کسی گدی نشین کا نواسا تھا۔ اس کے نانا اپنے حلقے کے بااثر سیاست دان بھی تھے اور بہت اثر رسوخ والے آدمی تھے۔ ان کے بعد یہ سیٹ اور گدی مخدوم فقیر حسین کی تھی۔ وہ اطوار و عادات سے بالکل مختلف لگتا تھا۔ اس کے مزاج میں انکساری تھی اور وہ اچھا خاصا مصور تھا۔ چنانچہ یار دوست اسے ایم ایف حسین کہتے تھے جو انڈیا کا عالمی شہرت رکھنے والا مصور تھا۔ نہ اس نے کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا اور نہ اطوار سے وہ ایسا لگتا تھا۔ خیر، اس کوٹھی میں فقیر حسین نے صاف الفاظ میں مہرین کو بتا دیا کہ اس کا کھیل ختم ہوا۔ اسے معلوم ہے ان دونوں نے کس کس کو بے وقوف بنایا تھا مگر وہ کسی اور کی بے وقوفی کا ذمے دار نہیں۔ وہ مہرین کو پسند کرتا ہے اور مہرین اسے بے وقوف نہ سمجھے۔ اسے آج فیصلہ کرنا ہے۔ اس کے بغیر وہ نہیں جا سکتی۔ اس کا پروپوزل یقیناً واضح تھا۔ وہ مہرین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ابھی اور اسی وقت۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی قصہ مختصر۔۔۔ مہرین کا اس سے نکاح ہوا۔"

میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں نے غلطی سے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ "نکاح؟"

"ہاں، مہرین کے پاس انکار کی گنجائش نہ تھی۔ فرزانہ اس نکاح میں موجود تھی۔ نکاح خواں، گواہ سب وہیں آ گئے۔ فرزانہ اپنے انجام کے خیال سے لرز رہی تھی کیونکہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا کھیل اسی کے مشورے سے شروع کیا گیا تھا۔ وہ دہشت زدہ تھی کہ نہ جانے اس جرم کی اسے کیا سزا دی جائے گی لیکن خلافِ توقع ایم ایف حسین نے اسے جانے دیا۔ یہ کہنے کے بعد کہ پھر کسی کے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلے۔"

"آپ کے خیال میں فرزانہ نے سچ بولا؟"

"اس کی تصدیق ممکن نہیں۔ سوال میرے ذہن میں صرف یہ ہے کہ اسے یہ کہانی سنانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم تو مایوس ہو کے واپس آ گئے تھے۔ کیا مجبوری تھی کہ اس نے مہرین کے بارے میں سچ بتایا یا جھوٹ بولا؟ معاملہ صرف رشتے کا تھا۔ وہ کیوں چاہتی تھی کہ مہرین کا یہ رشتہ نہ ہو۔ ظاہر ہے کسی لڑکی کے بارے میں ایسی کوئی کہانی سامنے آئے تو رشتے کی بات وہیں ختم۔۔۔ جھوٹ سچ کی تصدیق کے چکر میں کوئی نہیں پڑتا۔ لڑکی کے معاملے میں افواہ یا دشمنی پر مبنی خبر بھی رشتہ مانگنے والوں کو بھگا دیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ ایم ایف حسین اب کہاں ہے؟"

"ہوگا اپنے نانا کے علاقے میں۔ اس کی ماں کی شادی باپ کی موت سے ختم ہوئی تھی اس لیے وہ میکے آ گئی تھی۔"

"گویا مہرین کا وہ پہلا شوہر تھا؟"

"اگر نکاح ہوا تھا تو، یقیناً تھا۔ فرزانہ کو نہیں معلوم کہ نکاح کے بعد وہ کتنے دن ایم ایف حسین کے ساتھ رہی تھی اور اس نے یہ بات کیسے چھپائی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی تھی اور فرزانہ کو بتایا تھا کہ وہ سب ڈراما تھا۔ جیسے اسے چھوڑ دیا گیا تھا ایسے ہی ایم ایف حسین نے اسے بھی واپس گھر پہنچا دیا تھا۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانتا ہے۔"

میرا دماغ اب اس صدمے کے ابتدائی اثرات سے سنبھل گیا تھا۔ "میں نہیں مان سکتا کہ مہرین نے نکاح پر نکاح کیا مجھ سے۔"

فرح بھابی مجھے دیکھتی رہیں۔ "ہاں، ایسا کوئی عورت نہیں کر سکتی۔"

"یعنی آپ بھی مانتی ہیں کہ فرزانہ نے جھوٹ بولا؟" میں نے کہا۔

"اتنا بڑا جھوٹ کوئی عورت بلاوجہ کیسے بول سکتی ہے؟ خود سوچیں اس میں کچھ حقیقت ضرور ہوگی کیونکہ اس نے خود اپنا نام بھی اس کہانی میں شامل کیا ہے۔ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس نے خود کو بچایا۔ جھوٹ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عزت بچا کے نکل آئی تھی جبکہ سزا دونوں کو ایک جیسی ملی ہوگی۔ دونوں نے اپنے اپنے جرم کی سزا بھگتی اور واپس آ گئیں۔"

"میں نہیں مانتا۔"

"نہ مان کے کیا کریں گے؟ ایم ایف حسین سے ملیں گے؟ اس سے پوچھیں گے کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا؟ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔۔۔ جب مہرین ہی نہیں رہی۔"

"بھابی! اس عورت فرزانہ نے میری زندگی میں زہر گھولا ہے۔ میں اس کی زندگی میں زہر بھر دوں گا۔ اس کے شوہر کو وہ سب بتا دوں گا جو اس نے آپ کو بتایا۔"

فرح بھابی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اور اس سے جناب کو کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے جھلا کے کہا۔ "یہ کیا فائدے اور نقصان کی ڈفلی بجا رہی ہیں آپ۔۔۔ کیا سمجھ رکھا ہے مجھے آپ نے؟"

"جو مجھے سمجھنا چاہیے۔ ایک بات بتائیں دل پر ہاتھ رکھ کے۔۔۔ ایمان داری سے سچ سچ۔۔۔ اگر اب مہرین واپس مل جائے۔۔۔ وہ خود آ جائے یا آپ اسے ڈھونڈ نکالیں۔۔۔ تو کیا اس کے لیے آپ کے جذبات وہی ہوں گے جو پہلے تھے؟ فرض کریں آپ جاتے ہیں اس کے پاس۔۔۔ ایم ایف حسین کے پاس۔۔۔ اور وہ تصدیق کر دیتا ہے کہ ہاں مہرین میرے پاس ہے۔۔۔ کیونکہ وہ بیوی پہلے میری ہے۔"

"آپ پاگل کر دیں گی مجھے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"جواب دیں مجھے دیور جی! آپ کیا کہیں گے کہ نہیں وہ میری بیوی ہے۔ مجھے واپس کرو۔ واپس لے آئیں گے اسے؟"

"آپ ناممکن کو ممکن ثابت کرنے پر تلی ہیں۔ مہرین نکاح پر نکاح کیسے کر سکتی ہے اور پھر شوہر اسے کیسے لے جا سکتا ہے؟"

"دیکھیں، وہ دوسری طرح کا معاشرہ ہے۔ وہاں عورت بس عورت ہے۔ کار یا فرنیچر کی طرح استعمال کی چیز۔ ذاتی پراپرٹی۔ اگر اسے اتنی ہی پسند ہوگی تو رکھ بھی سکتا ہے لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ اسے اپنے جرم کی سزا مل چکی ہوگی۔ مت پڑیں اس چکر میں ورنہ جان سے بھی جائیں گے۔"

فرح بھابی کی آواز میرے کانوں میں باہر تک آتی رہی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس آواز کی بازگشت میں ساری رات سنتا رہا۔ فرزانہ نے ایسا خطرناک سچ کیوں بولا جس میں خود اس کا نام بھی شریکِ جرم کی حیثیت سے آتا تھا؟ اگر اس کے شوہر کو معلوم ہو جائے تو وہ کیسے ثابت کرے گی کہ جو سزا مہرین کو ملی تھی، وہ اس سے محفوظ رہی تھی؟ وہ صرف مہرین کا نام لے کر بتا سکتی تھی کہ اس قسم کی بات میں نے سنی تھی۔ دروغ برگردن راوی۔۔۔ شاید اسے یقین تھا کہ اس کے بعد مہرین میری زندگی کی کہانی سے آؤٹ ہو جائے گی ہمیشہ کے لیے۔ ہم اس رشتے کی بات یہیں ختم کر دیں گے۔ بعد میں کون اتنی لمبی تفتیش کے چکر میں پڑتا ہے۔

اگر یہ جھوٹ تھا تو اس کی تصدیق بہت مشکل نہ تھی۔ میں سیدھا ایم ایف حسین کے پاس جا کے معلوم کر سکتا تھا۔ ایسا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن لگتا تھا۔ کوئی بھی عورت ایسا نہیں کر سکتی کہ ایک نکاح کو نظر انداز کر کے دوسری شادی کر لے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایم ایف حسین نے سزا کے طور پر اس سے شادی کی۔ اسے ایک رات اپنے پاس رکھا اور صبح طلاق

دے کر آزاد کر دیا کہ اب تم جا سکتی ہو۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں رہا... بس... یہ ممکن ہے۔

لیکن ساری رات کے اس پاگل پن کا نتیجہ وہی دو سوال تھے۔ فرزانہ کی بات سچ ہوئی تو دوبارہ ملنے پر مہرین کو میں اپنی زندگی میں وہی جگہ دے سکوں گا جو اب تک تھی؟

اور اگر یہ جھوٹ ہوا تب بھی کیا مجھے مہرین کی کوئی وضاحت قبول ہوگی کہ وہ مجھے بتائے بغیر خاموشی سے کہاں چلی گئی تھی اور کیوں؟

دونوں کا ایک ہی جواب تھا... نہیں۔ دو متوازی خطوط میں سے ایک کی سمت میں فرق آجائے تو خواہ یہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو... فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آنے والی دوری کو کم کرنا ناممکن بات ہے۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا لیکن میں جینا چاہتا تھا... پاگل ہو کے مرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ برین ٹیومر تھا جسے سرجری سے نکال دینا زندگی کی ضمانت تھی۔ خواہ یہ آپریشن کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو... مجھے مہرین کی محبت کو برین ٹیومر نہیں بنانا ہے۔ دیٹ از دی اینڈ آف دی اسٹوری۔

میں رات بھر کی ذہنی اور جسمانی اذیت سے نڈھال تھا اور عام حالات میں شاید آفس نہ جاتا۔ لیکن اس خیال سے تیار ہونے لگا کہ گھر پر رہنا کسی صورت بہتر نہیں۔ اب مجھے مہرین کو بھولنا تھا اور اس کے لیے خود کو اتنا مصروف رکھنا تھا کہ مہرین کے خیال کو جگہ ہی نہ ملے۔ جہنم میں جائے فرزانہ اور وہ ایم ایف حسین... مہرین کا چچا اور مہرین کی سب یادیں۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک سال کو بھی مجھے زندگی سے اسی طرح نکال پھینکنا ہے جیسے سرجن دماغ سے برین ٹیومر کی جڑوں کو نکالتا ہے۔ مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے اور بس... وہ ساری دنیا کو کتنا روشن نظر آتا ہے۔ پھر میں کیوں اپنے ماضی کی تاریک قبروں کے کھنڈر میں رہوں؟

دس بجے میں نکلنے ہی والا تھا کہ مولاجٹ آگیا۔ میں نے کہا۔ ”تو اس وقت سوتا ہے۔“

”ہاں، میں کچھ دیر سو لیا تھا۔ رات دو بجے گھر پہنچا۔“

”میں ڈیڑھ بجے تک وہیں تھا۔“

”مجھے بتایا فرح نے۔“ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میں نے سوچا صبح بات کریں گے۔“

”یار! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ فرح بھابی کی بات بالکل ٹھیک ہے۔“

”کون سی بات... فرزانہ کی اسٹوری؟“

”ہاں، کوئی ضرورت نہیں مجھے تلاشِ حق کے سفر میں زندگی خراب کرنے کی۔ مہرین گئی تو گئی... اس کا واپس آنا محال ہے اور مجھے کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔“

”یہ کام میں کر سکتا ہوں بعد میں... تاکہ کسی کانٹے کی خلش بھی نہ رہے۔ ذہنی سکون کے لیے یقین اچھا ہوتا ہے۔“

”ابھی یہ مشکل تو ہوگا لیکن مہرین اچانک آجائے تو میں اسے کہہ سکتا ہوں کہ اب ہماری زندگی کے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے، یہ ناممکن ہے... مگر وہ آئے گی نہیں۔“

”اس وقت تیرے پاس آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔“ مولاجٹ نے جماہی لی۔ ”پرسوں رات ایک حادثہ ہو گیا۔“

”حادثہ؟ کس کے ساتھ؟“

”مہرین کا چچا ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔“

میں کچھ دیر اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ”پرسوں رات... تم اسے ملے تھے... تم اور فرح بھابی۔“

”ہاں، میں اس سے ملا تھا ایک بجے... فرح آئی تھی ڈیڑھ بجے۔ ہماری گفتگو تھانے کے باہر ہوئی تھی۔ وہ پتا نہیں کیوں اتنا ڈرا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کے بات نہیں کی جیسے ہم اسے اغوا کر کے لے جائیں گے۔ تمہارے پاس سے اٹھ کر وہ سیدھا تھانے نہیں گیا تھا۔ وہاں وہ شام چار بجے پہنچا تھا۔ درمیان میں وہ کہاں رہا... کسی کو نہیں معلوم۔“

”کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وکیل کے پاس گیا ہو؟“

”ہاں اور وکیل نے اسے مشورہ دیا ہوگا کہ پہلے تم پولیس میں رپورٹ تو درج کراؤ۔ پولیس نے اسے روکے رکھا۔ میرے کہنے پر۔ اس سے بات کرنے کے بعد ہم گھر چلے گئے تھے۔ غالباً دو بجے کے بعد کسی نے اسے مار دیا۔“

”کس نے مار دیا... کار، بس، ٹرک...“

”وہاں رات دس بجے کے بعد ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور دیکھنے والا تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اسے ایک کار نے مارا۔ سی گرین ہنڈا اکارڈ۔“

میں چونکا۔ ”سی گرین اکارڈ؟“

”ہاں، سوک تو یہاں بہت ہیں۔ اکارڈ خال خال نظر آتی ہے۔“

”سی گرین اکارڈ تو... باس کی بھی ہے مگر یہ کس نے بتایا؟“

”ایک بند دکان کے تھڑے پر دو نشے بیٹھے تھے۔ معلوم نہیں کون تھے اور کیا کر رہے تھے۔ تھے دونوں ہوشیار... انہوں نے حادثہ دیکھا... ان کے بیان کے

مطابق وہ بوڑھا بالکل کنارے پر چل رہا تھا کہ گاڑی مخالف سمت سے آئی۔ بڑھا اپنے بائیں ہاتھ پر تھا لیکن فٹ پاتھ پر نہیں تھا۔ سامنے سے آنے والی گاڑی نے ایک دم رخ بدلا اور دائیں جانب جا کے بڈھے کو ناک آؤٹ کیا۔ پھر رخ بدلا اور اپنے ہاتھ پر آکے سیدھی نکل گئی۔ اس وقت سڑک پر آگے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ظاہر ہے بڈھا وہیں پھڑک کر مر گیا۔ یہ چند سیکنڈ کا خونی ڈراما تھا۔ لڑکے ہمت والے تھے یا ان پر حادثے کا اثر زیادہ تھا۔ وہ تھانے چلے گئے۔ تھانہ وہاں سے ایک کلومیٹر بھی نہیں تھا۔ انہوں نے ڈیوٹی پر موجود کسی افسر کو سب بتایا۔ ظاہر ہے انہیں روک لیا گیا مگر بعد میں جب پولیس ان کے ساتھ جائے حادثہ پر گئی تو موقع پا کے وہ کھسک گئے۔“

”گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا انہوں نے؟“

”نہیں... لیکن ایک بڑے کام کی بات بتا دی تھی۔ گاڑی کو ایک مرد چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ کوئی عورت تھی۔ اس وقت وہ عمر کا فرق نہیں دیکھ سکتے تھے کہ مرد بوڑھا تھا اور عورت کوئی لڑکی تھی۔ تیرے مہمان کب گئے تھے؟“

”میرے مہمان... زارا اور اس کے پاپا... تیرا مطلب ہے انہوں نے مارا اسے؟“

”ایسا کہنے سے ایسا ثابت نہیں ہو سکتا۔“

”یار، انہیں معلوم تھا کہ ایک لاکھ میں وہ ٹل گیا ہے۔“

”ابھی ٹل گیا تھا۔ سمجھ دار لوگ بلیک میلر سے عارضی نہیں مستقل چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔ میرے پاس تھانے سے فون آیا کہ وہ بڈھا حادثے میں مارا گیا جو آپ کے دوست کے خلاف رپورٹ لکھوانے آیا تھا۔ میں گھر پہنچا ہی تھا۔ واپس تھانے گیا۔ وہ مہرین کا چاچا ہی تھا۔ میں نے محض افسوس کیا۔“

”وہ میرے خلاف رپورٹ لکھوانے گیا تھا۔ پولیس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کریں گے بھی نہیں۔ لاش کو انہوں نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا تھا۔ روزنامچے میں صرف یہ اندراج ہے کہ ایک لاوارث شخص کو کسی نامعلوم گاڑی نے ٹکر مار کے ہلاک کر دیا۔ اس کی جیب میں سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے شناخت میں مدد ملتی۔ لاوارث قرار دے کر اسے تین دن بعد دفن کر دیا جائے گا۔ لاش میڈیکل کالج والے خرید بھی لیتے ہیں۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ”پولیس نے ایسا کیوں کیا؟“

مولاجٹ نے اس احمقانہ سوال پر مجھے گھورا۔ ”پولیس ایسے ہی کرتی ہے دوست... قیمت وصول کرنے کے بعد۔“

”اور یہ قیمت کس نے ادا کی؟“

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”میں نے نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجھے بلانے کا مقصد یہی ہوگا مگر انہوں نے نہیں مانگی۔ اس لیے نہیں کہ میں کرائم رپورٹر ہوں۔ وہ اپنے باپ کو نہیں چھوڑتے۔“

”یہ باس نے اچھا نہیں کیا۔“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”کیا حرج ہے اگر تدفین میں کرا دوں۔ وہ بہرحال مہرین کے باپ کی جگہ تھا۔“

وہ تلخی سے ہنسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مہرین؟ کون مہرین؟ وہ تیری پرانی بیوی... تو جانتا ہے اس کے چچا کو؟“

☆☆☆

اتوار کی اس صبح میرا جسم تھکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور میرے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی تھی اور یہ اس لیے تھا کہ گزشتہ شب کے جشنِ طرب میں دوسروں کی طرح میں نے بھی پی لی تھی۔ پہلی بار یہ ہوتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے میں نے اس رات کو یاد کیا جو رنگ و نور، خوشیوں اور قہقہوں اور خوشبوؤں سے معمور تھی۔

اس فائیو اسٹار ہوٹل کے روف ٹاپ گارڈن ریسٹورنٹ میں جتنے ستارے آسمان پر روشن دکھائی دیتے تھے، اتنی ہی کینڈل لائٹس نے ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ شہر کی ایلیٹ کلاس کے اس منتخب اجتماع میں تقریباً سو افراد کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور ہنگامہ نا ؤ نوش کے درمیان باس نے تالی بجا کے سب کو متوجہ کیا تھا۔ ”ناؤ لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔ مجھے ایک اہم خبر دینی ہے۔“

آوازوں کا طوفان جیسے ایک دم تھم گیا۔ سارے چہرے گھوم گئے۔

”آج میں نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا ہے۔ (سسپنس)... میں نے اپنی بیٹی زارا اور جمال کو... لائف پارٹنر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

یہ سرپرائز شاید کسی کے لیے نہیں تھا مگر ایک دم تالیوں اور سیٹیوں کا شور بلند ہوا اور میں نے اپنے ساتھ آکے زرق برق نظروں کو خیرہ کرنے والے ملبوس میں کھڑی ہونے والی زارا کے نازک مرمریں ہاتھ کی انگلی تھام کے اس میں چار لاکھ کی ہیرے والی انگوٹھی پہنائی اور اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”آئی لو یو۔“ جس سے اس کا گلابی چہرہ شہابی ہو گیا۔ اس وقت وہ نہ صرف وہاں بلکہ شاید اس شہر، اس ملک،

اس دنیا اور کائنات کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے آگے آکے باری باری بے حد خوش پایا اور سب سے خوش نصیب جوڑے کو دلی مبارک باد دینا شروع کی۔ جو درحقیقت بہت سے حضرات اور خواتین کے دل سے نہیں ہوگی جن کی لڑکیاں اور لڑکے شادی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔

گھنٹی کی آواز پر میں اٹھا اور دروازے تک گیا۔ مولاجٹ کو دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ ''تو پھر صبح صبح؟''

''ہاں، اٹھ تیار ہو مردار مخلوق... آدھا گھنٹا دیتا ہوں میں تجھے۔''

''کیوں؟ اس کے بعد کہاں حاضری دینی ہے مجھے؟'' میں نے انگڑائی لے کر پوچھا۔

''تجھے چلنا ہے میرے ساتھ... راجن پور... میرا ایک اسائنمنٹ آگیا ہے ارجنٹ... دیر مت کر۔''

''تو اپنی سراغ رساں بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتا آخر... ناقدرے شخص۔''

''وہ خود میرے ساتھ جانا پسند نہیں کرتی... اچھا ہے ہاؤس وائف اگر گھر میں ہی رہے۔''

آدھے گھنٹے کے بجائے ہم ایک گھنٹے بعد روانہ ہوئے۔ ناشتے میں صرف ایک سلائس اور بلیک کافی پینے اور اس سے پہلے نہا کر میری کسلمندی خاصی دور ہوگئی تھی۔ موسم بہت خوش گوار اور میرا موڈ موسم سے بھی اچھا تھا... کسی نے سچ کہا تھا کہ موسم تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ گاڑی کو شوفر چلا رہا تھا۔ پیچھے بیٹھ کے میں نے کہا۔ ''راجن پور میں کیا ہے؟''

''مخدوم فقیر حسین۔'' مولاجٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میرے دماغ کو جھٹکا لگا۔ ''اس سے ملنے کیوں جارہے ہیں ہم؟''

''اس کے نانا دو مہینے پہلے فوت ہوئے تھے۔ ان کی خالی سیٹ پر ضمنی انتخاب وہ لڑ رہا ہے۔ مجھے اس کی کامیابی کو بھی کور کرنا ہے اور اس کا انٹرویو بھی۔''

''مگر مجھے ساتھ لے جانے کا مقصد؟''

''تیری فرح بھابی کا حکم ہے۔ تیرا چیک اپ ضروری ہے کہ پرانے برین ٹیومر کے آثار تو باقی نہیں رہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ نتائج پہلے سے طے شدہ تھے۔ اس روز مختلف اخبارات کے نمائندوں اور چینل والوں نے مخدوم فقیر حسین کے انٹرویو کیے۔ رات تک مولاجٹ کو اس سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن وہ اپنے وعدے کو بھولا نہیں تھا۔ وہ قدرے بھاری بدن کا لمبے گھنے سیاہ بالوں والا گورا چٹا جوان آدمی تھا جس کو کامیابی کی مبارک باد دینے والے دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک اس سے ہاتھ ملاتے تھے۔ دوسرے اس کے قدم چومتے تھے۔ اگلے روز ناشتے کے بعد بارہ بجے اس نے ہمیں طلب کیا۔

اس وقت اپنی اوطاق میں وہ اکیلا بیٹھا پی رہا تھا۔

''بیٹھو سائیں... کچھ پیو گے؟''

مولاجٹ نے کہا۔ ''میرا صرف کافی... آپ کو یاد ہے میں نے ایک درخواست کی تھی؟''

''یاد ہے، یاد ہے... اس بندے کو آخر کیوں ساتھ لائے ہو تم... یہ مہرین کا دوسرا شوہر تھا نا؟''

مجھے یوں لگا جیسے مخدوم فقیر حسین کے ریوالور سے نکلنے والی گولی میرے دل میں اتر گئی ہے مگر مولاجٹ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کروں گا۔

''انجانے میں غلطی ہوگئی تھی مجھ سے سائیں۔''

''دیکھو... تم کو بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا چاہیے... جو بات میں تم سے کررہا ہوں... یہیں تک رہے گی۔ دوبارہ بھی نہیں ہوگی۔ نہ اس کا حوالہ آئے گا۔''

''اسے آپ جنٹلمین پرومس کہیں یا مرد کا قول۔'' مولاجٹ نے کہا۔ ''کیا یہ بات صحیح ہے، مہرین سے آپ نے نکاح کی؟''

''ہاں، نکاح کرنا پڑا مجھے اس سے... اس کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔''

''پر آپ نے اسے چھوڑ کیوں دیا تھا؟ اگر وہ اتنی پسند تھی آپ کو؟''

''چھوڑا کدھر تھا بابا... اس نے کہا کہ مجھے بی اے کرنا ہے... میں نے کہا کہ جاؤ کرو... وہ چاہتی تھی کہ تب تک میں کسی سے کچھ نہ کہوں... بس ایک رات رہی تھی وہ میرے پاس... صبح ہم نے اسے گھر پہنچادیا تھا۔''

''اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی... اسے بھی...؟''

''وہ بہت چالاک لڑکی تھی۔ اس نے ایک طرف رکھا ہوا کلام پاک دیکھ لیا اور ایک دم اٹھا کے میرے قدموں میں لپٹ گئی... واسطے دینے لگی... اب اللہ رسول کی کتاب کو نہ مانتے... ایسے کافر بھی نہیں ہیں ہم۔''

''جب مہرین نے بی اے کرلیا... تو آپ اسے اپنے گھر کیوں نہیں لائے تھے؟'' مولاجٹ بولا۔

''بابا ہم نے سوچا وہ خود ہی آجائے گی۔ ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا تو وہ بھی کرے گی۔ ہم چلے گئے تھے لندن... وہ

ہمارے نانا کا تیسرا بائی پاس ہوا تھا۔ اس میں بھی چھ مہینے گزر گئے۔ ہم واپس آئے تو نانا کا انتقال ہوگیا۔ آپ کو پتا ہے... ہمیں معلوم ہوا کہ مہرین نے شادی کرلی ہے... سائیں یہ کتنی بے عزتی کی بات ہے کسی بھی شوہر کے لیے... کہ اس کے ہوتے بیوی کسی اور سے شادی کرلے... نکاح پر نکاح... ہمیں یقین نہیں آیا پہلے... پھر پتا کیا تو سچ تھا... ہم خود گئے۔ بدنامی کی بات تھی اس لیے کسی کو نہیں بتایا... ہم پہنچے صبح صبح... دروازہ اس نے خود کھولا... ہمیں دیکھ کر بے ہوش ہونے والی تھی... ہم نے تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں... میں صرف بات کرنے آیا ہوں... اسے نکاح نامہ دکھایا اور بولا کہ باہر آکے ایک منٹ کے لیے میری بات سن لو... پھر میں ابھی تم کو آزاد کردوں گا۔ ادھر تمہارا دوسرا شوہر نہ جاگ جائے... وہ خاموشی سے نکل آئی اور بات کرنے کے لیے میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بس... ہم اس کو لے آئے۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں وہ صبح لوٹ آئی جب مہرین بغیر کچھ بتائے خاموشی سے غائب ہوگئی تھی۔

''پھر آپ نے کیا کیا؟'' مولاجٹ بولا۔

''یہ کیسا سوال ہے بابا... ہم نے وہی کیا جو کرنا ہمارا فرض تھا... شریعت میں حکم کیا ہے ایسی عورت کے بارے میں؟ اس کو سنگسار کردو... ہم نے تھوڑا رحم دلی سے کام لیا... اس کو بتایا کہ اس کا جرم کیا ہے اور پھر خود قتل کردیا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ہماری روایات میں کاری کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ یہ بندہ اس لیے بچ گیا کہ اسے معلوم نہیں تھا۔ دھوکا ہوا اس کے ساتھ... ورنہ اس کا قتل بھی لازمی تھا۔''

زندہ رہنے اور آنے والی زندگی کے خیال نے میرے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا رکھی تھی۔ مزید کوئی بات جواب طلب نہیں رہی تھی۔ ہم نے مخدوم فقیر حسین سے اجازت لی اور اسی وقت واپس چل پڑے۔ ایک بھیانک سچ کا آسیب مجھ پر اور مولاجٹ پر ایک جیسا طاری تھا۔ فرح بھابی نے سچ کہا تھا۔ اسے لوٹ کے آنا ہوتا تو وہ جاتی ہی کیوں... اسے جانا پڑا تھا۔

کافی دیر بعد مولاجٹ نے کہا۔ ''اب کیسا محسوس کررہا ہے تو؟''

''پتا نہیں کیوں... اپنے کانوں سے سب سن لینے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آتا... کہ یہ سچ تھا۔''

''اس میں تیرا کیا قصور ہے... دنیا میں ہر بات جو آدمی اپنے کانوں سے سنتا ہے... سچ نہیں ہوتی۔''

''تیرا مطلب ہے... مخدوم فقیر حسین نے جھوٹ بولا؟''

''یار! ہم رپورٹر کتے کی طرح سونگھتے پھرتے ہیں اور سچ تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ اس وقت جب دونوں کی گنتی ہورہی تھی، میں مخالف امیدوار کے کیمپ کی طرف گیا تھا۔ ایک آدمی تلاش کرلیا تھا میں نے... اس نے مجھے دو افراد سے ملوایا جو اس نکاح کے وقت موجود تھے... حقیقت یہ ہے کہ کوئی نکاح نہیں ہوا تھا... نکاح کا ڈراما ضرور ہوا تھا... مخدوم صاحب نے مہرین کے ساتھ ایک شبِ عروسی بسر کرنے کے بعد اسے گھر بھیج دیا تھا اور اسے شاید بھول گئے تھے۔ پتا نہیں کہاں انہوں نے مہرین کو پھر دیکھ لیا تیرے ساتھ اور ان کی نفسانی خواہش پھر جاگ اٹھی... مگر اب یہ آسان نہ تھا۔ انہوں نے اسے جعلی نکاح نامہ دکھایا تو اس کی سٹی گم ہوگئی۔ بات کرنے کے بہانے وہ اسے باہر لے گئے۔ اینڈ دیٹ از دی اینڈ آف دی اسٹوری۔''

میں نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔ ''یعنی مہرین نے جھوٹ نہیں بولا تھا مجھ سے؟''

''ہاں، بس اس نے سچ کو چھپایا۔ جیسے ہم سب چھپاتے ہیں۔''

''لیکن اس نے نکاح پر نکاح نہیں کیا تھا... وہ صرف میری بیوی تھی... مرتے دم تک۔''

☆☆☆

برین ٹیومر میں شفایابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ اس کا انحصار ٹیومر پر ہے کہ وہ مہربان ہے یا جان لیوا۔ کہتے ہیں صرف ایک فیصد لوگ اس سے جانبر ہوتے ہیں۔

زندگی ایک فیصد امکانات سے کم پر رواں دواں رہتی ہے۔

مہرین کا مجھ سے ملنا ایسا ہی تھا۔ اس کا بچھڑنا بھی ایسے ہی ہوا۔ میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج جب میں زارا کے ساتھ ایک خوش و خرم کامیاب زندگی گزار رہا ہوں، مجھے وہ محبت یاد ہی نہیں آتی جو مہربان برین ٹیومر کی طرح تھی۔

ایسے ہی جیسے صبح سے شام تک کی مصروفیات میں آج تک مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے برین ٹیومر ہوسکتا ہے۔ کیا آپ ناممکنات کا تصور کرسکتے ہیں؟

نشان زدہ

مختار آزاد

کام چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو، ہنرمند کے لیے فن سے کم نہیں ہوتا۔ اسے بھی اپنے فن پر عبور تھا۔ جرم پیشہ فنکار کا ماجرا، جسے انفرادیت کی بنا پر زیرزمین دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں مجرم جان بوجھ کر ثبوت نہیں چھوڑتا مگر اُسے جان بوجھ کر ثبوت چھوڑنے کی عادت تھی۔ کبھی نہ پکڑے جانے پر نازاں... جب تقدیر کی ستم ظریفی کا شکار بنا تو چھوٹی چھوٹی گرہیں اس کے گرد مضبوط جال بُنتی چلی گئیں۔

مغرب سے درآمد پیشہ ور قاتل کا ماجرا جو ایک انگلی سے جان لینے کا دعویدار تھا...

جیسے ہی وہ دفتر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، دروازے کے پیچھے کھڑا کائل جھپٹ کر آگے بڑھا اور پیچھے سے اسے دھکا دیا۔ چھوٹے قد کا ڈومیسی سنبھلے بغیر منہ کے بل سیدھے اور گندے قالین پر جا گرا۔

کائل نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھٹنے سے ڈومیسی کا منہ دبایا اور نہایت تیزی سے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے ٹیپ سے باندھ دیے۔ یونہی اسے گرائے ہوئے آنکھوں پر رومال کی پٹی بنا کر باندھ دی اور اسے سیدھا کر کے اس کے منہ پر ٹیپ بھی لگا دیا۔ یہ کرنے کے بعد اس نے کھینچ کر اسے اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے کونے میں لے جا کر بٹھا دیا، پھر اس کے دونوں پاؤں بھی کس کر باندھ دیے۔ وہ ڈومیسی سے پہلے ہی کمرے میں موجود تھا اور کھڑکی میں کھڑا دور بین سے اسے آتا دیکھ چکا تھا۔

اس کے بعد اس نے ٹیپ رول سے ایک اور پٹی پھاڑی اور اس سے علامتی نشان کو بند کمپیوٹر پر چپکا دیا۔ یہ کرنے کے بعد اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر گردن باہر نکالی اور کوریڈور میں دیکھ کر تسلی کی کہ اس وقت وہاں کوئی اور تو موجود نہیں۔ کوریڈور خالی پڑا تھا۔ اس نے ٹیپ رول سے ایک اور پٹی پھاڑی اور کمپیوٹر کی طرح دروازے پر بھی اپنا مخصوص نشان چپکا دیا۔

یہ کام نمٹا کر وہ مڑا اور کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر کے اپنے ساتھ لایا ہوا ایک مستطیل بکس کھولنے لگا۔ اس میں کھلی ہوئی ایک رائفل تھی۔ وہ اس کو جوڑ کر تیار کرنے لگا۔ اس کی یہاں موجودگی کو تقریباً آدھا گھنٹا ہونے والا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ مزید کتنی دیر یہاں رکنا ہوگا پھر بھی امید تھی کہ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

اس نے رائفل تیار کر کے بولٹ چڑھایا اور اس کی نال سے سفید بالوں والے بوڑھے اکاؤنٹنٹ کی ٹھوڑی اونچی کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ہیلو مسٹر ڈومیسی...“ اس نے نام لے کر پکارا۔ اس کے سرد لہجے سے بھرپور سفاکی ٹپک رہی تھی۔

اپنا نام حملہ آور کے منہ سے سُن کر بوڑھے کے چہرے پر پل بھر کے لیے ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ آواز کی مدد سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو مگر صرف سرگوشی سے پہچاننا ناممکن تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا منہ لٹک گیا۔

”اگر تم مجھے سُن سکتے ہو تو اپنا سر ہاں میں ہلاؤ۔“ لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے پھر سرگوشی کی۔

بوڑھے نے آہستہ سے مرے مرے انداز میں سر ہلا دیا۔

”شاباش...“ اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔ ”سب سے پہلے میں تم سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک مرتبہ پھر لمحے بھر کا توقف کیا۔ ”میں کرائے کا قاتل ہوں اور تم جیسے لوگوں کو صرف ایک انگلی کے ذریعے ختم کر سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔ ”کبھی سنا تھا اس طرح کے کاریگر قاتل کے بارے میں؟“

بوڑھے نے انکار میں سر ہلایا۔

”بہت خوب...“ اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”خیر یہ بتاؤ، تم مرنا چاہتے ہو؟“ اس کا سرگوشیانہ لہجہ نہایت سفاک تھا۔

پل بھر کے لیے بوڑھے کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

”بہت خوب...“ وہ مسکرایا۔ ”میں تم جیسے بوڑھے کو قتل بھی نہیں کرنا چاہتا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو بوڑھے کے چہرے پر جاں بخشی کی اطلاع پر وقتی اطمینان کی جھلک نظر آئی۔

کائل خاموش تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے گہری سانس لی اور سرد لہجے میں ایک بار پھر سرگوشی کی۔ ”مگر ایک بات ہے۔“ اس نے بوڑھے کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”تمہیں زندگی چاہیے جو میں دے سکتا ہوں اور مجھے بھی تم سے کچھ چاہیے... تو سوال لو اور دو کا ہے۔“

بوڑھا ساکت بیٹھا سنتا جا رہا تھا۔

”... چلانے کی کوشش کرنا اور نہ ہی اٹھ کر بھاگنا، بس سکون سے یونہی بیٹھے رہو۔ جب تک میری ہدایت پر عمل کرو گے، تب تک تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“ اس نے پہلے کی نسبت اب ذرا نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”مجھے بہت دیر نہیں لگے گی، شاید ڈیڑھ گھنٹا یا بہت وقت لگا تو دو گھنٹے۔ اس کے بعد میں اپنا کام کر کے تمہارے دفتر سے نکل جاؤں گا اور تم زندہ رہو گے ٹی وی اور اخبار والوں کو اپنی بہادری کا قصہ سنانے کے لیے۔“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

یہ سن کر بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”سمجھدار لگتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”بس یونہی آرام سے بیٹھے وقت گزرنے کا انتظار کرتے رہو۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا اور اس بار ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ”گھبرانا مت، میری بات پر عمل کرو، اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا کر اپنی رائفل اٹھائی اور ڈومیسی کی میز کی طرف بڑھا۔ یہاں کرسی پر بیٹھ کر وہ باہر نظر رکھ سکتا تھا۔

کھڑکی سے باہر کا منظر ہر طرف سے واضح نظر آتا تھا مگر اس کی نظریں سڑک پار واقع گلیٹن ہوٹل کے داخلی دروازے کی سمت جمی ہوئی تھیں۔ وہ فور اسٹار ہوٹل تھا۔ کائل دل میں سوچ رہا تھا کہ اس جیسے شاندار ہوٹل کے سامنے اتنی پرانی تین منزلہ عمارت سے ہوٹل کی شان میں کتنا فرق پڑتا ہوگا۔ اگر ہوٹل انتظامیہ سے کوئی یہ بات کہے تو انہیں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہوگی۔

تقریباً پانچ منٹ پہلے ہوٹل کے دروازے پر سیاہ رنگ کی دو.... لیموزین کاریں آ کر رکی تھیں، جن میں سے کئی محافظ پلک جھپکتے اترے اور انہوں نے آنے والوں کو اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ ہوٹل کے ریوالونگ ڈور سے اندر داخل ہو گئے۔ چند لمحوں بعد وہ محافظ دوبارہ باہر نکلے۔ اس بار وہ اطراف کے ماحول پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے تھے جیسا کہ انہوں نے کچھ دیر پہلے دی تھی۔

وہ کھڑکی سے ان کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔

اسے سلک کی سفید شرٹ پر گرے کلر کا سوٹ پہنے اپنے خاص ہدف کی تلاش تھی جو اسے اب تک نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے شکار کے انتظار میں چوکس بیٹھا عقابی نظروں سے ہال کے ریوالونگ گیٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں دبی تھی اور پھر اسے اپنا شکار باہر نکلتے ہوئے نظر آ گیا۔

اس نے رائفل ہاتھ میں تھامی اور کھلی کھڑکی سے تاک کر سائلنسر لگی رائفل سے دو گولیاں چلائیں۔ پہلی گولی نشانے پر لگی۔ اس نے سینیٹر کی دائیں بھویں سے ذرا اوپر چھید کیا تھا۔ گولی لگتے وقت اس کا ہاتھ اپنی ٹائی کی گرہ درست کر رہا تھا۔ اس کے لڑکھڑا

کر گرنے سے پہلے ہی تجربہ کار نشانے باز نے دوسری گولی بھی داغ دی جو اس کے شانے پر لگی۔

جس وقت کائل نے گولی چلائی، باڈی گارڈ ہولسٹر سے پستول نکال رہا تھا۔ اس نے اپنے مالک کو لڑکھڑاتے دیکھا تو اسے تھامنے کے لیے تیزی سے لپکا مگر اس وقت دیر ہو چکی تھی۔ سینیٹر کو دو گولیاں لگ چکی تھیں۔ اسی دوران میں کائل نے نشانہ تاکا اور گارڈ پر بھی فائر کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا مگر اس کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ اس کا مالک سامنے مر رہا تھا، سب کی توجہ اس پر تھی۔ ویسے وہ محافظ کو مارنا نہیں چاہتا تھا، بس اسے مرتے ہوئے سینیٹر سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اب اگر وہ گولی اس کی جان کے لیے مہلک ثابت ہوئی تو اس سے کائل کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی دوران اس نے دو گولیاں لیموزین کے ہڈ پر بھی داغ دیں۔ گاڑی میں ڈرائیور بیٹھا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس آفت کے دوران وہ ہیرو بننے کے چکر میں کچھ کر کے اُس کا کام خراب کر دے۔ وہ ڈرائیور کو باز رکھنے کے لیے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈوں میں ہی اُس کا مشن مکمل ہو گیا۔ اس نے رائفل ڈومیسی کی میز کے نیچے ڈالی اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔

کائل زیرِ زمین دنیا میں کافی مشہور تھا اور اس کی خاصیت تھی بڑی شخصیات کو نہایت بھاری معاوضے پر قتل کرنا۔ اس کی شہرت میں ایک بات یہ بھی کہ وہ جہاں واردات کرتا، اپنا مخصوص نشان چھوڑ آتا تھا۔ جس کی وجہ سے اخبارات میں بھی اس کے خوب چرچے ہوئے تھے مگر وہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔ اسی نشان کی بدولت وہ سفید پوش دشمن دار امیروں میں بھی جانا جاتا تھا۔ مافیا میں بھی اسی بنا پر اس کی خاصی عزت تھی۔

کائل کی عادت تھی کہ وہ ہر قتل کے لیے نئی رائفل استعمال کرتا تھا اور اس کی مخصوص رائفل کے لیے رقم اس کے گاہک کے ذمے ہوتی تھی۔ اس بار بھی اس نے استعمال شدہ رائفل کو پولیس کے لیے چھوڑا اور باہر نکلنے لگا۔

دفتر سے باہر نکل کر اس ہوٹل تک پہنچنے میں اسے صرف چند منٹ ہی لگتے، جس کے داخلی دروازے کے سامنے فرش پر سینیٹر اور اس کے ایک گارڈ کی لاش پڑی تھی۔ اگرچہ وہ قریب جا کر اپنا شکار دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے اس نے ارادہ بدل دیا۔

جس وقت دفتر سے گولیاں چلنا شروع ہوئیں، تب گھٹنوں میں سر دیے ڈومیسی نہایت فکرمند حالت میں تھا۔ وہ سائلنسر لگی جدید رائفل سے گولی چلنے کے دوران پیدا ہونے والی کھٹ کھٹ سے جان چکا تھا کہ کچھ برا ہو رہا ہے مگر اس سے زیادہ فکرمندی یہ تھی کہیں وہ خود تو نشانے پر نہیں آنے والا... اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے سبب وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا البتہ کانوں سے صاف سنائی دے رہا تھا۔ بوڑھے اکاؤنٹنٹ کو کھڑکی کے باہر نشانے پر چلتی کائل کی رائفل سے نکلی گولی اپنی طرف بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوف کے باعث وہ دبی آواز میں رونے لگا تھا۔

کائل نے ایک نظر بوڑھے ڈومیسی پر ڈالی اور کرسی پر پڑے زرد رنگ کا رین کوٹ اٹھا کر پہنا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال گلو کی ٹیوب نکالی اور دوسرے ہاتھ سے لاک ہٹا کر دروازہ ذرا سا کھول کر جھری سے باہر جھانکا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا۔ اس نے ٹیوب کھول کر ذرا سی گوند نکالی اور دروازے کی چوکھٹ پر لگا دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جانے کے فوراً بعد کوئی اندر داخل ہو۔ وہ دروازہ بند کر کے کوریڈور میں نکلا اور لفٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر مڑا تو ایک اور دفتر کے سامنے ایک عورت اور مرد کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے دونوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے رین کوٹ کے کالر کھڑے اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر پر سرخ کیپ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کسی کی اس پر نظر پڑی تو انہیں صرف سرخ کیپ اور زرد رین کوٹ ہی یاد رہے گا۔

وہ لفٹ سے نیچے پارکنگ میں پہنچا۔ اس نے سلور کلر کی کار کیمرے کی آنکھ سے کافی دور پارک کی تھی۔ وہ کیمرے کی نگاہوں سے بچتا ہوا اپنی کار تک پہنچا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ کار کی آڑ میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا سوٹ کیس رکھا۔ رین کوٹ اور کیپ اتار کر اس میں رکھی۔ اب اس نے چمڑے کے دستانے اور جیکٹ پہن لی تھی۔

اس نے اوٹ سے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ کے نیچے تین پلاسٹک کے بڑے تھیلے رکھے تھے۔ یہ نیلے رنگ کے مخصوص تھیلے تھے، جن میں اسپتالوں کا مہلک کچرا ٹھکانے لگانے کے لیے ڈالا جاتا تھا۔ اس نے یہ تھیلے آج صبح ہی ایک اسپتال کے اسٹور روم سے پار کیے تھے۔

ایک تھیلے میں سیاہ رنگ کی راکھ پڑی تھی۔ اس نے جیب سے چاقو نکال کر رین کوٹ اور پی کیپ کے ٹکڑے کیے اور باقی دو تھیلوں میں بھی راکھ ڈال کر انہیں مکس کر دیا۔ اس نے تھیلے منہ بند کر کے انہیں اٹھایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے قریب ڈمپ سائٹ پر چھوٹا سا کنٹینر لگا تھا۔ اس کا ڈھکن کھولا اور تھیلے اس میں ڈال دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے چاروں سمت نظر دوڑائی مگر خوش قسمتی سے اس وقت کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ بڑے آرام سے چلتا ہوا واپس مڑا اور اوٹ لیتا ہوا اپنی کار کی طرف آیا۔ چند منٹ بعد وہ پارکنگ سے نکل رہا تھا۔ پارکنگ میں نسبتاً اندھیرا تھا اور مفلوک الحال لوگوں کے دفاتر ہونے کے سبب یہاں سیکورٹی کا بھی کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ کائل کو یقین تھا کہ شاید ہی کسی سیکورٹی کیمرے نے اسے دیکھا ہو۔

جب وہ پارکنگ سے باہر نکلا تو اسے ایمبولینس کے سائرن سنائی دیے۔ اس نے ہوٹل کی طرف نظر ڈالی۔ وہاں دو چار ایمبولینسز کے سوا کافی سارے ٹیلی وژن چینل والوں کی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ہوٹل کے باہر اچھا خاصا ہجوم جمع تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈال کر ٹائم دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور ایک ریستوران کے سامنے پہنچ کر رکا۔ گاڑی پارک کر کے جب وہ اندر داخل ہوا تو وہ تقریباً خالی تھا۔

"کھانے میں کچھ مل سکتا ہے؟" اس نے کرسی کھینچتے ہوئے سامنے کھڑی ویٹریس سے کہا۔

"لنچ ٹائم ابھی شروع ہوا ہے، جو چاہو گے مل جائے گا۔" اس نے زبردستی اپنے لبوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائی۔

وہ کاؤنٹر کے پاس، شیشے کی اس دیوار کے قریب بیٹھا تھا، جہاں سے باہر کا منظر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کا جائزہ لیا۔ ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی ٹی وی پر میوزک کا کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔

"یہ سائرن کیوں بج رہے تھے؟" کائل نے اس عورت کو مخاطب کیا۔

"معلوم نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹی وی چینل تبدیل کیا۔ یہ مقامی نیوز چینل تھا۔ "ٹی وی سے پتا چل جائے گا۔" اس نے ریموٹ دوبارہ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

اسی دوران اس کا کھانا بھی آ گیا مگر اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں۔ نیوز کاسٹر، رپورٹر سے لائیو بات چیت کر رہی تھی۔

"فی الحال زیادہ تفصیلات اس وقت بتانا مشکل ہیں تاہم اطلاعات یہی ہیں کہ گلیلین ہوٹل کے داخلی دروازے پر سینیٹر چارلس ڈاؤلنگ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے، جس میں وہ بری طرح زخمی ہوئے ہیں، شاید بات اس سے بھی زیادہ سنگین ہو چکی ہو۔" یہ کہہ کر رپورٹر لمحہ بھر کو خاموش ہوا۔ "حملہ شہر کے زیریں حصے میں ہوا ہے لیکن اب تک یہ تصدیق نہیں ہو سکی کہ حملے کے بعد سینیٹر کی زندگی کے کتنے چانس ہیں اور کیا ان کی زندگی کو کوئی بہت بڑا خطرہ تو نہیں ہے؟..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"حملے میں وہ صرف زخمی ہوئے ہیں؟" نیوز کاسٹر نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

"اس حملے کو گزرے چند منٹ ہوئے ہیں اور اب تک نہ تو اُن کے دفتر سے کوئی رابطہ ہو پا رہا ہے اور نہ ہی پولیس کچھ بتا رہی ہے، ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، ہم دوبارہ آپ سے بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر نیوز کاسٹر رپورٹر کی خبر اور اس کی فراہم کردہ اطلاعات کو ایک بار پھر دہرانے لگی۔ "سینیٹر ڈاؤلنگ پر شہر کے نسبتاً بے رونق علاقے میں حملہ ہوا ہے تاہم یہ بات معما ہے کہ وہ اس علاقے میں بغیر اطلاع کے خاموشی سے کیوں پہنچے تھے۔ اس بارے میں قیاس آرائیاں گردش کر رہی ہیں، تاہم فی الحال کوئی مصدقہ اطلاع سامنے نہیں آ رہی ہے۔"

کائل نے یہ سن کر بے فکرے انداز سے منہ ٹی وی کی طرف سے موڑ کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔

وہ نیوز کاسٹر کی اس بات پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ سینیٹر چوری چھپے اس ہوٹل میں کیوں پہنچا۔ وہ جانتا تھا کہ ہوٹل کے ایک کمرے میں اُس کی محبوبہ تھی اور سینیٹر کل رات وہاں پہنچا تھا، اب اس کے محافظ اسے واپس لینے آئے تھے مگر انہوں نے ہوٹل پر ایسا تاثر چھوڑا کہ جیسے سینیٹر ان کے ساتھ ہی وہاں پہنچا تھا۔ اگر یہ بات اخبار اور ٹی وی والوں کو پتا چل جاتی تو پھر تیکھی چٹخارے دار بحث شروع ہو سکتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سینیٹر چارلس کو مروانے کے لیے اسے سپاری دینے والے گاہک کا بھی اس میں بڑا فائدہ ہو سکتا تھا لیکن اسے چارلس کی سرخ بالوں والی محبوبہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے سر جھٹکا، یہ اس کا کام نہیں تھا۔ اس نے جس کام کا معاوضہ لیا، اسے پورا کر دیا تھا۔

ریستوران سے باہر نکل کر وہ تھوڑا آگے بڑھا۔ اس کے کانوں پر ہیڈ فون لگا تھا جبکہ ہاتھوں میں بریف کیس پکڑ رکھا تھا۔ اس نے آج صبح اسی مقام پر سے کار چوری کی تھی اور اب وہ اسے یہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تین دن کی ریکی کے بعد اسے اندازہ تھا کہ جب شام کو کار کا مالک اس میں بیٹھے گا تو وہ یہ سمجھ ہی نہیں پائے گا کہ اس کی کار نہ صرف چوری کی گئی تھی بلکہ اسے واردات میں بھی استعمال کیا جا چکا ہے۔

وہ جنوب کی سمت آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اسی سمت میں وہ ہوٹل تھا جہاں پر سینیٹر چارلس کا قتل ہوا۔ اسی دوران تین چار پولیس کاریں تیزی سے آگے گئیں۔ ان کا رخ بھی گلیلین ہوٹل کی طرف تھا۔

اس نے ہوٹل سے پانچ بلاک آگے بلیوا ایکوریم شاپنگ سینٹر کے قریب گیٹ وے کے سامنے اپنی نیلی اکورا کار پارک کی تھی،

مگر جب وہ وہاں پہنچا تو کار غائب تھی۔ وہ حیران رہ گیا۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں ہوسکتا۔“ ایک چھوٹے قد کے سیاہ فام نے اس کے قریب آکر اونچی آواز میں کہا۔ وہ کاؤبوائے حلیہ بنائے ہوئے تھا۔ ”تم نے اپنی کار کہاں پارک کی تھی؟“ اس نے سوال کیا۔

”اس طرف۔“ کائل نے انگلی سے اشارہ کیا۔

”پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔“ اس نے بےفکری سے کہا۔ ”جب تم اپنی کار ہائیڈرنٹ کے قریب پارک کرو گے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ ہائیڈرنٹ کے سامنے پارکنگ منع ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ ”دو کاریں اٹھائی گئی ہیں یہاں سے، ایک یقیناً تمہاری ہی ہوگی۔“

”تو اب...“

”گاڑی تو تبھی واپس ملے گی جب جرمانہ بھرو گے، ورنہ مزے کرو۔“

”ویسے تم کس ہائیڈرنٹ کی بات کر رہے ہو، صبح جب میں نے یہاں کار پارک کی، تب کوئی ہائیڈرنٹ وائیڈرنٹ یہاں نہیں تھا۔“ وہ جھلا کر بولا۔

”اب یہیں ہوگا، عین اس جگہ پر...“ اس نے انگلی سے ایک سمت اشارہ کیا۔ ”ویسے وہ عام طور پر نظر نہیں آتا۔“

”کیا میں تمہیں الو کا پٹھا لگ رہا ہوں۔“ کائل اس پر چلایا۔ وہ بری طرح جھلا چکا تھا۔

”تم مجھ پر کیوں چلا رہے ہو، جاؤ جا کر ان پر مقدمہ کر دو۔“ اس نے بھی غصے سے جواب دیا۔ ”میں نے تو کئی بار اس پولیس والی سے کہا ہے کہ یہاں پر کوئی بورڈ یا نشان وغیرہ لگا دو تاکہ لوگوں کو پتا چل سکے مگر اس منحوس کو تو دوسروں کی کاریں اٹھوانے اور پھر جرمانہ وصولی میں ہی دلچسپی ہے۔“ وہ سینڈوچ چباتے ہوئے بدستور بولے چلا جا رہا تھا۔

کائل خاموشی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی کار کی فکر تھی۔

”سنو...“ اس نے کائل کو متوجہ کیا۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”تم پولیس والی پر مقدمہ کر دو، وہی مصیبت کی جڑ ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”جب میں نے اسے یہاں بورڈ لگانے کا مشورہ دیا تھا تو بھنا کر کہنے لگی یہ میرا کام نہیں ہے، جس کا ہے وہ جانے۔ مجھے تو بس یہاں پر پارکنگ روکنی ہے اور خلاف ورزی پر جرمانہ لگانا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ ”کمینی عورت...“ یہ کہہ کر وہ پھر سینڈوچ پر منہ مارنے لگا۔

کائل نے کندھے اچکائے اور سوچنے لگا۔

گیٹ وے سے آگے اس کا پلان سیدھا سادہ تھا۔ وہ یہاں سے کار لے کر سیدھا ریلوے اسٹیشن جاتا۔ فرضی نام سے کار اگلے شہر کے لیے بک کراتا اور خود ریل کے ذریعے وہاں پہنچ جاتا۔ پھر وہاں سے کار لے کر دور یا ستوں کا سفر طے کر کے اپنے گھر جاتا۔ ”مگر اب کیا کروں؟“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

وہ اپنی کار وصول کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن جا کر چالان جمع کرانا چاہتا تھا اور ایک ایسی جگہ جہاں اس نے کچھ دیر پہلے سنگین واردات کی تھی وہاں سے کوئی دوسری کار چرانا حماقت ہوتی۔ وہ اس سوچ میں غرق تھا کہ اب کیا کرے۔ گیٹ وے کے قریب پہنچنے تک سارا کام اس کے منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔ یہاں چھوٹی سی گڑبڑ نے واپسی کے سارے منصوبے کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔

کائل نے سڑک کی طرف دیکھا۔ ایک ٹیکسی اس کی سمت آ رہی تھی۔ اس پر خالی کا اشارہ دینے والی لائٹ روشن تھی۔ وہ ون وے اسٹریٹ تھی۔ ”ٹیکسی...“ اس نے سڑک پر اتر کر اشارہ کیا۔

”دیکھ کر جوان۔“ غلط سمت سے آنے والا... سائیکل سوار چلایا۔ اسی دوران پچھلی جانب سے ایک ایمبولینس اور پولیس کار بھی سائرن بجاتی نمودار ہوگئیں۔ اس اچانک پڑنے والی افتاد سے لمحہ بھر کے لیے وہ چکرا کر رہ گیا۔ وہ پیچھے ہٹنا چاہتا تھا مگر وہاں پانی کے پمپ لگے تھے جس کی وجہ سے جگہ نہیں تھی۔ اسی دوران سائیکل اس سے بڑے زور سے ٹکرائی۔ وہ لڑکھڑا کر آگے گرا اور اس کا سر ٹیکسی کے بونٹ سے ٹکرایا جو اس کے اشارہ کرنے پر قریب پہنچ کر رک رہی تھی۔ سائیکل سوار نے ہلکا سا مڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور اب دونوں سڑک پر پڑے تھے۔

اسے اتفاق کہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور کوئی سکھ سردار تھا۔ اس نے صورت حال کو یوں بدلتا دیکھا تو بجائے رکنے کے رفتار بڑھا کر سڑک پر پڑے ان دونوں کو بچاتا ہوا آگے نکلا مگر اس دوران ٹیکسی کا پچھلا ٹائر سڑک پر گری سائیکل پر چڑھ گیا۔

”الو کا پٹھا...“ سائیکل والا چلایا مگر سردار جی کو کیا فرق پڑنا تھا۔ وہ تو ڈر گیا تھا کہ کہیں اسے بھی اس اتفاق کا ذمے دار سمجھ کر دھر نہ لیا جائے۔ وہ بےچارہ روزی کمانے نکلا تھا، پولیس کا جرمانہ بھگتانے کے لیے نہیں۔

اسی دوران وہ کاؤبوائے اسٹائل والا برابر سے نکل آیا جو سب سے پہلے کائل کو نکرایا تھا۔ ”حادثہ...“ وہ صورت حال دیکھتے ہی چلایا۔ ”پولیس کو فون کرو جلدی سے۔“ وہ گلا پھاڑ کر پکار رہا تھا۔

کائل آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ اس کا سر بڑی زور سے بونٹ سے ٹکرایا تھا اور اب تک اس کی نظروں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ وہ سر پکڑ کر کھڑا ہونے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ ”کیا ہوا تھا؟“ اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے بنا کسی کا نام لیے پوچھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہوا۔ وہ تو ٹیکسی میں بیٹھنے جا رہا تھا مگر...

کاؤبوائے اسٹائل والا مرد مداخلت بن کر سامنے آیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر سہارا دیا۔ ”اس کمینے نے تمہیں ٹکر مار کر گرایا اور وہ ٹیکسی والا اس کی سائیکل کچل کر بھاگ گیا۔“ وہ کائل کو صورت حال سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر لمحہ بھر رک کر اس نے سانس لی۔ ”تم اس پر مقدمہ کر دو۔“ اس نے سڑک پر گرے سائیکل سوار کو دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

کائل کے حواس اب بحال ہونے لگے تھے۔ اسے سائیکل والے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس کا تو یہی خیال تھا کہ اسے جان سے مار دے مگر سر چکرانے کے باوجود اس میں اتنی عقل ضرور باقی تھی کہ جو کچھ وہ سوچ رہا تھا، اس کام کے لیے نہ یہ وقت مناسب تھا اور نہ مقام... ورنہ وہ فطرتاً تو اس بات کا عادی تھا کہ جب چاہے کسی کی بھی جان لے لے۔

”فون ہے تو پولیس کو بلاؤ۔“ کاؤبوائے نے لہرا کر مشورہ دیا۔

”پولیس کی کوئی ضرورت نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا کہ کہیں وہ یہ نیک کام کر ہی نہ بیٹھے۔ ”میں چلتا ہوں۔“ وہ پیچھے کی طرف ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھنے لگا۔ کاؤبوائے نے اس کا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔

اسی دوران نیلے کپڑوں میں ملبوس ایک عورت برابر سے نکل آئی اور ہمدردی میں آ کر سڑک پر گرے سائیکل سوار کو اٹھنے میں مدد دینے لگی۔ اس کو بھی ٹھیک ٹھاک چوٹیں لگی تھیں۔

وہ سر پکڑے ہوئے سڑک پر چلنے لگا۔ لگ بھگ ایک بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ کاؤبوائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور اس کا بریف کیس اب تک اس کے ہاتھوں میں ہے۔

”شکریہ...“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بریف کیس لینے کی کوشش کی۔ ”اس میں میرے چند ضروری کاغذات تھے۔ شکر ہے تم نے اسے تھام لیا ورنہ میں بھول بھی سکتا تھا۔“

”تم ایسا کر سکتے تھے مگر میں نہیں...“ اس نے ہنس کر کہا۔ میں تو پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ یہ تمہارا بریف ہے۔ اسی لیے فوراً پکڑ لیا کہ کہیں کوئی اچکا اُچک نہ لے۔“

”شکریہ تمہارا...“ کائل نے ایک بار پھر سر سہلایا۔ اگرچہ اس کے حواس تو قابو میں تھے لیکن سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ سر درد کا پرانا مریض تھا۔ ”ریلوے اسٹیشن کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے؟“ اس نے دوستانہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

”یہی...“ اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

”کتنا دور ہوگا؟“ کائل نے پوچھا

”لگ بھگ ایک میل دور تو ہوگا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

کائل اب اس کے ساتھ چلنے سے پریشان تھا۔ اگرچہ اس شخص کا انداز دوستانہ تھا اور وہ ہمدردی میں اس کے ساتھ یہاں تک آیا مگر کائل جانتا تھا کہ یہ ہمدردی اسے مہنگی پڑ سکتی ہے۔ وہ اس سے جان چھڑانے کی فکر میں تھا۔

”پیدل چلو تو...“

”سیدھے چلتے رہو تو میرا خیال ہے پندرہ منٹ میں تو پہنچ ہی جاؤ گے۔“ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر آپ چلیے۔“ کائل نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”کوئی بات نہیں، میں بھی ذرا اسٹیشن تک چلتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”میری کون سی مصروفیات ہیں۔ ذرا تفریح رہے گی۔“

یہ سن کر کائل دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اسے اب اجنبی کی ہمراہی سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ اوپر سے وہ تھا کہ چپکے ہی جا رہا تھا۔

کائل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

”اے سنو...“ اس نے پکارا۔

”کیا بات ہے؟“ کائل کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔

”تمہارے پاس ایک سگریٹ ہوگی؟“

”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ کائل نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔

”اچھی بات ہے یہ۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ”خیر... تمہاری جیب میں کوئی چیونگم تو ضرور ہوگی۔“

”نہیں...“ کائل کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔ ”یہ مجھے پسند نہیں ہے۔“

”تو پھر تم زندہ کیوں ہو دادا؟“ اس نے بےشرمی سے ہنس کر کہا۔

”کیا کہا تم نے...“ کائل نے رک کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ دادا کے لفظ پر سخت غصے میں آ گیا تھا۔ اسے اس لفظ سے چڑ تھی۔ وہ اپنے دادا سے شدید نفرت کرتا تھا۔ بچپن میں ماں باپ کی وفات کے بعد انہوں نے اس پر شدید ظلم ڈھایا تھا۔ جس اجنبی نے اسے دادا کہا، وہ عمر میں اس سے شاید دس بارہ سال ہی چھوٹا ہوگا اور اسے دادا کہہ رہا تھا۔

وہ بھی اس کے تیور بھانپ گیا۔ ”میں تو یونہی مذاق کر رہا

تھا۔" اس نے گھگیائے لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارے پاس دو سیکنڈ ہیں۔ اس دوران میں میرے سامنے سے اور میرے راستے سے دفعان ہو جاؤ۔" کائل چلایا۔

"اوکے..." اس نے دونوں ہاتھ اس طرح آگے کیے جیسے کہ وہ خوف زدہ ہو کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کائل سمجھا کہ وہ ڈر گیا مگر اچانک اس نے اپنے بڑے سے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور جب وہ باہر آیا تو اس میں چھوٹے دستے والا بھاری ہتھوڑا تھا۔ "اپنا پرس نکالو۔" اس نے ہتھوڑا اس کی طرف لہرا کر، ڈراتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

"کیا..." کائل نے بھی خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی۔ "خدا کے لیے ہتھوڑا نہ مارنا۔"

"پرس نکالو ورنہ..." وہ دھاڑا۔

اسی دوران کائل نے اس کی پیٹ میں زوردار لات ماری اور وہ پیٹ پکڑ کر اُف کرتا ہوا دُہرا ہو گیا مگر لمحہ بھر میں اس نے خود کو سنبھالا اور ہتھوڑے سے اس کے سر پر وار کیا۔ کائل نے جھکائی دی مگر پھر بھی وہ اس کے دائیں کان سے رگڑ کھاتا چلا گیا۔ "تم کمینے..." وہ چلایا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس جوکرے اچھی طرح نمٹ لیتا مگر کار سے سر ٹکرانے کے بعد اس کی پرانی تکلیف پھر نمودار ہو گئی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ خود کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب سے وہ گیٹ وے پر اپنی کار کے لیے پہنچا تب سے اس کا برا وقت شروع ہو گیا تھا۔

اس نے ہمت کی اور آخر ہتھوڑا اس کے ہاتھوں سے چھین لیا مگر اسی دوران ایک اور شخص نمودار ہوا۔ وہ پہلے والے کا ساتھی لگ رہا تھا۔ کائل کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ انہوں نے اسے اپنا شکار منتخب کر کے ہمدردی کا ناٹک رچایا تھا۔

کائل کے ہاتھوں میں ہتھوڑا تھا۔ "آؤ... یہ لو۔" وہ ہتھوڑے کو تلوار کی طرح تھام کر نووارد کی طرف بڑھا اور جیسے ہی اس نے اسے ہتھوڑا مارنا چاہا وہ تیزی سے پیچھے مڑ کر دوڑ پڑا۔ یہ دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

اب وہ ہتھوڑا تھام کر اپنے کاؤبوائے ہمدرد کی طرف پلٹا۔ اس کے پیٹ پر کائل کی لات بڑے زور سے پڑی تھی۔ وہ پیٹ پکڑے گھٹنے کے بل فٹ پاتھ پر تھا۔ اس کے چہرے سے درد کے آثار ظاہر تھے۔ "ہاں تو اب ایک بار پھر مجھے کچھ دادا..." وہ اس کے سر پر کھڑا ہو کر ہتھوڑا فضا میں لہراتے ہوئے کہنے لگا۔ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"پلیز... مجھے معاف کر دو۔" وہ گھگیائے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں تو چھوٹا موٹا بدمعاش ہوں۔"

"لیکن میں بڑا بدمعاش ہوں۔"

اسی دوران اس کی نظریں اس کے برابر پڑیں۔ ایک دراز قد عورت کھڑی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایسے پہنے تھی جیسے دفتر سے لوٹ رہی ہو۔ جو صورت حال وہاں تھی، دیکھ کر اس عورت کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ "یہ مجھے لوٹ رہا تھا۔" کائل نے جلدی سے کہا۔ وہ اس کا خوف کرنا چاہتا کہیں وہ اسے بدمعاش سمجھ کر پولیس کو فون نہ کر دے۔

عورت نے اس کی بات سنی اور پرس میں ہاتھ ڈالا۔ تیزی سے آگے بڑھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ موبائل نکالتی مگر اس بجائے پستول بھی ہو سکتا تھا اور کائل اس وقت کسی بھی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے منصوبے کی تکمیل کے بعد منصوبہ بندی یعنی شہر سے فرار پر عمل کرنا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ پرس سے باہر نکلتا، کائل نے کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ اس عورت ہاتھ باہر آ چکا تھا اور اس میں مرچوں والا وہ مخصوص اسپرے جسے اُچکوں سے عورتوں کو بچانے کے لیے بطور ہتھیار استعمال جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، عورت نے اس چہرے پر اسپرے کر دیا۔ کافی سارا مواد اس کی آنکھوں میں گیا اور لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے تلملا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی دوران عورت نے اسے پیچھے دھکیلا اور وہ بند آنکھوں سے دوڑا مگر دو قدم پر ہی ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ آنکھ سے تو اسے پہلے ہی نظر نہیں آ رہا تھا، منہ کے بل گرنے سے جبڑے پر بھی بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ البتہ کان کام کر رہے تھے۔ اسے عورت کی زوردار تحکمانہ آواز سنائی دی۔ "چپ کر کے بیٹھ جاؤ، میں پولیس کو فون کر رہی ہوں۔"

اسی دوران کسی نے اسے پشت سے پکڑ کے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھوں کی سختی سے وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی کاؤبوائے ہے۔ جس انداز میں عورت نے کائل کو اس پر ہتھوڑا تانے دیکھا تھا، اس سے وہ اسے ہی بدمعاش سمجھی ہو گی۔ وہ سمجھ گیا کہ عورت پولیس کو اسی کے لیے بلا رہی ہے۔ یوں وہ کاؤبوائے خود بخود عورت کی نظر میں مظلوم بن گیا تھا۔ تبھی تو وہ اسے سیدھا کر کے بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تو اس کے کانوں میں اسی بدمعاش کی آواز آئی۔ کائل جل بھن کر رہ گیا۔ اب تک اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی دوران ایک بار پھر اسے اپنے کندھے پر مردانہ ہاتھ

محسوس ہوا۔ اس وقت نہ صرف اس کی آنکھیں بند تھیں بلکہ سر چکرانے کے علاوہ اس کے جبڑے میں بھی شدید درد ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ ہاتھ سرکتا ہوا اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں جا رہا ہے جہاں بٹوا رکھا تھا۔ "دفع ہو جاؤ کمینے۔" اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔

"یہ بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے، ایک بار پھر اس کی آنکھوں پر اسپرے کر دو۔" اگلے ہی لمحے وہ عورت کو مشورہ دے رہا تھا۔ اسپرے کا سنتے ہی اس کے درد میں ایک بار پھر شدت آ گئی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، اسے ایڑیوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور اسی دوران عورت نے اسپرے کر دیا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت اسپرے سے بھیگ گئیں۔ اگلے ہی لمحے وہ شدید غصے سے اٹھا اور آنکھیں کھول دیں۔ اگرچہ اب بھی بہت جلن ہو رہی تھی مگر پھر بھی اسے دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور عورت کے ہاتھ سے اسپرے اور پرس چھین کر دور پھینک دیا۔ اسی دوران ایک اور عورت کی آواز گونجی۔ "یہی بدمعاش لٹیرا ہو گا۔"

"ٹھیک کہا۔" اگلے ہی لمحے کاؤبوائے نے زور سے تائید کی۔

کائل سمجھ گیا قریب میں ہی کوئی پارک ضرور ہے ورنہ اس ویرانے میں اتنی جلدی دو عورتیں یوں اکٹھی نہ ہوتیں۔ اس نے گردن گھما کر جلدی جلدی دونوں طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر قریب کوئی پارک ہے تو وہاں فوارہ ہو گا، اس سے آنکھیں دھوئی جا سکتی ہیں۔ ایک طرف اسے چھوٹی پتھریلی دیوار سی نظر آئی۔ اگرچہ وہ کافی فاصلے پر تھی مگر تکلیف سے چھٹکارے کے لیے وہ اس طرف دوڑ پڑا۔

جلد ہی اسے فوارہ مل گیا اور دس منٹ تک خوب مَل مَل کر پانی سے آنکھیں دھوتا رہا۔ اگرچہ اب بھی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی مگر پھر بھی تکلیف کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔

گیٹ وے پر پہنچنے کے بعد جس افتاد کا اسے سامنا کرنا پڑا تھا، اس سے وہ خاصا تھک چکا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی، وہاں سناٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے اوسان بحال کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سر چکرا رہا تھا، جبڑے میں بھی درد ہو رہا تھا البتہ آنکھوں کی جلن اب ختم ہو چکی تھی اور وہ اچھی طرح دیکھ پا رہا تھا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سورج کی تیز تپش میں تپتا رہا ہے۔ اسی دوران لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ جیب کے اوپر پڑا۔ اس کا فون اب تک اس کے پاس تھا مگر یہ فون بے کار تھا۔ اس شہر میں وہ کسی کو نہیں جانتا تھا کہ جس سے مدد لے سکے ماسوائے اُس کے جس نے سینیٹر کو قتل کرنے کی سپاری دی تھی۔ اچانک اس کو کچھ خیال آیا۔ اس کا بٹوا غائب تھا۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ اب وہ پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ لٹیرا فرار ہو چکا ہو گا۔ آگے جانے کے لیے اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ سپاری کرنے والے کو فون کر کے کہے کہ اسے آن لائن رقم بھیج دے مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود پر لعنت بھیجی۔ اس اجنبی شہر میں جہاں کچھ دیر پہلے اس نے سنگین جرم کیا تھا، وہاں وہ کس شناخت پر پیسے منگوائے گا۔ غصے کے مارے وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔

وہ لڑکھڑا کر اٹھا۔ جانتا تھا کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر یہاں مزید بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اسے اب شہر چھوڑنے کے لیے کچھ کرنا تھا۔ اب بھی اس کے جبڑے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی شکار دیکھ کر اسے لوٹ لے۔ اسی طرح اسے فوری طور پر کچھ رقم مل سکتی تھی۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اس نے اپنے اس خیال پر بھی لعنت بھیجی۔ اسے رقم مل سکتی تھی لیکن اس کی جعلی شناختی دستاویزات پرس میں ہی تھیں اور بنا شناختی کارڈ وہ ٹرین ٹکٹ بک نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہاں سے نکلنے کے لیے کار چوری کرنے کا سوچا۔

پارک سے باہر نکل کر اس نے اچھی طرح چاروں

شکار

طرف دیکھا مگر اسے یہاں کوئی پارکنگ نظر نہیں آئی۔ وہ چاہتا تو کسی کار کو روک کر، ڈرائیور کو قتل کر کے کار حاصل کر سکتا تھا مگر کائل کو بنا سبب کسی کو مارنا پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی ایسی صورت میں تو اسے قتل کرنا سخت ناپسند تھا جب اس مقصد کے لیے اسے کسی نے بھاری رقم نہ دی ہو۔

وہ سوچوں میں گم آگے بڑھا۔ دو تین بلاک آگے جانے کے بعد اسے بے گھروں کے لیے قائم ایک شیلٹر ہاؤس نظر آیا۔ اس وقت اس کی حالت کافی پتلی ہو چکی تھی۔ بھوک لگنے لگی تھی اور شدت سے کافی کی خواہش بھی ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ یہاں جا کر کھانا کھا کر اور کافی پی کر ایک دو گھنٹے آرام کر لے تو طبیعت بہتر ہو سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے تو وہ کچھ بھی کر کے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر ہی لے گا۔ ”لعنت ہو اس منحوس سائیکل والے پر۔“ وہ بڑبڑایا۔ اب اس کے قدم شیلٹر ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ابھی وہ عمارت سے کچھ دور سڑک کے کنارے تھا کہ اسے اپنے پیچھے کچھ لوگوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ سنی ان سنی کر کے آگے بڑھتا رہا۔ اسی دوران پیچھے سے کسی نے پکارا۔ ”اے سنو...“ وہ رکا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ تیز تیز چلنے سے ایک بار پھر سر کے درد میں شدت آ گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کنپٹی دبائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے تین لڑکے کھڑے تھے۔ انہوں نے کسی کالج کی مخصوص شرٹ پہن رکھی تھی۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے غور سے ان تینوں کو دیکھنے کے بعد گمبھیر لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے تم کافی دیر سے مصیبت میں پھنسے رہے ہو۔“ ان تینوں کے درمیان کھڑے سنہرے بالوں والے لڑکے نے کہا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے۔“ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے تمہیں اس وقت آرام کی شدید ضرورت ہے مگر شاید...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مگر کیا...“ کائل نے چونک کر پوچھا۔

”لگتا ہے کہ تم بے گھر ہو اور شاید تمہارے پاس پیسے بھی نہیں۔“ اس لڑکے نے شرمندہ لہجے میں اٹکتے ہوئے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ”یہ میرے پاس کچھ پیسے ہیں، شاید اس سے تمہارا کچھ بھلا ہو جائے۔“ اس نے ہتھیلی آگے بڑھائی جس پر ایک دو ڈالر کے مڑے تڑے نوٹ اور چند سکے دھرے تھے۔

”یہ جیب میں ڈالو اور نکل لو۔“ کائل نے دبنگ لہجے میں کہا۔

”تمہارا رویہ تو بہت خراب ہے۔“ اس لڑکے نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ ”میں تمہاری مدد کر رہا تھا اور تم مجھ پر ہی بگڑ گئے۔“

”بکواس بند کرو؟“ وہ دہاڑا۔

”پال اسے جانے دو۔“ اس کے برابر کھڑے لڑکے نے ٹوکا۔

”ارے نہیں، یہ ہمارا دوست بننے والا ہے اور تم سنا نہیں...“ یہ کہہ کر وہ اپنے اس ساتھی کی طرف مڑا جس نے اسے پال کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ”ٹیچر نے آج ہی کہا کہ ہمیں اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اخلاق کی تعلیم دینی چاہیے تھی مگر...“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر کائل کی طرف دیکھا۔ ”تم تعلیم پر توجہ نہیں دیتے ہو۔“ اس کا مخاطب وہی ساتھی تھا۔

”اسی لیے تو کلاس سے نکال دیا گیا ہوں۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

”تم اپنی بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ۔“ کائل دھاڑا۔

”پال... اسے تم بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کلاس کے کتنے اچھے لڑکے ہو۔“ ہنسنے والے لڑکے نے لقمہ دیا۔

”اور یہ بھی بتا دو کہ کس کلاس میں پڑھتے ہو۔“

”ارے ہاں میرے دوست...“ سنہرے بالوں والے پال نے کہا۔ ”مجھے بدتمیزی پسند نہیں، میں کلاس کا سب سے اچھا لڑکا ہوں اور اخلاق کی تعلیم دینا میرا فرض ہے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”اور یہ مارشل آرٹس کی کلاسیں لے رہا ہے۔“ ان کے ایک اور ساتھی نے کائل کا مذاق اڑانے جیسے انداز میں تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی کائل کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اب اس میں خوامخواہ نیا پنگا لینے اور درگت بنوانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے سر جھکایا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت وہ خود کو کرائے کے مال دار قاتل سے زیادہ مفلس بھکاری محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ ”منحوس دن ہے۔“ وہ شیلٹر ہاؤس کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔

اسی دوران اسے اپنے پیچھے کچھ لوگوں کے بھاگنے کی آواز آئی اور جب تک وہ مڑتا، سنہرے بالوں والے پال نے چھلانگ لگا کر اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ کائل نے پھرتی سے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا مگر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کی پیٹھ پر پال کی زوردار لات پڑ چکی تھی۔

پال کے دونوں ساتھی شور مچا مچا کر اس کی ہمت بندھا رہے تھے اور پال اچھل اچھل کر حملہ کر رہا تھا۔ ”تم دس ڈالر جیت سکتے ہو، شاباش اور زور سے...“ کائل نے اس کے ایک ساتھی کی آواز سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سارا کھیل شرط کے چکر میں ہے اور قربانی کا بکرا وہ بن رہا ہے۔

اگرچہ کائل مضبوط ہاتھ پاؤں کا آدمی تھا مگر اس وقت وہ صرف دفاع کیے جا رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ انہیں سبق سکھا سکے۔ یہ اور بات کہ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو وہ ان کی گردنیں توڑ دیتا مگر اس وقت سر کے چکر کی پرانی تکلیف نے اسے ادھ موا کر رکھا تھا۔

پال نے اس پر کئی لاتیں جڑ دی تھیں اور کائل کا دفاع کمزور پڑنے لگا تھا۔ اس کے ساتھی چلا چلا کر پال کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اسی دوران کائل کو ذرا سا موقع ملا۔ وہ نیچے بیٹھا اور پھر قلابازی لگا کر ان کے نرغے سے نکل کر سرپٹ دوڑ پڑا۔ اسے اپنے پیچھے چلاتے لڑکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹی سڑک پر مڑنے ہی والا تھا۔ کسی نے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس سے پہلے کہ سنبھل کر نئی مصیبت کو دیکھتا، ٹکرانے والے نے اس کے بازو دبوچے اور موڑ کر پیٹھ کے پیچھے لے گیا۔ کائل پہلے ہی ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس افتاد کے بعد تو اس میں مدافعت کی ذرا سی بھی ہمت باقی نہیں تھی۔ اس کے سر میں درد کے مارے جھماکے ہو رہے تھے۔ اسی دوران اسے پولیس کار کا سائرن بھی سنائی دیا۔

اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب اس کے دونوں بازو پشت پر تھے جنہیں اس شخص نے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ کائل بھی پولیس میں رہ چکا تھا۔ وہ اس طرح ہاتھ موڑ کر کسی دوسرے شخص پر قابو پانے کی اس تکنیک اور اسے استعمال کرنے والوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے کسی پولیس والے نے لڑکوں کے شور مچانے اور بھاگتا دیکھ کر، بدمعاش سمجھ کر دھر لیا ہے مگر اگلے ہی لمحے جو ہوا، اس کے باعث کائل کی چیخیں نکل گئیں۔ درد اتنا تھا کہ وہ سر کے چکر بھول گیا۔

☆☆☆

تقریباً دس منٹ بعد وہ ایمبولینس میں لیٹا اسپتال جا رہا تھا۔ پولیس والے نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں موڑ کر ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں اور اسٹریچر پر لیٹا کائل درد کی شدت سے بلبلا رہا تھا۔

”شہر کی تاریخ میں پچھلے دس سالوں کا سب سے بڑا قتل تم نے کیا ہے۔“ اسٹریچر کے سامنے بیٹھے پولیس افسر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اس بہروپیے سے ہی تمہارا سراغ ملا۔ وہ تو شکر ہو اس عورت کا جس نے تمہارے فرار پر پولیس کو فون کر دیا۔ اگر بروقت نہ پہنچتے تو وہ بہروپیا بدمعاش تمہارا بریف کیس لے کے چمپت ہو چکا ہوتا اور شاید اس کے ساتھ تم بھی جان بچا چکے ہوتے۔“ وہ مسکرایا۔

کائل نے اسے بے بسی سے دیکھا۔

”ہمیں بریف کیس سے تمہارا مخصوص نشان ملا ورنہ تم کہاں پکڑ میں آتے۔“ دوسرا پولیس والا ہنس پڑا۔

”وہ تو شکر ہے کہ تمہارے دفتر سے نکلتے ہی کوریئر والا پہنچ گیا ورنہ تو اب تک ہم سینیٹر پر گولی چلانے والا متعاہم ہی ڈھونڈ رہے ہوتے۔“

”ڈومیسی نے ہماری خوب مدد کی۔“ اب وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔

”ابھی تو میں نے اس کی ساری انگلیوں کی ہڈیاں ہی توڑ دیں۔“ دوسرا پولیس والا یہ کہہ کر ہنسا۔

پہلی بار کائل کو اپنے اعتماد پر افسوس ہوا۔ کرائے کا مشہور قاتل بننے کے چکر میں اس نے اپنا مخصوص نشان تیار کرایا اور اپنا سراغ اس نشان کی صورت ہر جگہ چھوڑتا رہا۔ جرائم کی دنیا میں اس لیے اس کی شہرت تھی کہ سراغ کے باوجود وہ گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔ اسی نشان کی بدولت اسے کام اور بھاری معاوضہ ملتا تھا۔ وہ فخر سے کہتا تھا کہ ایک انگلی سے قتل کر سکتا ہے اور یہ کہتے ہوئے اس کا اشارہ سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی طرف ہوتا تھا، جس سے وہ رائفل کا ٹریگر دباتا تھا۔ مگر آج یہی فخر اس کی تکلیف اور گرفتاری کا سبب بن گیا۔

”افسوس...“ اس نے کراہتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنے فخر پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس کے سر میں پھر شدید چکر آ رہے تھے۔ ”کاش میں فالتو نشان بریف کیس میں نہ رکھتا۔“ وہ نیم غنودگی میں بڑبڑایا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے ہوش ہونے لگا تھا...

(!)

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل، ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں ڈیرہ آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کرلیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی ڈیرہ آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا سراغ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کرلیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کرلی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے وہ اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جارہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ شہریار کو دریا پر شبہ ہوتا ہے۔ دریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار رستم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے

اسما قادری

قسط : 43

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

ہے۔ ماریا کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح زخمی ہو جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریہ کی ماں ستھیا جو رشید سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار انشاء اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادی سے کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، ماہ نور اور اسمٰعیل کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ پھر اس کے ایکسیڈنٹ کا چرچا کر دیا جاتا ہے۔ شہریار، انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے تاہم مراد شاہ، کشور اور آفتاب سے بہت خلوص سے ملتا ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ڈیپارٹمنٹ کے ایف بی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی کے نواز نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شانی کسی چکر میں ملوث ہے۔ وہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرتا ہے۔ شانی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شانی کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی شروع کر دی جاتی ہے۔ جاوید علی ہیڈ کوارٹر رپورٹ کر رہا ہوتا ہے کہ نوازش علی کی بیٹی شازمین اس کی گفتگو سن لیتی ہے۔ وہ جاوید علی کو حقائق بتانا چاہتی ہے اور دوسرے دن اپنے کمرے میں آنے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ پکڑے جانے والے مال کے بارے میں ورما کو وضاحت دیتی ہے۔ وہ کراچی فون کر کے رنجنی پر نظر رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ورما اس کی گفتگو سن لیتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ورما اپنا ٹھکانا چھوڑتا ہے مگر سی ایف پی کا اہلکار اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نئے ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ شہریار کو اس کی تصویر بھیجی جاتی ہے تو وہ اسے شناخت کر لیتا ہے۔ ادھر جاوید علی شازمین کے کمرے میں پہنچ کر شازمین سے معلومات حاصل کرتا ہے اور کوٹھی میں کارروائی کی تیاری کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شازمین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اس پر قابو کر لیتا ہے۔ شازمین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے پر اصرار کرتی ہے۔ جاوید علی اس کے لیے گاڑی بھجوا دیتا ہے۔ راوی کے شازمین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سلمیٰ، شازمین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اس کو ایک مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھینک دیا جاتا ہے تاہم شازمین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شازمین وہاں خودکشی کر لیتی ہے۔ ادھر ورما سے پوچھ گچھ ہو رہی ہوتی ہے اور اس پر تشدد کا ہر حربہ آزمایا جا رہا تھا تاہم وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے ملا دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ایکٹو کر دیا جاتا ہے اور اسے سلو کے مشن پر کراچی بھیجا جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے اپارٹمنٹ میں زہریلی گیس چھوڑی جاتی ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ پولیس کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ قاتلانہ حملہ چودھری کی طرف سے کرایا گیا مگر چودھری پہلے ہی نیویارک چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ سلو، وزیراعلیٰ کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں دو اہم شخصیت کو مارنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان کی والدہ انتقال کر جاتی ہیں اور اس کی شادی گل سے ہو جاتی ہے۔ مشابرم ایک دہشت گرد کو پکڑ کر آرمی کے حوالے کرتا ہے۔ شہریار واپس لاہور آتا ہے۔ عمر فاروق اسے بتاتے ہیں کہ اسے ایک اہم مشن سونپا جا رہا ہے۔ شہریار کو بہاولپور بھیجا جانا ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ایک مشتبہ شخص بشیر اکبر کی رہائش گاہ میں داخل ہوتا ہے اور اسے وہاں سے گن پوائنٹ پر لے کر آرمی والوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ سی ایف پی والے ریاض انور کو اٹھا لیتے ہیں۔ اس کی زبانی جیل میں سازش کا انکشاف ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ سلو کو جیل میں ہلاک کیا جانا ہے۔ ادھر شہریار اپنے ساتھ سلو کو لے جانے کے لیے اصرار کرتا ہے۔ جیل سے قیدیوں کے فرار کی سازش پر عملدرآمد شروع ہو جاتا ہے۔ سلو کا ساتھی قیدی، اسے لے کر جیل کی دیوار پار کرنے کے لیے نکلتا ہے۔ سلو دیوار پر چڑھتا ہے مگر اچانک اس کی نظر ساتھی قیدی پر پڑتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں ریوالور ہوتا ہے۔ سلو دیوار سے چھلانگ لگا دیتا ہے تاہم ریوالور بردار فائر کر دیتا ہے۔ فضا میں انسانی چیخ بلند ہوتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہر طرف ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے باوجود سلو نے ریوالور سے کیے گئے فائر کی آواز بہت اچھی طرح سن لی تھی۔ شاید اس لیے کہ ریوالور چلانے والے نے اس گولی پر اس کا نام لکھ کر بھیجا تھا مگر بالکل آخری لمحات میں ایک معجزہ سا رونما ہو گیا۔ اس کے اور گولی کے درمیان ایک انسانی جسم اڑتا ہوا آ کر حائل ہو گیا اور فضا اس کی دردناک چیخ سے گونج اٹھی۔ سلو کے قدم زمین پر ٹکے تو اس نے اس انسانی جسم کو اپنے قدموں میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ بے حد تکلیف میں ہے اور شاید ہی بچ سکے۔

”ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ تمہارا انجام تمہارے ساتھی سے بھی زیادہ برا ہوگا۔“ یہ غراتی ہوئی آواز اس دوسرے قیدی کی تھی جو کچھ لمحوں قبل رائفل بردار قیدی سے برسرپیکار تھا مگر اب اس نے سارا کھیل ہی الٹ رکھ دیا تھا۔ وہ نہ صرف رائفل اپنے قبضے میں لے چکا تھا بلکہ اس کی طرف بڑھتی موت کی راہ میں اپنے مدمقابل کو اچھال کر حائل کر دیا تھا اور اب اس شخص کو رائفل کی زد میں لیے کھڑا تھا جو سلو سے اس کا ہمدرد اور نجات دہندہ بن کر ملا تھا لیکن لمحہ بھر قبل ہی اس نجات دہندہ نے موت کے ہرکارے کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم کون ہو؟“ ریوالور بردار نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ کچھ حیران بھی نظر آ رہا تھا جیسے جو کچھ ہوا ہو، وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ کسی قسم کی مداخلت کی امید نہیں رکھتا تھا۔

”تمہارے لیے میں جہنم کا فرشتہ ہوں۔ اگر تم نے ریوالور پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو میں تمہیں تمہارے ساتھی کے پیچھے جہنم روانہ کر دوں گا۔“ اس کے لہجے میں ایسا قطعی پن تھا کہ ریوالور بردار نے مزید پس و پیش سے کام نہیں لیا اور ریوالور پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے۔ اس کا پھینکا ہوا ریوالور اس کے ساتھی کے قریب جا کر گرا جس کا جسم اب تڑپنا چھوڑ کر ساکت ہو چکا تھا اور یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ سلو سکتہ زدہ سا کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن فی الحال تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس الجھن نے تو اسے اس ساری افراتفری اور ہنگامے سے بھی بے نیاز کر دیا تھا جو اس کے اردگرد جاری تھا۔

”اب واپس چلو۔“ رائفل بردار نے حکم جاری کیا تو ہاتھ اٹھائے شخص کو ناچار پلٹنا پڑا۔

”تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے سلیم۔“ دوسرا حکم سلو کے نام جاری ہوا تو اس نے وزدیدہ نظروں سے مردہ قیدی کے قریب پڑے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ جیل سے نکل کر آزاد فضاؤں میں جانے کے خیال سے اپنے اندر عجیب سی توانائی محسوس کر رہا تھا اور اب وہ شخص اسے واپس انہی اندھیروں کی طرف لے جا رہا تھا جہاں اس کا دم گھٹتا تھا۔ لیکن کمال یہ تھا کہ اس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے نے یقینی طور پر دو مرتبہ اسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ ایک بار اس وقت جب وہ رسی سے لٹکا دیوار کی بلندی کو سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور رائفل کی گولی اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزری تھی اور دوسری بار بھی اس نے عین اس وقت اس کی جان بچائی تھی، جب وہ ریوالور کی گولی کا نشانہ بننے والا تھا۔ اسے لگا کہ یہ بہت مشکل ہوگا کہ وہ دو بار اپنی جان بچانے والے شخص کے ساتھ کچھ برا کر سکے لیکن یہ بھی تو آسان نہیں تھا کہ وہ آزادی کے اتنے قریب آ کر ایک بار پھر زنداں میں لوٹنے کے لیے تیار ہو جائے۔ نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ریوالور اپنے قبضے میں کر کے کسی طرح رائفل بردار کو زیر کرلے اور ایک بار پھر اس رسی سے لٹک کر اوپر چڑھ جائے جو اسے جیل کی چار دیواری کے دوسری طرف لے جا سکے۔ اس کے اندر چھڑی جنگ شاید اسے آزادی کی طرف جانے والے راستے کا انتخاب کرنے کی راہ دکھاتی لیکن فیصلہ ہونے سے قبل ہی اس نے ایک ہاتھ کو آگے بڑھ کر ریوالور اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ ریوالور اٹھانے والے نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ ”چلو یار! کیا سوچ رہے ہو؟“

سلو کے پاس آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیے اور سر جھکائے آگے بڑھنے لگا۔ چار افراد پر مشتمل اس قافلے کا ہر شخص اردگرد پھیلی افراتفری سے مکمل بے نیاز تھا۔ البتہ ان میں سے ہر ایک کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ جیل انتظامیہ اس وقت پوری طرح متحرک ہو چکی ہے اور مشکل ہی ہے کہ قیدیوں کے فرار کا منصوبہ کامیاب ہو سکے۔

قیدیوں ہی کے حلیے میں موجود ان دو افراد کے زیرِ ہدایت چلتے ہوئے وہ لوگ جیل کی عمارت کے جس حصے میں پہنچے، وہ دفاتر پر مشتمل تھا اور وہ دونوں جس بے دھڑک انداز میں انہیں وہاں لائے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ ان کے جسم پر لباس تو بے شک قیدیوں والا ہے لیکن وہ انتظامیہ سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ایک باوردی اہلکار والے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہونے پر اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سامنے ہی کرسی پر جو شخص براجمان تھا، اس کے بیج پر ڈی آئی جی کے الفاظ کندہ تھے جبکہ ایس پی اور ڈی ایس پی بھی اسی کمرے میں پائے جاتے تھے اور ان کی نظریں اس اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جس پر جیل کے مختلف حصوں کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں حضرات نے کانوں پر ہیڈفون چڑھا رکھے تھے اور وقتاً فوقتاً احکامات جاری کر رہے تھے۔

”کامیاب واپسی مبارک ہو۔“ ڈی آئی جی نے مسکرا کر ان دونوں کا استقبال کیا۔

”آپ کو بھی مبارک ہو سر! آپ کا مجرم آپ کے حوالے ہے اور ہم انعام میں اپنے ساتھ اسے لے جا رہے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔“ رائفل بردار نے جواب دیا تو ڈی آئی جی ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور کچھ افسوس سے بولا۔

”یہ شخص اصل مجرم کہاں ہے؟ اصل مجرم تو ریاض انور ہے جس نے اس جیسے غنڈے کو اپنی ضرورت کے لیے پالا، اپنے کام نکلوائے اور اب اسے یہاں سے نکال لے جانے کے چکر میں تھا۔ اگر کرنل صاحب کی طرف سے اس سازش کا

انکشاف نہ کیا جاتا تو آج غضب ہی ہو جاتا۔ لیکن اب مجھے امید ہے کہ اس جیل سے ایک بھی قیدی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اور ہم اپنی صفوں میں شامل کالی بھیڑوں تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔'' ڈی آئی جی کی زبان سے ریاض انور کا نام سن کر خطرناک صورت قیدی اور سلو دونوں ہی چونک پڑے۔ دونوں ہی کے لیے یہ نام شناسا سا تھا اور فرق صرف اتنا تھا کہ سلو کو علم نہیں تھا کہ اس سب کے پیچھے ریاض انور موجود ہے جبکہ دوسرا جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، ریاض انور کی سرپرستی میں کر رہا تھا۔

''کیوں بھئی شہباز! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟ تمہیں جیل سے فرار کروانے کا یہ منصوبہ تمہارے باس ریاض انور نے ہی بنایا تھا نا اور اس نے ہی تمہیں حکم دیا تھا کہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرتے ہوئے نہایت چالاکی کے ساتھ سلو کو بھی ٹھکانے لگا دینا؟'' ڈی آئی جی نے بالکل اچانک ہی سلو کے ساتھ موجود قیدی کی طرف رخ کرتے ہوئے اس سے کہا تو وہ جواباً خاموش رہا۔ لیکن اس کی جھکی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ جو کچھ کہا گیا، وہ غلط نہیں تھا۔

سلو اس انکشاف کو سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ریاض انور کون ہے اور اس کی ڈوریاں کن ہاتھوں میں ہیں۔ اگر ریاض انور نے اس کے قتل کے احکامات جاری کیے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ یہ حکم وہاں سے صادر ہوا ہے جنہوں نے برسوں اسے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔

''تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتے شہباز! سچ بولو، یہ ریاض انور ہی کا کارنامہ ہے نا؟'' ڈی آئی جی سلو کی کیفیت سے بےخبر فرار کی کوشش کرنے والے قیدی سے مخاطب تھا۔

''اب میں کیا بولوں سر! آپ کو تو لگتا ہے سب بات کی پکی انفارمیشن ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو سیدھے ریاض صاحب کی خدمت میں پہنچتے۔ ان سے اچھا خدمت کا صلہ کوئی نہیں دیتا اور ابھی تو اگر بیچ میں یہ لوگ نہیں کودتے تو ہم انعام کے بھی حق دار ہو جاتے۔ ریاض صاحب نے کہلوایا تھا کہ اس سالے کو اپنے ساتھ بھاگنے کے لیے تیار کرو اور جب یہ راضی ہو کر ساتھ چل پڑے تو عین وقت پر اسے کسی پولیس والے کی رائفل سے اڑا دینا تاکہ ہر طرف یہی خبر پھیلے کہ سلیم عرف سلو جیل سے بھاگنے کی کوشش میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔'' اس نے نہایت بےخوفی سے اعتراف کرتے ہوئے ایک ایسا انکشاف کیا جس نے سلو کو ہلا کر رکھ دیا اور ما... طیش کے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ممکن تھا کہ وہ طیش ... میں شہباز پر ہی حملہ کر دیتا لیکن فوراً ہی ریوالور کی نال اس... کنپٹی سے آ لگی۔

''کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ... شخص نے جو کچھ کیا، اس کی سزا اسے مل جائے گی۔'' ... تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تمہاری قسمت کا فیصلہ ... اور ہوگا۔'' اس کے عقب میں کھڑا ہو کر یہ سب کہنے وا... شخص تھا جس نے کچھ دیر قبل اس کے ریوالور ہتھیانے ... ارادے کو ناکام بنایا تھا۔ سلو دوسری بار اس کے ا... ارادے کی راہ میں رکاوٹ حائل کرنے پر اندر سے جھنجلا... رہ گیا لیکن فی الحال کچھ کرنے سے قاصر تھا، اس لیے خامو... ہی بہتر تھی۔

''او کے سر! ہمارا کام مکمل ہوا، ہم چلتے ہیں۔ امید ... کہ آپ اپنے معاملات خود بہتر طور پر نمٹا لیں گے۔'' رائفل بردار نے ڈی آئی جی سے اجازت چاہی۔

''شیور۔'' ڈی آئی جی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، ... مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ''کرنل صاحب کا ایک... پھر میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔ یہ ان کی مہربانی ہے... آئی جی صاحب کی غیرموجودگی میں مجھ پر آنے والی یہ بلا... گئی۔'' وہ بہت ممنون دکھائی دے رہا تھا اور اسے ہونا ... چاہیے تھا کہ آئی جی صاحب ہفتے بھر کے لیے چھٹی لے کر... چیک اپ کروانے بیرونِ ملک گئے ہوئے تھے اور ان... غیرموجودگی میں جو کچھ بھی ہوتا، اس کی ذمے داری اس... شانوں پر ہی آ جاتی۔

ڈی آئی جی سے الوداعی کلمات ادا کر کے وہ دونو... سلو اور شہباز کو لے کر باہر نکلے تو باہر بہت سے پولیس وا... ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان میں ... ایک نے آگے بڑھ کر شہباز کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈ... اور پھر وہ تین چار افراد کے ٹھڈوں اور لاتوں کی برسات م... وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ ان تینوں کے ساتھ صرف پولیس والے باقی رہ گئے۔

''اسے بھی ہتھکڑی لگانی ہے سر؟'' ایک پولیس وا... نے سلو کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، اسے ہم مہمان بنا کر لے جا رہے ہ... اور مہمانوں کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاتی۔'' رائفل بردار... جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سر! جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کے...

گاڑی تیار ہے۔'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا اور پھر ان تینوں کو اپنی راہنمائی میں لے کر آگے بڑھا۔ سلو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ اندر کمرے میں ہونے والی گفتگو سے اس نے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ اب اس کا واسطہ فوج سے پڑنے والا ہے لیکن وہ لوگ اس پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے تھے؟ یہ اپنی جگہ ایک الجھن تھی۔

جدید ماڈل کی اس گاڑی کے شیشے بلٹ پروف اور ٹنٹڈ تھے چنانچہ باہر سے کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا کہ گاڑی میں تین ایسے افراد سوار ہیں جن کے جسموں پر قیدیوں والا لباس ہے۔ گاڑی انہیں لے کر وہاں سے روانہ ہوئی تو جیل میں مچی بھگدڑ میں خاطرخواہ کمی ہو چکی تھی اور لگتا تھا کہ جیل حکام حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ سلو نے گیٹ سے باہر گاڑی نکلنے پر حیرت زدہ نظروں سے ان راستوں پر نظر دوڑائی جس پر لوگ آزادانہ چلتے پھرتے تھے لیکن وہ اس آزادی سے محروم تھا اور کچھ دیر قبل دوبارہ مرنے سے بچنے کے بعد ایک بلٹ پروف گاڑی میں، انجان لوگوں کے ساتھ نہ جانے کس انجان منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''نئی زندگی مبارک ہو۔'' اسپتال کے خنک اور اجلے ماحول میں آنکھ کھلنے پر مشابرم خان نے میجر اسفند یار کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے چہرے پر بڑی جان دار اور پُرخلوص مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اپنائیت کا احساس تھا۔

''شکریہ میجر صاحب۔'' مشابرم خان جواب میں محض اتنا ہی کہہ سکا۔

''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میجر اسفند کرسی سرکا کر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بہت زیادہ نقاہت محسوس کر رہا تھا لیکن اظہار ضروری نہیں سمجھا۔

''تم قابلِ فخر ہو مشابرم خان! تم نے جس طرح اپنی جان کی بازی لگا کر اس بھیڑیے کو ہم تک پہنچایا ہے، اس کے لیے ہم سب تمہارے احسان مند ہیں۔'' میجر کے لہجے میں عقیدت تھی۔

''میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے اور اگر فرض کی ادائیگی میں میری جان بھی چلی جاتی تو مجھے غم نہیں ہوتا۔ بیکار بیٹھنے سے کچھ کر کے مرجانا بہتر ہوتا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں پہلا طویل جملہ بولا۔

''جان دینا اور لینا ہمارے ہاں اب کوئی بڑی بات نہیں رہی ہے۔ لوگ معمولی رقم سے لے کر مذہب، سیاست، زبان، غیرت اور جانے کن کن بنیادوں پر اس مشکل مرحلے سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جنہیں اس بات کا ادراک ہو کہ وہ جان جیسی قیمتی شے کی بازی ناحق نہیں لگا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم اس حال کو کس وجہ سے پہنچے تھے؟ تمہیں اس خنجر سے زخم لگا تھا جس کی زد میں لے کر تم بشیر اکبر کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر ہم تک لائے تھے۔ وہ خنجر زہر آلود تھا اور اس کا زہر تمہارے سارے جسم میں پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹرز کو تمہاری جان بچانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کرنی پڑی ہیں تب جا کر تم نے آنکھیں کھولی ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ خنجر زہر آلود ہے۔ اسے میں نے بشیر اکبر کے ملازم سے چھینا تھا اور اس سے جھڑپ کے دوران ہی مجھے زخم آیا تھا۔'' اسے سمجھ آنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں وہ خنجر دیکھ کر بشیر اکبر اتنا خوف زدہ کیوں ہو گیا تھا کہ بے چون و چرا اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا چلا گیا تھا۔ خود اپنی کیفیت بھی اسے سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ جسم میں سرایت کرتے زہر کا ہی اثر تھا کہ وہ نڈھال سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت تو اس نے اپنی کمزوری کے بارے میں یہی گمان کیا تھا کہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ایسی کیفیت ہو رہی ہے لیکن اب حقیقت کھلی تو دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے اس پر احسان کیا اور قوتِ ارادی کو اتنی مضبوطی بخشی کہ وہ حالات سے بخیر و خوبی نمٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

''ہم بھی خنجر کے بارے میں نہیں جانتے تھے لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر نے تمہیں دیکھتے ہی کیفیت سے اندازہ لگا لیا کہ تم پر زہر کا اثر ہوا ہے۔ بعد میں بشیر اکبر سے تفتیش کی تو اس نے خنجر کی حقیقت بتائی۔ اس قسم کے خنجر اس کے چند مخصوص محافظوں وغیرہ کے پاس ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حلف اٹھا رکھا ہے کہ بشیر اکبر کے حکم پر اور اس کی حفاظت کی خاطر وہ اپنی جان قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ ان لوگوں کو وہ اپنے خاص کاموں کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔ ان لوگوں کی اس نے اس طرح برین واشنگ کر رکھی تھی کہ اگر ان کے لیے اپنے مشن سے صحیح سلامت واپس لوٹنا ممکن نہ ہو اور پکڑے جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو وہ بلاجھجک خودسوزی کر ڈالتے تھے۔ اسی لیے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ آج کل لوگوں کے لیے جان لینا اور دینا دونوں ہی بڑی بات نہیں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور میں اللہ کا شکرگزار

ہوں کہ میرا شمار ان خوش قسمتوں میں ہوتا ہے۔'' کمزوری اور خون کی کمی سے زرد پڑتے مشابرم خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔ البتہ میجر اسفند کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بڑی جان دار اور بھرپور تھی۔

''تم خوش قسمت بھی ہو اور دلیر بھی ورنہ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی کہ بشیر اکبر کو اس کی کچھار سے یوں نکال لایا جائے کہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو۔'' میجر نے ایک بار پھر کھل کر اسے سراہا۔

''لیکن بعد میں تو ہنگامہ کھڑا ہوا ہوگا۔ اس کے محافظوں کے انجام اور میرے فرار نے بہت سے سوال اٹھائے ہوں گے۔ کیا اس صورت حال پر اس کے عقیدت مند مشتعل نہیں ہوئے؟'' وہ جسمانی طور پر نڈھال تھا لیکن دماغ نے تیزی سے کام شروع کردیا تھا اس لیے اس قابل تھا کہ سوالات اٹھا سکے۔

''اس سلسلے میں ہماری بشیر اکبر کے نائب سے ڈیل ہو گئی ہے۔ وہ اپنے لوگوں کو یقین دلادے گا کہ بشیر اپنی مرضی سے گیا ہے۔ بشیر کے بعد اسے وہاں اتنا اثر رسوخ حاصل ہے کہ اگر کچھ لوگوں کو شک ہوا بھی تو وہ کچھ نہیں کرسکیں گے۔ اگر کسی نے اس کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کا نام و نشان مٹادے گا۔''

''لیکن وہ اس بات پر راضی کیسے ہوا؟'' مشابرم خان کو حیرت ہوئی۔

''اقتدار کے لالچ میں۔'' میجر مسکرایا۔ ''تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے اپنے خون کے رشتوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ ایسے میں اگر بشیر اکبر کے نائب نے ہمارے ساتھ سازباز کرلی تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔''

''میں پھر بھی حیران ہوں کہ یہ ڈیل ہوئی کیسے؟'' مشابرم خان کی الجھن وحیرت اپنی جگہ قائم تھی۔

''اس کے لیے مجھے تمہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا ہوگا۔ تم نے جو عرصہ اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے گزارا ہے، اس عرصے میں ہم نے بشیر کے سارے کس بل نکال کر اس سے نہ صرف بہت سی معلومات حاصل کی ہیں بلکہ معاملات کو بھی تیزی سے نمٹایا ہے۔ بشیر نے اعتراف کیا ہے کہ وہ نسلاً یہودی ہے اور بچپن سے اسے ایسی تربیت دی گئی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہر بات کا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ نوعمری میں ہی اپنے بزرگوں اور مذہبی پیشوا کے سامنے اس بات کا عہد کرچکا تھا کہ عظیم اسرائیل کی خاطر اپنی زندگی وقف کردے گا اور یہود کے سب سے بڑے دشمن مسلمین کو نیست ونابود کرنے کے لیے ہر وہ کام کرے گا جو اس کے لیے ممکن ہو۔ اپنی مخصوص تربیت اور ارادوں کے ساتھ اس نے بہت نوعمری میں یہاں ڈیرا جمالیا اور اپنی چالاکی اور ذہانت سے کام لے کر آہستہ آہستہ ایسا مقام حاصل کرلیا کہ بے شمار لوگ اس کے سحر میں گرفتار ہوگئے۔ وہ ان سحر زدہ لوگوں کو اسلام کے نام پر ایسی تعلیمات دیتا رہا جن سے اسلام کا دور تک تعلق نہیں تھا لیکن اس نے اتنی ہوشیاری سے اس کام کو انجام دیا کہ معصوم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ کوئی ان کی برین واشنگ کرکے انہیں اسلام کی حقیقی روح سے دور کرتا چلا جارہا ہے۔ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھی بھی تو اسے گمراہ ومتعصب قرار دے کر اس کے خلاف نام نہاد جہاد کا اعلان کردیا گیا۔ غرضیکہ بشیر ایک بڑے طبقے کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہوکر ایک طرف تو اسلام دشمنی نبھاتا رہا اور دوسری طرف اس نے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے در پے را والوں سے بھی سازباز کرلی اور نہایت کامیابی سے ڈبل ایجنٹ کے ساتھ ساتھ مذہبی راہنما کا رول بھی ادا کرتا رہا۔ یہاں گزرنے والے طویل عرصے میں اس نے پاکستان اور پاکستانیوں کا بڑا نقصان کیا۔ پہاڑوں میں دہشت گردوں کی تربیت کے لیے جو کیمپ قائم کیا گیا تھا، اس کیمپ کے قیام میں بھی بشیر نے خاصی مدد کی تھی۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم اس کیمپ کی تباہی کے براہِ راست ذمے دار ہونے کے باوجود کسی کی نظر میں نہیں آئے تھے ورنہ شاید بلتستان میں قدم رکھتے ہی دھر لیے جاتے اور بشیر پر قابو پانا تو دور کی بات، خود اپنا بچاؤ بھی نہ کرپاتے۔'' میجر اسفند کی بات نے اسے اپنا بلتستان کا پچھلا دورہ یاد دلادیا۔ زندگی کا وہ حصہ اس کے دل پر ایسے زخم لگا گیا تھا جو شاید کبھی نہ بھر پاتے۔ اس نے پناہ کی تلاش میں بھٹکتی ماہ بانو کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن قسمت کی ماری ماہ بانو وہاں بھی محفوظ نہ رہ سکی اور اسے اغوا ہونے سے بچانے کے لیے اس کے بھائی اکرم خان نے اپنی جان قربان کردی۔ جوان بیٹے کی موت نے ماں کو غم سے ایسا نڈھال کیا کہ وہ ہوش حواس کھو کر کومے میں چلی گئی اور آخرکار اپنی جان کی بازی بھی ہار گئی۔ غصے اور غم میں مبتلا مشابرم خان نے اس وقت ایک عالم جنون میں برف پوش پہاڑوں میں واقع اس تربیتی کیمپ تک رسائی حاصل کی تھی اور اتفاق اور خوش قسمتی کے باعث تن تنہا اس کیمپ کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ آج اسے بتایا جارہا تھا کہ اس کیمپ کو قائم کرنے میں مدد دینے والوں میں ایک بشیر بھی تھا اور اسے خوشی تھی کہ اپنی جان کی بازی لگا کر وہ برسوں سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر بھرتے اس شاطر سانپ کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

''بشیر جو کچھ کررہا تھا وہ مکمل طور پرون مین شو تھا۔ اس نے اپنے قرب وجوار میں موجود کسی شخص، یہاں تک کہ اپنے نائب کو بھی اپنی حقیقت کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ یہاں جو لوگ اس کے معتقد تھے، وہ بھی بس اس حد تک اسے جانتے تھے کہ بشیر اکبر یک ایسا فرڈ ہے جو مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنارہا ہے اور اپنے جھوٹے زہد وتقویٰ کا جال بچھا کر لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو وہ دونوں ہاتھوں سے دولت کما کر خوب عیاشی کررہا تھا اور دوسری طرف اعلیٰ طبقے اور حکومتی حلقوں میں اپنا اثر رسوخ بھی قائم کررکھا تھا۔ اس کے کردار سے واقف ہونے کے باوجود اس کے معتقدین ومقربین کو اس پر اس لیے کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ انہیں بھی خوب عیاشی کرواتا تھا اور دل کھول کر نوازتا تھا۔ اس بات کا تو کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اسرائیلی و بھارتی ایجنٹ ہے۔ حقیقتاً وہ اتنا شاطر تھا کہ لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچانے کے باوجود انہیں اپنے اصل عزائم اور مقاصد کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے اتنے بہت سے سال اسرائیل کی خدمت میں صرف کرکے اپنے آقاؤں کو بے تحاشا خوش کررکھا تھا، چنانچہ ان کی طرف سے بھی اسے خوب نوازا جاتا تھا۔ اسرائیل میں اس کے خاندان کو بھی خصوصی رعایت ومراعات حاصل تھیں۔ اس کے اہلِ خانہ کئی بار جعلی پاسپورٹ اور دستاویز کے ذریعے پاکستان آکر اس سے ملاقات کرچکے تھے جبکہ وہ صرف دو بار اسرائیل گیا تھا۔ ایک بار اپنی شادی کے لیے اور دوسری بار اپنے باپ کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے۔ ظاہر ہے دونوں جانب سے ہونے والی یہ آمدورفت براہِ راست اسرائیل اور پاکستان کے درمیان نہیں تھی بلکہ وہ لوگ ہمیشہ کسی دوسرے ملک کے شہری کی حیثیت سے سفر کرتے تھے۔ بشیر کی بیوی نے اس کے اہلِ خانہ میں سے سب سے زیادہ پاکستان کا سفر کیا اور ہمیشہ کسی نہ کسی مذہبی جماعت کے ساتھ باپردہ عرب مسلمان عورت کے روپ میں یہاں آئی۔ یہاں اس نے طویل دنوں کے لیے قیام کیا جس کے نتیجے میں ان کے ہاں تین اولادیں بھی پیدا ہوئیں۔ ان

بچوں کو بھی بشیر اکبر کی طرح ہی اسرائیل میں خصوصی تعلیم و تربیت دی جارہی ہے۔ بشیر کی بیوی بھی اسی کی طرح کٹر یہودی ہے اور اسے شوہر کی بہت کم رفاقت میسر آنے کے باوجود اس بات پر فخر ہے کہ اس کا شوہر اپنے مذہب اور وطن کی خاطر بے شمار قربانیاں دے رہا ہے۔ ہم نے نہ صرف یہ ساری معلومات بشیر سے اگلوائیں بلکہ اس کی ویڈیو بھی تیار کی۔ اس ویڈیو نے ہمارا کام بہت آسان کردیا اور ہم اس کے نائب کو اپنا ہم نوا اور رازدار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ تم بے ہوش تھے ورنہ بہت سے حالات سے میرے بتائے بغیر بھی واقف ہوجاتے۔ بشیر کے غیاب پر بہت سی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ کسی کا خیال تھا کہ جیسے وہ ماضی میں پہلے بھی دو بار غائب ہوکر واپس آگیا تھا، ویسے ہی اس بار بھی ہوگا۔ کچھ لوگ جو اندر کے حالات سے واقف تھے، اسے بشیر کا اغوا قرار دے رہے تھے اور اس اغوا کا ذمے دار تمہیں ہی ٹھہرایا جارہا تھا کیونکہ تم پراسرار طور پر اسپتال سے غائب تھے۔ البتہ اس کے نائب نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ اس خبر کو عوامی حلقوں تک نہیں جانے دیا اور کسی بڑے ہنگامے سے بچنے کے لیے خود ہی انتظامیہ سے مذاکرات میں مصروف تھا۔ شروع میں اس نے بہت شور مچا رکھا تھا کہ کسی بھی طرح بشیر کو بازیاب کروایا جائے ورنہ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر پورے علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہم نے محسوس کرلیا کہ وہ بشیر کا اتنا وفادار نہیں جتنا ظاہر کررہا ہے بلکہ ایک طرح سے اس کی خواہش ہے کہ بشیر غائب ہی رہے تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح کل اختیارات اسے حاصل ہوجاتے۔ ہم نے اس کے دل کے اس چور کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے جب بشیر کی حقیقت کا علم ہوا تو سناٹے میں رہ گیا اور برملا اعتراف کیا کہ اس کے ساتھ مل کر عوام کو دھوکا دینے کے باوجود وہ قطعی واقف نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے یہودی کا آلۂ کار بنا ہوا ہے جو بیک وقت اسرائیل اور بھارت کا ایجنٹ ہے۔ اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ اس معاملے کو اتنی خوبی سے سنبھال لے گا کہ کسی کو شک بھی ہوا تو اظہار نہیں کرسکے گا۔ ہم نے کچھ شرائط اور ضوابط کے ساتھ اس سے معاملات طے کرلیے۔ اب وہ بشیر کی جگہ سنبھالے گا اور عبادت گاہ کے تمام معاملات اس کے ہاتھ میں رہیں گے۔''

میجر اسفند نے اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی تشویش کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگیا۔

’’یہودی بڑی منصوبہ ساز قوم ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے یہاں اپنا اتنا بڑا سیٹ اپ قائم کیا اور اسے اس حال میں چھوڑ دیں کہ بشیر کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے۔ اصولاً تو یہاں اس کے بعد اس کی جگہ سنبھالنے کے لیے کسی اور کو موجود ہونا چاہیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا نائب ہی اس کا جانشین ہو اور بظاہر ہم سے معاہدہ کر کے اسرائیل سے وفاداری نبھاتا رہے؟‘‘

’’تمہاری تشویش درست ہے لیکن غلطی کی گنجائش ہر جگہ ہوتی ہے۔ بشیر کا نائب بھی تیار کیا جارہا تھا لیکن یہاں نہیں تل ابیب میں۔ بشیر کی خواہش تھی کہ اس کے بعد اس کی جگہ اس کا بیٹا لے۔ اگلے سال وہ اپنے بیٹے بلکہ پوری فیملی کو یہاں بلوانے والا تھا۔ وہ لوگ ایک ایسے فلسطینی خاندان کی صورت میں یہاں آکر آباد ہوتے جس کا سربراہ اسرائیلی جارحیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس طرح بشیر کو اپنے خاندان سے قریب رہنے کا موقع بھی مل جاتا اور وہ اپنے بیٹے کو اپنی جگہ دینے کی راہ بھی ہموار کر لیتا۔ لیکن یہ ہماری خوش قسمتی رہی کہ یہ مرحلہ آنے سے قبل ہی اس کی حقیقت ہمارے سامنے آگئی اور اب وہ اپنے انجام تک پہنچنے کے لیے ہماری گرفت میں ہے۔‘‘

’’اور اگر اسرائیل نے اس کے نائب کو لالچ اور دباؤ کے ذریعے اپنے دام میں پھنسالیا تو؟‘‘ اس کے پاس ایک اور اندیشہ تھا۔ میجر اسفند ہنس پڑا۔

’’تم تو حد سے زیادہ محتاط اور دور اندیش آدمی ہو یار... لیکن فکر نہیں کرو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اب چونکہ یہ معاملہ ہمارے سامنے آگیا ہے اس لیے ہم کڑی نگاہ رکھیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ اب عبادت گاہ اور اس سے متعلق ہر اہم شخص چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی میں رہے گا۔‘‘ اس نے مشابرم خان کو تسلی دی۔ ’’اب اگر تمہاری تشفی ہو گئی ہو تو مجھے اجازت دو۔ کوئی اور بھی ہے جو میرے بعد تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ میجر صاحب! میں نے واقعی آپ کا بہت وقت لے لیا۔‘‘ اس بار مشابرم خان جھینپ گیا۔

’’اٹس اوکے مین! تم نے جو کچھ کیا، وہ اتنا قابلِ قدر ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں کسی بڑے قومی اعزاز سے نوازنے کی سفارش کرتا۔ لیکن یہ بھی ہماری قسمت کا کھیل ہے کہ قوم و وطن کی خاطر بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کی ایک بڑی تعداد کو منظر پر نہیں لایا جا سکتا۔‘‘ میجر اسفند نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے شانے پر تھپکی دی اور باہر نکل گئے۔ ان کے باہر جانے کے لمحہ بھر بعد ہی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس کھلے دروازے سے گل مینا بہار کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مشابرم خان کے ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ پھیل گئی جبکہ گل مینا اس کے قریب آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

’’ادھر آؤ میرے پاس، رو کیوں رہی ہو؟‘‘ اس نے محبت سے گل مینا کو پکارا تو وہ اس کے کچھ اور قریب چلی آئی لیکن ساتھ ہی آنسوؤں کی روانی میں بھی مزید اضافہ ہو گیا۔ مشابرم خان نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

’’اس بار تو میں تمہیں بتا کر گیا تھا پھر کیوں رو رہی ہو؟ کیا میرے بتا کر جانے کے باوجود تمہیں یہ ڈر تھا کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہوں؟‘‘ اس نے پوچھا تو گل مینا شدت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

’’اگر تم اس طرح روتی رہیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔‘‘ اس کے تسلسل سے بہتے آنسوؤں کو روکنے کے لیے اس نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا جو کارگر رہا اور گل مینا نے بڑی جدوجہد سے اپنے جذبات کو قابو میں کر کے آنسوؤں کو مزید امڈنے سے روک لیا۔ آنسو رکے تو وہ زبان سے کچھ کہنے کے لائق ہوئی۔

’’آپ مجھے یہ تو بتا کر نہیں گئے تھے کہ اس حال میں واپس آئیں گے۔‘‘ رندھی ہوئی آواز میں اس کے لبوں پر شکوہ مچلا جسے سن کر مشابرم خان کے ہونٹوں سے ایک گہرا سانس خارج ہوا اور اسے سمجھ میں آنے لگا کہ گل مینا کیوں رو رہی ہے۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ اور ہراساں ہو گئی تھی۔

’’دیکھو گل! یہ سب میری زندگی کا حصہ ہے۔ میں لوگوں کو اس حال تک پہنچاتا بھی ہوں اور خود بھی اس حال کو پہنچ جاتا ہوں۔ تم یوں سمجھ لو کہ میں جس کھیل میں ملوث ہوں، اس میں انسان کو اپنی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے اور جان کی بازی لگانا ہمارے لیے کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کے کتنے مرد ہیں جو دیامیر (نانگا پربت) سر کرنے والوں کے جنون کا ساتھ دینے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر، پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس جنون میں میرے باپ، بھائیوں سمیت ہمارے کتنے پیارے اپنی جان گنوا چکے ہیں۔ ماں نے مجھے ان خطروں سے بچانے کے لیے ہی یہاں سے دور بھیج دیا تھا لیکن میری رگوں میں جو خون ہے، وہ کیسے مجھے سکون سے بیٹھنے دیتا۔ میں بے جان پہاڑوں سے گریز کر کے نکلا تو ایسے انسانوں سے ٹکرانے پر مجبور ہو گیا جو سینے میں دل کی جگہ پتھر لے کر گھومتے ہیں اور انسان ہونے کے باوجود انسانیت کی تذلیل کرتے ہیں۔ میں بہت چھوٹا آدمی ہوں اور میری کوئی حیثیت بھی نہیں، اس کے باوجود میرا خود سے یہ عہد ہے کہ زندگی میں جب جب ان انسان دشمنوں سے سامنا ہوگا، میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے کے بجائے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کروں گا۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میں کچھ غلط نہیں کر رہا ہوں بلکہ جب میں مروں گا تو میرے پاس یہ فخر ہوگا کہ میں نے اپنے وطن اور انسانیت کی بہبود کے لیے اپنی جان دی ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم مجھ جیسے سرپھرے کا ساتھ دینا چاہتی ہو یا نہیں۔ لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میرے ساتھ رہنے کی صورت میں تمہیں بار بار ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور آج کے بعد میں یہ قطعی پسند نہیں کروں گا کہ کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھوں۔ عورت کے آنسو مرد کو کمزور کر دیتے ہیں اور میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔‘‘ اس نے گفتگو کا آغاز تو بہت نرمی سے کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا لہجہ خود بخود ہی سخت ہوتا چلا جارہا تھا اور اس کے ہر لفظ کے ساتھ گل مینا اپنے اندر حیرت انگیز تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ مشابرم خان خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں کی سطح بالکل خشک ہو چکی تھی اور گلے میں پھنسا آنسوؤں کا پھندا بھی کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت صاف اور واضح تھا۔

’’میں تمہارے ساتھ رہوں گی خان اور یہ میرا وعدہ ہے کہ آج کے بعد تم کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھو گے کیونکہ میری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تمہاری رگوں میں ہے۔ وقت تم پر ثابت کر دے گا کہ صرف پہاڑوں کے بیٹوں کے حوصلے ہی بلند نہیں ہوتے بلکہ بیٹیاں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں۔‘‘ وہ ایسے عزم اور حوصلے سے بول رہی تھی کہ مشابرم خان بھی چند لمحوں کے لیے اس کا منہ تکتا رہ گیا اور اس کے دل میں خیال آیا کہ وطن عزیز کے خلاف سازش کرنے والے یہود و ہنود اگر اس کم عمر لیکن بلند ہمت عورت کو دیکھ لیں تو جان لیں گے کہ بشیر اکبر جیسے پٹھوؤں کے سہارے وہ [illegible] کتنے بھی جال بچھائیں، کامیاب بہرحال نہیں ہوں گے کہ بشیر اکبر جیسے تو برسوں کی عیش و عشرت کی زندگی کے نتیجے میں اتنے کمزور اور بودے ہو چکے ہوتے ہیں کہ چار ہاتھ [illegible] پڑا [illegible] سب، گل ڈالتے ہیں اور یہاں ایک عورت کا عزم بھی ایسی مضبوط چٹان کے مانند تھا کہ اس سے ٹکرانے والے لہولہو ہو جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

’’مجھے تم پر فخر ہے گل مینا! اللہ کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے تم جیسی باہمت عورت کا ساتھ دیا۔ اپنے اس وعدے کو زندگی بھر یاد رکھنا۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی کسی دوسری عورت کو تمہاری جگہ نہیں دوں گا۔‘‘ اس نے گل مینا کے ہاتھ کو زور سے دبا کر کھینچا لیکن پھر خود ہی کراہ اٹھا کہ زخم زخم وجود کسی بے احتیاطی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ادھر گل مینا کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی اور چہرے پر وہ سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے جو سورج نکلتے سے دیامیر کی چوٹیوں پر بکھرتے ہیں۔

☆☆☆

’’تم کب تک میرے سر پر مسلط رہو گے؟‘‘ ریاض انور نے اپنے ساتھ چلتے نوجوان سے برہم لیکن دبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کے ساتھ چلنے والا یہ نوجوان سی ایف پی کا اہلکار تھا جو منصوبے کے مطابق ریاض انور کے ساتھ اس کی کوٹھی میں اس طرح نازل ہوا تھا کہ ریاض انور کو سب پر یہ ظاہر کرنا پڑا تھا کہ اسے ویران سڑک پر بے ہوش حالت میں پا کر اس نوجوان نے اس کی مدد کی اور وہیں مرنے کے لیے پڑا چھوڑنے کے بجائے ہوش میں لا کر یہاں تک لایا۔ راستے میں نوجوان سے گفتگو کے دوران اسے معلوم ہوا کہ وہ پڑھا لکھا لیکن بے روزگار ہے تو اس کا احسان چکانے کے لیے فوراً اپنے مشیر کی حیثیت سے اسے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ جسے ظاہر ہے نوجوان نے قبول کر لیا اور اب وہ مشیر ہر وقت اس کے ساتھ دیکھا جارہا تھا۔ ریاض کی معلومات کے مطابق اس کا نام سہیل تھا اور وہ دل میں اس سے بہ حد چڑنے کے باوجود سب پر یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ اپنے کیے گئے احسان کے بدلے وہ نوجوان اسے دل و جان سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ سہیل مستقل اس کے قریب دیکھا جارہا تھا۔ کسی شدید ضرورت کے تحت چند منٹوں کے لیے وہ اسے تنہا چھوڑتا بھی تھا تو ایسے وقت میں بھی وہ مکمل آزاد نہیں ہوتا تھا بلکہ جانتا تھا کہ ایک ڈیوائس کے ذریعے اس کی حرکات و سکنات کی نگرانی کی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آقاؤں کو اپنے حالات کے بارے میں آگاہ کر پاتا۔ ویسے بھی سی ایف پی والوں نے اس کے ہاتھ پیر مکمل طور پر باندھ دیے تھے۔ ایک طرف اسے اپنی اکلوتی بیٹی کی طرف سے خطرات لاحق

تھے تو دوسری طرف اپنے اس اعترافی بیان کے سامنے آنے کا خدشہ تھا جو اس نے سی ایف پی کی تحویل میں رہ کر دیا تھا۔ یہ سب خطرات نہ بھی ہوتے تو وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق خفیہ ملکی ادارے کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے پاس کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی .... فی الحال وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی مدد سے بھی یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس لیے مجبور تھا کہ اس سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر بے چون و چرا اسے عمل کرتا جائے۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے آدمیوں کو جیل سے فرار اور سلو کے قتل کے احکامات جاری کر دیے تھے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کرنے سے اس کے سر پر سوار لوگوں کو کیا حاصل ہوگا؟ انہی لوگوں کی ہدایت پر اس نے اپنی ساری سرگرمیاں موقوف کر دی تھیں اور صرف ایک بار میڈیا کو اپنے اغوا برائے تاوان کی کہانی سنانے کے بعد شدید اعصابی دباؤ میں ہونے کا بہانہ کر کے زیادہ تر وقت اپنی خواب گاہ میں گزار رہا تھا۔

سہیل اس کا چہیتا بنا یہاں بھی اس کے آس پاس موجود رہتا تھا۔ مزاج پرسی کے لیے آنے والے مہمانوں اور فون کالز کے سلسلے میں بھی وہ ہی فیصلہ کرتا تھا کہ کس کو ریاض انور تک رسائی حاصل کرنے دی جائے اور کس کو نہیں۔ اس جکڑ بندی نے ریاض انور کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی اپنے قریب نہیں رہنے دے رہا تھا اور ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خواب گاہ میں آنے پر چند منٹوں میں ہی واپس بھیج دیتا تھا۔ اس کی بیوی بے چاری کو عادت تھی کئی کئی راتیں شوہر کے بغیر گزارنے کی۔ وہ ایسا مصروف رہتا تھا کہ اسے مشکل سے ہی اپنی خواب گاہ کا رخ کرنے کی مہلت ملتی تھی لیکن اس بار عجب تماشا ہوا تھا کہ وہ خود تو مستقل خواب گاہ میں مقیم تھا لیکن بیوی کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اس کی وسیع و عریض کوٹھی میں کمروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بیوی کسی بھی دوسرے پرتعیش کمرے میں مزے سے سو سکتی تھی لیکن اندر ہی اندر تلملائی ہوئی تھی کہ اس طرح خواب گاہ سے باہر کیے جانے پر اس نے ملازمین کے سامنے سبکی محسوس کی تھی۔ ریاض انور کو اس کے احساسات کی فی الحال کوئی فکر نہیں تھی بلکہ وہ تو اس چکر میں تھا کہ کسی طرح سر پر مسلط مصیبت سے جان چھڑائی جائے۔ طبیعت بہت الجھی تو اس نے سہیل سے لان میں چہل قدمی کی فرمائش کر دی جسے اس نے قطعی رد نہیں کیا اور اب وہ دونوں کچھ اس طرح لان میں ٹہل رہے تھے جیسے دونوں کے درمیان بڑی خوش گوار گفت و شنید ہو رہی ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ ریاض انور اس پر اپنی جھلاہٹ نکال رہا تھا۔

”آپ تو بڑے کمزور اعصاب کے نکلے ریاض صاحب! میرا خیال تھا کہ را والوں نے آپ کا انتخاب کیا ہے تو کچھ دیکھ بھال کر ہی کیا ہوگا لیکن آپ تو ذرا سی مشکل پڑنے پر ہی ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔“ اس نے چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ ریاض انور کو جواب دیا۔

”بار بار مجھے را کا طعنہ مت دیا کرو۔ تم ان کا ذکر کیے بغیر بھی بات کر سکتے ہو۔“ وہ بگڑا۔

”عجیب آدمی ہو دوستوں کا ذکر سن کر چڑتے ہو یا پھر اس لیے ناراض ہو کہ تمہارے بخیر و عافیت واپس آنے پر ان میں سے کسی نے اب تک تمہیں ایک فون تک نہیں کیا۔“ اس نے مزید اسے سلگایا۔

”وہ میرے باپ کے سگے نہیں ہیں جو خیر خیریت پوچھنے کے لیے مجھے فون کریں۔ انہیں کام ہوتا ہے تو رابطہ کرتے ہیں۔“ ریاض نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

”تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہاری را والوں کے کسی ٹھکانے سے واقفیت نہیں ہے اور میں تمہارے ذریعے ان تک نہیں پہنچ سکتا۔“

”یہ بات میں پہلے ہی تمہارے بھائی بندوں کو سمجھا چکا ہوں۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو وہ دیگر باتوں کی طرح یہ بات بھی مجھ سے اگلوا لیتے۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا جس پر سہیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے اچھی طرح ریاض انور کی وہ حالت یاد تھی جب وہ سی ایف پی کے جوانوں کے ہاتھوں بھیگی بلی بنا سب کچھ فرفر بتا رہا تھا۔ مجبور تو خیر وہ اب بھی تھا کہ اپنے گھر میں ہوتے ہوئے اپنی مرضی کرنے سے قاصر تھا لیکن یہاں پھر بھی شاید اسے امید تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بچاؤ کا کوئی راستہ نکال لے گا اس لیے پہلے کے مقابلے میں کم دباؤ میں محسوس ہو رہا تھا۔

”میں اپنی بیوی اور بیٹی کو یہاں سے کسی دوسری جگہ شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔“ کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتے رہنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”کر دینا۔ کل تک رک جاؤ۔“ خلاف توقع سہیل نے کوئی اعتراض کرنے کے بجائے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ ریاض کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ اتنی آسانی سے راضی ہو گیا، ساتھ ہی اسے خوشی بھی تھی۔ بیوی اور بیٹی کو یہاں سے محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کے بعد اس کے لیے تنہا یہاں سے بھاگ نکلنا نسبتاً آسان ہوتا۔ اس نے اپنے ذہن میں سارا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کر اپنی فیملی سمیت بیرون ملک منتقل ہو جاتا۔ روپے پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو دنیا کے کسی بھی حصے میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔ یہ بات تو اسے ویسے بھی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ پاکستان میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی ہے اور وہ یہاں رہ کر مزید لوٹ مار نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ آٹھ دس سال کے لیے منظر سے ہٹ جاتا اور کسی مضبوط کہانی کے ساتھ واپس آتا تو اپنے خلاف موجود ثبوتوں کو رد کر کے دوبارہ سیاست کے میدان میں اپنے قدم جما سکتا تھا۔

”تمہارے خیال میں پاکستان کو چھوڑ کر کہیں اور رہنے کے لیے کون سا ملک سب سے بہتر ہے؟“ سہیل نے اچانک یہ سوال کر کے اسے حواس باختہ کر دیا اور اسے یوں لگا کہ وہ اس کی حرکات و سکنات کے ساتھ ساتھ سوچوں پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔

”تم مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تمہارا باہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دنیا کے اتنے ملک دیکھ چکے ہو اس لیے میں نے پوچھ لیا۔“ اس کی بوکھلاہٹ سے بے نیاز سہیل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کا انداز واقعی ایسا تھا جیسے بنا کسی سبب برسبیل تذکرہ یہ سوال کر بیٹھا ہو۔ ریاض انور کچھ دیر تو اسے مشکوک نظروں سے گھورتا رہا پھر سر جھٹک کر بولا۔

”اگر آدمی کے پاس دولت ہو تو پاکستان سمیت تمام پسماندہ ممالک کو چھوڑ کر دنیا میں کہیں بھی مزے سے رہا جا سکتا ہے۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا تنفر تھا جسے سہیل نے شدت سے محسوس کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں تو تم جیسے لوگ صرف دولت لوٹنے کے لیے رہتے ہیں۔“ اس نے بھی ریاض انور کے لیے اپنے دل میں موجود نفرت کو چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر کلائی پلٹ کر رسٹ واچ میں ٹائم دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے اب تک کھیل شروع ہو چکا ہوگا۔ آؤ تمہارے بیڈروم میں چل کر ٹی وی پر دیکھتے ہیں کہ کیا خبریں ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ریاض انور کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے لان پر سے واپسی کے لیے پلٹ گئے۔

”اپنے پی اے کو بتا دو کہ آدھ گھنٹے بعد میں اپنے گھر والوں سے ملنے جاؤں گا۔ میرے لیے ایک گاڑی تیار رکھی جائے۔“ اس نے دور کھڑے پی اے کو دیکھ کر آہستہ سے ریاض سے کہا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا، پی اے بے چارہ کچھ لاوارث سا نظر آنے لگا تھا۔ اسے پہلے کی طرح ریاض انور کے قریب رہنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ وہ اسے بس چند لمحوں کے لیے بلاتا تھا اور ضروری احکامات دے کر فارغ کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ریاض انور جہاں ہو، آس پاس ہی منڈلاتا رہے جیسا کہ اس وقت وہ لان کے آغاز میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کہہ رہا ہو...... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ سہیل نے آدھ گھنٹے بعد یہاں سے اپنی روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو جہاں ریاض انور کو جھٹکا لگا اور اس نے اپنے وجود میں خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی، وہیں پی اے بھی صاحب کی زبانی یہ سن کر کھل اٹھا کہ سہیل اپنے گھر جا رہا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنے مالک کو یہ احساس دلا سکتا تھا کہ وہ ایک اجنبی نوجوان کو جو بے شک اس کا محسن ہے، ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر اچھا نہیں کر رہا ہے۔ ایسا پچھلے وقتوں میں ہوتا تھا کہ بادشاہ احسان کے بدلے میں محسن کو سر پر بٹھا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بادشاہ نے نظام سقہ جیسے شخص کو ایک دن کی حکمرانی دینے جیسی حماقت بھی کر ڈالی تھی لیکن آج کے دور میں اس قسم کی احسان شناسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں دشمن تو دشمن، دوست سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ریاض انور اور سہیل حکم جاری کرنے کے بعد اندر کی طرف بڑھ گئے اور پی اے آدھ گھنٹے بعد دیے جانے والے لیکچر کے لیے نکات تلاش کرتا رہا۔ بیڈروم میں پہنچ کر سہیل نے خود ٹی وی کھول دیا۔ توقع کے مطابق نیوز چینلز سے سینٹرل جیل میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کی خبریں نشر کی جارہی تھیں اور صاف بتایا جا رہا تھا کہ چند قیدیوں کے جھگڑے سے شروع ہونے والا یہ ہنگامہ اصل میں جیل سے فرار کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آیا کوئی قیدی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہوا ہے یا نہیں۔ جیل انتظامیہ نے فی الحال اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صحافیوں نے البتہ جیل کے باہر مورچے جما لیے تھے اور وقفے وقفے سے جاری فائرنگ کی خبریں دینے کے ساتھ ساتھ مرکزی گیٹ اور چہار دیواری کے مختلف اطراف کے مناظر بھی دکھا رہے تھے۔ ان مناظر میں ایک منظر جیل کے مرکزی دروازے

سے برآمد ہونے والی تاریک شیشوں والی گاڑی کے تیزی سے وہاں سے نکل جانے کا بھی تھا جسے دیکھ کر صحافیوں نے گھیرنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ اس گاڑی کو دیکھ کر سہیل نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اس کے ساتھی سلو کو وہاں سے لے کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

"دو کپ چائے تو منگوالیں ریاض صاحب۔" اس نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ٹی وی اسکرین کو دیکھتے ریاض انور سے فرمائش کی۔

"تمہارے لیے منگوا دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت چائے سے زیادہ ڈرنک کی طلب ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ چائے منگوائیں تب تک میں آپ کے لیے ڈرنک تیار کر دیتا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شیلف کی طرف بڑھ گیا جہاں انواع و اقسام کی شرابیں سجی ہوئی تھیں۔ اس نے ریاض انور سے اس کی پسند دریافت کر کے ایک بوتل نکالی اور جام، سوڈے اور برف سمیت جملہ لوازمات کے ساتھ میز پر لا کر رکھ دی۔ ریاض انور اس دوران میں انٹرکام پر چائے کا آرڈر دے رہا تھا اس لیے یہ نہیں دیکھ سکا کہ سہیل نے برف کے کیوبز پر سفید رنگ کا ایک سفوف سا چھڑک دیا ہے جو کہ برف کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا۔ وہ انٹرکام پر آرڈر دے کر فارغ ہوا تو سیدھا شراب نوشی کے لوازمات سے سجی میز کی طرف آ گیا اور سہیل کو اشارے سے جام تیار کرنے سے روک کر خود ہی ایک جام میں تھوڑی سی انڈیل کر نیٹ پینے لگا۔ سہیل ہونٹ بھینچے اسے دیکھنے لگا۔ عادی شرابی کو نیٹ پینے سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑ رہا تھا، ماسوائے اس کے کہ آنکھوں کے گوشوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔ اسے الجھن سی ہونے لگی۔ اسے یہاں سے روانہ ہونے سے قبل ریاض کا قصہ تمام کرنے کا حکم تھا اور اس نے کوشش کی تھی کہ خاموشی سے یہ کام ہو جائے۔ لیکن اب لگتا تھا کہ تھوڑا طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچتا ہوا وہ ٹیلی وژن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے ملازم کے چائے لانے کا انتظار تھا۔ اس کے چائے لانے کے بعد ہی وہ کچھ کر سکتا تھا۔ ملازم چائے لے آیا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ریاض انور نے پہلا جام نیٹ پینے کے بعد دوسرا پورے اہتمام سے تیار کیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ ریاض کو شراب نوشی کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ شراب نے اس کے اعصاب کو سہارا دینا شروع کر دیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ اب اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ جو سفوف اس نے ریاض انور کے معدے میں پہنچانے کا اہتمام کیا تھا، اس کی یہ خاصیت تھی کہ وہ آدھ گھنٹے بعد اپنا اثر شروع کر کے استعمال کرنے والے کی حرکت قلب کو بند کر دیتا تھا اور پوسٹ مارٹم میں اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔ اپنی پیالی خالی کرنے کے بعد اس نے ملازم کو انٹرکام پر برتن لے جانے کا حکم دیا۔

"آپ اتنی ٹینشن مت لیں سر! ٹینشن میں آپ حد سے زیادہ ڈرنک کریں گے تو یہ آپ کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔" ملازم میز پر سے چائے کے برتن سمیٹ رہا تھا تو اس نے جان بوجھ کر ریاض انور سے یہ جملہ کہا تا کہ ملازم گواہ رہے کہ ریاض انور کسی وجہ سے پریشانی کا شکار تھا۔

"تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔ میری مرضی میں جتنی چاہے پیوں۔" لازم تھا کہ ریاض انور کو اس کی مداخلت بری لگتی اس لیے اس نے بگڑ کر جواب دیا۔

"میں تو آپ کی صحت کے خیال سے کہہ رہا تھا سر۔" اس نے ملازم کے سامنے جھینپ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے منمناتی آواز میں کہا۔ چند جملوں کی گفتگو کا گواہ ملازم اپنی تربیت کے مطابق بظاہر انجان بنا برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے ریاض صاحب! میں چلتا ہوں۔ آپ دل بھر کر پیتے رہیے۔ کیا پتا پھر کبھی ملے یا نہیں۔" اس نے وہی سلگاتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ریاض سے کہا اور اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کی پروا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ حسب ہدایت گاڑی تیار تھی۔ کوٹھی سے روانہ ہو کر وہ لوگ مین روڈ پر پہنچے تو اس نے ڈرائیور کو ایک ایسے علاقے کا پتا بتایا جہاں گنجان آبادی تھی اور پتلی پتلی گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر اس نے ایک پتلی سی گلی کے سامنے گاڑی رکوائی۔ یہ گلی اتنی تنگ تھی کہ اس میں گاڑی کا جانا ممکن نہیں تھا۔

"بس یار! یہیں روک دو۔ اندر مجھے پیدل ہی جانا ہو گا۔ تم ایسا کرو کہ اب واپس چلے جاؤ۔ مجھے جب واپس آنا ہو گا تو خود آ جاؤں گا یا فون کر کے تمہیں کہہ دوں گا۔" اس نے ڈرائیور سے دوستانہ انداز میں کہا اور گاڑی سے نکل کر گلی میں داخل ہو گیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ پُرپیچ گلیوں سے گزرتا ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جہاں راستہ ذرا کشادہ تھا اور رکشہ وغیرہ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک رکشا روک کر اس میں بیٹھ گیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ریاض

انور کی موت کے بعد اس کے بارے میں بہت سے سوال اٹھائے جائیں گے اور اس کی موت کو طبعی نظر آنے کے باوجود پراسرار قرار دیا جائے گا۔ کچھ لوگ شاید ممکنہ قاتل کی حیثیت سے اس کی تلاش کا کام بھی شروع کر دیتے لیکن اسے ان سب باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے لیے اہم یہ تھا کہ وہ اس کام کو کامیابی سے انجام دے کر آ رہا ہے جو اسے سونپا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ریاض انور جیسے ناسور سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے نظریں گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ایک سادہ سی نشست گاہ تھی جہاں وہ بالکل آزادی کے ساتھ مہمان کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے لیے یہ تبدیلی خاصی حیرت انگیز تھی۔ کراچی کی جیل سے فرار کی ناکام کوشش کے بعد وہ جن لوگوں کی حراست میں چلا آیا تھا، انہوں نے اگرچہ اس سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اور کھانے پینے سمیت آرام وغیرہ کا بھی پورا خیال رکھتے رہے تھے لیکن اس کے باوجود اسے اس بات کا بھرپور احساس رہا تھا کہ وہ ان کی قید میں ہے۔ اسے کراچی سے لاہور لاتے ہوئے بے شک اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئی تھیں لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کے اردگرد موجود لوگ اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا ہیں اور جیسے ہی وہ ان کی مرضی سے ہٹ کر حرکت کرنے کی کوشش کرے گا، وہ حرکت میں آ جائیں گے۔ ویسے وہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا بھی نہیں تھا اور ملی کے قبیلے سے بچ آنے تک خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اتنا اندازہ البتہ اس نے لگا لیا تھا کہ وہ جن لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہے، ان کا تعلق پاکستان کے کسی نہ کسی خفیہ ادارے سے ہے جب ہی تو وہ اتنی آسانی سے اسے جیل حکام کی رضامندی کے ساتھ وہاں سے نکال کر لے آئے تھے۔ اب وہ منتظر تھا کہ ان کی اس مہربانی کا مقصد سامنے آ جائے۔ اسے کراچی سے سڑک کے راستے لاہور لایا گیا تھا اور یہ سفر ایک ایسے بند ٹرک میں طے ہوا تھا جس کے اندر کھانے پینے، آرام کرنے سے لے کر ہر طرح کی سہولت میسر تھی اور انہیں راستے میں کسی ہوٹل وغیرہ میں نہیں رکنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ ٹرک کے بند کیبن میں باتھ روم کی سہولت بھی موجود تھی۔ اس سفر کے اختتام پر اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ اب لاہور میں ہے پھر اسے چند گھنٹے آرام کا موقع دینے کے بعد اس جگہ پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں وہ ایک نشست گاہ میں بیٹھا یہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے پہلے سے طے شدہ کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے آیا ہے۔

"السلام علیکم دوست! امید ہے تمہیں میرے انتظار میں زیادہ دیر بور نہیں ہونا پڑا ہو گا۔" نشست گاہ میں بیٹھے اسے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک شخص دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اس سے بڑے دوستانہ لہجے میں بولتا ہوا قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جواب دینے سے پہلے آنے والے کا جائزہ لیا۔ وہ دراز قامت کا خوش شکل اور جوان آدمی تھا جس کے نقوش میں نرمی کا تاثر پایا جاتا تھا۔

"ایک قیدی کے لیے یہ بات قطعی غیر اہم ہوتی ہے کہ وہ بور ہو رہا ہے یا نہیں۔" مختصر سے جائزے کے بعد اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"قیدی... کس نے کہا کہ تم یہاں قیدی ہو؟" نووارد نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"یعنی میں یہاں سے باہر نکل کر کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں؟" اس نے جانچتی ہوئی نظریں اپنے مقابل کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"شیور! تمہیں یہاں ایک معاملے پر بات چیت کے لیے بلایا گیا ہے۔ اگر تم نہ چاہو تو گفتگو کیے بغیر بھی یہاں سے جا سکتے ہو۔ اس کمرے سے لے کر باہر مین گیٹ تک کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔" اس نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا جس پر وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اس نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے خلاف کچھ نہیں ہو گا اور وہ واقعی یہاں سے نکل کر باہر جانے کے لیے آزاد ہو گا۔ لیکن اس پر یہ واضح نہیں تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا؟ وہ بالکل خالی جیب تھا اور لاہور میں اس کا ایسا کوئی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا جس کے گھر وہ پناہ لے سکے۔ ہاں، اپنی تربیت کے بل بوتے پر اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ کسی کی جیب کاٹ کر یا بہ زورِ طاقت رقم حاصل کر لے اور آگے کے لیے بھی اپنی راہیں بناتا چلا جائے لیکن فی الوقت اس کے لیے ایسا کرنا بھی دشوار تھا کہ وہ جن کے اشارے پر سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالنے کے لیے پاکستان آیا تھا، انہوں نے اس سے اپنا رابطہ ہی توڑ دیا تھا۔ دوسرے یہ تجسس بھی ہو چلا تھا کہ اتنی جدوجہد سے خود کو یہاں بلوانے والوں کا مقصد جان سکے چنانچہ راستہ کھلا ملنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔

"مجھے کس معاملے پر بات کرنے کے لیے بلایا گیا ہے؟" خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے

دریافت کیا۔

''میں تم سے جو بات کرنا چاہتا ہوں، اس سے پہلے یہ ویڈیو دیکھ لو تاکہ تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔'' اس نے ریموٹ کی مدد سے ایک طرف رکھا ٹی وی آن کر دیا۔ ٹی وی اسکرین پر ریاض انور کا چہرہ نظر آنے لگا۔ چہرے کے پس منظر میں کمرے کا جو ماحول تھا، اسے دیکھ کر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی انٹروگیشن سیل ہے اور ریاض انور کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔ ابھی وہ مشاہدے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ ریاض انور کا اعترافی بیان شروع ہو گیا۔ یہ بیان حقیقتاً ان سوالوں کے جوابات پر مشتمل تھا جو کوئی نادیدہ شخص اس سے کر رہا تھا اور وہ صرف اس کی آواز ہی سن رہا تھا۔ اس بیان میں ریاض انور نے اعتراف کیا کہ اس کے را سے روابط ہیں اور وہ خطیر رقوم کے عوض را کی خواہش پر پاکستان کے مفادات کے خلاف کام کرتا رہتا ہے۔ اس نے شہر میں ہونے والے حالیہ فسادات میں اپنے کردار کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ دہشت گردی کی اس کارروائی میں بھارت سے تربیت حاصل کر کے آئے ہوئے ایک نوجوان سلو نے منصوبہ سازی میں اس کی خاطر خواہ مدد کی تھی۔ سوالات پوچھنے والے نے تاریخ اور وقت کا حوالہ دے کر تصدیق چاہی تو ریاض انور نے اس کا بھی اعتراف کر لیا۔ دم بخود سے بیٹھے سلو پر اس اعتراف سے انکشاف ہوا کہ وہ پاکستان آمد کے فوراً بعد سے ہی نگرانی میں رہا ہے۔ بہرحال، وہ خاموشی سے ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ رہا۔ ویڈیو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض انور سے مختلف اوقات میں حاصل کی گئی معلومات کو ایک ساتھ یکجا کر لیا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں ریاض انور نے اعتراف کیا کہ را کی خواہش پر ہی اس نے سلو کو وزیراعلیٰ کے سیکیورٹی اسٹاف میں ملازمت دلوائی تھی اور پروگرام یہ تھا کہ سلو کے ہاتھوں وزیراعلیٰ کے مخالف سیاست دان کو قتل کروانے کے بعد اسے بھی موقع پر ہی ہلاک کر دیا جائے گا۔ البتہ سلو کو یہ جھانسا دیا گیا تھا کہ جب وہ اپنا کام مکمل کر لے گا تو اسے محفوظ راستے سے فرار کروا دیا جائے گا۔ را کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تو سلو سے جان چھڑانے کے لیے متبادل منصوبہ اس طرح تیار کیا گیا کہ ریاض انور اپنے جن غنڈوں کو جیل سے فرار کروانے کی کوشش میں تھا، انہی کے ذمے سلو کا قتل بھی لگا دیا گیا لیکن یہ کام اس طرح ہونا تھا کہ سمجھا جاتا سلو فرار کی کوشش میں کسی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔ سلو نے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ یہ سب سن اور اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ویڈیو لگانے والے نے آف کا بٹن دبا کر اسکرین کو تاریک کر دیا اور اسے متوجہ کرنے کے لیے آہستہ سے کھنکھارا۔

''ریاض انور کی زبانی اس منصوبے کا علم ہونے پر ہم نے جیل حکام کو اعتماد میں لے کر خود ایک متبادل منصوبہ تیار کیا اور اپنے کچھ آدمی قیدیوں کے روپ میں تمہارے آس پاس پھیلا دیے۔ ان آدمیوں کی وجہ سے ایک طرف ہم تمہاری جان بچانے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف جیل انتظامیہ نے بھی خطرناک مجرموں کے فرار کی سازش کو ناکام بنا دیا۔'' وہ متوجہ ہوا تو مقابل نے اسے آگاہ کیا۔

''بڑی مہربانی لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تم کون ہو اور مجھ پر تمہاری مہربانی کا کیا مقصد ہے؟'' وہ شاک کی کیفیت سے نکلا تو اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مخصوص بے باک انداز میں سوال کیا۔

''میں تمہاری یہ الجھن دور کر سکتا ہوں۔ میرا نام عادل خان ہے اور میں پاکستان کے ایک خفیہ ادارے کے لیے خدمات انجام دیتا ہوں۔ اپنے ادارے کی کوششوں کے ذریعے ہی ہمیں تمہارے بارے میں علم ہوا تھا اور ہم نے پاکستان میں قدم رکھتے ہی تمہیں اپنی خفیہ نگرانی میں لے لیا تھا۔ میرے پاس تمہارے پاکستان میں گزرے ایک ایک دن کی تفصیل موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پاکستان آنے کے بعد تم کب ریاض انور سے ملے۔ کس طرح تم نے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں بم بلاسٹ کی کوشش کی۔ کیسے وزیراعلیٰ کی سیکیورٹی فورس میں شامل ہوئے اور کس طرح جیل سے فرار کی اسکیم کا حصہ بنائے گئے۔ اس کے علاوہ بھی مجھے تمہارے بارے میں چھوٹی بڑی بہت سی تفصیلات کا علم ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ تمہارے پاکستان آنے سے قبل ہی تمہارا کیس مجھے سونپ دیا گیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ را کے سورماؤں نے ایک معصوم پاکستانی بچے کی برین واشنگ کر کے اسے دہشت گرد میں تبدیل کر دیا ہے اور ہمارے شہری کو ہمارے ہی خلاف استعمال کرنے جا رہے ہیں۔ اس کیس کے انچارج کی حیثیت سے مجھے تمہارے سلسلے میں مکمل اختیار حاصل تھا۔ میں چاہتا تو تمہیں پاکستان کی زمین پر قدم رکھتے ہی شوٹ کر دیتا۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور میں بم رکھنے کے الزام میں گرفتار کروا دیتا یا وزیراعلیٰ کے ہاں تقریب میں دہشت گردی کے الزام میں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیتا۔ کچھ نہیں تو ریاض انور کے منصوبے کے مطابق جیل سے فرار کے موقع پر تمہارا قتل ہو جانے دیتا لیکن میں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر نہ صرف تمہیں ڈھیل دی بلکہ پوری پوری کوشش کی کہ تمہاری زندگی کی حفاظت ہو سکے۔''

''لیکن کیوں؟'' اس نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے تسلسل سے بولتے عادل خان سے پوچھا۔

''میرے پاس اس کی بہت سیدھی اور صاف وجہ تھی۔ ایک مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے میں قدرتی طور پر تمہارے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہوں۔ میرے لیے پل بھر میں تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دینا مشکل نہیں تھا لیکن میں ان والدین کی آنکھوں میں جلتے خوشی کے دیپ نہیں بجھانا چاہتا تھا جو برسوں سے اپنے بیٹے کی جدائی کا غم سہتے وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو چکے تھے اور اب اس بیٹے کو اپنے سامنے دیکھ کر پھر سے جی اٹھے تھے۔ دوسرے یہ کہ میرے نزدیک اصل مجرم تم نہیں بلکہ وہ ہیں جنہوں نے ایک معصوم بچے کے کورے کاغذ جیسے ذہن پر نفرت کی تحریر نقش کی۔ تم تو خود مظلوم تھے کہ تم سے تمہارا اصل چھین کر تمہارے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دیے گئے تھے۔ میری خواہش تھی بلکہ ہے کہ تمہارے دل و دماغ پر لکھی نفرت کی اس تحریر کو مٹا کر تمہیں تمہارا اصل لوٹا سکوں تاکہ آنے والے کل میں تمہیں دہشت گرد سلو کے بجائے محب وطن سلیم کے نام سے یاد رکھا جائے۔'' عادل خان جو دراصل شہریار تھا، بولتے بولتے تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔

''اور اگر آپ مجھے وہ نہ بنا سکے جو چاہتے ہیں پھر؟'' سلو نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''پھر مجبوری ہو گی۔ ناسور بن جانے پر بعض اوقات انسان اپنے جسم کا ہی کوئی عضو کاٹ ڈالنے پر راضی ہو جاتا ہے حالانکہ اسے اس عضو سے بہت محبت بھی ہوتی ہے اور اس کی ضرورت بھی لیکن باقی جسم کو بچانے کے لیے اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے باقی ساری زندگی ادھورے پن کا دکھ دل میں کچوکے لگاتا رہے۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو سلو کچھ دیر کے لیے خاموش ہی ہو گیا لیکن یہ خاموشی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر لب کھولے اور اعتراف کیا۔

''آپ نے اس ویڈیو میں جو کچھ دکھایا اور سنوایا، وہ میرے لیے زیادہ انوکھا نہیں ہے۔ مجھے وزیراعلیٰ ہاؤس میں پکڑے جانے پر ہی شک ہو گیا تھا کہ اگر ادھر ہمارا کوئی ہمدرد ہوتا تو ہمارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ بعد میں جیل میں جو چلو ہوا، اس پر بھی میں نے یہاں لائے جانے تک بہت سوچا اور یہی سمجھ میں آیا کہ را والوں نے مجھے چونا لگا دیا

ہے۔ میرے دل میں ان کے لیے بڑا غصہ بھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ایک دم سے محب وطن پاکستانی بن جاؤں گا اور باقی کی زندگی پاکستان کی خدمت کرتے ہوئے گزاروں گا۔ سوری صاحب! چاہے آپ کو بُرا لگے لیکن سچ یہ ہے کہ میرے دل میں بڑے شکوے ہیں۔ اگر یہ کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگ ہم غریب عوام کے لیے کچھ کرنے والے ہوتے تو مجھے اپنی زندگی کے اتنے سارے سال وہاں بھارت میں نہیں گزارنا پڑتے اور پھر نہ وہ لوگ مجھے دہشت گردی کی ٹریننگ دیتے، نہ ادھر میرے ماں باپ رو رو کر خوار ہوتے۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں صاحب کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق کبھی اچھا پاکستانی نہیں بن سکتا۔ اب یہ آگے آپ کی مرضی ہے کہ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، کیا نہیں۔ گولی مارنے کا ارادہ ہے تو ماریں، ایسی چیزوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا اور میں وہی بولتا ہوں جو سچ ہے۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں شہریار سے بھی بڑھ کر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے اس انداز پر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی سلیم۔ میں انسانی نفسیات کو سمجھتا ہوں اور مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے جیسا شخص اتنی آسانی سے ایک دم تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس وقت تم مجھ سے سچ کہنے کے بجائے یہ کہتے کہ تمہارے دل میں اچانک اپنے وطن کی محبت جاگ گئی ہے اور تم وطن کی خاطر تبدیل ہونے کو تیار ہو تو میں کبھی یقین نہیں کرتا بلکہ یہی سوچتا کہ تم اپنی جان بچانے کی خاطر مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ نے میرے دل میں تمہاری قدر و قیمت کو مزید بڑھا دیا ہے۔''

''شکریہ! اب آگے بولیں میرے لیے کیا حکم ہے؟'' اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ برسرِ مطلب آیا۔

''کیسی ڈیل؟'' سلو نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''مجھے بھارت میں ایک مشن پر جانا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس مشن میں تم میرے معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ چلو۔ مجھے اپنے مشن کے لیے بہادر اور جرأت مند شخص کے ساتھ کی ضرورت ہے جو کہ تم ہو۔ لیکن یہ تمہیں ساتھ لے جانے کی واحد وجہ نہیں ہے۔ بہادروں کی میرے اپنے ساتھیوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں تمہیں ان پر فوقیت صرف دو وجوہات کی بنا پر دے رہا ہوں۔ اوّل یہ کہ میں

بھارتیوں کا تیار کیا ہوا ہتھیار انہی پر استعمال کر کے انہیں سبق سکھانا چاہتا ہوں، دوسرے یہ کہ تم کئی برس بھارت میں رہنے کی وجہ سے وہاں سے کافی حد تک واقف ہو اس لیے زیادہ بہتر معاون ثابت ہو گے۔'' وہاں گویا صاف گوئی کا مقابلہ ہو رہا تھا جس میں وہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو ہو گیا آپ کا فائدہ پر مجھے کیا فائدہ ہو گا کہ میں آپ کا ساتھ دوں اور اپنی جان مشکل میں ڈالوں؟'' ٹانگ پر ٹانگ جمائے ہوئے سلو نے اس سے پوچھا۔

''جان تو تم اپنی مشکل میں ڈال ہی چکے ہو۔ یہاں سے باہر نکل کر دیکھو پھر تمہیں پتا چل جائے گا کہ تم کتنے محفوظ ہو۔ تم ایک ایسے شخص ہو جو ریکارڈ کے مطابق جیل سے مفرور ہے اور جس کی قانون نافذ کرنے والے اداروں کو شدت سے تلاش ہے۔ اگر تم ملکی پولیس اور ایجنسیوں سے بچ نکلے تو تمہارے نام نہاد آقا تمہیں نہیں بخشیں گے۔ وہ تو پہلے ہی تمہارے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور تمہارے منظر پر آتے ہی تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا دینے میں ذرا دیر نہیں لگائیں گے کیونکہ تم ان کے لیے ایسا خطرہ ہو جو کبھی بھی ان کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا ساتھ دینے میں تمہارا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ تمہیں ایک پناہ گاہ میسر آجائے گی جہاں تم قانون نافذ کرنے والوں کے ساتھ ساتھ را کے گرگوں سے بھی محفوظ رہو گے۔ یہاں رہ کر تمہیں اپنے حلیے میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کرنے کا موقع ملے گا جس کے بعد تمہارے لیے آزادانہ نقل و حمل آسان ہو جائے گی۔ ہم تمہاری مالی معاونت بھی کریں گے اور اگر تم میرے ساتھ میرے مشن میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے تو تمہیں تمہارے کام کا باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے تمہارے لیے موجودہ حالات میں یہ پیشکش بہت مناسب ہے کیونکہ تم جن عزائم کے ساتھ اور جن لوگوں کی پشت پناہی میں یہاں آئے تھے، وہ تو اب تمہارے لیے اپنی حیثیت کھو بیٹھے ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم پر یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ بھارتیوں نے تمہیں محض اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ تو وہ تمہارے ہمدرد ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات سے کوئی مطلب ہے کہ تمہارے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے۔'' وہ جو کچھ بول رہا، سلو سر جھکائے اسے سنتا رہا کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''تمہارے لیے میرے پاس ایک اہم اطلاع یہ بھی ہے کہ تمہارے والدین کو ان کی جھگی سے نکال کر ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ وہ کسی اندھے انتقام کی بھینٹ نہ چڑھ سکیں اور نہ ہی... کوئی تم تک پہنچنے کے لیے انہیں استعمال کر سکے۔ تم جب چاہو گے ان سے تمہاری ملاقات کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ تم جب تک میرے ساتھ رہو گے، یہاں ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور کفالت ہوتی رہے گی۔''

''تھینک یو سر! یہ آپ نے مجھ پر سچ مچ بڑا احسان کیا۔'' سلو جو اب تک کسی بات سے متاثر نظر نہیں آرہا تھا، اس کی زبانی اپنے والدین کی بابت سن کر چونک گیا اور اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں تھینک یو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں پاکستانی شہری ہیں اور ان کا تحفظ ہم اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔''

''کاش کہ کھلے سمندر سے گرفتار ہونے والے غریب مچھیروں کو بھی آپ لوگ اپنی ذمے داری سمجھتے تو میرے ساتھ یہ سب نہیں ہوتا۔ اب میں چاہوں بھی تو نارمل لائف نہیں گزار سکتا۔'' اس کے لہجے میں طنز اور دکھ دونوں ہی تھے۔

''تم سمجھو گے نہیں لیکن یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کھلے سمندروں سے گرفتار ہونے والے ماہی گیروں کے سلسلے میں ہم بالکل بے بس ہیں۔ ان ماہی گیروں کو ہمیشہ اس الزام کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے کہ انہوں نے سمندری حدود کی خلاف ورزی کی تھی۔ حالانکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور وہ لوگ جان بوجھ کر بھی بے گناہ ماہی گیروں کو کھلے سمندر سے گھیر کر لے جاتے ہیں۔ اب یہ ماہی گیروں کی قسمت پر منحصر ہوتا ہے کہ اردگرد ہماری کوئی کشتی بوٹ وغیرہ موجود ہو تو انہیں مدد مل جاتی ہے ورنہ وہ بے چارے پھنس جاتے ہیں اور ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ انہیں بے گناہ ثابت کر سکیں۔ تم اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ تمہارے کیس میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے تمہاری کم عمری کو دیکھتے ہوئے تمہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ تمہاری اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ تمہاری یہاں آمد سے قبل ہی ہمیں تمہارے بارے میں علم ہو گیا اور وہ لوگ تم پر بہت سا وقت اور پیسا خرچ کرنے کے باوجود تم سے اپنا کوئی ایک بھی کام نہیں نکلوا سکے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ اور کام لینا چاہتا ہے اور اگر اس کی بھی مرضی ہے تو میں کون ہوتا ہوں منع کرنے والا۔ ٹھیک ہے، میں چلوں گا آپ کے ساتھ انڈیا اور ان ماں کے... کو بتاؤں گا کہ سلو کی زندگی چھیننا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ جوش میں آگیا پھر خیال آنے پر پوچھنے لگا۔ ''آپ کس مشن پر ادھر جا رہے ہیں۔ تاج محل کو اڑانا ہے یا ممبئی کی دو چار مارکیٹوں میں بم بلاسٹ کرنا ہے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں یا میرے ساتھی کوئی دہشت گرد نہیں ہیں جو بلاوجہ کسی کی املاک کو نقصان پہنچائیں یا بے گناہوں کا خون بہانے کا سوچیں۔ فی الحال میں تمہیں اپنے مشن کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ لیکن تم اتنا سمجھ لو کہ بھارتیوں نے ہماری ایک بہت ہی قیمتی شے پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے اس شے کو واپس اپنے وطن لانا ہے۔'' اس نے بہت سجاؤ سے سلو کے سوال کا جواب دیا جس پر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''مجھ پر اعتماد نہیں ہے نا اس لیے اصل بات گول کر دی آپ نے؟''

''اعتماد انسان اپنے رویّے سے وقت کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔ ابھی تو تمہاری حیثیت ایک ایسے شخص کی ہے جو اپنے مفادات کی خاطر اجرت پر میرا ساتھ دے گا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں تم پر مکمل بھروسا کر سکوں۔ ویسے بھی ہماری فیلڈ میں بلاضرورت معلومات کو منتقل نہیں کیا جاتا، چاہے وہ شخص کتنا ہی بااعتماد اور مخلص کیوں نہ ہو۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔ آج سے میں آپ کا ملازم ہوں اور جو حکم آپ دیں گے، اس پر عمل کروں گا۔'' سلو نے بھی بحث نہیں کی اور فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

''ویری گڈ۔ تمہارا یہی رویّہ رہا تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔ فی الحال تم آرام کرو اور ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرو جو تمہارا حلیہ وغیرہ تبدیل کرنے میں تمہاری مدد کریں گے۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سلو بھی خودکار انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مدمقابل میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''میرے خیال میں تمہیں یہ بتانے کی تو قطعی ضرورت نہیں ہے کہ اس عمارت سے باہر تمہارے لیے خطرہ ہے اس لیے بلا ضرورت یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔'' اس نے باہر کی طرف قدم بڑھانے سے قبل نہایت نرم لہجے میں سلو سے یہ الفاظ کہے۔ لہجے کی نرمی کے باوجود سلو تک یہ پیغام پہنچ گیا کہ عملاً وہ ایک قیدی ہے جسے یہاں سے باہر جانے کی آزادی نہیں ہے۔ ناگواری کے احساس سے اس کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔

''آپ تو مجھے میرے ماں باپ سے ملوانے والے تھے؟'' اس نے ذرا تلخی سے دریافت کیا۔

''مجھے اپنی ہر بات یاد ہے۔ تم فکر نہ کرو، ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔'' اس نے جواب دیا اور باوقار قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سلو جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اسے پکار سکتا یا کوئی اور سوال کر پاتا۔

☆☆☆

''بڑے دکھ کی بات ہے لنڈا ڈارلنگ! میں نے تم سے اتنا چھوٹا سا کام کہا اور تم نے ابھی تک نہیں کیا۔ میری مجبوری تھی کہ مجھے دبئی سے اچانک واپس پاکستان پہنچنا پڑا ورنہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے خود ہی اپنا مسئلہ حل کر لیتا۔'' چودھری کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ناراض نہ ہوں چودھری صاحب! میری بھی خواہش تھی کہ آپ کے کام آتی لیکن مجبوری نے میرے ہاتھ پیر باندھ دیے۔'' لنڈا نے اپنی لوچ دار آواز میں معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری کا رونا رو دیا۔

''تمہاری کیا مجبوری ہو سکتی ہے؟ تم نیویارک میں بیٹھی ہو اور تمہاری کتنی پہنچ ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔ کشور اور آفتاب تو کیا، اگر میں تم سے امریکا کے صدر کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی خواہش کرتا تو تم معلوم کر سکتی تھیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم ایسا کرنا چاہو۔'' وہ سچ مچ خفا تھا۔ نیویارک والے اپارٹمنٹ میں کشور اور آفتاب کی ہلاکت کا منصوبہ ناکام ہونے پر وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اور اس کے امریکا میں داخلے کا راستہ بھی ایک طرح سے بند ہو گیا تھا۔

نیویارک پولیس کی مستعدی کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اگر اس نے مستقبل قریب میں نیویارک کا رخ کیا تو دھر لیا جائے گا۔ الفانے بھی فی الحال اس کے ادھر کا رخ کرنے پر پابندی لگا دی تھی اور مقامی معاملات سنبھالنے پر زور دیا تھا اس لیے وہ بالکل بندھ کر رہ گیا تھا۔ البتہ لنڈا کے توسط سے اسے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ آفتاب اور کشور اب نیویارک کے اس اپارٹمنٹ میں نہیں

رہتے جہاں انہیں قتل کروانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے دل میں بھڑکتی آتشِ انتقام اس اطلاع پر مزید بھڑک اٹھی تھی اور اس نے لنڈا سے درخواست کی تھی کہ وہ ان دونوں کا پتا چلانے کے ساتھ کسی دوسرے گینگ سے معاملات طے کروانے میں اس کی مدد کرے۔ لنڈا نے اس وقت تو اس کی بات خاموشی سے سن لی تھی لیکن کئی دن گزر جانے کے بعد بھی اس کا ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا چنانچہ چودھری نے خود اس سے رابطہ کرکے شکوہ شروع کردیا۔

”آپ نے تو مجھے بہت اونچی چیز بنا دیا چودھری صاحب! اب میری اتنی بھی زیادہ پہنچ نہیں ہے اور اگر میں تھوڑی بہت کوئی حیثیت رکھتی بھی ہوں تو وہ اپنے ان بڑوں کی وجہ سے، جنہوں نے سختی سے مجھے آپ کے ذاتی معاملات سے الگ رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ میرے لیے حکم ہے کہ میں تنظیمی معاملات کے علاوہ آپ سے کسی اور معاملے میں ڈیلنگ نہ کروں، ورنہ تنظیم میں میری اپنی پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اتنے سخت احکامات کے بعد میں کیسے آپ کی خواہش پوری کرسکتی ہوں؟ اوپر والوں کی نظر میں معتوب ہونے کے بعد تو میرا کہیں کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہے گا۔“ چودھری کے شکوے کے جواب میں اس نے اپنی صفائیاں پیش کرنا شروع کردیں جسے سن کر چودھری تل کھا کر رہ گیا۔

”تم بڑوں کا رونا کیوں رو رہی ہو؟ صاف کہو کہ الفا نے تمہیں منع کیا ہے۔“

”آپ جانتے ہیں تو میری زبان سے کہلوانا کیا ضروری ہے؟“

”وہ شخص ضرورت سے زیادہ مجھے اپنے دباؤ میں لینے کی کوشش کررہا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اسے سمجھا دو، میں اتنا بھی بے اختیار اور مجبور نہیں ہوں کہ اس سے دبتا ہی چلا جاؤں۔ یہاں کے معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ اگر میں چاہوں تو کچھ بھی کرسکتا ہوں۔“

”مثلاً...؟“ اس کی دھمکی کے جواب میں لنڈا نے سرد مہری سے پوچھا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنے علاقے میں کتنا بااختیار ہوں۔ اگر میں ضد میں آگیا تو تم میں سے کسی کی جنگل میں موجود فیون کے کھیتوں تک رسائی نہیں رہے گی۔ میں خود ہر شے پر قبضہ کرلوں گا۔ اس کے بعد میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ میں اس افیون کو ڈائریکٹ کسی دوسری پارٹی کو بیچ دوں۔ تمہارے علاوہ بھی مارکیٹ میں دوسرے لوگ ہیں جو اس دھندے کو چلا رہے ہیں۔ جو مجھے تم سے [illegible] رہا ہے، وہ میں بغیر غلامی کے آزادی سے دوسروں سے حاصل کرلوں گا۔“ اپنے تئیں اس نے بہت زوردار دھمکی [illegible] تھی جس پر اس کے خیال کے مطابق تنظیم کے کرتا دھرتا [illegible] رہ جاتے۔

”یہ آپ کی خام خیالی ہے چودھری صاحب! [illegible] لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ کسی شخص کو اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقع دے دیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے اور وہاں نگرانی کے فرائض انجام دینے والے بے شک آپ کے لوگ ہیں لیکن وہاں ٹیکنالوجی ہماری کام کررہی ہے۔ ہم اگر چاہیں تو محض ایک بٹن دبا کر سب [illegible] تباہ کرسکتے ہیں اور اس تباہی کے نتیجے میں آپ کے کئی قیمتی کارندوں کے ساتھ ساتھ اتنا بڑا جنگل بھی جل کر بھسم ہو جائے گا۔ اس صورت میں آپ اپنے نقصان کا حساب کر لیجیے گا۔ آپ ہماری طرف سے ملنے والے خطیر معاوضے کے علاوہ بھی بہت کچھ کھو بیٹھیں گے جبکہ ہمارے لیے مشکل نہیں ہے کہ ہم کہیں اور اپنا سیٹ اَپ دوبارہ قائم کرلیں۔ دوسرے آپ کبھی خواب میں بھی یہ مت سوچیے گا کہ آپ ہم سے بالا بالا ہماری افیون کا کسی دوسری پارٹی سے سودا کرسکتے ہیں۔ پہلے نمبر پر تو آپ شمالی علاقہ جات اور افغانستان کے بیوپاریوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے جو اپنے مقابل آنے والے کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ ہماری بات اور ہے، ہم اس بزنس پر چھائے ہوئے ہیں اور ہم نے طلب و رسد میں کبھی کمی نہیں آنے دی ہے۔ اس لیے ہم پر کوئی اعتراض نہیں کرتا لیکن آپ کو کوئی نہیں چھوڑے گا۔ دوسرے جو افیون آپ کے ہاں کاشت کی جارہی ہے، اس سے ہیروئن تیار کرنے کی ٹیکنالوجی بھی ہمارے پاس ہے۔ ہماری ٹیکنالوجی کے بغیر کوئی اور اس افیون سے اس کوالٹی کی ہیروئن تیار نہیں کرسکتا جس کی مارکیٹ میں ڈیمانڈ ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک بار سودا کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو اگلی بار کوئی آپ سے سودا نہیں کرے گا۔ ان سب حقائق کو اپنے سامنے رکھ کر آپ ذرا عقل کے ساتھ فیصلہ کیجیے گا کہ آپ ہم سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں ہیں بھی یا نہیں۔“

چودھری کو سراسر نقصان بتاتے ہوئے لنڈا کے لہجے میں جو اجنبیت اور سرد مہری تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی اصل ہمدردیاں اور وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں اور اگر وہ اس سے محبت اور لگاوٹ سے بات کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ، اپنی تنظیم کے مفادات پر اسے کسی بھی طرح

ترجیح یا چھوٹ دے سکتی ہے۔ اس کے لب و لہجے نے چودھری کے جوش کے غبارے میں سوئی چبھو دی اور وہ گھبرا کر بولا۔

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو ڈارلنگ! میں تو بس غصے میں ایک بات کہہ گیا تھا ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ نہ ہی میں تنظیم سے بغاوت کا سوچ سکتا ہوں لیکن تنظیم کے بڑوں کا بھی تو فرض ہے کہ وہ اپنے لیے خدمات انجام دینے والوں کے مفادات کا خیال رکھیں۔ اگر ہم اپنے ذاتی مسائل کی طرف سے پُرسکون ہوں گے تو تنظیم کے لیے زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکیں گے۔" لنڈا کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر اس نے بہت تیزی سے پینترا بدل لیا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تنظیم اپنے لیے کام کرنے والے ہر شخص کو اس کی خدمت کے بدلے میں نہایت معقول معاوضہ دیتی ہے جس کے بعد اس پر کسی طرح کی ذمے داری نہیں رہتی، دوسرے یہ کہ تنظیم کے لیے ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ اگر ہم ہر شخص کے ذاتی مسائل کے حل کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتے رہیں تو تنظیمی کام کب اور کیسے انجام پائیں گے؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک کاروباری تعلق ہے اور یہ تعلق اسی صورت قائم رہ سکتا ہے کہ آپ ہماری شرائط کے مطابق کام کرتے رہیں اور جواب میں اپنی شرائط پیش کرنے کی زحمت نہ کریں۔" لنڈا اس سے جس لب و لہجے میں بات کر رہی تھی، اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس نرم و گداز حسینہ کے بجائے ڈیوڈ یا الفا سے بات چیت کر رہا ہے۔ آج پہلا موقع تھا کہ لنڈا سے بات کرتے ہوئے وہ رعبِ حسن کے بجائے دہشت سے پسینا پسینا ہو رہا تھا۔

"کول ڈاؤن ہنی! میں نے مان لیا ہے نا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں غصے میں کچھ زیادہ ہی غلط سلط بول گیا ہوں۔ تم اس بات کو اب یہیں ختم کر دو۔" وہ اب باقاعدہ گھگیا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ سے دوستی کے ناتے میں بات ختم کر دوں گی لیکن اب آئندہ کبھی آپ ایسا کچھ مت کہیے گا جس سے بغاوت کی بو آئے۔ آپ نے سنا ہے نا... کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور ہماری تنظیم جتنی طاقتور اور جدید ہے، کچھ بعید نہیں کہ ہماری لاعلمی میں ہی ہماری گفتگو کا ریکارڈ ان تک پہنچ جائے۔ آپ نے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا مزاج نہیں سمجھتے لیکن میں آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ آپ اپنی نادانی میں کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ آپ کا جوان بیٹا یہیں نیویارک میں رہتا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو آپ کیا کریں گے؟ سنا ہے آپ کے ہاں تو جاگیر کے وارث کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وارث نہ رہا تو آپ کے بعد آپ کی جاگیر تو بیکار ہی چلی جائے گی۔" وہ اسے میٹھی چھری سے ذبح کر رہی تھی۔ ہمدرد اور دوست بن کر وہ سب کہتی جا رہی تھی جو کوئی دشمن ہی کہہ سکتا ہے۔

"میں نے کہا ہے نا کہ اس بات کو جانے دو۔ اب تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اس نے بہت زور دے کر لنڈا کو یقین دلایا۔

"اوکے، ایز یو وِش۔ اب مجھے اجازت دیں۔ پھر کبھی اچھے ماحول میں بات یا ملاقات ہوگی۔" لنڈا کے لہجے کی نرمی اور لوچ واپس لوٹ آئے اور اس نے بڑے خوش گوار لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

فون بند ہونے کے بعد بھی چودھری بہت دیر تک ساکت سا بیٹھا رہا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے ٹکرانے کی خواہش میں اسے ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی تھی اور یہ تسلیم کرنا پڑا تھا کہ ان لوگوں کے اختیارات کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پھر بھی جانے کیوں وہ اپنے خون کی تاثیر سے مجبور ہو کر ایسی غلطی کر بیٹھتا تھا اور اس دفعہ تو لنڈا نے اسے بہت ہی زیادہ خطرناک دھمکی دی تھی۔ چودھری مراد عالم شاہ، اس کا وہ اکلوتا بیٹا تھا جس سے بہت خفا رہنے کے باوجود وہ بڑی محبت کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اولادوں میں واحد وہی ہے جو اس کے بعد اس کی جاگیر کا وارث قرار پا سکتا ہے۔ دوسرا بہزاد شاہ تو اپنی ذہنی پسماندگی کی وجہ سے کسی لائق ہی نہیں تھا اور بیٹیوں کو وارث بنانے کا ان کے ہاں رواج نہیں تھا۔ اس کے حوالے سے دھمکی ملی تو اس کا دل اتنا بے قرار ہوا کہ فوراً ہی اس کا نمبر ملا بیٹھا۔ دوسری طرف سے فون مراد ہی نے اٹھایا اور یہ جاننے کے بعد کہ دوسری طرف اس کا باپ موجود ہے، نہایت ادب سے سلام کرنے کے بعد اس کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں پتر! بس تیری فکر ہو رہی تھی اس لیے تجھے فون لگا لیا۔"

"وہ کیوں ابا جی! میں یہاں اچھا بھلا ہوں پھر آپ کو میری فکر کس لیے ہو رہی تھی؟" یہ پہلا موقع تھا کہ باپ نے ایسی بات کہی تھی اس لیے وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ اس کے پوچھنے پر چودھری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ بات بنانے کے لیے بولا۔

"بس پتر! تیری ماں کے بعد دل ایسا ہی کملا ہو گیا ہے۔ وہ تھی تو آپ ہی تجھے فون شون کرتی رہتی تھی اور مجھے بھی تیری خیریت بتاتی رہتی تھی۔ اب اتنے دنوں سے کسی نے مجھے تیرے بارے میں نہیں بتایا تو ایسے ہی میرا دل گھبرا گیا۔"

"اماں کی کمی تو مجھے بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ ان جیسی رعب داب والی اور دبنگ خاتون اتنی خاموشی سے دنیا چھوڑ گئی ہیں۔" وہ بیٹا تھا۔ ماں کے ذکر پر قدرتی طور پر آزردہ ہو گیا۔

"بس پتر! جیسی رب کی مرضی۔ ہمارے تمہارے پاس صبر کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔" وہ فوراً بیٹے کو تسلی دینے کو، پھر بات بدلنے کے لیے بولا۔ "تو سنا تیری زنانی اور بچی کا کیا حال ہے؟" دل میں چور ہونے کی وجہ سے وہ وڈی چودھرائن کے موضوع پر بیٹے سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ یہ خوف کہ کہیں مراد شاہ کو اپنی ماں کی موت کی حقیقت کا علم نہ ہو جائے، اسے اندر ہی اندر سہمائے رکھتا تھا اور اسی خوف کی ایک بڑی وجہ لنڈا بھی تھا جس نے واضح طور پر دھمکی دے رکھی تھی کہ اس کی سرکشی کا ایک نتیجہ مراد شاہ پر افشائے راز کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔

"وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ شاہدہ آپ کو سلام کہہ رہی ہے۔" مراد نے جواب دیا۔

"ہور کشور کی کیا اطلاع ہے؟"

"کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس سے میرا رابطہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔" مراد شاہ کے لہجے میں خود بخود ہی تلخی در آئی۔

"تو جھوٹ بول رہا ہے مراد شاہ! تجھے سب معلوم ہے پر تو جان بوجھ کر مجھے نہیں بتا رہا، پر تو فکر نہ کر... میں خود اس کا کھوج لگا لوں گا۔" چودھری دہاڑا۔

"تاکہ اس پر ایک اور قاتلانہ حملہ کروا سکیں؟ آپ نے تو مجھے کشور سے نظر ملانے کے لائق نہیں چھوڑا ابا جی! وہ سوچتی ہوگی کہ میں بھی آپ کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور ہمدردی کی آڑ میں اس سے دشمنی کر رہا ہوں اسی لیے تو اس نے مجھ سے رابطہ توڑ دیا اور اب اگر اتفاق سے کہیں مل بھی گئی تو مجھے یقین ہے کہ مجھ سے منہ پھیر کر چلی جائے گی۔ آپ نے تو بہن بھائی کے رشتے کا اعتبار ہی توڑ دیا ابا جی! بھائی تو بہنوں کی حفاظت کیا کرتے ہیں اور میری بہن سمجھتی ہوگی کہ میں اس کے لیے خطرہ ہوں۔" وہ بیک وقت تلخ اور اداس ہو رہا تھا۔

"اونے رہنے دے یہ تقریریں۔ بھائی، بہنوں کے رکھوالے ہوتے ہیں، پر ایسی بہنوں کے جو گھر کی چار دیواری میں بیٹھتی ہیں۔ کشور کی طرح چوری چھپے گھر کی دہلیز پار کرنے والیوں کے لیے غیرت مند بھائی کندھے پر بندوق ڈال کر گھومتے ہیں تاکہ موقع ملتے ہی عزت کا جنازہ نکالنے والی کا جنازہ نکال سکیں۔ لیکن تو یہ گل نہیں سمجھے گا مراد شاہ! تو رہتا ہے امریکا میں، ہور خود بھی امریکی بن گیا ہے۔ تجھے کہاں یاد رہے ہیں عزت و غیرت کے اصول۔" اس نے بیٹے کو لتاڑا۔

"اچھا ہی ہے کہ مجھے ایسے غیر انسانی اصول یاد نہیں ہیں جو صرف اس لیے بنائے گئے ہیں کہ انسان سے اس کے بنیادی حقوق چھین کر اپنی حکمرانی کا نشہ پورا کیا جا سکے۔" اس نے ترت جواب دیا۔

"تجھ سے گل کرنا تو اپنا متھا خراب کرنا ہے۔ تو نہ میری گل سمجھا ہے، نہ سمجھے گا پر میری مجبوری ہے کہ تو میرا اکلا وارث ہے۔ ہیر پھیر کر مجھے تجھے منہ لگانا ہی پڑتا ہے۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو میرے بعد جاگیر کا انتظام کیسے چلائے گا؟ تجھے تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ تیرے دادا کا عرس کس تاریخ کو ہوتا ہے۔ پر میں جب تک زندہ ہوں مجھے تو سب دیکھنا ہے اور اپنے پرکھوں کی روایات کی حفاظت کرنی ہے۔ جا تو ادھر فرنگیوں میں ہی خوش رہ، میں پتر والا ہو کر بھی سب کلا ہی دیکھتا رہوں گا۔" اس نے مراد شاہ کو باتیں سنا کر فون بند کر دیا اور بلند آواز میں منشی کو پکارا۔

"حاضر سرکار۔" منشی چراغ کے جن کی طرح فوراً خدمت میں آ موجود ہوا۔

"عرس کی تیاریوں کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟" اس نے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ دریافت کیا۔

"تیاریاں جاری ہیں سرکار! آپ دیکھیے گا کہ پچھلے سال سے زیادہ شاندار انتظامات ہوں گے اس بار۔ میں نے درگاہ کی سجاوٹ اور حویلی کی تزئین کا کام شروع کروا دیا ہے۔ دعوت نامے بھی ایک دو دن میں چھپ کر آ جائیں گے۔ آپ دیکھیے گا، مخمل کے کیسے شاندار دعوت نامے تیار کروائے ہیں میں نے۔ باقی سب انتظام بھی بہت شاندار ہوگا۔ اللہ نے چاہا تو آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" منشی نے فوراً رپورٹ دینی شروع کر دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے تیرے انتظامات کو بھی۔ یہ بتا کہ ادھر ڈاک بنگلے کی کیا خبر ہے؟ پھر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ادھر؟"

"نہیں چودھری صاحب! سب ٹھیک ہے۔ اور دوسروں کو میں نے آپ کے حکم پر ڈاک بنگلے سے

تھا۔ اب وہاں صرف سرکاری چوکیدار ہے اور اسے کسی معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اے سی عمیر آفندی بھی اپنی جگہ موجود ہے اور ہمارے خدشات کے مطابق اس نے دوبارہ جنگل کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کی۔" اس حوالے سے بھی منشی کے پاس اس کے لیے تسلی بخش رپورٹ موجود تھی۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں کو جنگل میں قتل کرنے کے بعد سے وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اظفر کے بارے میں انہیں شک تھا کہ وہ کسی خفیہ ادارے کا آدمی ہے اس لیے اسے قتل کرنے کے بعد بھی یہ خیال رکھا تھا کہ اگر اس کے قتل کی تفتیش شروع ہو تو کوئی گرفت میں نہ آسکے۔ کیونکہ اس سارے معاملے میں بہرام ہی سامنے تھا، اس لیے انہیں خطرہ تھا کہ تفتیش کرنے والے اسے ہی گھیرنے کی کوشش کریں گے اس لیے اسے اس کی پوری ٹیم سمیت منظر سے ہٹا دیا تھا اور ڈاک بنگلے سے یوں لاتعلق ہو گئے تھے جیسے وہاں ان کا عمل دخل ہی نہ رہا ہو۔ وہاں ابھی تک نیا فاریسٹ آفیسر نہیں آیا تھا اس لیے فی الحال وہاں قبضہ رکھنا ضروری بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرا خطرہ انہیں عمیر کی طرف سے تھا کہ وہ اظفر کا کزن ہونے کی وجہ سے اس معاملے میں دلچسپی لے سکتا ہے لیکن اس کی طرف سے بھی کوئی قابلِ ذکر ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اس لیے انہیں اطمینان ہو چلا تھا۔

"اس نئے اے سی سے عرس سے پہلے میری ملاقات کا انتظام تو کرواؤ۔ بلاؤ کسی دن اسے حویلی کھانے پر۔ تم تو اس کی طرف سے سب اچھا کی رپورٹ دے رہے ہو۔ میں بھی مل کر دیکھوں کہ کیسا بندہ ہے۔"

"چنگا سرکار! میں آپ کا پیغام اے سی کو پہنچا دوں گا۔ دیکھیے گا، سر کے بل دوڑا چلا آئے گا۔ پہلے ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ چودھری صاحب امریکا سے آجائیں تو ان سے ملاقات کروں گا۔ ہمارے دیے تحفے شحفے بھی اس نے بہت خوش ہو کر لیے تھے۔"

"یہ چنگی گل ہے کہ وہ تحفے لے کر خوش ہونے والا آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو مٹھی میں لینا آسان ہوتا ہے۔ وہ تحفے لے کر خوش باش ایک طرف بیٹھا رہے گا، اور ہم اپنے کام کرتے رہیں گے۔" چودھری کو عمیر کے بارے میں جان کر خاصا اطمینان ہوا ورنہ جب تک شہریار یہاں تھا، اس نے ان لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ تو عرصہ ہوا، بند ہو چکی تھی۔ دوسرے معاملات میں بھی اس کا عمل دخل تھا۔ اس کی وجہ سے حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ وہ ملک سے باہر بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب شہریار تو نہیں تھا لیکن اس نے خفیہ اداروں کی جو تلوار اس کے سر پر لٹکا دی تھی، اس کی وجہ سے اسے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ عمیر کی طرف سے سہارا مل جاتا تو اسے اپنے کالے دھندوں میں آسانی ہو جاتی۔

"یہ کام تو آپ سمجھیں ہو گیا سرکار۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو تو حکم فرمائیں۔" منشی بلا کا چرب زبان، خوشامدی تھا، کام بھی خوب کرتا تھا اس لیے برسوں سے اس کی چودھری کے ساتھ اچھی نبھ رہی تھی۔ کبھی کوئی کوتاہی ہو جاتی تو اس کی پچھلی خدمات کی وجہ سے چودھری زیادہ [illegible] سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے موڈ کی خرابی کا منشی پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا اور اس کی خلاصی کر کے خود اٹھ کر زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ عرس کے سلسلے میں چھوٹی چودھرائن کو ضروری ہدایت دینا لازمی تھا۔ وڈی چودھرائن ایک تو اپنے میکے سے بھی خاصی تربیت لے کر آئی تھی، دوسرے برسوں سے حویلی کا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھوں میں تھا اس لیے خاص مواقع پر اسے سرسری ہدایت کرنا کافی ہوتا تھا، باقی وہ سب کچھ اچھی طرح سنبھال لیتی تھی لیکن چھوٹی چودھرائن کی طرف سے وہ زیادہ مطمئن نہیں تھا کہ اتنے بڑے موقع پر اس کی کارکردگی اچھی رہے گی۔

"سلام چودھری صاحب۔" وہ جیسے ہی چھوٹی چودھرائن کی خواب گاہ میں داخل ہوا، وہ ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اتری اور ادب سے اسے سلام کیا۔ چودھری نے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور ایک منقش کرسی پر براجمان ہو گیا۔

"بیٹھو۔" اس نے اجازت دی تو چودھرائن بھی مسہری پر ٹک گئی لیکن انداز مؤدبانہ تھا اور چہرے پر فکر جھلک رہا تھا کہ چودھری نے آخر یہاں کا رخ کیسے کیا ہے؟ عام طور پر تو وہ اسے ملازماؤں کی زبانی ہی پیغام بھجوا دیا کرتا تھا اور ملاقات کا شرف بخشنے کا مطلب ہوتا تھا کہ کوئی بہت ضروری کام ہے۔ وہ ایک ایسی بیٹی کی ماں تھی جس نے حویلی کی روایات سے بغاوت کر کے اپنے لیے زندگی کی خوشیاں تلاش کرنے کی جسارت کی تھی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی کے اتنے برسوں میں کئی باغیوں کا انجام دیکھ چکی تھی۔ حویلی کی کرتا دھرتا وڈی چودھرائن کا انجام بھی اس کے سامنے تھا جس کی ساری خدمات اور حیثیت کو بھلا کر چودھری نے فوری طور پر اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرتی رہتی تھی کہ جانے کب اسے کشور کے متعلق کوئی بری خبر سننے کو مل جائے گی۔

"حویلی کا سب انتظام سنبھال لیا ہے نا تُو نے؟ کہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟" اس کے تفکرات سے بے نیاز چودھری نے اس سے پوچھا۔

"کوئی پریشانی نہیں چودھری صاحب! ملازم سارے پرانے اور وفادار ہیں۔ سارے کام جیسے وڈی آپا کی زندگی میں چلتے تھے اب بھی ویسے ہی چل رہے ہیں۔ میں اچھی طرح سب کاموں کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔" اس نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

"تجھے معلوم ہے نا کہ سالانہ عرس ہونے والا ہے اور اس موقع پر حویلی میں بھی وڈی مہمان داری رہتی ہے۔ اس کے لیے بھی تو کوئی تیاری شیاری کر رہی ہے یا نہیں؟" اس کی رپورٹ سے متاثر ہوئے بغیر چودھری نے سختی سے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں چودھری صاحب! منشی نے پہلے ہی مجھے پیغام بھجوا دیا تھا۔ رنگ و روغن اور مرمت شرمت کے کام اس کے بندے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ساری صفائیاں ستھرائیاں اپنی نگرانی میں ہی کروانی ہیں۔ نئے پردے اور چادریں وغیرہ بھی شہر سے منگوا کر رکھ لی ہیں۔ پنڈ کی عورتیں چاول اور دوسرے اناج کی صفائی کے لیے بھی روزانہ پابندی سے آرہی ہیں۔ آپ ذرا لوڑ نہ کرو۔ عرس کے وقت سب تیار رہے گا۔" اس نے مؤدبانہ تسلی دی۔

"مجھے اطمینان تو دلا رہی ہے پر یہ گل کھوپڑی میں بٹھا لے کہ اگر مجھے کوئی شکایت ہوئی تو وڈی کی طرح تیری بھی حویلی سے چھٹی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔" چودھری نے اپنے سرد لہجے میں دھمکی دی کہ وہ کانپ کر رہ گئی اور بے ساختہ ہی اس کو مزید تسلیاں دینے لگی جنہیں سننے کے بعد چودھری نے اپنی طرف سے بھی اسے خاصی ہدایات دیں۔ وہ اس کی ہر بات کو گرہ میں باندھتی رہی۔

"سب چنگی طرح سمجھ گئی ہے یا نہیں؟" آخر میں چودھری نے اس سے سوال کیا۔

"بالکل سمجھ گئی ہوں سرکار۔" اس نے فوراً جواب دیا لیکن پھر بچے کے رونے کی آواز سن کر بری طرح اچھل گئی۔ آواز سن کر چودھری بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ ایک چھوٹا سا [illegible] بچہ چودھرائن کے بستر پر ایک جانب لیٹا رو رہا تھا۔ بچے نے بیڈ شیٹ کا ہم رنگ کمفرٹ اوڑھ رکھا تھا اس لیے کمرے میں موجود ہونے کے باوجود وہ اس کی موجودگی کے بارے میں نہیں جان سکا تھا۔ اگر بچہ روتا نہیں تو وہ اب بھی بے خبری میں ہی واپس لوٹ جاتا۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟" اس نے چونک کر چودھرائن سے سوال کیا۔

"اپنے بہزاد شاہ کا پتر ہے۔ میرا اکیلے جی گھبراتا ہے تو کبھی کبھار اسے نیچے بلوا لیتی ہوں۔" اس نے جواب ضرور دیا لیکن اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ چودھری کی اجازت کے بغیر خود روتے ہوئے بچے کو آگے بڑھ کر اٹھا لے۔

"اس کو اوپر ہی رکھا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔" بچے کے بارے میں جان کر اس کے احساسات عجیب سے ہو گئے اور یاد آیا کہ کچھ دیر قبل وہ مراد شاہ کو اپنا اکلوتا وارث قرار دے رہا تھا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی۔ اس کا ایک وارث یہ بچہ بھی تھا جو بظاہر تو بہزاد شاہ کا بیٹا کہلاتا تھا لیکن وہ یہ حقیقت جانتا تھا کہ بہزاد شاہ ایسا کوئی کارنامہ انجام دینے کے قابل ہی نہیں تھا اور خود اس نے اپنے سفلی جذبات کی تکمیل کے لیے باپ بیٹے کے رشتے کی دھجیاں اڑائی ہیں اور اپنے ذہنی معذور بیٹے کی منکوحہ سے شرمناک تعلق قائم کر کے دنیا کی مکروہ ترین حرکت کی ہے۔ بہزاد شاہ کی منکوحہ فریدہ کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ اس کے حریف وڈیرے کی بہن تھی اور قسمت کی خرابی سے اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک طرف تو ذہنی معذور بہزاد شاہ سے فریدہ کا نکاح پڑھوا کر اپنے حریف کو نیچا دکھایا، دوسرے فریدہ کو پامال کر کے اپنی کامیابی کا جشن مناتا رہا۔ یہ بچہ اس کے اسی ظلم اور بربریت کی نشانی تھا جس سے صرف وہی واقف تھا۔

"میں ابھی اسے اوپر بھجوا دیتی ہوں۔" اس کے احساسات سے بے خبر چھوٹی چودھرائن نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"اماں! بچہ کیوں اتنی بری طرح رو رہا ہے؟" ابھی چودھرائن کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور فریدہ اندر داخل ہوئی۔ اندر آنے کے بعد وہ چودھری کو مکمل طور پر نظرانداز کرتی ہوئی بچے کی طرف بڑھ گئی اور اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔ چھوٹی چودھرائن اس کی جرأت پر آنکھیں پھاڑے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر ملازماؤں نے فریدہ کو چودھری کی اندر موجودگی کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا اور اس صورت میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی بنا اجازت اندر آجاتا لیکن فریدہ نہ صرف اندر آگئی تھی بلکہ چودھری کی موجودگی کو نظرانداز کر کے بچے کو بھی گود میں اٹھا لیا تھا... جبکہ چودھرائن خود اندر موجود ہوتے ہوئے یہ جرأت نہیں کر سکی تھی۔

"فریدہ! چودھری صاحب کو سلام کر۔" اس نے فریدہ کو اس کی گستاخی کا احساس دلانا چاہا۔ بچے کو بہلاتی فریدہ نے نظر اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا۔ اس کی اس

ایک نظر میں طنز، حقارت، نفرت... کیا کیا نہیں تھا۔ بے حد و حساب بے ضمیر ہونے کے باوجود چودھری کو اس کی نظر نے اندر سے کپکپا کر رکھ دیا۔ ضمیر کی ملامت پر یا شاید دل بھر جانے پر اس نے فریدہ سے اپنا گھناؤنا تعلق تو ختم کر لیا تھا لیکن جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ بات ختم ہو جاتی۔ فریدہ کی نفرت بھری نگاہیں اس جیسے آدمی کو بھی اندر سے جھلسا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ وہاں کھڑا نہیں رہ سکا اور فوراً ہی مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے چھوٹی چودھرائن فریدہ کو اس کی حرکت پر سرزنش کرتی رہی اور وہ بے نیازی سے یوں سنتی رہی جیسے اس کے بجائے کسی اور کو یہ سب کہا جا رہا ہے۔

☆☆☆

وہ ایک گاہک کی فرمائش پر اسے مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی ٹائیاں نکال کر دکھا رہی تھی کہ اچانک ہی آنکھوں کے آگے دائرے سے ناچنے لگے اور اسٹور میں موجود ہر شے گھومنے لگی۔ اس نے کوشش کی کہ کاؤنٹر کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچالے لیکن خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی اس کے لیے کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا اور وہ نیچے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ نیچے بیٹھ کر اسے بہت زور کی ابکائی آئی اور ایسا لگا کہ آنتیں الٹ کر باہر آنے لگی ہوں۔

"آر یو او کے مہرین!" اس کے برابر والے کاؤنٹر پر موجود لڑکی کی نظر اس پر پڑی تو وہ تشویش سے پوچھنے لگی لیکن اس میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ طبیعت اچانک ہی اتنی بری طرح بگڑی تھی کہ پسینے چھوٹ گئے تھے اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ ساتھی لڑکی نے اس کی حالت دیکھی تو لپک کر اس کے قریب آئی اور سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا پھر دوڑ کر گلاس میں پانی لے آئی۔ اس نے ایک گھونٹ پانی پیا تو طبیعت سنبھل گئی۔ اس اثنا میں لڑکی انٹرکام پر کیش کاؤنٹر پر بیٹھے اسلم کو اس کے بارے میں اطلاع دے چکی تھی اور خود حیران پریشان کھڑے گاہک کو ٹائیاں دکھانے لگی تھی۔ اتفاق سے یہ ایسا وقت تھا کہ اسٹور میں زیادہ رش نہیں تھا اس لیے اس لڑکی کو اپنی جگہ چھوڑنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

"کیا ہوا ماہ! طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟" افتاں و خیزاں اسلم اطلاع ملتے ہی کاؤنٹر چھوڑ کر دوڑا ہوا آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

"بس ایسے ہی ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

"ذرا سا چکر آنے میں رنگت ایسی زرد ہو جا[illegible] کیا؟ تم اٹھو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چل[illegible] تمہیں خود تو ذرا اپنا خیال نہیں ہے۔ ڈھنگ سے کھا[illegible] تک نہیں ہو، ایسے میں کمزوری تو ہونی ہی ہے۔" اس [illegible] دینے کے باوجود اسلم کی تشویش اپنی جگہ تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ یہاں سے آف کرنے [illegible] چلیں گے۔" وہ اپنے لیے اس کی محبت سے واقف [illegible] لیے زیادہ بحث نہیں کی۔

"آف ہونے میں تو ابھی بہت دیر ہے۔ میں [illegible] مصطفیٰ صاحب سے بات کر کے دو گھنٹے کی چھٹی لے [illegible] ہوں۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور فوراً ہی مصطفیٰ خا[illegible] موبائل پر رابطہ کر کے اجازت طلب کرنے لگا۔ ا[illegible] بلاتردد اجازت دے دی۔ اجازت کا مسئلہ حل ہوتے [illegible] نے اپنی جگہ کسی اور کو ذمے داری سونپی اور ماہ بانو کو لے [illegible] روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے لیڈی ڈاکٹر کو خود [illegible] کے بارے میں نہایت تشویش سے آگاہ کیا اور جب [illegible] اسے معائنے کے لیے کمرے میں لے گئی تو خود مضطرب سا ہو [illegible] رہا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے اسے دوبارہ بلایا تو اس کے چہ[illegible] پر مسکراہٹ تھی جبکہ ماہ بانو کچھ جھینپی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"آپ کو مبارک ہو مسٹر اسلم! آپ کی مسز کے [illegible] ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس پر آپ پریشان ہوں... [illegible] آپ کے لیے خوش خبری ہے کہ آپ کے ہاں ننھے مہما[illegible] آمد آمد ہے۔" وہ ایک ادھیڑ عمر کی ایشیائی نقش و نگار [illegible] والی عورت تھی جس نے بہت جوش سے اسے یہ خوش خ[illegible] سنائی تھی۔ خبر سن کر اسلم کھل اٹھا۔

"تھینک یو سو مچ ڈاکٹر! آپ نے واقعی مجھے [illegible] بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ اب آپ میری مسز کو بھی سمجھا [illegible] کہ بچے کی خاطر انہیں اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا ہو گا۔ [illegible] اب یہ مکمل طور پر آرام کریں گی۔" اس نے ماہ بانو پر مح[illegible] بھری نگاہ ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

"صحت کا خیال رکھنے والی بات تو بالکل ٹھیک ہے [illegible] میں انہیں مکمل ڈائٹ شیڈول بنا کر دے دوں گی جس پر [illegible] سے عمل کروانا آپ کا کام ہے۔ اس کے علاوہ آپ [illegible] پابندی سے چیک اپ کے لیے بھی یہاں لاتے رہیے گا [illegible] مکمل آرام والی بات غلط ہے۔ پریگنینسی کوئی مرض نہیں [illegible] جو عورت کو مکمل بستر پر لٹا دیا جائے۔ کسی پیچیدگی کی صورت [illegible] میں بیڈ ریسٹ کا مشورہ دینے کے علاوہ ہم ماں بننے [illegible] عورتوں سے یہی کہتے ہیں کہ صحت مند زندگی کے اصولوں

عمل کرتے ہوئے بالکل نارمل لائف گزاریں... کیونکہ ماں جتنی متحرک رہتی ہے، اس کے اور بچے کی صحت کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ گھریلو کام کاج کے علاوہ اپنی جاب آسانی سے جاری رکھ سکتی ہیں۔ بس اتنی احتیاط کرنی ہوگی کہ زیادہ وزن وغیرہ نہ اٹھائیں اور چلتے پھرتے وقت دھیان رکھیں کہ کہیں سے گرنے پڑنے نہ پائیں۔" ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اسے اچھی طرح سمجھایا پھر ڈائٹ پلان کے ساتھ ساتھ فولاد اور وٹامنز پر مشتمل دوائیں بھی تجویز کر کے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا۔

"میں بہت خوش ہوں ماہ! سچ پوچھو تو میں خوشی سے ساتویں آسمان پر اڑ رہا ہوں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا خوشی کا مقام ہے کہ میری محبت کی نشانی تمہارے وجود میں سانس لے رہی ہے۔" باہر نکل کر اس نے ماہ بانو کو اپنے ایک بازو کے حصار میں لے کر خود سے قریب کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولی اور صرف خاموشی سے مسکراتی رہی۔ فی الحال وہ اسلم کی طرح خوش یا پُرجوش ہونے کے بجائے عجیب سے احساسات کا شکار تھی اور قدرت کی کاریگری دیکھ رہی تھی جس نے عجیب طرح سے پہلے اسے اسلم کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھا تھا اور اب اولاد کی زنجیر بھی پیروں میں پڑتے جارہی تھی۔ اس زنجیر کے بعد کہاں ممکن تھا کہ وہ پلٹ کر ماضی کی کسی یاد کو آواز دے سکتی یا اس محبت کے بارے میں سوچ سکتی جس نے بارش کی پہلی بوند کی طرح اس کے دل کی سرزمین کو مہکایا تھا۔

☆☆☆

اس قافلے میں کُل سات افراد شامل تھے جن میں سے دو شہریار اور سلو تھے۔ یہ اسمگلروں کا قافلہ تھا جن کے لیے انڈیا اور پاکستان کی درمیانی سرحد عبور کرنا ایک معمول کی بات تھی۔ وہ دونوں اس قافلے کا حصہ اس لیے بنے تھے کہ بھارت میں رازدارانہ داخلے کا یہی سب سے مناسب اور کسی حد تک محفوظ طریقہ تھا۔ قافلے میں ان کی شمولیت کا انتظام کیپٹن اظہر نے کروایا تھا لیکن وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں ایک دوسری پارٹی موجود تھی اور قافلے کو لیڈ کرنے والا اسمگلر قاسم بھی جانتا تھا کہ اسے جن دو لوگوں کو اپنے ساتھ بھارت لے جانا ہے وہ بھیرو دادا کے بندے ہیں۔ اس کام کے لیے بھیرو دادا نے اسے بھاری رقم دی تھی اور ساتھ ہی یہ تنبیہ کر دی تھی کہ اس کا کام صرف ان دونوں کو سرحد پار کروانا ہے۔ وہ کیوں اور کس لیے وہاں جارہے ہیں؟ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ قاسم نے اب تک اس بات کا خیال رکھا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی دورانِ سفر ان کے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھ رہے تھے دونوں کی بھی پوری کوشش تھی کہ ایسی کوئی صورتِ حال پیش نہ آئے کہ قافلے میں شامل دیگر افراد سے کسی قسم کی کھٹ پٹ ہو لیکن وہ باقی لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے گریزاں اور ضرورت کے علاوہ بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس موجود سامان کے بیگز بھی کسی اور کو اٹھانے کی اجازت نہیں دی تھی اور خود انہیں اٹھاتے تھے۔ ان کا ... سفر جیپ میں طے ہوا تھا اور اس کے بعد وہ پیدل چل رہے تھے۔ قاسم نے انہیں بتایا تھا کہ پیدل صرف چند گھنٹوں کی مسافت ہے، اس کے بعد انہیں سواری کے لیے اونٹ مل جائیں گے۔ آبادی میں پہنچنے کے بعد یہ شہریار اور سلو کی صوابدید پر تھا کہ کہاں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کر لیتے۔ فی الحال تو ان کا سفر جاری تھا اور ابھی انہوں نے سرحد پار نہیں کی تھی۔ پیدل چلتے ہوئے ان کے بیگز ان کے شانوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ موجود اسمگلروں نے بھی اپنے شانوں سے بڑے بڑے تھیلے لٹکا رکھے تھے جن میں اسمگلنگ کا وہ عمومی سامان تھا جو بھارت اور پاکستان کے درمیان اسمگل ہوتا رہتا تھا۔ لیکن بھیرو دادا کے توسط سے شہریار کو پتا چلا تھا کہ اس سامان کے ساتھ ساتھ قاسم نایاب ہیرے اور مورتیاں بھی خفیہ طور پر لے کر جارہا ہے۔ عام حالات میں وہ قطعی یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ پاکستان کی نادر و نایاب اشیا کو یوں بھارت اسمگل کرے۔ لیکن فی الحال وہ جس اہم مشن پر تھا، اس کی خاطر اسمگلروں سے مفاہمت پر مجبور تھا۔

"فائق خان..." قافلہ کچھ اس ترتیب سے چل رہا تھا کہ شہریار، سلو اور ایک اسمگلر سب سے آگے تھے۔ باقی چار افراد، دو دو کی ٹولیوں میں اس طرح چل رہے تھے کہ قاسم سب سے پیچھے تھا۔ اور اس وقت قاسم نے ہی شہریار کو، جو فائق خان کے نام سے سفر کر رہا تھا، پکارا تھا۔ اس کی پکار پر وہ اور اس کے ساتھ چلتا سلو رک گیا۔ سلو کا موجودہ ... پاشا تھا اور شہریار کی طرح اس کا حلیہ بھی کافی بدلا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے قاسم؟" شہریار نے قاسم کے قریب آنے پر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"سرحد پار سے میرے ساتھیوں نے خبر پہنچائی ہے کہ آج رات سرحد پار کرنا خطرناک ہوگا اس لیے آج ہمیں اسی طرف ہی کہیں پڑاؤ ڈال لینا چاہیے۔ آج رات سرحد پر انڈین آرمی کی معمول سے زیادہ نفری اور نقل و حمل دیکھی جارہی ہے۔" اس نے پُرتشویش لہجے میں اطلاع دی جسے سن کر شہریار کے ماتھے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

"پریشان نہ ہو خان! یہ ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے اور ہم تھوڑا ٹھہر کر اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔" اسے پریشان پا کر قاسم اسے تسلی دینے لگا۔

"اوکے، تم ان معاملات کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا ہوگا؟ رات تو اب ہو ہی چکی ہے۔" شہریار نے فوراً ہی مطمئن ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی ہمیں کچھ دیر اور چلنا ہوگا۔ پھر ہم محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔" قاسم نے اسے بتایا اور ان کا سفر ایک بار پھر جاری ہوگیا۔ اس بار قاسم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جبکہ سلو اور اس کا ساتھی پیچھے ہو گئے تھے۔

"لگتا ہے تم بھیرو دادا کے پاس نئے آئے ہو۔ میں نے پہلے کبھی اس کے آدمیوں میں تم دونوں کو نہیں دیکھا۔" ساتھ چلتے چلتے قاسم نے اس کے ساتھ گفتگو چھیڑ دی۔

"ہم اس کے آدمی نہیں ہیں۔ ہم اپنی کسی ضرورت کے تحت بھارت جارہے ہیں جس کے لیے ہم نے اس سے سرحد پار کروانے کی درخواست کی تھی لیکن اس نے بتایا کہ اس کا قافلہ جانے میں ابھی ایک ہفتہ مزید لگے گا۔ ہمیں جلدی تھی اس لیے اس نے تمہارے ساتھ ہمارا معاملہ کروا دیا۔" شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور اندر ہی اندر ہوشیار ہو گیا کہ یہ شخص اپنی ابتدائی خاموشی کے بعد اب تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ تم دونوں اس فیلڈ میں نئے ہو اور اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن اگر تم چاہو تو اپنا مال مجھے دکھا کر مجھ سے یہیں سودا کر سکتے ہو۔ مال اچھا ہوا تو میں تمہیں اس کی بہت اچھی قیمت دوں گا اور تم بیکار میں سرحد پار کرنے کے خطرے سے بچ جاؤ گے۔" قاسم نے نہایت مکاری سے اپنی دانست میں اسے خاصی پُرکشش پیشکش کی۔

"تمہارا شکریہ لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا اپنے طور پر خود کر لیں گے۔ تم سے ہماری بس اتنی ڈیلنگ ہوئی ہے کہ ہمیں سرحد پار کروا دو اس لیے بہتر ہے کہ تم خود کو دوسرے معاملے میں دلچسپی لینے کے بجائے خود کو اس کام تک محدود رکھو جس کا تمہیں معاوضہ دیا گیا ہے۔" شہریار نے سخت لہجے میں تنبیہ کی جس پر اس نے فوراً ہی اپنا رویہ

بدل لیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔

"بُرا کیوں مانتے ہو یار! میں نے تو ایسے ہی ایک آفر کی تھی۔ اگر تمہیں قبول نہیں تو کوئی بات نہیں۔"

اس کے بعد ان کا باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر وہ لوگ رک گئے۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا اور کسی ذی روح کی موجودگی کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ قاسم کے ساتھیوں نے فالتو سامان میں موجود خیمے نصب کیے۔ خیمے چھوٹے تھے جن میں دو آدمی ہی سما سکتے تھے۔ شہریار اور سلو کو ایک ہی خیمہ ملا، باقی میں قاسم کے ساتھی کسی نہ کسی طرح فٹ ہو گئے۔ خیموں کی تنصیب کے بعد انہوں نے ڈبوں میں بند خوراک سے اپنی بھوک مٹائی۔ اس تاریک ویرانے میں آگ جلانا خطرناک ہوتا اس لیے انہوں نے ٹھنڈے کھانے پر ہی اکتفا کیا اور کھانے کے بعد چائے، کافی کا تکلف بھی نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ قاسم اور اس کے ساتھیوں نے شراب نوشی ضرور شروع کر دی تھی۔ ان دونوں کو بھی انہوں نے اس شغل میں شامل کرنا چاہا تھا لیکن دونوں ہی نے انکار کر دیا تھا جس کے بعد ان سے مزید اصرار نہیں کیا گیا اور مائع دودھ کے بند ڈبے پینے کے لیے دے دیے گئے۔ قاسم اور اس کے ساتھی شراب نوشی کے دوران میں خوب خوش گپی کر رہے تھے۔ شہریار نے سلو کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اپنے ہاتھ میں پکڑے دودھ کے ڈبے لے کر اپنے خیمے میں چلے گئے۔ آگے انہیں نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھانی تھیں اور کتنے دن رات جاگ کر گزارنے تھے اس لیے بہتر تھا کہ آرام کا جو موقع مل رہا ہے، اس سے فائدہ اٹھالیں۔ جلد ہی وہ دونوں سو گئے۔ سوئے ہوئے انہیں مشکل سے آدھ گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ شہریار کی آنکھ کھل گئی۔ خیمے میں حرکتی پنسل ٹارچ کی روشنی نے فوراً ہی اسے احساس دلایا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ دم سادھے پڑا دیکھتا رہا۔ وہ شخص سلو کے بیگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ قاسم کا ساتھی گاما ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ قاسم کے لالچ نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ ان کی لاعلمی میں ان کے سامان کی تلاشی کروائے۔ اس نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص پر جا پڑا۔ وہ شاید ان کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھا اس لیے پوری طرح گرفت میں آگیا اور اس کے بعد شہریار نے اسے سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اتنی بُری طرح مارتا چلا گیا کہ اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے لوگ دوڑے آئے۔

انہوں نے گاما کو اس کی گرفت سے چھڑوایا۔
''چھوڑو فائق خان! کیا اس کی جان لو گے؟'' قاسم نے اسے جھنجوڑا۔
''میں اپنے سامان پر بُری نظر ڈالنے والے کی جان نکال لوں گا۔ یہ رات کی تاریکی میں یہاں چوری کرنے آیا تھا۔'' شہریار نے جان بوجھ کر غصے سے کف اڑاتے ہوئے جواب دیا۔
''میں اسے اس کی غلطی پر کڑی سزا دوں گا۔ فی الحال ہم سفر میں ہیں اس لیے تم جانے دو۔ میں واپسی پر اس کا فیصلہ کروں گا۔'' قاسم نے اسے سمجھایا تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ قاسم اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شہریار نے بے خبر سوئے ہوئے سلو کی طرف دیکھا۔ اتنے ہنگامے میں اس کا سوئے رہنا حیرت انگیز تھا۔ فوراً ہی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ سونے سے پہلے انہیں جو دودھ کے ڈبے دیے گئے تھے، ان میں یقیناً نیند کی کوئی دوا انجیکٹ کی گئی تھی۔ اتفاق سے اس نے وہ دودھ نہیں پیا جبکہ سلو پینے کی وجہ سے غفلت میں چلا گیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ جو ہوا، اس میں قاسم کا ہاتھ تھا، یہ معاملہ سامنے آنے پر مزید تصدیق ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ باقی کے سفر میں قاسم اور اس کے ساتھیوں سے خود بھی ہوشیار رہے گا اور سلو کو بھی ہوشیار رہنے کی ہدایت کرے گا۔
باقی رات آرام سے گزر گئی۔ شاید قاسم اور اس کے ساتھیوں نے سمجھ لیا تھا کہ اندر موجود شخص ٹیڑھی کھیر ہے، وہ اتنی آسانی سے اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔ صبح سلو بھی جاگ گیا لیکن کسلمندی اور سستی کی شکایت کرتا رہا۔ قاسم اور اس کے ساتھی چور بنے خاموش رہے۔ البتہ شہریار نے سب کے سامنے سفر کی تھکن اور بے آرامی کو الزام دیتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ دن کی روشنی میں آگ جلانے میں حرج نہیں تھا اس لیے قاسم کے دو ساتھیوں نے مل کر تازہ ناشتا تیار کیا۔ ناشتے کے بعد وہ لوگ اپنی اپنی مرضی کے شغل میں مصروف ہو گئے۔ سرحد پار کرنے کے لیے رات کا اندھیرا ضروری تھا اس لیے انہیں سفر کا آغاز ابھی نہیں کرنا تھا۔ ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر شہریار نے سلو کو قاسم کی حرکت سے آگاہ کر دیا۔ وہ بیک وقت شرمندگی اور غصے کا شکار ہو گیا۔ معمولی اسمگلرز کے ہاتھوں بے بس ہو جانا اس کے لیے باعثِ شرمندگی تھا اس لیے بس نہیں چل رہا تھا کہ قاسم کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے۔ شہریار نے اسے ٹھنڈا کیا اور سمجھایا کہ مصلحت یہی ہے کہ فی الحال خاموشی اختیار کر لی جائے اور ایسے غیر اہم لوگوں سے الجھ کر اپنی توانائی ضائع نہیں کی جائے۔ سلو نے اس کی بات سمجھ لی۔
سرِ شام ان کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد قاسم نے انہیں بتایا کہ وہ زون میں داخل ہو گئے ہیں اور اب انہیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ اس کی ہدایت کے بعد ان لوگوں کے اعصاب بھی تنے رہے لیکن خیر گزری اور وہ اس جگہ سے بھی گزر گئے۔ آگے ان لوگوں کا ٹھکانا تھا جنہوں نے انہیں اونٹ فراہم کرنے تھے۔ وہاں انہوں نے کچھ دیر ٹھہر کر خود کو تازہ دم کیا اور پھر اونٹوں پر سوار ہو کر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہریار کے لیے یہ سفر کا ایک نیا تجربہ تھا۔ اگر وہ استاد فاروق کی سخت تربیت میں نہ رہا ہوتا تو یہ سفر اس کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا۔ سلو البتہ اطمینان سے تھا۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی سختیاں دیکھی تھیں پھر را والوں کی تربیت سے گزرا تھا اس لیے اسے کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ان کا سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بہت دور معمولی سے روشنیاں نظر آنے لگیں۔
''یہ سرحد سے قریب ترین آبادی ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں بھی ہمیں کم از کم ایک گھنٹا اور لگے گا۔'' قاسم نے اس کے قریب ہی اونٹ کو دوڑاتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ مزید پانچ منٹ گزر گئے۔ اچانک وہاں ہلچل مچ گئی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور اچانک ہی رائفلیں چلا کر انہیں للکارنے لگے تھے۔
''بھاگو۔'' شور و غل کے درمیان قاسم کی بلند آواز سنائی دی اور پھر وہاں عجیب افراتفری مچ گئی۔ شہریار کا اونٹ بھی دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ ناتجربے کاری کی وجہ سے اسے اونٹ پر جم کر بیٹھے رہنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی اور ہر لمحے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی پل وہ گر جائے گا۔ اس کا یہ اندیشہ اس صورت پورا ہوا کہ ایک فائر کی آواز گونجی اور ایک انگارہ سا اس کے بازو میں گھس گیا۔ اسے مزید بھی فائر سنائی دیے اور اس کا بھاگتا ہوا اونٹ بھیانک آواز میں چیخا۔ انسانوں کی ہوس نے ایک جانور کو بھی جنگ کا ایندھن بنا دیا تھا۔ زخمی اونٹ نے اسے نیچے پٹخ دیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

میری کرسمس

جمال دستی

زندگی کے ہر لمحے سے محظوظ ہونا ہر شخص کی دلی تمنا ہوتی ہے... مگر کبھی کبھی کوئی ان لمحوں میں مخل ہو کے سرشاری و خوشی کی اس کیفیت کو یکسر بدل دیتا ہے... اس کے ہر قدم پر ایک رکاوٹ کھڑی تھی... اس نے اپنی زندگی کے ہر پل سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس رکاوٹ کو ہمیشہ کے لیے ہٹانے کا طریقہ سوچ لیا تھا...

کرسمس کے تہوار پر خوشی... غمی اور جرم کا ملاپ

''جیکب!''
جیکب چونک پڑا اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اپنا پین اٹھا لیا۔ وہ اس وقت ... آرام کرسی پر بیٹھا اپنی نوٹ بک ... لکھنے میں مگن تھا۔
جیکب نے جھنجھلاتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اس عورت کو غور سے دیکھ رہا تھا جو گزشتہ پچیس سال سے اس کی بیوی تھی۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس عورت کے چہرے کی رنگت تانبے جیسی کر دی تھی جو کسی زمانے میں اس دور کی حسینہ ''ہارو مائے ویسٹ'' سے مشابہ لگتی تھی۔ اب اس کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور جسم بھی دبلا پتلا ہو گیا تھا۔
وہ سوچنے لگا کہ میری کی وہ سریلی آواز جس سے وہ اس کا نام بڑی چاہت سے پکارا کرتی تھی اب اونچی اور سمع خراش ہو گئی ہے جیسے تیز نکیلے ناخنوں سے کسی بورڈ پر رگڑ لگائی جا رہی ہو۔
''جیکب۔'' وہی ناگوار آواز پھر گونجی۔
''ہاں، میری؟''
میری نے اس کی آرام کرسی کے اطراف میں پھیلے ہوئے کاغذ کے مڑے تڑے گولوں کی جانب اشارہ کیا اور کرخت آواز میں بولی۔ ''مجھے کتنی بار تمہیں بتانا پڑے گا؟ اپنی ان بے کار تحریروں کو کوڑے کی بالٹی میں پھینکا کرو۔ ہمیں اس جگہ کو صاف ستھرا رکھنا ہے۔ یاد نہیں کہ بریجٹ اور راجر کرسمس ڈنر کے لیے یہاں آنے والے ہیں؟''
جیکب خاموش رہا۔
میری اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔ ''اوپری منزل سے آرائشی اشیا اتار کر نیچے لے آؤ۔ ہمیں اس جگہ کو تہوار کے لحاظ سے سجانا ہے۔''
جیکب نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے سر جھکا لیا۔ کیا کوئی شخص اپنے گھر میں بھی اپنی من مانی نہیں کر سکتا؟ ویسے بھی

ابھی کرسمس کی آمد میں دو دن باقی تھے۔

"تم یہ ہرگز نہیں چاہو گے کہ تمہاری بیٹی اور داماد یہ دیکھ پائیں کہ تم کتنے نااہل اور کاوڈی ہو چکے ہو اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ تم اس حد تک کم عقل اور ستِ دماغ ہو چکے ہو کہ تمہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا اسی لیے تم ہر بات۔ لکھ کر یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہو۔"

جیکب نے کاغذ کی مڑی تڑی گیندوں کو فرش سے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھرا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔ وہ کوڑے کی بالٹی تلاش کر رہا تھا۔ 'مجھے اسی طرح میری کو بھی کہیں پھینک دینا چاہیے!' وہ دل ہی دل میں بڑبڑانے لگا۔ 'ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی گزارنے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ ہر وقت اس بڑھیا کی بک بک سنو اور وہ مجھ پر حکم چلاتی رہے!'

"کوڑا باہر لے جاؤ، جیکب۔" میری نے اپنی مخصوص تیز... آواز میں کہا۔ "کل کوڑا اٹھانے کا دن ہے۔"

وہ بک کر رہ گیا 'میں ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں، بڑھیا' وہ دل ہی دل میں پھر بڑبڑایا۔

پھر اس نے اپنی لکھی ہوئی تحریروں کے مڑے تڑے کاغذ کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیے اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا، میری!"

پھر اس نے کوڑے کی بالٹی اٹھائی اور باہر رکھے ہوئے کوڑے دان میں ڈال دیا۔ پھر وہ گھوم کر عقبی دروازے سے مکان میں داخل ہوا اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے ایک قلم اور لکھنے کا پیڈ اٹھایا اور اس کا ذہن جرم کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

'کرسمس کی آرائشی لائٹوں کی ایک جھالر لے کر دبے پاؤں میری کے عقب میں جا کر جھالر کا تار اس کی گردن میں لپیٹ دے اور اس کا گلا گھونٹ دے۔' جیکب یہ لکھنے کے بعد رک گیا۔

'نہیں، جھالر کا تار بہت لمبا ہوتا ہے اور جھالر کے بلبوں کے آپس میں ٹکرانے کی جھنکار سے میری چونک سکتی ہے۔' اس نے یہ کاغذ پھاڑ دیا اور اسے مروڑ تروڑ کر حسب عادت فرش پر اچھال دیا۔

پھر اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔

'میری کی کافی میں سنکھیا ملا کر اسے زہر آلود کر دے۔' یہ لکھ کر اس نے قلم دوبارہ روک لیا۔

'نہیں، میرے پاس کوئی زہر نہیں ہے اور اگر میں نے اس کے لیے خود کافی کا کپ تیار کیا تو اسے شک ہو سکتا ہے۔' اس نے وہ کاغذ بھی پھاڑ دیا اور اس کی گیند سی بنا کر فرش پر اچھال دی۔

پھر دوبارہ نئے پلاٹ پر غور کرنے لگا۔ 'فرض کریں کہ میں ایک چور ہوں اور چوری چھپے گھر میں داخل ہوتا ہوں... اسے اس طرح ڈراتا ہوں کہ خوف کے مارے میری... واقع ہو جائے۔'

اس آئیڈیے پر جیکب نے اپنے ہونٹوں... پھیرتے ہوئے غور کیا تو اسے یہ آئیڈیا بھی رد کرنا پڑ... 'نہیں، میری کو ڈرانا آسان نہیں اور ممکن ہے... بھاری شے سے میری کھوپڑی بجا دے اور مجھے لینے... پڑ جائیں۔'

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔

'جب کوڑا اٹھانے والا ٹرک شور مچاتا ہوا محلے سے... لگے تو جب وہ اپنی الماری سے گن نکال کر میری کو سو... شوٹ کر دے اور اسے کوڑے دان میں ٹھونس دے۔'

'ہاں، یہ طریقہ صحیح رہے گا۔ لاش بھی ٹھکانے... گی اور ٹرک کے شور میں فائر کی آواز بھی دب جائے گی۔'

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور میری... کرنے کے لیے دبے پاؤں لیونگ روم کی جانب چلا...

میری اپنی کرسی پر بیٹھی خراٹے لے رہی تھی۔ '...میری، تم سہانے خواب دیکھتی ہوں لیکن یہ تمہار... خواب ہوگا۔'

جیکب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے... روم میں چلا گیا اور گاؤن اتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔

شور کی آواز نے اسے نیند سے بیدار کر دیا۔ یہ... اٹھانے والے ٹرک کا تھا جو اس وقت محلے سے گزر رہا تھا۔

تب جیکب کو اپنا پلان یاد آ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے... بیٹھا۔

پھر حیرت سے منہ پھاڑے اپنی بندوق کی... جانب گھورنے لگا جو اس کے سینے کا نشانہ لیے ہو... بندوق کی دوسری جانب میری کھڑی تھی۔ اس نے جیـ... متوجہ پا کر بیڈ کے کنارے رکھے ہوئے ان کاغذات کی... اشارہ کیا جو جیکب نے اپنے چھوٹے کمرے میں توڑ مـ... پھینک دیے تھے۔

"تو تم نے مجھے قتل کرنے کے یہ مختلف پلاٹ تحر... ہیں۔" میری نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "مجھے ہوشیار کر... بہت بہت شکریہ، مائی ڈیئر جیکب!"

جیکب کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ اس نے کچھ کہنا... حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

"میری کرسمس!" میری نے کہا اور ٹریگر دبا دیا۔

قیمت

محمد عفان آزاد

قدرت نے کائنات کو حُسن کے ہر رنگوں سے نوازا ہے... فطرت کی ہر دلکشی عطا کی ہے... مگر جب دولت کے پجاریوں کو حُسن و دلکشی کے پیچھے مالِ مفت نظر آتا ہے وہ جنتِ ارضی کو بے دریغ اجاڑنا شروع کردیتے ہیں... ایک قبیلے کا فسانہ جسے حُسنِ فطرت کا داغ دار ہونا منظور نہ تھا۔ جان سب سے قیمتی شے ہے مگر قبیلے کے لیے جان سے بھی زیادہ کچھ اور قیمتی تھا۔ حرص زادوں کے نزدیک جو بک نہیں سکتا... وہ بے مول مگر قدردانوں کے نزدیک جو بے قیمت ہو وہ انمول... مول انمول کے بیچ ایک زندگی کے داؤ پر لگ جانے کا فیصلہ کن دوراہا...

زرخیز خدا ترس پولیس افسر کی کارکردگی... جسے نسل پرستی سے نفرت اور پیشے سے عشق تھا

کافی دیر تک پولیس کانسٹیبل لیونارڈ اسمتھ سر جھکائے ساحل پر کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا اور اوپر نظر ڈالی۔ موسم خوشگوار تھا اور آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سورج کی کرنوں میں سمندر کا شفاف نیلگوں پانی جھلملا رہا تھا۔ چند لمحوں تک سمندر کو تکنے کے بعد اس نے نظریں ریتیلے ساحل پر مرکوز کر دیں۔

اسی دوران میں ایک تیز لہر آئی اور اس کے سامنے آڑی ترچھی حالت میں پڑی لاش کو چھوتے ہوئے گزر گئی۔

وہ کسی نوجوان لڑکی کی لاش تھی جو سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوئی یا پھر اسے قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ پتا چلانا فی الحال دور کی بات تھی، وہ تو لاش کی اطلاع ملنے پر کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔

دوسری زوردار لہر آئی اور لاش پر سے ہوتے ہوئے کانسٹیبل اسمتھ کے جوتے بھی بھگو گئی۔ تیز لہر سے اوندھے منہ پڑی لاش کے کھلے سیاہ بال لہرا کر رہ گئے۔ اسمتھ بھی دو قدم پیچھے ہٹا مگر پھر فوراً آگے بڑھا اور جیب سے کیمرا نکالنے لگا۔ وہ لاش اور اس جگہ کی تصاویر بنانا چاہتا تھا تاکہ بعد میں فرانزک تفتیش میں مدد مل سکے۔

وہ گرمیوں کے دن تھے اور ساحل پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم موج مستی میں مشغول تھا۔ لاش کی اطلاع اسے مقامی رینجر جوناتھن نے دی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اس کے پیچھے چلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ جگہ ہجوم والے مقام سے لگ بھگ تیس چالیس میٹر کے فاصلے پر تھی۔ لاش بھیگی ہوئی تھی جس کا مطلب تھا کہ جب سے سمندر کی لہروں نے اسے واپس ساحل پر پھینکا تھا، تب سے لہریں بدستور اسے بھگوتی رہی تھیں۔

لاش کے جسم پر جگہ جگہ ایسے چھوٹے سوراخ بنے تھے جیسے مچھلیوں اور کیکڑوں نے اسے اپنی خوراک بنانے کی کوشش کی ہو۔ اسمتھ گھٹنوں کے بل بیٹھا لاش کے مختلف حصوں کی تصاویر بنا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس نے دستانے پہنے اور نہایت احتیاط سے لاش کا سر سیدھا کیا۔ اس کا شک درست نکلا۔ سر پر موجود گھاؤ اتنا گہرا تھا کہ اندر سے دماغ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے نہایت قریب سے دیکھا تو چوٹ کی جگہ پر بھورے رنگ کا دھاگا الجھا ہوا نظر آیا۔ کافی دیر تک وہ لاش کا معائنہ کرتا رہا مگر سر پر چوٹ اور مچھلیوں کے نوچنے کے سوا، اس پر کسی بھی قسم کے دوسرے تشدد کا کوئی اور نشان نہیں تھا۔

لاش کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور پاؤں کے جائزے سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی ایسی عورت تھی جس کا روزگار بہت سخت تھا۔ ممکن تھا کہ وہ کسی لانڈری سے وابستہ تھی یا پھر ماہی گیری سے وابستہ ہوگی۔ جو بھی کام ہو، جسمانی طور پر وہ کڑی مشقت سے گزرتی ہوگی۔ اسی دوران میں ایک بادل کا آوارہ ٹکڑا بھٹکتا ہوا آیا اور عین اس مقام پر چادر کی طرح تن گیا جہاں لاش پڑی تھی۔ اسمتھ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور ایک بار پھر سر جھکا کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

موت کی درست وجہ تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہوسکتی تھی مگر یہ اسمتھ کی پرانی عادت تھی کہ وہ اس و[illegible] واقعات میں موقع کا بہت باریک بینی سے جائزہ [illegible] اب بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پوسٹ مارٹم رپو[illegible] موت کا سبب بتائے گی۔ قاتل تک پہنچنے کے لیے [illegible] دماغ سے کام لینا پڑے گا۔ جب سے وہ یہاں پہنچا [illegible] یہی کر رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر لڑکی کے سر کی طرف [illegible] سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے یہ چوٹ سمندر میں تیز [illegible] مردہ جسم کے اِدھر اُدھر ڈولنے کے دوران چٹان [illegible] ٹکرانے کا نتیجہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ موت کی چوٹ نہ ہو بلکہ وہ اس سے پہلے ہی آخری سانسیں [illegible] ہو۔ وہ بدستور امکانات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

لاش کے جسم پر نیلی تنگ جینز اور سرخ ٹی شرٹ [illegible] اس نے ٹی شرٹ کھسکا کر اور جینز کے پائنچے ہٹا کر کسی شے کو دیکھنے کی کوشش مگر جسم کے مختلف حصوں کا معائنہ کے باوجود اسے ایسی کوئی بات پتا نہ چل سکی [illegible] میں مددگار ثابت ہوتی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سمندر کی [illegible] دیکھنے لگا۔

کافی فاصلے پر اسے سمندر میں ایک ماہی گیر [illegible] آئی۔ افق پر دو چار سمندری بگلے اڑ رہے تھے۔ [illegible] پُرسکون تھا۔ اس نے دائیں جانب نظر دوڑائی۔ کافی [illegible] پر لوگ چمکیلے دن کا مزہ لینے کے لیے کھیل کود میں [illegible] تھے۔ اسی دوران میں پولیس وائرلیس گونجا۔ ''[illegible] اسمتھ...''

''لاش کا انتظام کرو۔ اسے فوراً پوسٹ مارٹم کے [illegible] اسپتال بھجوا دو۔'' دوسری طرف سینئر سارجنٹ تھا جس [illegible] اس کی سنے بغیر بھاری آواز میں حکم سنانا شروع کر دیا۔ [illegible] خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے کہ سب کچھ کس طرح [illegible] ہے؟'' جب لمحہ بھر کو اس کی خاموشی کے دوران اسمتھ نے جواب نہ دیا تو سارجنٹ نے پہلے سے زیادہ درشتی [illegible] کہا۔

''جانتا ہوں۔'' اسمتھ نے جواب دیا۔

''غور سے سنو۔'' سارجنٹ نے دوبارہ کہنا [illegible] کیا۔ ''کوئی بھی ایسا ثبوت ضائع نہ ہونے پائے [illegible] ہمیں کورٹ میں سبکی اٹھانی پڑے۔ یاد ہے نا پچھلا کیس [illegible]''

''سب جانتا ہوں۔'' اسمتھ نے بات کاٹ دی۔

''تم لاش کو محفوظ کرو اور فوراً کسی سراغ رساں [illegible] کرو۔''

''او کے سر۔'' اسمتھ کے جواب دیتے ہی سینئر سارجنٹ نے وائرلیس آف کر دیا۔

سینئر سارجنٹ نے اسے سراغ رساں کو بلانے کا حکم دیا تھا مگر وہ سوچ رہا کہ اس جزیرہ نما دور دراز علاقے میں، کون سا ایسا سراغ رساں ہوگا جو تپتی دوپہر میں ایک عام سی لاش کے لیے یہاں پہنچنا گوارا کرے گا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا وائرلیس سیٹ باہر نکالا۔

''اے جوناتھن...'' اسمتھ نے پیچھے مڑ کر ساتھ آنے والے رینجر کو پکارا۔ ''آجاؤ، اسے اب اسپتال پہنچانا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور کھڑا ہو کر اپنی پتلون سے ریت صاف کر کے آگے بڑھا۔ وہی اسمتھ کو اس مقام پر لے کر آیا تھا اور خاصی دیر سے، ساحل پر بیٹھا اسے کارروائی کرتے دیکھ رہا تھا۔

''لاش کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرو اور اسے ٹھیک سے لٹا دو۔'' اسمتھ نے حکم دیا۔ ''سراغ رساں کے آنے کے بعد سے اسپتال بھجوانا ہے۔''

لاش اس وقت ساحل کی ریت پر پڑی تھی۔ ایک تو اس کے اعضا اکڑ چکے تھے، دوسرا پانی میں رہنے کے باعث ذرا سی پھولی ہوئی لگ رہی تھی۔ جوناتھن نے اپنے تئیں اسے چت کر کے لٹایا اور جتنا کر سکتا تھا، ہاتھ پاؤں سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر اب بھی وہ پوری طرح سیدھے نہیں ہوئے تھے۔

''اسے ڈھانپنے کے لیے کچھ مل سکتا ہے؟'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اسمتھ نے سوال کیا۔

''کوشش کرتا ہوں، شاید شیلٹر میں ترپال مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ترپال کا ایک ٹکڑا تھا جسے اس نے لاش پر ڈال دیا۔ ترپال کافی بڑا تھا اور اس سے لاش پوری طرح ڈھانپی جا چکی تھی۔ ساحل پر ہوا خاصی تیز چل رہی تھی۔ اس نے ترپال کو اڑنے سے بچانے کے لیے اس کے کناروں پر کئی پتھر رکھ دیے تھے۔

''ایمبولینس کو فون کر دیا ہے اور سراغ رساں کو بھی، دیکھیں کب تک آتے ہیں یہ دونوں۔'' اسمتھ نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور ریت پر بیٹھ گیا۔

''اور کچھ؟'' جوناتھن نے پوچھا۔

''نہیں... اب ہم دونوں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔'' اسمتھ نے اسے بھی ہاتھ سے برابر میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جوناتھن جزیرہ نما ڈیم پائر کے قدیم باشندوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ جزیرہ نما ساحلی علاقہ شمالی آسٹریلیا کا حصہ تھا مگر اس کا انتظام رینجرز کے ہاتھوں میں تھا۔ کبھی یہ برطانوی نوآبادی کا حصہ رہ چکے تھے، مگر اب رینجرز اور مقامی لوگ اس کا انتظام چلاتے تھے۔

ڈیم پائر سیاحوں میں خاصا معروف تھا۔ اکثر یہ ساحل سمندر پر موج مستی کرنے والے لوگوں سے بھرا رہتا تھا مگر اس کے باوجود مقامی رینجرز کی یہ کامیابی تھی کہ انہوں نے ساحل کو آلودگی سے اور ماحول کو ان کی مداخلت سے بچا رکھا تھا۔ ان کا ایک اور فرض تھا، وہ یہ کہ علاقے کے سمندر میں غیر قانونی ماہی گیری کو روکیں۔ اس مقصد کے لیے رینجرز دو حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ ایک سمندر کی نگرانی کرتی اور دوسری خشکی پر۔ جوناتھن زمین پر ڈیوٹی انجام دینے والے

امیر خسرو

امیر خسرو کی شہرۂ آفاق شخصیت سے کون واقف نہیں۔ ایک بار آپ کسی دیہاتی علاقے میں سفر کر رہے تھے کہ ایک گاؤں میں آ کر پنگھٹ پر ٹھہر گئے۔ وہاں گاؤں کی عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو نے ان سے پانی طلب کیا۔ ایک عورت نے اس اجنبی شخص کو دیکھ کر سوال کیا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

امیر خسرو نے کہا۔ ''میں خسرو ہوں جس کی پہیلیاں، دوہے اور کہہ مکرنیاں تم سب لوگ کہتے اور سنتے ہو۔''

اس عورت نے کہا۔ ''اگر تو امیر خسرو ہے تو کچھ سنا۔ پھر ہم تجھے پانی پلائیں گے۔''

امیر خسرو نے کہا۔ ''دیکھو پنگھٹ پر تم چار عورتیں ہو تم میں سے ہر ایک، ایک ایک چیز کا نام لے۔''

ایک عورت نے کہا۔۔۔ ''کھیر۔''

دوسری نے کہا۔۔۔ ''کتا۔''

تیسری نے کہا۔۔۔ ''چرخہ۔''

چوتھی نے کہا۔۔۔ ''ڈھول۔''

امیر خسرو نے برجستہ کہا۔

''کھیر پکائی جتن سے۔۔۔ چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا۔۔۔ تو بیٹھی ڈھول بجا
لا پانی پلا''

(ڈھاکا سے عائشہ خرم کا انتخاب)

رینجرز گروپ کا اہلکار تھا۔

"تم تو یہاں رہنے والے ہر مقامی شخص کو جانتے ہو گے؟" اسمتھ نے اس سے پوچھا۔

"تقریباً سب کو۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا ہی ہوا کہ تم نے بروقت لاش کو دیکھ لیا۔" اسمتھ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں گوشت خور سمندری بگلوں کے جھنڈ اڑ رہے تھے۔ اس نے سر دوبارہ نیچے کیا اور جوناتھن کو دیکھا۔ "اگر تم نہ دیکھتے تو ان بگلوں کی تو عید ہو جاتی، نوچ نوچ کھاتے لاش کو۔"

"یہ تو ہوتا...." اس نے ہنکارا بھرا۔ "وہ تو میں یونہی گشت کرتا ہوا ادھر نکل آیا، ورنہ تو عام طور پر یہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔ سیاح بھی دور ہی رہتے ہیں۔"

"تم اسے پہچانتے ہو؟" اسمتھ نے لاش کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

جوناتھن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسمتھ کو یہ سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ نیم خودمختار ڈیم پائز کا رقبہ بیس ہزار کلومیٹر پر مشتمل تھا جہاں چھ مختلف نسلی گروہوں کے ایک ہزار سے زائد افراد رہتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ ویسے اتنی کم آبادی کی بنا پر یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔

"اس کا نام کیا ہے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اسمتھ نے پوچھا۔

"جانتا ہوں پر اپنی زبان سے یہ نام نہیں لے سکتا۔"

"مگر کیوں؟" اسمتھ کو یہ جواب سننے کی توقع نہیں تھی۔

"مرنے والے کا نام لینے کا مطلب ہے اس کی روح کو واپس بلایا جا رہا ہے کہ وہ دنیا میں پلٹ کر آئے اور اپنے قاتل سے بدلہ لے۔"

"اوہ.... سمجھ گیا۔" اسمتھ نے ہنکارا بھر کر کہا۔ وہ جان چکا تھا کہ قدیم روایات کی پابندی اور توہم پرستی کی جڑیں ان قبائلیوں میں اپنے اجداد کی تعلیمات کی وجہ سے بہت گہری ہیں۔ "ویسے تم اس کے ماں باپ کا نام تو جانتے ہی ہو گے؟" اس نے کچھ توقف کے بعد پھر پوچھا۔

"ہاں...." جوناتھن نے آہستگی سے کہا۔ "مگر وہ دونوں بہت عرصہ پہلے ہی مر چکے تھے۔"

"تو کیا یہ بالکل تنہا رہتی تھی؟" اسمتھ کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

"نہیں، یہ دو بہن بھائی تھے۔" جوناتھن [illegible] شروع کیا۔ "ماں باپ کی موت کے بعد دونوں اپنے [illegible] پاس رہنے لگے تھے۔"

"ان کا قبیلہ کون سا ہے؟"

"گروگ۔" جوناتھن نے لاش کی طرف [illegible] کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اس کا نانا اپنے قبیلے [illegible] ہے۔ وہ قبیلے کے لڑکوں کو جڑی بوٹیوں کی پہچان [illegible] ہے، شکار کرنا سکھاتا ہے، قدیم ہتھیار بنانے کا [illegible] کام بھی انہیں سکھاتا ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے بچوں کو [illegible] کہانیاں سناتا ہے تاکہ بڑے ہو کر وہ بھی اپنے [illegible] بزرگوں کے سینہ بہ سینہ چلنے والے قصے سنا سکیں۔"

"اوہ.... یہ بات ہے۔" اسمتھ نے سر ہلایا۔ [illegible] قبیلے کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ اگرچہ ڈیم [illegible] زیادہ تر لوگ نئی تہذیب کے دلدادہ ہوتے جا رہے [illegible] اب بھی گروگ اپنی پرانی رسوم و روایات پر سختی سے عمل [illegible] تھے۔ حتیٰ کہ اس قبیلے میں شراب کا استعمال کرنے پر [illegible] پابندی تھی۔ خلاف ورزی کرنے والے کو سخت سزا [illegible] جاتی تھیں جس کی وجہ سے کوئی ایسی پابندیاں توڑنے [illegible] بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک اسمتھ کو ایک خیال آیا۔ "حال ہی میں [illegible] سے اپنے قبیلے کی کسی رسم کی خلاف ورزی تو نہیں ہوئی [illegible]"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" جوناتھن نے نفی میں [illegible] جواب دیا۔

"کوئی اور ایسی غیر معمولی بات جو پچھلے چند [illegible] دوران ہوئی ہو جس کا اس سے تعلق بنتا ہو؟" اسمتھ [illegible] سے لاش کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلایا۔ "[illegible] لوگوں کے بارے میں اتنی تفصیل سے کچھ نہیں جا[illegible] اس لڑکی کو ادھر اُدھر آتے جاتے کئی بار دیکھا۔ بس اس [illegible] کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ اس کے [illegible] معلوم نہیں۔" جوناتھن نے سپاٹ لہجے میں بات مکمل [illegible]

"تمہیں ٹھیک سے کچھ یاد ہے کہ کیا وقت [illegible] جب تم نے لاش دیکھی تھی؟" اسمتھ نے بات کا رخ [illegible] ہوئے سوال کیا۔

"سورج اپنے نصف سے تھوڑا دور تھا۔" [illegible] آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید [illegible] پھر دس بجے ہوں۔" اس نے بے یقینی کی کیفیت میں [illegible] دیا۔

یہ سن کر اسمتھ کچھ سوچنے لگا۔ سینئر سارجنٹ نے اسے [illegible] بجے فون کرکے ڈیم پائز کے ساحل پر لاش ملنے کی [illegible] دیتے ہوئے موقع پر پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد [illegible] ڈیانا پولیس ہیڈ کوارٹر سے اس دور دراز ساحل تک [illegible] پہنچنے کے لیے اسے دو گھنٹے ڈرائیو کرنا پڑی۔ یعنی یہ کہ سینئر سارجنٹ کے فون سے لے کر یہاں تک پہنچنے میں اس کے [illegible] گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت صرف ہوا۔ اس کا مطلب ہے [illegible] کہ لاش کو پہلی بار دیکھے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ [illegible] اپنے دل میں وقت کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ وہ یہ اندازہ [illegible] لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑکی کو قتل ہوئے کتنا وقت گزر چکا ہو گا۔

"کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو اس لڑکی کے [illegible] ساتھ گھومتا پھرتا ہو؟" اسمتھ نے کافی دیر بعد کھنکھار کر گلا صاف کرکے جوناتھن سے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ ساحل پر موج مستی کرنے والوں کے ساتھ پارٹی وغیرہ کرتے ہوئے؟"

"شاید نہیں...." اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "میں نے اسے کبھی لڑکوں کے ساتھ گھومتے پھرتے نہیں دیکھا۔"

"تمہارے خیال میں کیا اسے قتل کیا گیا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے بے یقینی سے جواب دیا۔

اس دوران میں اسمتھ کے کان میں سمندری بگلوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساحل کے قریب اور لاش کے اوپر بہت سارے سمندری بگلے اڑ رہے تھے۔

"یہ بڑے منحوس ہیں۔" جوناتھن نے انگلی سے بگلوں کی طرف اشارہ کیا۔ اسمتھ نے اسے دیکھا۔ قدیم باشندوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے رینجر کی آنکھوں میں اس وقت خوف جھلک رہا تھا۔ "یہ جہاں نظر آئیں، وہاں انسانوں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آتی ہے۔"

"واقعی...." اسمتھ ایسی توہم پرست باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا مگر جوناتھن کی بات اور تھی۔ وہ قدیم قبیلے کا باشندہ و رسم و روایات پر یقین رکھتا تھا۔

"تم میری بات کا یقین کرو۔" جوناتھن نے اس کی طرف گردن موڑتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری قدیم روایت [illegible] سب اب بھی دیکھ لو کہ اس گرمی میں تم اپنے دفتر سے باہر یہ [illegible] جھیل رہے ہو اور سامنے ایک لاش پڑی ہے۔ نہ جانے کب تک تمہیں اس تفتیش میں سر کھپانا پڑے گا۔" وہ اسے سمندری بگلوں کے منحوس ہونے کا بھرپور یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا اس ساحل کی نگرانی تمہاری ذمے داری میں شامل ہے؟" اسمتھ نے گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے پوچھا۔

"ہاں.... کیمپ ان سے کیرناٹ بے تک کا علاقہ میری ذمے داری ہے۔ میں ہی یہاں گشت کرتا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اسمتھ کو اپنے علاقے کی وسعت سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا۔

"تو کیا سمندری رینجرز بھی اس علاقے کی نگرانی کرتے ہیں؟" اسمتھ نے ایک اور سوال کیا۔ "ویسے کیا اب بھی قریب میں رینجرز ہوں گے؟"

"ہاں...." جوناتھن نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "دو کشتیاں پورے عملے کے ساتھ گشت پر ہیں۔ ابھی وہ جنوب مشرق میں ہیں۔ جب موجیں تھمیں گی تو وہ شمال مغرب کی طرف آئیں گے۔" اس نے تفصیلی جواب دے کر اسے لمحہ بھر کو غور سے دیکھا۔

"تیز موجیں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں ایک تیز لہر آئی اور لاش پر پڑے ترپال سے ٹکرا کر پلٹ گئی۔

"ہاں.... یہ چڑھتے چاند کی راتیں ہیں۔ ان راتوں میں یہاں موجیں چار سے چھ فٹ تک اونچی ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے رینجرز تیز موجوں والے علاقے کا رخ نہیں کرتے۔ ویسے بھی تیز موجوں کے دوران چوری چھپے مچھلیاں پکڑنے والے سمندر کا رخ نہیں کرتے، کشتیاں الٹنے کا ڈر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اونچی موجوں والے علاقوں پر ذرا کم ہی توجہ رہتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے لاش کی طرف دیکھا۔ "اونچی لہروں نے ہی اسے ساحل پر لا کر پھینکا ہوگا۔" جوناتھن نے اپنا خیال پیش کیا۔

"اس صبح کتنے بجے تک اونچی لہروں کا وقت رہا ہوگا؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔ ایک بار پھر وہ ساحل پر لاش کی موجودگی کے تعین کی کوشش کر رہا تھا۔

جوناتھن نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ "میرا خیال ہے کہ صبح چھ بجے تک اونچی لہروں کا وقت رہا ہوگا۔"

اسمتھ نے کوئی جواب نہیں دیا اور غور سے سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے بہت دور، عین نظروں کے سامنے افق کے قریب ترین ایک نقطے جیسی چیز نظر آ رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک اسے بغور گھورتا رہا۔ پھر اس نے گردن موڑی اور انگلی

سے اس سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کیا وہ لیس پیڈ اجڑ رہا ہے؟''

یہ سن کر جوناتھن مسکرا دیا۔ ''بہت تیز نگاہیں ہیں تمہاری۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''جو نقطہ تم دیکھ رہے ہو، وہ ایسٹ آئی لینڈ کے لائٹ ہاؤس کی روشنی ہے۔ وہ دن میں بھی روشن رہتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''ویسے تم کبھی وہاں جانے کی حماقت نہ کرنا، وہ سمندر سے بہت اونچا نہیں، اسی لیے ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔''

''وہاں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں؟''

''رہتا تو کوئی نہیں البتہ وہاں سمندری کچھوؤں.... مگرمچھوں اور دیگر پرندوں کی بہتات ہے۔ اسی لیے اس علاقے کو قبیلے والوں نے غیر محفوظ قرار دے دیا ہے۔ البتہ وہاں سچے موتیوں (پرل) کے بھی دو تین قدرتی تالاب ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا۔ ''مونگے کی کافی چٹانیں ہیں وہاں اور تم تو جانتے ہی ہو گے کہ جہاں مونگے کی چٹانیں ہوں وہاں مچھلیوں کی بہتات ہوتی ہے۔''

''پھر تو وہاں خوب مچھلیاں پکڑی جاتی ہوں گی؟''

''ہاں...'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''البتہ قبیلے کی اجازت کے بغیر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ فیس لے کر ماہی گیری اور پرندوں کے شکار کی اجازت دے سکتے ہیں مگر دیتے نہیں۔'' جوناتھن نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور انگلی سے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ جزیرہ اس کے قبیلے والوں کی ملکیت ہے۔ جب یہ زندہ تھی تو شکار کے لیے رقم وصول کر کے کچھ مقامات کے لیے ہی اجازت نامہ دیتی تھی۔''

''اچھا...'' اسمتھ نے جواب دیا اور پھر حسب عادت بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لاش کس سمت سے بہتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوگی؟''

یہ سن کر جوناتھن سوچ میں پڑ گیا اور پھر کافی دیر تک سمندر کو دیکھتا رہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر لاش رات میں یا صبح سویرے ساحل پر آئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جنوب کی سمت سے آئی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ''ویسے بھی اب ایک دو گھنٹے کے بعد اونچی لہروں کا وقت شروع ہو جائے گا۔ اس سے پہلے ہی لاش کو یہاں سے اٹھانا ہوگا ورنہ یہ حصہ لہروں کی زد میں ہوگا اور یہاں صرف پانی ہی پانی ہوگا۔''

اسی دوران میں ایک تیز ہوا کا جھونکا آ کر ان کے چہروں سے ٹکرایا۔ اسمتھ نے گہری سانس لی۔ ''تمہیں لاش سے بو اٹھتی تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

جوناتھن نے دو تین گہری سانسیں لیں۔ ''ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''سمندر، لاش...''

''اور مگرمچھ بھی۔'' جوناتھن نے اسے بات مکمل کا موقع ہی نہیں دیا۔ ''شمالی آسٹریلیا کے اس ساحل پر مگرمچھ بھی ہیں۔''

''یہاں...'' اسمتھ نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں... اب اتنی کم گہرائی پر نہیں ہوتے۔ یہ سے چھ سات میٹر کی گہرائی پر ہوتے ہیں۔ ڈرنے کی نہیں، وہ ساحل پر نہیں آتے۔''

''لیکن کیوں؟'' اسمتھ چونکا۔ ''مگرمچھ تو دھوپ میں چپ چاپ پڑے رہنا پسند کرتے ہیں۔''

''جس حصے میں مگرمچھ ہیں، وہاں پر کچھ لوگوں نے اس طرح جال لگا دیے ہیں کہ وہ یہاں نہیں آ سکتے۔'' اس نے ایک بار پھر لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہی کے قبیلے نے جگہ کو کچھ لوگوں سے فیس لے کر کرائے پر دے رکھا ہے۔ مگرمچھوں کو پکڑ کر تجارتی استعمال کے لیے بیچتے ہیں مگر تعداد میں کہ جس سے ان کی نسل کشی نہ ہوتی ہو۔''

''تو یہ بات ہے۔'' اسمتھ نے سر ہلایا۔ ''کیا وہ بڑے ہیں کہ کسی انسان کو اپنے جبڑے میں جکڑ کر کھوپڑی توڑ سکیں؟'' اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

''کر تو سکتے ہیں اگر مگرمچھ جوان ہو اور بھوکا بھی۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''ویسے سمندر میں مچھلیاں بہت ہیں۔ میرا خیال نہیں کہ کوئی مگرمچھ اتنا بھوکا ہو کہ انسان پر حملہ کر کے کھوپڑی توڑ ڈالے۔ ویسے بھی پیٹ بھر کر کھانا مل جائے تو وہ سست ہو جاتے ہیں۔ بھوک میں تو شیر کو بھی دبوچ لیں۔'' وہ اسمتھ کو ان کے بارے میں اس طرح بتا رہا تھا جیسے کسی طالب علم کو لیکچر دے رہا ہو۔

''تم نے یہاں قریب میں کبھی کوئی مگرمچھ دیکھا ہے؟''

''کئی بار... مگر جب سے جال لگا ہے، شاید ہی کوئی ساحل پر آتا ہو۔ جال لگنے کے بعد بھی کبھی کوئی یہاں دھوپ تاپتا نظر آ جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا۔ ''اسی لیے ساحل پر آنے والوں کو پانی میں جانے کی اجازت نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں ایک بار مسکرایا۔ ''اگر ہم لوگوں کو نہ روکیں تو پھر یہ ساحل نوجوانوں کی جنت بن جائے۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''آج ساحل پر خاصا رش تھا۔ اسی چکر میں... میں یہ دیکھنے آیا تھا

کہ کہیں کوئی جوڑا چوری چھپے تو یہاں نہیں پہنچ گیا۔ اگر خوش قسمتی سے یہ خیال نہیں آتا تو پھر نہ جانے کب تک یہ لاش یہیں پڑی رہتی یا پھر رات کو تیز موجیں بہا کر اسے کہیں اور لے جاتیں۔'' اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر ترپال سے ڈھکی لاش کی طرف دیکھا۔

''تم نے آج صبح یہاں کسی کو آتے تو نہیں دیکھا تھا؟'' اسمتھ نے پھر موضوع بدل دیا۔

''ہاں...''

''کون لوگ تھے؟''

''مچھیرے تھے، ان کی کشتیاں بھی یہیں کھڑی تھیں، صبح سویرے وہ نکلتے ہیں مچھلیاں پکڑنے کے لیے۔''

''انہیں اجازت ہوگی مچھلیاں پکڑنے کی؟'' اسمتھ نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''بنا اجازت تو کوئی جانے سے رہا۔''

''اس لڑکی کے نانا کا کیا نام ہے؟''

اسمتھ نے یہ سن کر پلکیں جھپکائیں اور جواب دینے میں لمحہ بھر تاخیر کی۔ ''بلی... بلی بورا۔'' اس کی نگاہیں ساحل پر جمی تھیں۔

''بلی بورا۔'' اسمتھ نے زیر لب یہ نام دہرایا۔ ''تم اسے موت کی یہ اطلاع پہنچا دو گے؟''

''میں...'' جوناتھن نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ''یہ میرا کام ہے؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ''تم خود کیوں نہیں جا کر اسے یہ اطلاع دے دیتے؟'' اس نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ میرا کام نہیں۔'' اسمتھ نے بیزاری سے سر جھٹک کر کہا۔

''ویسے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے مجھے خوشی ہوگی کہ یہ میرا کام بھی نہیں ہے۔'' جوناتھن نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

یہ سن کر اسمتھ اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

''بڑا فخر تھا اس کے نانا کو۔ کہتا تھا کہ یہ بہت اچھی سمندری رینجر بن سکتی ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''ایک مرتبہ وہ بوڑھا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس میں اپنے بھائی سے زیادہ سیکھنے کی صلاحیت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لاش کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''کہتا تھا کہ اس کی تربیت میں نے خاص طور پر کی ہے تاکہ رینجر بن سکے۔ وہ دوسرے پر واہی کو ترجیح دیتا تھا۔'' وہ بے تکان بولے جا رہا

تھا۔

”اس سے کسی کی کوئی دشمنی، میرا مطلب ہے کہ کسی کا کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں تھا؟“

”میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ اور اس کا بھائی رونالڈو، دونوں اچھے بچے تھے۔“ اس کا لہجہ یک دم نرم پڑ گیا۔ اس نے اسمتھ کی طرف دیکھا۔ ”میں نے کبھی کسی کے منہ سے ان دونوں بہن بھائیوں سے متعلق کوئی شکایت نہیں سنی۔“

اسی دوران میں اسمتھ کا وائرلیس آن ہو گیا۔ ایمبولینس بیس کلومیٹر دور تھی اور ڈرائیور اس سے جائے وقوعہ کی لوکیشن پوچھ رہا تھا۔ ”ایک منٹ ہولڈ کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے جی پی آر ایس سے لوکیشن دیکھ کر ڈرائیور کو پتا سمجھایا۔ ”اور کچھ؟“ اس نے پتا بتانے کے بعد وضاحت چاہی۔

”پندرہ سے بیس منٹ لگیں گے پہنچنے میں... اوور۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں... اوور۔“ یہ کہہ کر اس نے وائرلیس جیب میں اڑسا۔ جوناتھن اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”شکر ہے خدا کا، ایمبولینس پہنچنے والی ہے۔“

اس نے بھی بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک بار پھر دونوں کی نظریں ترپال سے ڈھکی لاش پر تھیں۔ لہروں میں تیزی آنے لگی تھی اور وہ اب کافی آگے تک آ رہی تھیں۔ سورج بھی ڈھلنے لگا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ایمبولینس کا سائرن گونجنے لگا۔ آواز سنتے ہی وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایمبولینس کا عملہ اتر کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”لگتا ہے ہمیں ان کا ہاتھ بٹانا پڑے گا؟“ اسمتھ کی بات سن کر جوناتھن کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اسمتھ اس کا خوف محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے تھوک نگلا۔ ایمبولینس دیکھ کر اس کا گلا خشک ہونے لگا۔ اسمتھ لاش کی طرف بڑھا۔ اسپتال کا عملہ لاش پلاسٹک بیگ میں منتقل کر رہا تھا اور جوناتھن ان سے کچھ فاصلے پر منہ موڑے کھڑا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد لاش ایمبولینس میں منتقل کر دی گئی اور وہ اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر آگے بڑھنے لگی۔ یہاں سے لاش کو سب سے پہلے بروم اسپتال لے جایا جاتا جہاں سے اسے پوسٹ مارٹم کے لیے ڈھائی سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے پوسٹ مارٹم اور معدے کی آلائش کے تجزیے کے لیے پرتھ پہنچایا جاتا۔ اس پورے عمل کے دوران میں اسمتھ نے محسوس کیا تھا کہ جوناتھن لاش کو دیکھنے تک کا روادار نہیں تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ جس قدر ہو سکے، وہ خود کو اس سے دور رکھے۔

ایمبولینس نظر سے اوجھل ہوئی تو جوناتھن ڈھلتے سورج پر رخ کر کے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے ٹی شرٹ اتاری اور مٹھی میں ریت لے کر سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں، بازوؤں اور سینے پر ملا۔ اس کے بعد ریتلے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے لگا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔

اسمتھ کے لیے یہ حیران کن نظارہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شمالی آسٹریلیا کے یہ قدیم باشندے خود کو موت کی بو اور لاش کی نحوست سے بچانے کے لیے... مختلف قسم کے ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں۔

”تم کسی عامل کے پاس جا کر اس سے خود کو پاک کیوں نہیں کروا لیتے؟“ تقریباً دس منٹ بعد جب جوناتھن اپنے عمل سے فارغ ہو کر اس کی طرف پہنچا تو اسمتھ نے کہا۔ ”وہ تمہیں دھونی وغیرہ دے کر نحوست سے پاک کر سکتا ہے۔“

جوناتھن نے یہ سن کر غور سے اسے دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر فی الحال یہی منتر تھا جو تم نے دیکھا۔“ اس نے ٹی شرٹ کا بٹن لگایا۔ ”ویسے جاؤں گا تو اس کے پاس مگر پتا نہیں کب تک جا سکوں۔ اگر اس لڑکی کو قتل کیا گیا ہے تو پھر خود کو اثرات سے پاک کرانے کے لیے مجھے ہر حال میں عامل کے پاس جانا ہوگا۔“ اس کے لہجے سے خوف اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں اسمتھ نے پولیس کار پارک کی تھی۔ ”اب سب سے اہم کام لڑکی کے ورثا کو اطلاع دینا ہے۔“ اس نے وائرلیس پر سینئر سارجنٹ کو لاش اسپتال روانہ کرنے کی اطلاع دینے کے بعد جوناتھن کی طرف دیکھے بنا کہا۔

”یہ کام تو کم از کم میں نہیں کر سکوں گا۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے، تم ہی جانو۔“ جوناتھن نے سنتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میں اپنی ذمے داریاں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اسمتھ نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ تو پہلے ہی یہ جان چکا تھا کہ جوناتھن کی مجبوری تھی جو اتنا وقت اس نے لاش کے قریب گزار لیا ورنہ رنجبر ہونے کے باوجود وہ کم تو ہم پرست نہیں تھا۔

جوناتھن اس سے دو قدم کے فاصلے پر سورج کی طرف

منہ کیے کھڑا تھا۔ اگرچہ اب گرمی اتنی نہیں تھی مگر پھر بھی اس کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ گرمی کا نہیں، اس کے اندرونی خوف کا پسینا ہے۔ اسے بھی ایک لمحے کے لیے اس کی توہم پرستی پر رحم آ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اسمتھ پلٹا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مجھے میری ذمے داریاں بتانے کے بجائے اس لڑکی کے گاؤں اور نانا کے گھر کا پتا بتا دو۔'' اس کا لہجہ خاصا نرم اور دوستانہ تھا۔

''بتا سکتا ہوں۔'' جوناتھن پلٹا۔ یہ سن کر اس کی بھی جان میں جان آئی کہ اسمتھ اکیلا وہاں جانے پر تیار تھا۔

جوناتھن جب اسے کین لارگن قبیلے کے گاؤں اور مرنے والی لڑکی کے نانا کا پتا سمجھا چکا تو اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ دن ڈھلنے سے پہلے وہ لواحقین کو موت کی اطلاع دے کر اپنا سرکاری فرض پورا کرے اور واپس سومیل کا سفر طے کر کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر رپورٹ کر دے۔ اس کے بعد سراغ رساں جانے یا عدالت۔

☆☆☆

تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اسمتھ گاؤں میں داخل ہو چکا تھا۔ گاؤں کی سڑک پر داخل ہوتے ہی اسے کچھ فاصلے پر آئرن شیٹ سے بنی سفید چھتوں والی جھونپڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ تھوڑا آگے بڑھا تو تیسرے گھر کے باہر اسے ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ اس نے سردار کے مکان کا پوچھا۔ اس نے اشارہ کرتے ہوئے اسے پتا سمجھایا۔

سردار کی جھونپڑی سب سے آخر میں اور کافی الگ تھلگ سی تھی۔ یہ علاقہ صحرا کی طرح کا تھا۔ گھر کے اطراف چھوٹی چھوٹی جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جھونپڑی کے گرد کانٹوں کی چھوٹی سی باڑ تھی۔ احاطے کے اندر جھونپڑی واقع تھی جہاں تک ایک راستہ جا رہا تھا۔

اسمتھ نے جھونپڑی کے عین سامنے رک کر دو بار ہارن دیا مگر کوئی نہیں آیا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور باڑ عبور کر کے احاطے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ چاروں طرف نظریں گھماتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ ماحول پر گہری خاموشی طاری تھی۔

وہ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر رکا اور ایک بار پھر اطراف میں نظر ڈالی۔ جھونپڑی کے برآمدے کے ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جبکہ دوسری طرف تین چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس نے سامنے دیکھا۔ وہ آگے بڑھا اور دروازے پر دستک دی۔ ''کوئی ہے؟''

چند لمحوں کے بعد اسے اندر سے کسی کے بھاری قدموں کی آواز آئی۔ وہ سیدھا ہو کر مہذب انداز میں کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر بعد ہلکی سے آواز آئی جیسے کسی نے بھاری ہاتھوں سے دروازہ اندر کی طرف دھکیلا ہو۔ اگلے ہی لمحے اس کے سامنے لگ بھگ پچاس سال کا ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ وہ توانا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت گہری سرخی مائل تھی۔ اس کی سفید داڑھی بے ترتیب پھیلی ہوئی تھی اور بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ وہ دروازے کے بیچ تن کر کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس طرح چوکھٹ پکڑے ہوئے تھے جیسے.. وہ اسے اندر آنے سے روکنا چاہتا ہو۔

''میرا نام اسمتھ ہے اور بروم پولیس میں کانسٹیبل ہوں۔''

بوڑھے نے یہ سن کر اس کا جائزہ لیا۔ اس وقت اسمتھ یونیفارم میں تھا۔ بوڑھے نے دوسری نظر احاطے کے باہر کھڑی کار پر ڈالی جس پر لگی سرخ نیلی بتیوں سے کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ پولیس کار ہے۔

''مجھے بلی بیورا سے ملنا ہے، کیا وہ آپ ہی ہیں؟''

بوڑھے نے ایک بار پھر اس پر نظریں گڑا دیں۔ وہ اسے گھورنے کے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار تھے۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' اسمتھ نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''مگر کیوں؟'' پہلی بار بوڑھے نے لب کشائی کی۔ اس کا لہجہ درشت تھا۔

''میرے پاس آپ کے لیے ایک بُری خبر ہے۔ بہتر ہوتا کہ ہم بیٹھ کر بات کرتے۔'' اب اسمتھ کے لہجے سے بھی بیزاری جھلک رہی تھی۔

''کھڑے کھڑے بتا دو۔'' بوڑھے سردار نے تلخی سے جواب دیا۔

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آج پولیس کو تمہاری نواسی کی لاش ملی ہے ساحل پر۔'' اسمتھ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

یہ سن کر بلی بیورا لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گیا اور پھر وہ تن کر سیدھا کھڑا ہوا اور دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا اسے؟''

''فی الحال یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔'' اس کا لہجہ افسردہ تھا۔ ''ممکن ہے کہ وہ ایک حادثہ ہو، ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور ہوا ہو۔ ہم نے لاش کو پرتھ اسپتال بھجوا دیا ہے پوسٹ مارٹم کے لیے۔ رپورٹ کے بعد ہی کچھ کہا جا سکے گا کہ حقیقت میں اس بدنصیب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔''

بلی بیورا کے ماتھے پر شکنیں اور گہری ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھ چکی تھی اور چہرے پر سخت تناؤ نظر آ رہا تھا۔ ''تو کیا اس کے بعد لاش گھر بھیج دی جائے گی؟'' اس نے اسمتھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے درشت لہجے میں سوال کیا۔

''کیوں نہیں، یہ تو قانون ہے۔''

''لاش کب ہمیں دی جائے گی؟''

''میرا خیال ہے کہ شاید ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔'' اسمتھ نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

یہ سن کر بلی بیورا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا جسے وہ سمجھ نہ سکا۔ اسی دوران میں ایک نوجوان لڑکا بھی خاموشی سے آ کر اس کے قریب کھڑا ہو چکا تھا۔ ''تم رونالڈو ہو، اُس کے بھائی؟'' اسمتھ نے لڑکے سے پوچھا۔

یہ سنتے ہی وہ لڑکا گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور پھر اٹکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔'' ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے خوفزدہ ہے۔

''میں آپ دونوں سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔'' اس نے ہاتھ سے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلی بیورا سے کہا۔

آخر وہ باہر نکلا اور برآمدے میں داخل ہو کر کرسیوں کی طرف بڑھا۔ اسمتھ نے بھی اس کے پیچھے پیچھے قدم بڑھائے۔

''وہ کہاں تھی؟'' اس بار اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''وہاں...'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کر کے سمت بتائی۔ ''شمالی ساحل پر لاش پڑی ملی ہے۔

رونالڈو بھی باہر آ کر نانا کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اسمتھ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر کہا۔ ''میں جاننا چاہوں گا کہ تم دونوں نے اسے آخری بار کب زندہ دیکھا تھا؟''

''کل شام گھر پر۔'' رونالڈو نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں لکڑیاں لے کر آ رہا تھا تب۔''

''اور آپ؟'' اس نے بیورا سے پوچھا۔ اب اسمتھ پولیس والوں کے خالص تفتیشی انداز میں سوال و جواب کرنے لگا۔

''کل رات ڈنر پر۔'' اس نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے اندرونی کرب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔
''کیا تم جانتے ہو ڈنر کے بعد وہ کہاں گئی تھی؟''
یبورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''عورتوں کے کاروبار سے متعلق معاملات سیکھنے کے لیے وومن کیمپ گئی تھی۔'' اس کی آواز بھرّا رہی تھی۔
''وہاں اسے کسی سے ملنا تھا کیا؟''
''ہاں... اپنی خالہ زاد بہن کلارا سے۔''
''کیا اسے وہاں رات بھر ٹھہرنا تھا؟''
یبورا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اسمتھ ان قبائلیوں کی رسوم و روایات جانتا تھا۔ ان کے ہاں عورتوں کے ملنے کی جگہ کو وومن کیمپ کہتے تھے جہاں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اکثر ان کے میلے وغیرہ بھی وہیں ہوتے تھے۔ ان کے لیے یہ بات اہم نہیں تھی کہ کوئی غیر شادی شدہ لڑکی رات وہیں گزارے۔ وہ ان کیمپوں کو لڑکی کی تربیت گاہ کے طور پر دیکھتے تھے۔ اب تک اسے کوئی اہم بات پتا نہیں چلی تھی اور وہ جو کہنے والا تھا، اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر کچھ توقف کے بعد اُن دونوں کے چہروں پر باری باری نظر ڈالی اور پھر یبورا کو مخاطب کر کے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم ایسے کسی شخص کے بارے میں جانتے ہو جو یہ چاہتا ہو کہ تمہاری بچی اس دنیا میں نہ رہے؟''
یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح خاموش تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسمتھ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اندر طوفان بپا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے لب کشائی کی۔
''نہیں... ایسا کوئی نہیں تھا۔''
''ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ اِدھر اُدھر نکل گئی ہو۔ ممکن ہے کہ اس نے ڈرنک کی ہو جس میں کسی نے کچھ ملا دیا ہو یا پھر وہ زہریلی ہو...''
''نہیں۔'' یبورا تقریباً چلّایا۔ ''وہ ہرگز ایسی نہیں تھی۔''
اسمتھ چند لمحے خاموش رہا۔ ''ہاں رونالڈو! تم بتاؤ۔'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد اس کے بھائی سے کہا۔ ''تم کچھ جانتے ہو کہ کہیں وہ اس طرح کی عادتوں میں تو مبتلا نہیں تھی؟''
وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ ''نہیں... میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بالکل بھی ایسی لڑکی نہیں تھی جیسا تم کہہ رہے ہو۔''
''بات یہ ہے جناب...'' اب اسمتھ نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''فرض کریں کہ کوئی اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کوئی اسے کس وجہ سے قتل کرنا چاہے گا؟ کیا آپ اس بارے میں قانون کی کچھ مدد کر سکتے ہیں؟''
اس کے چہرے پر شدید تناؤ نظر آ رہا تھا۔ ماتھے پر پڑی شکنیں اور گہری ہو چکی تھیں۔ اس نے سرخ آنکھوں سے لمحہ بھر کے لیے اسمتھ کو گھورا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔
اسمتھ نے رونالڈو کی طرف دیکھا مگر وہ بھی سپاٹ چہرہ لیے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ ''کم از کم مجھے اس کا نام اور عمر بتا دیں، پولیس رپورٹ کے لیے یہ بنیادی معلومات ہیں۔'' اسے اب تک ان سے کام کی کوئی بات پتا نہیں چلی تھی۔ اس کے انداز سے مایوسی جھلکنے لگی تھی۔
یبورا نے سر اٹھایا اور لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''نینسی... نینسی گیبے، عمر یہی کوئی پندرہ سال ہوگی۔''
اسمتھ نے نوٹ بک... جیب میں رکھی۔ ''تمہارے خیال میں کلارا سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''
''وومن کیمپ میں۔'' یبورا نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے، تم مجھے اس جگہ کا پتا سمجھا دو۔''
''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اسے کیمپ کا پتا سمجھانے لگا۔

☆☆☆

وومن کیمپ روایتی طرز کی بنی ہوئی ایک بڑی سی جھونپڑی تھی جس کے ارد گرد کیکر کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ اس نے کیمپ سے خاصے فاصلے پر گاڑی روکی اور پیدل ہی اس طرف بڑھنے لگا۔
وہ مرکزی دروازے پر پہنچ کر دستک دینے والا تھا کہ اچانک برابر والے دروازے سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے شدید غصے میں کہا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جانتے نہیں یہ وومن کیمپ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ غصیلی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ شخص کوئی پولیس والا ہے۔
''جانتا ہوں۔'' اسمتھ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں یہاں کلارا سے ملنے آیا ہوں، نینسی کی کزن۔''
''تم یہاں کے تو نہیں لگتے؟'' اس عورت نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کیا۔ اسمتھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''یہاں تمہارا قانون نہیں چلتا... مجھے سفید فام...''

''جانتا ہوں مگر میں یہاں کسی کو گرفتار کرنے نہیں آیا۔''
وہ اس عورت کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اگرچہ یہ قبائلیوں کا نیم خودمختار علاقہ تھا تاہم اب تک یہ معاملہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا کہ آیا انہیں پولیس جیسے معاملات میں داخلی خودمختاری دی جائے یا نہیں۔ مگر اس عورت کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ غیروں کے قانون کو ماننے پر تیار نہیں تھی، دوسرے قبائلیوں کی طرح۔
''جب گرفتار نہیں کرنا تو پھر یہاں کس لیے آئے ہو؟'' وہ بدستور لڑنے پر آمادہ تھی۔ اس کی آنکھوں سے صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے غیر مقامیوں سے شدید نفرت ہے۔
''مجھے اس سے صرف چند سوالات کرنے ہیں اور بس۔'' اسمتھ کا لہجہ دوستانہ تھا۔ وہ اس سے خوامخواہ کا جھگڑا مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔
عورت نے اس کا ایک منٹ تک بغور جائزہ لیا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اب اس کا لہجہ پہلے کی نسبت خاصا نرم تھا۔ ''تم یہاں ٹھہر کر انتظار کرو، میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی، دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔
چند منٹ بعد ایک دبلی پتلی، لمبے قد کی لڑکی باہر نکلی۔ اس نے کاٹن کا بڑے بڑے پھولوں والا میکسی نما لباس پہن رکھا تھا۔ بال پیچھے کی طرف کھینچ کر باندھے گئے تھے۔
''فرمائیے...'' اس نے اسمتھ کو مخاطب کیا۔
''کیا آپ ہی...''
''جی ہاں، میں ہی کلارا ہوں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔
''جی جی...'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں کانسٹیبل اسمتھ ہوں۔'' اس نے اپنی قمیص پر لگے پولیس بیج کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ ''مجھے ایک کیس کے حوالے سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔''
کلارا نے کچھ نہیں کہا البتہ اس کی آنکھوں میں حیرت اور ہلکا سا خوف نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی یہ بات محسوس کر گیا۔
''اگرچہ میں جانتا ہوں کل رات نینسی تم سے ملنے آئی تھی...''
''لیکن اس بات سے تمہارا کیا تعلق؟'' کلارا نے اس کی بات کاٹ دی۔
''آج صبح ساحل پر سے اس کی لاش ملی ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔
''اوہ میرے خدا...'' یہ سنتے ہی کلارا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے دیوار کا سہارا لیا۔
''کل رات وہ تم سے ملنے آئی تھی؟''
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''مگر کیوں؟''
''وہ گانا سیکھنا چاہتی تھی۔''
''کس طرح کا گانا؟''
''یہ ہمارا لوک گیت ہے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔'' کلارا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''وہ یہاں سے کب واپس گئی تھی؟''
''آج صبح سویرے، سورج نکلنے سے بھی پہلے وہ یہاں سے چلی گئی تھی۔''
''اس کا مطلب ہے کہ صبح پانچ بجے کے قریب۔'' اس نے زیرِ لب کہتے ہوئے نوٹ بک میں لکھا اور پھر سر اٹھا کر... کلارا کو دیکھا۔ ''کیا تمہیں علم ہے کہ یہاں سے نکل کر اسے کہاں جانا تھا یا وہ کہاں گئی ہوگی؟''
''وہ کزن سے ملنے کا کہہ رہی تھی۔''
یہ سنتے ہی اسمتھ کے کان کھڑے ہو گئے۔ پہلی بار اسے کوئی سرا ہاتھ لگ رہا تھا۔ ''کیا نام ہے اس لڑکے کا؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔
''کائن۔''
''انہیں کہیں جانا تھا؟''
''شاید مچھلیاں پکڑنے کے لیے۔'' کلارا نے کنپٹی کو انگلی سے دباتے ہوئے جواب دیا۔
''تو نینسی نے تم سے کہا تھا کہ وہ صبح مچھلیاں پکڑنے کے لیے کائن کے ساتھ جائے گی؟'' اسمتھ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔
''آج صبح نہیں کل رات کہا تھا کہ وہ کائن کے ساتھ کٹ بائٹ کے لیے جائے گی۔''
''کٹ بائٹ؟'' اسمتھ نے حیرت سے کہا۔
''یہ چھوٹی سفید مچھلی ہے، جسے فشنگ راڈ سے شکار میں بطور چارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے سفید مچھلیاں شوق سے کھاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں گورے بہت مہنگے داموں خرید لیتے ہیں۔'' کلارا سمجھ گئی تھی، اس لیے اس نے وقت ضائع کرنے کے بجائے وضاحت سے اسے سمجھایا۔
''کائن کیا کام کرتا ہے؟''
''مچھیرا ہے، بروم میں اس کے پاس ایک بڑی فشنگ بوٹ اور عملہ بھی ہے۔'' کلارا نے خود کو اس کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔ ''میں نے اس کی بوٹ دیکھی ہے، بڑی خوبصورت اور

آرام دہ ہے۔"

"تم نے اسے کبھی کائن کے ساتھ جاتے دیکھا ہے فشنگ بوٹ پر؟" اسمتھ کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کیس میں آگے بڑھنے کے لیے کلارا کے بیان سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ اس کی باتوں کو نوٹ کرتا جارہا تھا۔

"نہیں... لیکن اس کے منہ سے اکثر سنتی تھی۔ میں تو کبھی اس کی بوٹ پر نہیں گئی، بس لوگوں سے ہی اس کے بارے میں سنا ہے۔"

"صبح جاتے ہوئے وہ تمہیں ملی تھی؟"

"ہاں، میں نے اسے الوداع کیا۔ وہ باہر نکلی، ایک کار کھڑی تھی اور وہ اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔"

"کس کی کار تھی وہ؟"

"کائن کی ہی ہوگی، اسی کے ساتھ تو جانے کا پروگرام تھا نینسی کا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ اس کی ہی کار ہوگی؟" اسمتھ نے تصدیق چاہی۔

کلارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم کچھ ایسا جانتی ہو کہ وہ دونوں اکثر ملا کرتے تھے، ساتھ ڈرنک کرتے تھے، گھومتے پھرتے تھے؟" وہ اس کے تق ودن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں ایسا کچھ نہیں جانتی۔" اس کے چہرے پر شرم کے آثار نمودار ہورہے تھے۔ "میرے ماں باپ بوڑھے ہیں اور وہ ان باتوں کو قطعی پسند نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر وہ رکی۔ "ویسے میں نے نینسی یا کائن سے بھی کبھی اس طرح کی بے شرمی کی باتیں نہیں کیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا نینسی کے نانا، نانی یہ جانتے ہوں گے؟"

"مجھے نہیں پتا؟" اس نے بیزاری سے کہا۔

اسمتھ سمجھ گیا کہ اسے اس طرح کی باتیں پسند نہیں۔ اس نے فوراً گفتگو کا رخ موڑا۔ "نینسی کیسی لڑکی تھی؟" یہ سن کر کلارا نے اسے گھورا۔ اچانک اسے کچھ خیال آگیا۔ "تم شاید غلط سمجھیں، میرا مطلب ہے کہ وہ کام کاج اور تعلیم وغیرہ کے حوالے سے کیسی لڑکی تھی۔"

"بہت اچھی۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "اس نے اپنے نانا سے جنگلی جانوروں، جنگل، موسم، شکار سے متعلق بہت ساری باتیں سیکھ لی تھیں۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ رینجر بنے گی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اسمتھ منتظر تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ "اگر وہ زندہ رہ جاتی تو ایک اچھی رینجر بنتی، شاید یہاں کی سب سے پہلی خاتون رینجر۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ذرا سی نم ہوگئی تھیں۔

"بلی بیورا کیا یہاں کسی سے ڈرتا ہے؟" اس نے ایک نئی بات چھیڑ دی۔

"وہ کیوں ڈرے گا؟" کلارا چونک گئی۔ "اسے یہاں کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ سب اس کا بہت احترام کرتے ہیں۔"

"کائن کہاں رہتا ہے؟"

"کبھی بروم میں اپنے والدین کے پاس اور کبھی یہاں اپنے دادا کے ساتھ۔" کلارا نے جواب دیا۔

"اس کے دادا کا گھر کہاں ہے؟"

یہ سن کر کلارا نے تفصیل سے اس کے گھر کا پتا بتادیا۔ کائن کا دادا، نینسی کے نانا بلی بیورا کا بھائی تھا۔ اس کا گھر اسی گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔

☆☆☆

اپنے بھائی کی طرح بلی لزارا بھی بے ہنگم سفید داڑھی والا تانبے جیسی رنگت کا توانا مگر بوڑھا شخص تھا۔ جب وہ اس کے پکارنے پر باہر نکلا تو سامنے پولیس والے کو کھڑا دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی تشویش دوڑ گئی۔ اسمتھ نے اسے مختصر طور پر نینسی کیس کے بارے میں بتایا۔ جس دوران وہ بات کررہا تھا، لزارا دونوں نتھنے پھلا پھلا کر ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسمتھ یہ دیکھ کر دل میں مسکرا دیا۔ وہ ان کی توہم پرستی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا، بوڑھا یہ سن چکا ہے کہ وہ لاش کو بھیج کر آرہا ہے۔ اب یہ فضا میں موت کی بو محسوس کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ شاید وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں موت کا سایہ اسمتھ کے ساتھ ساتھ یہاں تک تو نہیں پہنچ گیا۔

"مجھے کائن سے ملنا ہے۔" اسمتھ نے مطلب کی بات کی۔

یہ سنتے ہی بوڑھے نے نتھنے پھلانا بند کیے۔ "کیوں؟" اس کا لہجہ درشت تھا۔ "تمہیں اس سے کیا کام ہوسکتا ہے؟"

"آخری بار نینسی کو اس کے ساتھ جاتے دیکھا گیا ہے۔" اسمتھ نے نرمی سے جواب دیا۔ "کیا وہ کل رات یہیں پر تھا؟" اس نے انگلی سے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں..." اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "وہ کل ہی فشنگ کے لیے چلا گیا تھا۔"

"کل ہی چلا گیا تھا۔" اسمتھ نے زیر لب کہا اور پھر بوڑھے کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ "اس نے کچھ بتایا تھا کہ وہ نینسی کو بھی اپنے ساتھ بوٹ پر لے جارہا ہے؟"

"نینسی..." بوڑھے نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں نہیں، اسے تو کائن کبھی کبھار ہی لے کر جاتا ہے، جب اس کے عملے میں لوگوں کی کمی ہوتی تھی۔" بوڑھے نے بتایا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ چکی تھیں۔

"اس کے لیے عملے کا بندوبست کون کرتا ہے؟"

"کیپٹن پارکر۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے آج کائن یا نینسی کو بھی نہیں دیکھا ہوگا؟" اسمتھ نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا مگر اسمتھ بھانپ گیا کہ اس کی بات سن کر بوڑھے کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی تھی۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ کل رات کہاں ٹھہرا ہوگا؟"

"شاید بروم میں، جب وہ فشنگ پر نہیں جاتا تو اپنے والدین کے گھر پر ہی ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے رات بھی وہیں چلا گیا ہو۔" یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکا۔ "وہ لوگ بروم میں کیمبل اسٹیشن کے عقبی بلاک میں رہتے ہیں۔"

اسمتھ نے کائن کے والدین کا پتا نوٹ کرکے نوٹ بک بند کی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔

☆☆☆

ایک فون کال اور دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ بروم پہنچ گیا مگر ہیڈ کوارٹر جانے کے بجائے سیدھا کیمبل اسٹیشن پہنچا۔ وہ کائن کے گھر جانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پوسٹ مارٹم سے بھی کہیں پہلے وہ اس کیس کی گتھی سلجھا لے گا۔

کیمبل اسٹیشن کے عقب میں واقع بلاک کے جس گھر کا پتا لزارا نے دیا تھا، وہ دراصل ایک بڑی شیڈ نما عمارت نکلی۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی مگر روشنیوں کے سبب وہ اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ اس نے شیڈ سے کافی فاصلے پر گاڑی کھڑی کی اور پیدل چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس وقت دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا، البتہ شیڈ میں جلنے والی بتیوں سے اسے اندازہ ہوگیا کہ اندر لوگ موجود ہیں۔

جب وہ شیڈ کے پاس پہنچ کر داخلی دروازہ ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا، اسی وقت برابر کے شیڈ سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ وہ لمبے قد اور گھنگریالے بالوں والا تھا۔ ایک اجنبی کو وہاں کھڑا دیکھ کر آگے بڑھا۔ "کس سے ملنا ہے؟" اس نے سر سے پیر تک اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کائن بیورا سے۔" اسمتھ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ نوجوان اس کی یونیفارم سے اندازہ لگا چکا

"بہت خوب... آپ مصر کی سیاحت سے کب لوٹے مسٹر موتی؟"

ہوگا کہ وہ پولیس والا ہے۔

"میں ہی ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"نینسی کو آخری بار تمہارے ساتھ ہی جاتے دیکھا گیا تھا۔" اسمتھ نے بااعتماد لہجے میں کہا تو اس کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میں..." اس نے حیرت سے کہا۔ "نہیں نہیں، میں نہیں ہوسکتا۔ میں تو اس سے پرسوں ملا تھا۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پریشان نظر آرہا تھا۔

"تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ آج صبح تم نے اسے وومن کیمپ سے پک نہیں کیا تھا اپنی کار میں؟" اسمتھ کا لہجہ بدستور سخت اور سپاٹ تھا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اب وہ ملزم کے نہایت قریب پہنچ چکا ہے۔ کائن چپ چاپ کھڑا تھا۔ اسی دوران میں اسمتھ نے نظر دوڑائی تو دائیں جانب اسے ایک کار کھڑی نظر آئی۔ "وہ تمہاری کار ہے؟" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم نے اپنی کار کل رات یا آج صبح کسی کو دی تھی؟" اسمتھ نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"تو پھر یہ کار دومن کیمپ تک کیسے پہنچی؟" اسمتھ نے نوجوان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اس کار میں ہی آج صبح نینسی کو دومن کیمپ سے پک کیا گیا تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" یہ سنتے ہی کائن نے تڑپ کر کہا۔

"نینسی نے اپنی کزن کلارا کو بتایا تھا کہ تم آج صبح اسے کیمپ سے اپنی گاڑی میں پک کرو گے اور جب صبح پانچ بجے وہ باہر نکلی تو ایک کار کھڑی تھی، جس میں وہ بیٹھی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر انگلی سے کار کی طرف اشارہ کیا۔ "اور وہ یہی کار تھی۔" اسمتھ نے الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔

یہ سنتے ہی خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔" اسمتھ بھانپ گیا تھا کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی ہے۔ اس لیے اس نے نفسیاتی دباؤ بڑھا دیا۔ اس کا شک یقین میں بدلنے لگا۔

کائن نے اس کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"کل تم نے اپنے دادا سے کہا تھا کہ فشنگ بوٹ پر سمندر میں جا رہے ہو۔ اس وقت تو تمہیں سمندر میں ہونا چاہیے تھا۔" اس نے ترکش سے ایک اور تیر چلایا۔ اسمتھ کو اس کے جواب کا انتظار تھا مگر وہ بدستور خاموش کھڑا تھا۔ اسمتھ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ کائن کی نظریں کچھ فاصلے پر موجود درختوں کے جھنڈ پر جمی ہوئی تھیں۔

"کائن..." اسمتھ نے اونچی آواز میں پکارا۔ "تم جانتے ہو کہ نینسی آج صبح مر چکی۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟" اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ نینسی کا قتل ہوا ہے اور کائن اس کا اہم کردار ہو سکتا ہے۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے ویسے بھی وہ تھک چکا تھا اور کائن کی خاموشی اسے اور چڑچڑا بنا رہی تھی۔

کائن نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اسمتھ اس کی حرکت سے کچھ نہیں سمجھ سکا۔ "تم نے آج صبح پانچ، ہو سکتا ہے کہ ساڑھے پانچ بجے ہوں، نینسی کو دومن کیمپ سے پک کیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس کے سر پر چوٹ مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد لاش سمندر میں پھینک دی۔ اور پھر نو یا دس بجے کے قریب لہروں نے اسے ساحل پر لا کر پٹخ دیا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے رک کر اس کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ "کائن... تم نے اسے قتل کیا ہے۔"

"نہیں..." اس نے تڑپ کر کہا۔

"تو پھر کون ہو سکتا ہے اسے مارنے والا؟ اور سوال یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا ایسا کس لیے کرے گا؟"

کائن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم اُس کے ساتھ تھے۔" اسمتھ نے کہنا شروع کیا۔ "تم اگر اس کے ساتھ نہیں تھے تو پھر کون تھا؟ تم ہی تھے وہ... جانتے ہو قتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟ طویل عرصے تک قید... ممکن ہے کہ تم سزا بھگتتے بھگتے جیل میں ہی مر جاؤ، اپنے لوگوں سے دور تنہائی میں۔" وہ اس کی نفسیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سچ اگلوانے کے لیے اس پر پے در پے حملے کر رہا تھا۔

جیل کی دہلا دینے والی دھمکی سن کر کائن نے گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پرتھ بھیجی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر سب معلوم کر لیں گے۔ موت کی وجہ بھی پتا چل جائے گی اور اگر قاتل نے اس سے زیادتی کی ہے تو وہ بھی چھپی نہ رہ سکے گی۔" اسمتھ کا لہجہ سفاک پولیس والے جیسا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کائن ڈھے چکا ہے۔ وہ اسے سچ اگلنے پر مجبور کر رہا تھا مگر وہ بدستور آنکھیں بند کیے، سر جھکائے کھڑا تھا۔

لگ بھگ تین چار منٹ گزر گئے۔ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ کائن کی آنکھیں بدستور بند اور سر نیچے تھا۔ اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ "ٹھیک ہے..." اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "بہت ہو چکا، بس اب تم چلو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن۔" اس نے کائن کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "تمہیں جو کہنا ہے وہیں سن لیں گے۔"

☆☆☆

رات ہو چکی تھی مگر اسمتھ کو سکون نہ تھا۔ ڈھائی گھنٹے بعد ایک بار پھر وہ بلی بیورا کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت تک نینسی کی موت کی خبر پورے علاقے میں پھیل چکی تھی۔ گھر کے سامنے گاؤں کے کافی لوگ جمع تھے۔

وہ ان پر نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ بیورا سے ملنے آیا تھا مگر وہ ان لوگوں کے بیچ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھر کی طرف بڑھا اور دستک دی۔

"کون ہے؟" اسمتھ پہچان گیا۔ یہ بیورا کی آواز تھی۔

"باہر آؤ... تم سے کچھ بات کرنی ہے؟"

"اندر آ جاؤ۔"

وہ اندر داخل ہوا تو بیورا صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسمتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں اس طرح کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اسے کسی خاص شے کی تلاش ہو۔

"کائن بیورا اس وقت بروم پولیس اسٹیشن کی حوالات میں ہے۔ اس پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے۔" اس نے کچھ دیر تک بوڑھے کے چہرے کے تاثرات کا گہری نظروں سے جائزہ لینے کے بعد بات شروع کی۔

بلی بیورا نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے منہ سے لفظوں کو باہر نکلنے سے روکنے کی پوری کوشش کر رہا ہو۔

"اس کا کہنا ہے کہ یہ اس نے نہیں کیا مگر اس کے سوا وہ کچھ نہیں بتا رہا۔" اسمتھ نے کہنا شروع کیا۔ اس کی نظریں بدستور بیورا کے چہرے پر گڑی تھیں۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ وہ کسی سے سخت خوف زدہ ہے اسی لیے سچ نہیں بتا رہا۔"

"ایک بات تم سے بھی کہنی ہے۔" اسمتھ کی بات سنتے ہی بلی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ خاموش تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور چند لمحوں بعد اسمتھ نے دوبارہ بات شروع کی۔ "جب میں چند گھنٹے پہلے تم سے ملا، اُس وقت تم یہ بات جانتے تھے کہ نینسی مر چکی ہے؟" اسمتھ نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

بلی پر بدستور گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور ماتھے کی شکنیں سخت ہو چکی تھیں۔

کافی دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ "آخر تم وہ سب کچھ مجھے سچ سچ کیوں نہیں بتا دیتے جو جانتے ہو؟" اسمتھ نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

بلی نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ وہ اسمتھ سے آنکھیں ملانے سے کترا رہا تھا۔ یہ بات اس نے صاف محسوس کر لی تھی۔

"مجھے علم ہے کہ تم بھی کسی سے خوف زدہ ہو۔" اسمتھ کا لہجہ طنزیہ تھا۔

کمرے پر گہری خاموشی طاری تھی جس میں اسے باہر موجود لوگوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کافی دیر تک یہ خاموشی رہی، آخر اسمتھ نے سکوت توڑا۔ "بلی بیورا... میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے قتل سے پہلے کیا ہوا تھا اور اسے کیوں قتل کیا گیا ہے؟" اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

بلی نے یہ سن کر لمحہ بھر کے لیے نظریں بھر کر اسے دیکھا اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اسمتھ اس کے تاثرات بھانپنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کیا بات تھی کہ کائن اسے قتل کرنے کی حد تک پہنچ گیا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "بہتر ہے کہ سچ یہیں سامنے آ جائے ورنہ..." اسمتھ نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کائن اور تم دونوں جانتے تھے کہ نینسی کو قتل کیا جا چکا ہے اور یہ بات میرے بتانے سے پہلے ہی تم دونوں کے علم میں تھی۔" یہ کہہ کر اس نے توقف کیا اور لمحہ بھر بعد کہنے لگا۔ "نہ جانے تم کس سے خوف زدہ ہو جو سچ نہیں بتا رہے۔ یہ بات مجھے پریشان بھی کر رہی ہے اور حیران بھی..."

اسی دوران میں باہر سے کچھ عورتوں کے زور زور سے رونے کی آوازیں آئیں اور پھر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

"ممکن ہے کہ کائن نے اسے قتل نہیں کیا ہو، ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ کیا ہو..." اسمتھ نے اس بار نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "یہ قتل کا معاملہ ہے اور وہ نوجوان بھی۔ اگر کسی خوف کے باعث سچ سامنے نہیں آیا تو اسے جیل میں شاید پوری زندگی بسر کرنا پڑے۔ ہو سکتا ہے اسے موت کی سزا ملے اگر..." اسمتھ نے بات ادھوری چھوڑ دی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اگر وہ جیل جاتا ہے اور موت کی سزا ملتی ہے تو پھر بلی بیورا... اس کے قاتل تم ہو گے۔" اس نے انگلی سے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

کمرے میں کافی دیر تک خاموشی رہی۔ اسمتھ کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اس کی باتوں کا اثر نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے پر فیصلہ نہیں کر پا رہا ہو۔ اس کے جسمانی تناؤ کو بھی اس نے صاف محسوس کر لیا تھا۔

آخر بلی نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور چند گہری سانسیں لیں۔ "وہ مجھ سے جزیرے پر مگرمچھوں، کچھوؤں اور دوسری جنگلی حیات کے شکار کے لیے مستقل بنیاد پر اجازت نامہ مانگ رہا تھا۔" آخر اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تم خود سوچو میں یہ کام کیسے کر دیتا؟ نینسی بھی اس کی مخالف تھی۔ وہ جزیرہ انسانوں کی نہیں جنگلی حیات کی زمین ہے۔ ہم نے انہیں گفٹ کر دیا ہے۔ اگر ایک بار میں اس کی بات مان لوں تو اس کا مطلب ہے کہ اُن جانوروں اور پرندوں کی تباہی شروع..." لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ بات شروع کی۔ "مگر اسے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو ان جانوروں اور پرندوں سے پیسا بنانا چاہتا ہے۔ لالچی شخص..." یہ کہہ کر اس نے غصے سے فرش پر تھوک دیا۔

"تو پھر کیا ہوا؟"

"میں نے اسے انکار کر دیا تھا۔" بلی نے کہنا شروع

کہا۔ "آج صبح وہ میرے پاس دوبارہ آیا اور کہا کہ اس نے نینسی کو قتل کر دیا ہے۔ اگر اسے جزیرے پر شکار کا اجازت نامہ نہ ملا تو اگلی باری رونالڈو کی ہوگی۔"

"اوہ میرے خدا..." اسمتھ نے سر پکڑ لیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے معصوم نینسی کی لاش آ گئی تھی۔ علاقے کی پہلی خاتون رینجر بننے کا سپنا بھی اس کی لاش کے ساتھ ہی سمندر میں بہہ گیا تھا۔ "اب تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "کائن اب شاید ہی جیل سے زندہ باہر آسکے گا۔"

"مگر وہ کائن نہیں تھا۔" بلی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو پھر کون تھا؟" اسمتھ چونک گیا۔ اس کی آنکھوں سے حیرانی جھلک رہی تھی۔

"اگر میں نے یہ بات کسی سے کہی تو وہ میرا نواسا رونالڈو تھا، اس کے بعد اب میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں... وہ کیپٹن پارکر تھا۔"

"کیپٹن پارکر..." اسمتھ نے حسب عادت نام دہرایا۔ "تو وہ کائن نہیں تھا؟" اس نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

"نہیں..." بلی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ بے چارہ بے قصور ہے۔ یہ سب کچھ کیپٹن پارکر نے کیا ہے۔"

"یہ سب کچھ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آیا تھا تمہیں بتانے کا۔ تم بھی سفید فام ہو اور وہ بھی۔" بلی نے کہا۔ "تمہارا قانون اسی کی مدد کرے گا۔ ہمیں تو تم کیڑے مکوڑے سمجھتے ہو۔" ایک بار پھر اس کی آواز میں تلخی در آئی تھی۔

"کیپٹن پارکر کہاں ملے گا؟" اسمتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بروم میں۔" یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کا پتا اسے نوٹ کروا دیا۔

"ابھی ایک سوال تشنہ ہے۔" اسمتھ زیر لب بڑبڑایا۔ اسے بروم پہنچنے کی جلدی تھی۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کیپٹن پکڑا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسمتھ کو اپنے اس آخری سوال کا جواب مل گیا کہ اگر وہ مین کیمپ سے نینسی، کائن کے ساتھ نہیں تو پھر کس کے ساتھ گئی تھی؟

کیپٹن پارکر سے کائن کے قریبی مراسم تھے مگر وہ اس کے عزائم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ پارکر نے اسے استعمال کیا۔ کائن جانتا تھا کہ اسے جزیرے کا اجازت نامہ درکار ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ نینسی کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ پارکر نے اس سے کہا کہ وہ نینسی سے بات کرنا چاہتا ہے اور وہ اسے ملوا دے مگر راز داری سے جس کا اس کے نانا کو پتا نہ چلے۔

کائن پر اس کے کئی احسانات تھے۔ وہ اسے سیدھی سادی بات سمجھا اور ہامی بھر لی۔ نینسی، کائن کی رشتے دار تھی اور اس پر اعتماد بھی کرتی تھی۔ وہ اسے کیمپ سے ساحل تک لے گیا جہاں پارکر کی بوٹ کھڑی تھی۔ اس نے نینسی کو بوٹ پر بھیجا اور وہ بنا سوچے سمجھے چلی گئی۔ کائن واپس بروم چلا آیا۔

پارکر کا کہنا تھا کہ اس نے نینسی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اسے پیسے سے زیادہ جنگلی حیات کے تحفظ میں دلچسپی تھی۔ جب وہ نہ مانی تو اس نے سر پر ہتھوڑا مار کر اسے قتل کیا اور لاش سمندر میں پھینک کر واپس آیا اور ایک بار پھر بلی کے پاس پہنچ کر اسے دھمکی دی۔

کائن اس معاملے میں بالکل بے قصور ثابت ہوا تھا اور اب رات کے اس پہر وہ اسے گھر پہنچانے جا رہا تھا۔

سینئر سارجنٹ اسمتھ کی اس تیز رفتار کامیابی سے بہت خوش تھا۔ اس نے کسی سراغ رساں کی مدد کے بغیر، پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی پہلے قاتل کو گرفتار کر کے اعتراف جرم کرا لیا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد صبح کے دس بج رہے تھے جب وہ بلی کے گھر پہنچا۔ اب بھی برآمدے میں کئی لوگ سوگوار بیٹھے تھے۔ بلی بھی وہیں تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"جو کچھ ہوا، مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔" اسمتھ نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "نینسی کو ہم دوبارہ دنیا میں نہیں لا سکتے مگر میرے پاس ایک اچھی خبر ہے تمہارے لیے۔" بلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"جنگلی حیات کے تحفظ میں جان دینے جیسے بہادرانہ اقدام کے لیے بروم کے میئر نے آج اس کا نام آسٹریلیا کے سب سے بڑے قومی اعزاز کے لیے حکومت کو بھجوا دیا ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر ابھرا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ قدیم سیاہ فام باشندہ تمام تر نفرت کے باوجود سفید فام کے گلے لگ کر اپنے دل کا بوجھ آنسوؤں کی شکل میں ہلکا کر رہا تھا۔ اسمتھ کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔

نیوائیر فول

کاشف زبیر

جہاں دمڑی کے بدلے چمڑی دینے پر آمادہ دولت گزیدہ موجود ہیں، وہیں انہیں غچّا دینے والوں کی بھی کمی نہیں... جو سیدھے ہاتھ سے معمولی نذرانہ دینے کے روادار نہ ہوں، وہ اُلٹے ہاتھ کی چال پر بہت کچھ ہارنے پر تیار ہو جاتے ہیں... دولت پہ سانپ کی طرح بیٹھ کر پہرا دینے والوں کا قصہ... ایک اس کی دولت کے پیچھے تو دوسرا بے ایمانی کی نگرانی بھی ایمانداری سے کرنے پر مامور تھا...

[illegible]

سال کے آخری دن مجھے تین پیغام ملے، پہلا شنو کا۔ ہمارا نیو ایئر نائٹ ڈنر کا پروگرام اماں اور خالہ نے مشترکہ طور پر ویٹو کر دیا تھا اگرچہ نقطۂ نظر دونوں کا الگ تھا۔ خالہ لاؤڈ اسپیکر کا خیال تھا کہ زمانہ خراب آ گیا ہے اب لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے ملنے لگے ہیں۔ اس پر شنو نے خالہ لاؤڈ اسپیکر کی زبانی سنے وہ قصے دہرائے جن میں خود خالہ، خالو کے ساتھ شادی سے پہلے تفریح کرنے اور فلم دیکھنے جاتی تھیں۔ اس پر خالہ نے جوتی اٹھالی اور شام کو ڈیٹ پوائنٹ پر شنو نے دکھی دل اور اس سے زیادہ دکھتی کمر (جہاں جوتی لگی تھی) کے ساتھ

قصہ دل گداز سنایا کہ میں مسلسل ہنس رہا تھا۔ شنو چڑ کر واک آؤٹ کر گئی پھر اس کا پیغام آیا کہ جلیل کچھ کر۔ جلیل بے چارہ کیا کر سکتا تھا جبکہ اماں اور خالہ مل کر ہمارے ساتھ وہ سلوک کر رہی تھیں جو پہلے حکومتیں اپوزیشن کے ساتھ کیا... کرتی تھیں اور نئی زمانہ حکومت اور اپوزیشن مل کر عوام کے ساتھ کر رہے ہیں۔

دوسرا پیغام راجا کا تھا... بہ قول اس کے اس نے نیو ایئر نائٹ منانے کے لیے ایک سنسنی خیز جگہ تلاش کر لی ہے اور وہاں داخلے کا مناسب طریقہ بھی ڈھونڈ لیا ہے مگر راجا کی بات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا اس کے دریافت کیے مناسب طریقے پر عمل کرنے کی صورت میں نیو ایئر نائٹ تھانے میں گزرتی۔ میں نے راجا کے ایس ایم ایس کا کوئی جواب نہیں دیا اور جب اس نے کال کی تو میں نے ریسیو نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے اور بھول گیا کہ راجا عقل کی جگہ بھی ڈھٹائی سے کام لیتا ہے، وہ گھر چلا آیا۔ میں نے اماں کو آگے کر دیا۔ اماں نے اس کے وہ لتے لیے کہ راجا بدحواسی میں گلی سے نکلتے ہوئے مین ہول میں اتر گیا۔ وہ تو غنیمت رہا کہ اس کا ایک پاؤں گیا تھا۔ ورنہ راجا کی نیو ایئر نائٹ غسل خانے یا دھوبی گھاٹ میں گزرتی۔ البتہ تیسرا پیغام مجھے کچھ فائدے مند لگا۔ بارہ بجے مجھے نورو بھائی نے کال کی تھی۔ وہ چھوٹا بھائی کے ریفرنس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ملاقات کے لیے کہا۔ میں نے پوچھا "کام کیا ہے نورو بھائی؟"

"یہ ملاقات پر بتائے گا۔" وہ غالباً پان چباتے ہوئے بولا۔ "تیرے مطلب کا ہے۔"

"میں پرانے کام چھوڑ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یار کاہے کو نخرا کرتا ہے۔ چھوٹا سا کام ہے دو تین گھنٹے کا تیرے نیو ایئر کا اچھا اسٹارٹ ہو جائے گا۔"

"اچھا آنا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

نورو بھائی نے مجھے ڈیفنس کا ایک پتا دیا تھا۔ میں نے اس سے بات کر کے چھوٹا بھائی سے بات کی۔ اس نے حسب معمول رکھائی سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"تم نے کسی نورو بھائی کو میرا نمبر دیا ہے؟"

"ہاں اس کا کوئی مسئلہ ہے، وہ ٹھیک کر دے۔ تیرے کو خوش کر دے گا۔ دل کا کھلا آدمی ہے میری طرح نہیں ہے۔"

"اپنی مثال مت دیا کرو پہلے ایک قارون گزرا تھا اور اب تم ہو۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ بہر حال چھوٹا بھائی کی تصدیق کے بعد میں کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ میں نے نورو بھائی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ٹیلر شاپ بند تھی کیونکہ استاد اکرم ایک خاتون سے مار پیٹ کے الزام میں پہلے حوالات اور پھر اسپتال میں مقیم تھا۔ اتفاق سے خاتون لیڈی پولیس تھی اور اس نے حوالات میں استاد سے بذات خود تفتیش کی تھی حالانکہ اس سے پہلے وہ دکان پر ہی استاد کا حلیہ بگاڑ چکی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ استاد نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ساڑھے پانچ فٹ قامت اور ڈھائی سو پونڈ وزنی خاتون جو سائز بتا رہی تھیں، اس میں شنو بھی سما سکتی آتی۔ دراصل چرس کی عدم دستیابی سے استاد کا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔ اس لیے وہ انجام کا سوچے بغیر پولیس والی سے الجھ بیٹھا۔ بہر حال اس کی ضمانت ہونے تک اس کا حال اسپتال جانے والا ہو گیا تھا اور میں نے اسے وہیں پہنچا دیا۔ نتیجے میں دکان بند پڑی تھی۔ آمدنی کی جگہ خرچ ہو رہا تھا۔

چھ بجے میں مطلوبہ پتے پر پہنچا تو وہ ایک بڑی کوٹھی ثابت ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ نورو بھائی بڑی پارٹی ہے۔ کوٹھی کی عمارت بڑی شاندار تھی اور پورچ میں چمکتی دمکتی مہنگی لگژری گاڑیاں موجود تھیں۔ نام بتانے پر صورت سے خونخوار دکھائی دینے والے گارڈ نے اندر اطلاع دی اور ایک ملازم نے مجھے نورو بھائی کے سامنے پیش کر دیا۔ پورنیمل قسم کا سیٹھ نورو بھائی سفید کرتے پاجامے میں سفید تخت پوش پر اکڑوں بیٹھا پان چبا رہا تھا۔ اس کا ذاتی رنگ بھی بہت زیادہ سفید تھا اس لیے ہونٹوں سے جھلکتی پان کی سرخی کی وجہ سے خون آشام لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور باریک بینی سے میرا جائزہ لیا۔ "تو جلیل ہے۔"

"کیا اپنا شناختی کارڈ پیش کروں سیٹھ؟"

"چھوڑ اب تو ساڑھے تین کروڑ جعلی آئی ڈی بن گئے ہیں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"تب اپنی اماں کو لا سکتا ہوں وہی سب سے زیادہ گواہ ہیں کہ میں ہی جلیل ہوں۔" میں نے متبادل طریقہ پیش کیا۔

"غارض غائے غو غو تا غے۔" نورو بھائی منہ اوپر کر کے غوغیایا اور... نزدیک ہی رکھے چاندی کے گلدان میں وہ تمام مسالا اگل دیا جسے وہ بڑی عرق ریزی سے چبا رہا تھا۔ اس میں عرق بھی اس کا اپنا تھا۔ منہ خالی کر کے نورو بھائی نے صاف لہجے میں کہا۔ "کام اعتماد والا ہے۔ تیرے بارے میں چھوٹا بھائی نے بتایا۔ دیکھ پہلی بار ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"تب چھوٹا بھائی سے رابطہ کر کے تسلی کر لو۔"

نورو بھائی نے سر ہلایا۔ "اپن مطمئن ہے۔ اب کام سن، تیرے کو ایک بیگ دے گا۔ وہ لے کر تو ایک جگہ جائے گا۔ وہاں ایک آدمی بیگ لے کر تجھے ایک چیز دے گا وہ تو لا کر مجھے دے گا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "بیگ میں کیا ہوگا؟"

"تیرا اس سے تعلق نہیں ہے۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"بیگ کسے دینا ہے؟"

"اس سے بھی تیرا تعلق نہیں ہے۔ وہ آدمی خود تیرے پاس آئے گا۔"

"وہ آدمی مجھے کیا دے گا؟"

"تجھے کیا؟" نورو بھائی چڑ گیا۔ "جو بھی دے تجھے اسے میرے پاس لانا ہے۔ تیرا کام ختم ہو جائے گا۔"

"تب سیٹھ یہ کام تم کسی اور سے لے لو۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "جلیل نے آج تک اس طرح آنکھ بند کر کے کسی کا کام نہیں کیا ورنہ یہ آنکھیں بہت پہلے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہوتیں۔"

"بیٹھ، بیٹھ۔" اس نے اضطراب سے کہا۔ "میں پریشان ہے اور ٹیم اپنی جگہ نہیں ہے۔ دیکھ میں تجھے دس ہزار دے گا۔"

"نورو بھائی مجھے دس لاکھ روپے بھی ملتے ہیں۔ تب بھی میں آنکھ بند کر کے کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یا تو مجھے پوری بات بتاؤ یا پھر کسی اور سے کام لے لو۔"

نورو بھائی سوچ میں پڑ گیا۔ میں کھڑا تھا کچھ دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "جلیل میں پوری بات نہیں بتا سکتا ہوں۔ یوں سمجھ لے کہ میں تجھے رقم کا بیگ دوں گا۔ تجھے یہ بیگ لے کر ایک جگہ جانا ہے۔ وہ جگہ ایسی ہے کہ تجھے یا رقم کو خطرہ نہیں ہوگا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "یعنی مجھے یا رقم کو خطرہ ہو سکتا ہے؟"

اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ "ویسے ہو سکتا ہے۔"

"تب اس جگہ جانے تک میں بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں ادھر خطرہ نہیں ہے۔ جب تو اس جگہ پہنچے گا تب ہو سکتا ہے پر وہاں اتنا لوگ ہوگا کہ کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"ٹھیک ہے وہ بندہ کون ہوگا جسے بیگ دے کر چیز لینی ہے؟"

نورو بھائی نے سلام پھیرنے کے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو میں بھی نہیں جانتا وہ تجھے خود پہچان کر تیرے پاس آئے گا۔"

"مجھے پہچان کر۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔ "یعنی وہ مجھے پہچانتا ہوگا۔"

"نہیں وہ تیرے کپڑے سے پہچانے گا۔"

"یعنی مجھے کسی خاص حلیے میں جانا ہوگا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "اور وہ مجھے کیا دے گا؟"

"جلیل بس یہ نہ پوچھ..." نورو بھائی نے عاجزی سے کہا۔ "جب وہ دے گا تو تو خود دیکھ لے گا۔"

"اگر اس نے مجھے بم پکڑا دیا یا زہریلے سانپ کی پٹاری۔" میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں بابا وہ بالکل بھی خطرناک چیز نہیں ہے۔" نورو بھائی جلدی سے بولا۔ "ایک دم بے ضرر ہے میری طرح۔"

میں نے غور کیا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے نورو بھائی لیکن معاوضہ دس نہیں تیس ہزار ہوگا اور وہ بھی پیشگی۔"

وہ اچھل پڑا۔ "اکٹھا تیس ہزار اور وہ بھی پیشگی۔"

"میں معاوضہ پیشگی لیتا ہوں۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا تو اس نے مجبوراً سوچا اور مجبوراً ہی مان گیا۔ اس نے پاجامے کی جیب سے پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد کی اور اس میں سے گن کر مجھے چھ نوٹ پکڑا دیے۔ میں نے نوٹ پرس میں رکھے۔

"جانا کب ہے اور بیگ کہاں سے ملے گا؟"

"یہیں سے جانا ہے میرا ڈرائیور لے جائے گا۔ بیگ بھی اسی وقت ملے گا۔ ٹھیک نو بجے آ جانا۔ پر کوئی لفڑا مت کرنا میرا نام نورو بھائی ہے۔"

نورو بھائی کسی پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس کا آدمی یقیناً مجھ پر نظر رکھنے کے لیے ساتھ جاتا۔ بہر حال اگر مجھے محسوس ہوتا کہ مجھ سے غلط بیانی کی گئی ہے تو میں اپنا دفاع کرنے کے لیے تیار ہوتا۔ وہاں سے نکل کر میں سیدھا کیفے ڈی پھونس پہنچا۔ مجھے امید تھی کہ راجا اب تک بکروں کی کمائی ٹھکانے لگا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہوگا اور میری امید درست ثابت ہوئی۔ راجا وہاں موجود تھا اور راجا اسی وقت کیفے ڈی پھونس میں پایا جاتا تھا جب اس کی جیب میں کہیں اور جانے کے لیے نوٹ نہیں ہوتے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "جلیل میں تیرے

بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اور یقیناً اچھا نہیں سوچ رہا ہوگا۔"

"تو مجھ سے ہمیشہ بدگمان رہتا ہے۔" راجا نے دانت نکالے۔" حالانکہ میں تیرا سب سے مخلص دوست ہوں۔"

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔ "تو مجھ سے اتنا ہی مخلص ہے جتنی حکومت عوام سے مخلص ہے۔"

راجا نے قطعی برا نہیں مانا، اس کا مطلب تھا کہ وہ پوری طرح کنگال ہو چکا تھا۔ راجا نے چھوٹے کو اشارہ کیا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ "چھوڑ یہاں کی بکواس چائے چل بابو بھائی کے پاس چلتے ہیں۔"

بابو بھائی چائے کا کھوکھا لگاتا تھا لیکن اس کی چائے میں نہ جانے کیا بات تھی جو ایک بار پیتا اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ وہ کچھ خاص مسالہ جات استعمال کرتا تھا اپنی چائے میں۔ راجا خوش ہو گیا۔ "اس کا مطلب ہے تیرے پاس رقم ہے۔"

"ہے نہیں، آنے والی ہے لیکن پوری بات وہیں چل کر بتاؤں گا یہاں تو بات کر کے آدمی کتھک ڈانس کا ماہر بن سکتا ہے۔"

بابو بھائی کے کھوکھے کے پاس پن ڈراپ سائلنس تھا۔ کیونکہ تمام چائے پینے والے کھوئے کھوئے سے تھے اور انہیں بات کرنے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ سنا تھا کہ بابو بھائی افیم کی آمیزش کرتا ہے۔ یہاں فقط دل میں کہنا بھی کافی تھا اگلا آدمی بہ خوبی سن لیتا اس لیے میں نے خفیف ترین سرگوشی میں راجا کو کام کی نوعیت بتائی جو اسے کرنا تھا۔ اسے اصل میں دو کام کرنے تھے ایک میرا پیچھا کرنا اور دوسرے بہ وقتِ ضرورت میری مدد کرنا۔ راجا نے سنا اور واشگاف الفاظ میں پوچھا۔ "مجھے کیا ملے گا؟"

"ہزار کام سے پہلے اور ہزار کام کے بعد۔"

"ہزار بعد میں کیوں؟" راجا نے اعتراض کیا۔

"کیونکہ مجھے بھی معاوضہ اسی ترتیب سے ملے گا۔" میں نے دانت نکالے۔

"کام کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم بس تجھے میرا پیچھا کرنا ہے۔"

"پیچھا۔" راجا نے غور کیا۔ "اگر تیرا رخ اگلے جہان کی طرف ہو گیا تو...؟"

"ایسا کوئی امکان نہیں ہے تو جانتا ہے میں صرف ایک حد تک خطرہ مول لیتا ہوں اور جس کے لیے کام کر رہا ہوں وہ بھی کاروباری آدمی ہے مار دھاڑ والا نہیں ہے۔ پھر گولیاں وغیرہ چلنے لگیں تو میرے کہنے کی ضرورت نہیں ہے تو خود سر پر پاؤں بلکہ بائیک رکھ کر بھاگے گا۔"

"میرے پاس بائیک نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تو سدا کا کنگلا ہے جو رقم بچی ہوگی، عارفہ کی نذر ہو گئی ہوگی۔"

"ہاں یار۔" راجا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ابا کی طرح عارفہ بھی میری جیب میں رقم برداشت نہیں کر سکتی۔"

"میں تجھے اپنی بائیک دوں گا لیکن اسے اپنے باپ کی گدھا گاڑی سمجھ کر مت چلانا۔"

نو بجے ہم نورو بھائی کی کوٹھی کے پاس تھے۔ میں نے بائیک راجا کے حوالے کی۔ خوش قسمتی سے اس نے موبائل لے لیا تھا اس لیے اس سے رابطہ کرنے میں آسانی رہتی۔ راجا کو گلی کے کونے پر چھوڑ کر میں پیدل نورو بھائی کی کوٹھی پہنچا۔ دروازے پر گارڈ کے ساتھ ایک تنومند سیاہ فام بھینسے جیسا شخص موجود تھا اس نے بھینسے کی طرح ڈکرا کر کہا۔ "تو جلیل ہے؟"

میں نے اقرار کیا تو وہ گرفتار کرنے کے انداز میں مجھے پکڑ کر اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ اس نے مجھے نیوی بلو کلر کی جینز اور جینز سے ہی بنی جیکٹ دی۔ نیچے پہننے کے لیے سیاہ ہائی نیک جرسی تھی اور سر پر جینز سے بنی پی کیپ تھی۔ جس کی پیشانی پر سرخ دھاگے سے رقص کرتی لڑکی کاڑھی گئی تھی۔ یہ لباس یقیناً نشانی کے لیے تھا۔ جب میں نے لباس بدل لیا تو بھینسے کے بجائے نورو بھائی اندر آیا۔ اپنے آدمی کے مقابلے میں وہ بھینس کا بچہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ایک سرخ چرمی بیگ سینے سے لگا رکھا تھا۔ "جلیل تجھے یہ لے کر جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہ جابر بتائے گا۔" نورو بھائی نے جواب دیا۔ جابر وہی بھینسا ثابت ہوا تھا۔ میں نے نورو بھائی سے کہا۔

"جب تمہارے پاس اس جیسے پلے پلائے سانڈ ہیں تو مجھے کیوں بلاوجہ تیس ہزار دے رہے ہو؟"

جابر نے ڈکرا کر میری طرف دیکھا۔ نورو بھائی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس کا جسم دیکھ رہا ہے بھینس کے مافق... اس کی کھوپڑی میں مغز بھی بھینس جیسا ہے۔ جتنا بولا جائے اتنا کرتا ہے۔"

میں جابر کے ساتھ باہر آیا تو اس نے ڈکرا کر کہا۔ "میرا نام جابر ہے میرے ساتھ اڑی کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"مجھے بھینسوں سے اڑی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے دانت نکال کر کہا۔ اس نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا لیکن فی الحال وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ گاڑی بڑی شاندار تھی میں پیچھے بیٹھا تو اس نے پھر برا منایا... مگر مجھے آگے بیٹھنے پر راضی نہیں کر سکا... گاڑی کوٹھی سے نکلی تو میری نظر عقب میں تھی میں نے چپکے سے راجا کو مس کال دے دی تھی۔ سڑک پر آنے سے پہلے بائیک کی ہیڈ لائٹ نظر آنے لگی تھی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے جابر سے پوچھا۔ "تم کب سے نورو بھائی کے ساتھ ہو؟"

"بیس سال سے۔" اس نے فخر سے کہا۔ "سیٹھ جی مجھ پر پورا بھروسا کرتے ہیں۔"

"تم ڈرائیور ہو؟"

"میں سب کرتا ہوں جو سیٹھ جی کہتے ہیں۔"

ظاہر ہے سب کچھ میں یہ بھی شامل تھا جو وہ اس وقت کر رہا تھا۔ اسے ساتھ بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ رقم کے بارے میں میری نیت ٹھیک رہے۔ کچھ دیر بعد گاڑی ساحل کے ساتھ چلنے والی سڑک پر آ گئی۔ گاڑی کا رخ کریکس کی طرف تھا۔ جیسے جیسے آگے جا رہے تھے آبادی کم ہوتی جا رہی تھی۔ سردی خاصی تھی، اور اس وجہ سے سڑک پر اتنی رونق نہیں تھی۔ اصل رونق سی ویو والی طرف تھی جہاں نیو ایئر نائٹ منانے کے شوقین جمع ہو رہے تھے۔ یہاں ویرانی تھی۔ اب ساحل کے ساتھ اکا دکا فلیٹس اور بڑے بنگلے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ویرانے میں ایسی کون سی جگہ ہوگی جسے نورو بھائی محفوظ سمجھ رہا تھا۔ یہ علاقہ تو چوری ڈکیتی کے لیے نہایت موزوں تھا۔ بائیک کی روشنی مناسب فاصلے سے مستقل نظر آ رہی تھی ویسے یہ سڑک بالکل ویران نہیں تھی اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس لیے جابر کو شک نہیں ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے راجا کی ہوشیاری کی داد دی۔

نورو بھائی کی وجہ سے مجھے اطمینان تھا کہ میں کسی بڑے چکر میں شامل نہیں تھا۔ وہ کاروباری آدمی تھا۔ یقیناً یہ کوئی ایسا معاملہ تھا جس میں وہ پولیس کی مدد نہیں لے سکتا تھا نہ اپنے آدمی استعمال کر سکتا تھا۔ شاید اس نے کسی کو رقم ادا کرنی تھی اور اس کے بدلے اس سے کوئی قیمتی چیز لینی تھی۔ میں اندازے لگانے لگا کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ غالباً سونا یا جواہرات یا پھر کوئی اینٹیک چیز۔ نورو بھائی اس طرح سرِعام قیمتی دستاویز کی خریداری تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے جو بیگ دیا تھا وہ نمبر لاک والا تھا۔ کھٹکا دبانے سے کھلتا اور اس کی چابی میرے پاس نہیں تھی۔ اس لیے میں اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ بیگ کا وزن زیادہ نہیں تھا شاید تین کلو ہوگا اس میں بیگ کا اپنا وزن ڈیڑھ کلو سے کم نہیں تھا۔ اگر اس میں ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں تو ڈیڑھ کلو میں پندرہ گڈیاں آ سکتی ہیں۔ یعنی پندرہ لاکھ روپے تھے۔

آبادی تقریباً ختم ہو گئی تھی اور اب بہت دور کریکس کے ساتھ بننے والے سپر لگژری قسم کے فلیٹوں کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں جبکہ دائیں طرف تاریک سمندر تھا۔ وہ روشن احاطہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا جیسے سمندر میں سے کوئی روشن جزیرہ نکل آیا ہو۔ اس کی چار دیواری بھی خاصی بلند تھی اس لیے نزدیک آئے بغیر یہ نظر نہیں آتا تھا۔ احاطے کی دیواریں ساحل کے ساتھ سمندر کے اندر تک چلی گئی تھیں۔ اندر بہت زیادہ روشنی تھی جس کا انعکاس باہر تک آ رہا تھا اور اس کے ساتھ تیز موسیقی کا شور اور لڑکیوں کی ہذیانی چیخیں تھیں۔ جابر نے گاڑی احاطے کی طرف موڑ دی اور دیوار کے ساتھ کھڑی گاڑیوں کے درمیان..... لے جا کر روک دی اور میری طرف مڑا۔ "نیچے اترو... تم کو اندر جانا ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"ایک پرائیویٹ کلب ہے یہاں صرف مخصوص لوگوں کو جانے کی اجازت ہے۔"

میرا پہلے اس طرف شاید ایک دو بار آنا ہوا تھا اور اس وقت یہ احاطہ اور کلب یہاں نہیں تھا۔ شاید حال ہی میں کھلا تھا اور اس کے اندر سے آنے والی مادر پدر آزاد آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہاں نیو ایئر نائٹ کے نام پر کیا ہو رہا ہے۔ نورو بھائی نے مجھے بتا دیا تھا کہ جس شخص سے بیگ کا تبادلہ کرنا ہے وہ خود مجھے تلاش کر لے گا۔ لیکن اب میں الجھن میں تھا کہ اگر میں کسی غلط آدمی سے ٹکرا گیا اور اس نے بیگ کے بدلے مجھے کچھ اور تھما دیا۔ تو بعد میں نورو بھائی اس غلطی کو تسلیم کرے گا۔ بہرحال ذمے داری تو اسی کی ہوتی کہ اس نے مجھے ادھوری معلومات کے ساتھ اس مشن پر روانہ کر دیا تھا۔ میں گاڑی سے اترنے لگا تو مجھے خیال آیا۔ "جب یہاں صرف مخصوص لوگوں کو جانے کی اجازت ہے تو میں کیسے اندر جاؤں گا دیوار پھلانگ کر؟"

تو جابر نے دو چیزیں اور تھما دیں۔ ایک شیر کی صورت والا ماسک تھا اور دوسرا ایک ممبر شپ کارڈ جس پر کسی ساجد مجید کا نام لکھا تھا۔ مگر تصویر نہیں تھی اس لیے میں ساجد بن سکتا تھا اور شیر والا نقاب لگا کر تو بالکل بن سکتا تھا۔ لیکن میں نے جابر کو تنگ کرنے کے لیے کہا۔ "اس عمر سے گزر چکا ہوں یہ نقاب بچپن میں لگاتا تھا۔"

"نخرے مت کرو... اندر سب ایسے ہی نقابوں میں

ہوں گے۔"

مغرب میں اس طرح کے نقاب لگا کر میلوں اور تقریبات میں شرکت کی جاتی ہے لیکن نیو ایئر نائٹ پر کوئی ایسا نہیں کرتا ہے۔ نہ جانے یہاں یہ روایت کس نے نکالی تھی۔ گیٹ پر ریچھ کے کاسٹیوم میں ملبوس گیٹ کیپر تھے۔ ایک نے میرے کارڈ کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور پھر مجھ سے میرا موبائل اور وہ تمام چیزیں طلب کیں جو میری جیب میں تھیں۔ میں سب ان کے حوالے کر کے ایک چھوٹے سے واک تھرو گیٹ سے اندر داخل ہوا اگر میری جیب میں کچھ ہوتا تو یہ الارم بجاتا۔ مگر دوسری طرف آنے کے بعد سوائے موبائل کے سب مل گیا۔ موبائل کے بارے میں کہا گیا کہ واپسی میں ملے گا اندر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ظاہر ہے یہاں اکثریت ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی تھی جیسا کہ باہر کھڑی گاڑیوں سے بھی ظاہر تھا۔ ان کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ تمام شور اور روشنیاں براہِ راست میری سماعت اور بصارت پر حملہ آور ہوئیں جو احاطے کے باہر تک سنائی اور دکھائی دے رہی تھیں۔ احاطے کے وسط میں ایک دو منزلہ ریستوران نما عمارت تھی۔ اس کے چاروں طرف سبزہ زار اور سوئمنگ پول تھے۔ چھت پر شاید ڈانس کا انتظام کیا گیا تھا اور موسیقی کا شور قیامت بھی وہیں سے بلند ہو رہا تھا۔ اس شور کے بارے میں بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ لتو کے کینے ڈی پھولس کا ڈیک اس کے سامنے گونگا تھا۔ سماعت شکن موسیقی سے زیادہ بلند شور ان خواتین و حضرات کا تھا جو بنتِ انگور کے اثرات کا اظہار زبان اور گلے سے کر رہے تھے۔ بعض ذرا دوسرے طریقے سے بھی اظہار کر رہے تھے۔ میں دم بخود سا کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

موبائل سے محروم ہونے کے بعد میں راجا سے مدد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اسے بلاوجہ ساتھ لایا۔ میں نے چرمی بیگ اس طرح اٹھایا کہ وہ نمایاں رہے اور دور سے بھی نظر آئے۔ میں میزوں کے درمیان گھومنے لگا۔ وہاں بہت سارے لوگ کھڑے تھے یا اسی طرح گھوم پھر رہے تھے اور کوئی ان کا نوٹس نہیں لے رہا تھا مجھے آسانی رہی تھی ورنہ سب اپنی گیدرنگ میں ہوتے تو میں اکیلا گھومتا ہوا بلاوجہ نظر میں آ جاتا۔ موسم کے سرد ہونے کے باوجود خواتین نے لباس کے معاملے میں کفایت شعاری کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ مغرب والے دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ اگر شنو کے تمام سوٹس کا کپڑا ملایا جاتا تو وہ یہاں موجود تمام خواتین کے لباسوں میں استعمال شدہ ... زیادہ ہی نکلتا۔ سوئمنگ پول والی طرف تو وہ ... حد ہو گئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ دریا کو کوزے میں ... کہیں کہیں تو سمندر بھی کوزے میں بند دکھ... خواتین شترِ بے مہار گھوم رہی تھیں۔ ابھی میں ... درمیان گھوم رہا تھا کہ ایک طرحدار خاتون آ کر ... میرے بازو سے لپٹ کر نشیلے لہجے میں چہکیں۔

"شوکی... یہ تم ہو؟"

خاتون پینتیس کے آس پاس تھیں مگر ... سنبھال کر رکھا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے خا... کیا۔

"افسوس کہ میں شوکی نہیں ہوں۔"

خاتون نے بالکل برا نہیں منایا اور لہجے ... چال چلتی ہوئی شوکی کی تلاش میں نکل گئیں۔ مجھ سے کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا اور میری خواہش بھی نہیں تھی ... اتنی جلدی رابطہ کرے۔ ابھی میں یہاں گھوم پھر ... قیامت کی مزید نشانیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ گھومتا ہوا بیچ کی طرف آیا یہاں دیوار لگا کر سمندر کو بھی پرائیویٹ ... تھا دو طرف سے دیوار سمندر کے اندر تک گئی تھی اور ... سے سفید ریت سے بنایا ہوا ساحل جس کے شروع ... اور پام کے درخت لگے تھے صرف ممبرز کے لیے مخصوص ... یہاں تیز روشنیاں تھیں اور اس موسم میں بھی ساحل ... لوگ اور خاص طور سے صنفِ نازک موسم کو خاطر میں ... ہوئے نیو ایئر نائٹ بھرپور طریقے سے منا رہی تھی ... بار ایک خاتون نے پاس آ کر میرا بازو پکڑا تو میں نے ... بتا دیا۔ "میں شوکی نہیں ہوں۔"

وہ لڑکی تھی کم سے کم اس کے منی اسکرٹ اور ... شرٹ سے عیاں جسامت سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میرا ... سن کر وہ ساکت رہ گئی پھر اس نے چلا کر کہا۔ "... ہے؟"

اس بار میں دنگ رہ گیا تھا۔ یہ نازو کی آواز تھی ... بھائی کو چوری کا مال بیچنے والے کیس کے بعد میں ... کو دیکھ رہا تھا۔ اس کیس کی تفصیلات قارئین تک پہنچاؤں گا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ "نازو تم یہ... رہی ہو؟"

"میں ایک کام سے آئی ہوں۔" اس نے ... گلے لگ کر کان میں کہا۔ شور یہاں بھی کم نہیں تھا لیکن ... مقصد رازداری تھا۔

"میں بھی کام سے آیا ہوں۔"

... اس کا مطلب ہے انہوں نے تمہیں بھیجا ہے۔" نازو ... سے بولی وہ جس طرح میرے گلے لگی تھی آس پاس ... دیکھنے والے ہمیں پریمی جوڑا سمجھ رہے تھے۔ وہاں سارے ... ہی ہوتے تھے اس لیے یہ پوز نیچرل تھا مگر مجھے گھبراہٹ ... نے لگی۔

"ذرا دور ہو کر بھی بات کر سکتی ہو اور مجھے کس نے بھیجا ... ہے؟"

"دوسری پارٹی نے۔" نازو خفگی سے بولی۔ "مجھے بھی ... نہیں ہے تمہارے گلے لگنے کا۔" وہ دو ڈھائی انچ پیچھے ... ہوئی۔

میں دنگ رہ گیا۔ "تمہارا مطلب ہے مجھ سے جسے ... تھا، وہ تم ہو؟"

"تو اور کیا؟" اس نے سر ہلایا۔ "یہ بیگ میرے ... حوالے کر دو۔"

اس نے بیگ لینا چاہا لیکن میں نے بیگ مضبوطی سے ... تھام لیا۔ "ایک منٹ نازو بی بی اتنی جلدی کیا ہے اور تم نے یہ ... حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

وہ صحیح معنوں میں جامے سے باہر ہو رہی تھی لیکن اس ... نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "جیسا دیس ویسا بھیس۔"

"ہو گے، میری بلا سے تم افریقہ کے جنگلیوں والے ... حلیے میں آ جاؤ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے مجھ سے یہ بیگ تم کو ہی ... لینا ہے۔"

نازو نے بلی کا ماسک لگایا ہوا تھا اس لیے میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکا تھا مگر آواز سے وہ خفا لگ رہی تھی۔ "کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"

جواب میں میں نے صرف قہقہہ مارا تو نازو کھسیا گئی پھر اس نے کھسیانی بلی کی طرح ہی مجھے کھمبا سمجھ کر نوچ کر کہا۔ "تمہیں نورو بھائی نے بھیجا ہے نا؟"

میں نے بازو سہلایا۔ "ہاں لیکن یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"تب کیا ثبوت پیش کروں۔" نازو غرائی۔

"نورو بھائی نے کہا تھا جواب میں تم بھی مجھے ایک چیز ... دو گی۔"

"میں اس کی مجاز نہیں ہوں۔ تم سے بیگ لے جا کر ... پارٹی ... کو دوں گی اور جواب میں وہ اسے چھوڑ دیں گے۔"

میں چونکا۔ "چھوڑ دیں گے یعنی وہ کوئی انسان ہے؟"

نازو نے غور سے مجھے دیکھا۔ "جلیل کیا تو اس معاملے سے بے خبر ہے نورو بھائی نے تجھے بتایا نہیں؟"

"کیا نہیں بتایا؟"

"یہی کہ معاملہ نورو بھائی کی پوتی جویریہ کا ہے۔ وہ اس کی اکلوتی وارث ہے۔"

"میں بات اب بھی نہیں سمجھا۔ نورو بھائی کی پوتی جویریہ اس معاملے میں کہاں سے آ گئی۔" میں نے سادگی سے کہا جس پر نازو نے شاید دانت پیسے۔

"احمق وہ اغوا کر لی گئی ہے اور تم اس کا تاوان لائے ہو۔"

"یہ تو گڑبڑ ہو گئی، تم جانتی ہو میں اس قسم کے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتا تو براہِ راست جرم کے زمرے میں آتے ہیں اور اغوا تو خاصا سنگین جرم ہے۔"

"میں جانتی ہوں اور میں بھی ان چکروں میں نہیں پڑتی ہوں مگر رقم اچھی مل رہی ہے اور خطرہ بھی اتنا نہیں ہے۔"

"خطرہ تو ہے ورنہ دونوں پارٹیاں اتنا پیچیدہ طریقہ کیوں اختیار کرتیں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نازو یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا نظر آ رہا ہے۔ آخر دونوں پارٹیوں نے براہِ راست معاملہ کیوں نہیں کیا اور بلاوجہ ہمیں کیوں شریکِ راز کر لیا۔"

"یہ تو میں نے سوچا نہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"ہاں آنکھوں پر نوٹوں کی پٹی جو بندھ گئی ہوگی۔" میں نے طنز کیا۔

وہ کھسیا کر بولی۔ "تم بھی خدمتِ خلق کے لیے نہیں آئے ہو مگر یہ تم نے ٹھیک کہا کہ انہوں نے ہمیں کیوں شامل کیا؟"

"اغوا کرنے والے کون ہیں؟"

"میں نہیں جانتی۔" نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھ سے فون پر رابطہ کر کے اس کام کے لیے کہا گیا معاوضہ مجھے نامعلوم ذریعے سے ملا۔"

"وہ تم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ میں یہاں آ کر رقم والا بیگ لے کر ان تک پہنچا دوں اور وہ نورو بھائی کی پوتی کو چھوڑ دیں گے۔"

"تم بیگ کہاں پہنچاؤ گی؟"

"میں بیگ لے کر گھوموں گی اور مجھ سے کوئی لے لے گا۔"

"میرے بارے میں کس نے بتایا؟"

"ظاہر ہے ان ہی لوگوں نے، مجھ سے کہا گیا کہ جینز کے سوٹ میں ملبوس شیر کے نقاب والے شخص سے چرمی بیگ

وصول کرلوں پھر وہ مجھ سے وصول کرلیا جائے گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ سب توقع کے خلاف ہو رہا تھا اول تو اغوا جیسا سنگین معاملہ نکل آیا تھا اور پھر نورو بھائی کی ہدایت کے برعکس بیگ میں نازو کے حوالے کر دیتا تو اسے کیا جواب دیتا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "نازو اس منصوبے کے پیچھے کوئی نہایت شاطر آدمی ہے اور اب مجھے لگ رہا ہے نورو بھائی نے مجھے بے وقوف بنایا ہے اس نے کہا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے جو بیگ لے جائے گا وہ اس کے بدلے چیز دے گا۔"

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں ایسی کوئی کہانی نہیں ہے بیگ دینے کے بعد تمہارا کام ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بات اغوا کرنے والوں نے نورو بھائی کو بھی بتادی ہوگی۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر نورو بھائی مجھے بے وقوف نہیں بنا رہا تھا تو نازو بنا رہی تھی لیکن نازو کے انداز سے جھلک رہا تھا کہ وہ بھی اس معاملے سے اتنی ہی بے خبر ہے جتنا کہ میں فرق صرف معلومات کا تھا۔ اسے میری نسبت زیادہ معلوم تھا اور میں نورو بھائی پر بھروسا کر کے دھوکا کھا گیا تھا۔ مگر ایک امکان یہ تھا کہ وہ اداکاری کر رہی تھی اور یہ بات مجھ سے زیادہ کون بہتر جانتا تھا کہ وہ کتنی اعلیٰ پائے کی اداکارہ تھی اگر وہ ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی تو تمام اداکاراؤں کے چراغ گل کر سکتی تھی۔ حسن اور دلکشی میں بھی وہ ان سے کم نہیں تھی۔ اس لیے میں نے غور کرنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ "نازو میرا خیال ہے مجھے اور تمہیں وہ نہیں کرنا ہے جو ہمیں کہا گیا ہے۔"

وہ گھبرا گئی۔ "پھر کیا کرنا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں تم اسی جگہ رکو یا سرکل کرتی رہو لیکن یہاں سے زیادہ دور مت جانا۔"

اس نے بے تابی سے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بس دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔"

"جلیل مجھے مروا مت دینا۔" وہ فکرمندی سے بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ وہ لوگ کون ہیں اور کتنے خطرناک ہیں۔ میں اندھیرے کے تیر کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

"یہ تو اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا بہرحال ہمت کرو تم کوئی عام عورت نہیں ہو نازو ہو۔"

نازو اتنی آسانی سے میری جان چھوڑنے والی نہیں تھی لیکن میں بات کرتے ہی روانہ ہو گیا۔ ایک سیدھے سادے تبادلے کا کیس اچانک ہی اغوا برائے تاوان کے جرم میں بدل گیا تھا۔ نورو بھائی نے مجھے دھوکا دیا اور اب مجھے اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ اگرچہ بظاہر مجھے بیگ نازو کے حوالے کر جانا چاہیے تھا مگر میری چھٹی حس خبردار کر رہی تھی [illegible] میں میں کسی مشکل میں پڑ جاؤں گا اس لیے مجھے [illegible] اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ میں بیگ لے کر گم ہو جانے والے گائے کی طرح گھوم رہا تھا کہ ایک کونے میں واش [illegible] الفاظ جگمگاتے نظر آئے اور میں اس طرف بڑھ گیا۔ سامنے لیڈیز اور جینٹس کے لیے مخصوص باتھ روم [illegible] میں اندر داخل ہوا تو وہاں دو عدد حضرات پہلے سے تھے۔

میں نے بھی ایک ٹوائلٹ کا رخ کیا [illegible] ہوتے ہی تیزی سے اپنی شرٹ نما جیکٹ اتاری۔ نقاب [illegible] پی کیپ پہلے ہی اتار چکا تھا۔ اس دوران میں پہلے [illegible] تھا اور دوسرا اب منہ دھو رہا تھا۔ میں دبے قدموں [illegible] آیا اور اچانک اس کا سر پکڑ کر واش بیسن پر مارا۔ [illegible] وہ پہلے ہی ادھ موا ہو گیا تھا اور یقیناً نشے کی وجہ سے پہلے سے چکرا رہا تھا رہی سہی کسر اس ضرب نے پوری کر دی۔ وہ گرا تو میں نے لپک کر باتھ روم کا دروازہ اندر سے [illegible] اور اس کا لباس اتار لیا۔ اس نے پینٹ کوٹ کے ساتھ [illegible] کا ماسک لگا رکھا تھا۔ میں نے صرف اس کی قمیص [illegible] اتارا۔ ایسا ماسک میں کئی افراد کو پہنے دیکھ چکا تھا۔ [illegible] امکان نہیں تھا کہ وہ ہوش میں آتے ہی مجھے تلاش کرے [illegible]

میں نے جینز پر اس کی شرٹ پہن لی اور [illegible] نقاب لگا لیا۔ بیگ کو میں نے اپنی شرٹ میں لپیٹ [illegible] بیگ نمایاں نہیں تھا اور میرا حلیہ بالکل بدل گیا تھا۔ [illegible] آدمی کو میں نے کوٹ پہنا کر لٹا دیا، ورشیر کا ماسک [illegible] بھی شرٹ میں لپیٹ لی مجھے بعد میں اس کی ضرورت [illegible] مجھے امید تھی کہ وہ آدھا پون گھنٹے سے پہلے ہوش میں [illegible] گا۔ باہر آ کر میں اسی جگہ آیا جہاں نازو کو چھوڑا تھا مگر [illegible] نہیں تھی۔ حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ [illegible] اسے یہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ چلی گئی تھی۔ مجھے [illegible] نافرمانی پر غصہ آیا مگر میں انتظار کے سوا [illegible] ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ابھی نیو ایئر نائٹ [illegible] میں ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ لیکن یہاں موجود خواتین [illegible] حالت سے مشکل لگ رہا تھا کہ وہ بارہ بجے تک ہوش [illegible] ہوں گے۔

جب نازو نظر نہیں آئی تو میں اس کی تلاش [illegible] میں گھومنے لگا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس طرح کا [illegible] ساری لڑکیوں نے پہن رکھا تھا اور بلی کا ماسک [illegible]

[illegible] کم نہیں تھیں۔ جن پر مجھے شبہ ہوتا کہ وہ نازو ہے میں ان کے پاس جا کر بے تکلفی سے پوچھ لیتا۔ یہاں کوئی کسی بات کا برا نہیں منا رہا تھا اس کا فائدہ اٹھا کر کئی حضرات خواتین سے زیادہ ہی بے تکلف ہو رہے تھے کیونکہ بعد میں نشے یا غلط فہمی کا بہانہ موجود تھا۔ میں نے جن تین لڑکیوں کو نازو سمجھا ان میں سے ایک بھی نازو ثابت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ وہ مجھے کھینچنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ میں دل ہی دل میں اسے بے نقط سنانے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد میں تھک ہار کر واپس جانے پر غور کر رہا تھا۔ بس مجھے نورو بھائی کے سامنے جا کر ناکامی کا اعتراف کرنا پڑتا۔ مگر میں نے اتنی آسانی سے ہار ماننے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب مجھے بھی تجسس ہو گیا تھا کہ یہ چکر کیا ہے میں معاملے کی تہ تک جانا چاہتا تھا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ نازو دھوکا دے گئی مگر پھر میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ وہ وہی چکر چلا رہی تھی جو میں نے چلایا اس نے حلیہ بدل لیا تھا، ورنہ وہ کیونکہ مجھ سے زیادہ جانتی تھی اس لیے عین ممکن تھا کہ اس نے پہلے سے بندوبست کر رکھا ہو جبکہ مجھے بندوبست کرنا پڑا تھا۔ اب جیسے میں اسے تلاش کر رہا تھا اسی طرح وہ میری تلاش میں ہوگی لیکن اس طرح کہ مجھے خبر نہ ہو۔ اب سوال یہ تھا کہ نازو ایسا کیوں کر رہی تھی؟ تو اس کا بہت سادہ سا جواب تھا کہ وہ تاوان کی رقم کے چکر میں یہ سب کر رہی تھی۔ اگر وہ صرف کام سے مطلب رکھتی تو اسے اس طرح غائب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کی نیت میں فتور تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی دولت کی خاطر نازو کسی کو بھی دھوکا دے سکتی تھی۔ اس کا پورا امکان تھا کہ اس نے مجھے جو بتایا ہو وہ مکمل جھوٹ ہو۔

جس طرح میں نازو کو تلاش نہیں کر پا رہا تھا اسی طرح وہ بھی مجھے تلاش نہیں کر سکی تھی۔ اسے سامنے لانے کا ایک ہی طریقہ تھا میں دوبارہ جینز والے حلیے میں آجاتا۔ احاطے کی چار دیواری کے ساتھ سرو جیسے درخت لگے تھے میں نے ایک درخت پر بیگ ذرا بلندی پر اس طرح چھپایا کہ کوئی آسانی سے نہ دیکھ سکے اور جب مجھے ضرورت ہو تو میں آرام سے حاصل کر لوں یہاں کوئی نہیں تھا جو مجھے بیگ چھپاتے دیکھتا۔ پھر بھی میں احتیاطاً دس منٹ تک ایک اور درخت سے پیچھے چھپا نگرانی کرتا رہا تھا۔ مگر جب کوئی اس طرف نہ آیا تو میں نے مطمئن ہو کر دوبارہ جینز والی جیکٹ، [illegible] اور [illegible] ماسک پہنا۔ حسب توقع نازو لپک کر [illegible] آئی اور میرے اندازے کے عین مطابق اس [illegible] تھا اور اب وہ میکسی نما لباس میں تھی اور اوپر

اس نے چڑیل کا ماسک لگا رکھا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔

"میں کوئی اور ہوں۔"

"میں بھی کوئی اور ہوں۔" نازو نے سرگوشی کی تو میں دم بخود رہ گیا۔ میں سمجھا کہ پھر کسی خاتون کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ "بیگ کہاں ہے؟"

"پہلے بتاؤ تم نے حلیہ کیوں بدلا؟" میں نے پوچھا۔

"زندگی میں پہلی بار اصل صورت نظر آ رہی ہے۔"

"گدھا شیر کا نقاب لگا لینے سے سچ مچ شیر نہیں بن جاتا ہے۔ گدھا ہی رہتا ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"پہلے میں نے سوال کیا تھا؟"

"اوکے میں نے حلیہ اس لیے بدلا ہے کہ ان لوگوں کی نظروں سے بچ کر تمہیں تلاش کر سکوں جنہوں نے مجھے ہائر کیا ہے۔"

میں نے اس کے جواب پر غور کیا۔ "تمہیں شک ہے کہ وہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے؟"

"ہاں۔" نازو نے یقین سے کہا۔

"تب تم گدھی کا ماسک پہن لو۔" میں نے دانت

چٹکلے

ایک کالی سیاہ رنگ کی عورت نے گہرے پیلے رنگ کا سوٹ سلوایا۔ اسے پہن کر اپنے خاوند کے پاس گئی اور بولی۔

بیوی: "میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

خاوند: "بالکل ایسے جیسے سرسوں کے کھیت میں بھینس کھڑی ہو۔"

☆☆☆

ایک سردار جی شادی میں کافی دیر سے کھانا کھا رہے تھے۔ بالآخر ایک آدمی سے رہا نہ گیا، اس نے سردار سے پوچھا۔

آدمی: "سردار جی! اب بس بھی کریں اور کتنا کھائیں گے؟"

سردار جی: "او جی کیا بتائیں، شادی کارڈ میں لکھا تھا کہ 12 بجے سے 3 بجے تک کھانا کھلایا جائے گا۔"

☆☆☆

پیسے۔ ”تمہیں اتنا خیال نہیں ہے کہ تم پہلے بھی مجھ سے مل چکی ہو اور وہ دیکھ چکے ہیں۔ یعنی میں ان کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ اب کوئی دوسری عورت میرے پاس آئے گی تو کیا وہ مشکوک نہیں ہوں گے؟“

”ہاں ہوں گے تو لیکن مجھے نازو تو نہیں سمجھیں گے۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ”مجھے بیگ دو۔“

”تاکہ تم لے کر فرار ہو جاؤ اور میں مارا جاؤں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”نورو بھائی تو مجھے ذمّے دار قرار دے گا۔“

”جلیل میں کہیں نہیں جا رہی۔ بیگ مجھے دے دو ورنہ تم بچ جاؤ گے لیکن میں ضرور ماری جاؤں گی۔“ نازو نے کہا وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ”تم نہیں جانتے وہ خطرناک لوگ ہیں۔“

”مجھے لگ رہا ہے تم ان سے واقف ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم اس کھیل میں ایک کوریئر سے زیادہ پارٹ رکھتی ہو۔“ میں نے کھل کر اپنے شبہے کا اظہار کر دیا۔

”چلو ایسا ہی سہی۔“ نازو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم کیا کرو گے کیا رقم واپس لے جاؤ گے؟“

”نہیں مگر نورو بھائی نے جن حالات میں رقم دینے کی بات کی تھی وہ حالات نہیں ہیں۔ ان حالات میں ناکامی کی ذمّے داری مجھ پر آتی ہے۔ میں کوئی اندھا قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”تم پر ذمّے داری نہیں آئے گی۔“ نازو نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ”کیا تم نے بیگ میں رقم دیکھی تھی یا نورو بھائی نے تمہیں پورے حالات بتائے تھے؟“

”نہیں۔“

”تب تم ذمّے دار نہیں بنتے۔ ہاں تم بیگ واپس لے گئے تو اس سے نورو بھائی کا کوئی بڑا نقصان ہو سکتا ہے تو وہ تمہیں نہیں بخشے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا مالی نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے جانی نقصان کی نہیں ہو سکتی ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا اور درحقیقت میں درست طور پر سوچ نہیں پا رہا تھا کچھ دیر پہلے میں نے نازو کو فراڈ قرار دے دیا تھا لیکن اب اس کی بات میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ اگر رقم کا نقصان ہوتا تو نورو بھائی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کی پوتی کو کچھ ہو جاتا تو وہ پاگل ہو سکتا تھا اور دولت مند آدمی پاگل ہو جائے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں حلیہ بدلنے جا رہی ہوں [illegible] بیگ لے آؤ۔“

نازو کہتے ہی ایک طرف چل پڑی۔ [illegible] اگرچہ شانوں سے پنڈلیوں تک کی لیکن یہ ریشم جیسے اور سرسراتے کپڑے سے بنی تھی اس لیے اس [illegible] بن جاتی تھی۔ تمام پیچ و خم اور دائرے نمایاں تھے۔ اس کی کیٹ واک اسے زیادہ نظر نواز بنا رہی تھی۔ لاحول پڑھی اور اس سے نظریں ہٹا کر آس پاس [illegible] ایک رابن ہڈ میرے پاس سے کہتے ہوئے گزرا [illegible] میرے پیچھے آ، بات مت کرنا۔“

سال کا آخری دن میرے لیے حیران [illegible] دنگ رہ جانے والا ثابت ہو رہا تھا۔ یہ راجا کی آواز [illegible] نہ جانے اندر کیسے آیا اور اس وقت رابن ہڈ کا کاسٹیوم [illegible] گھوم رہا تھا۔ حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر میں اس [illegible] چل پڑا لیکن یوں جیسے کہیں اور جا رہا ہوں۔ راجا جان [illegible] حسیناؤں کے جھرمٹ سے گزر رہا تھا اور اسے [illegible] گزرنا پڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے حسیناؤں کو بھی اعتراض [illegible] ورنہ وہ راستے میں اس طرح کھڑی کیوں ہوتیں۔ [illegible] ایک ایسے گوشے میں پہنچا جہاں آس پاس سوائے [illegible] کے اور کچھ نہیں تھا لیکن یہ میری غلط فہمی تھی کہ وہاں [illegible] ہے۔ جیسے ہی میں نے راجا سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا [illegible] فوراً ہی جھاڑیوں کے پیچھے کھلبلی مچی اور ایک [illegible] خلوت میں مداخلت پر قہر آلود نظروں اور زبان سے [illegible] سناتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔ راجا نے دانت نکا[illegible] ہو رہا ہے یہاں، آج مجھے بھی بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔“

”بیٹے عارف کے بیڈ روم میں آئینہ ہو گا اس [illegible] اس سے زیادہ ہی دیکھنے کو مل جائے گا۔“ میں نے [illegible] تو اندر کیسے آیا؟“

”میں نے گھسنے کی کوشش کی لیکن اس [illegible] نے مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ پھر میں نے [illegible] لڑکا آ رہا تھا میں نے اسے جھاڑیوں میں کھینچ [illegible] مزاج سا تھا میں نے ایک ہاتھ مارا تو رونے لگا [illegible] پر بے ہوش ہو گیا۔“

”مجھے یقین نہیں آیا ہے۔“ میں نے صاف [illegible] کہا۔

”اچھا میں نے اس کے سر پر ایک لکڑی بھی [illegible] تھی۔“ راجا نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں بروقت اندر [illegible] میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔“

”کیا جان گیا ہے؟“

”میں اس وقت بتاؤں گا جب میرا حصہ نصف ہو [illegible]“ راجا نے عیاری سے کہا۔

”[illegible] جتنا مل گیا ہے اس پر قناعت کر۔“

”ٹھیک ہے تو میں باہر جا کر قناعت کرتا ہوں۔“ راجا [illegible] نے کے لیے مڑا میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”اتنی جلدی کیا ہے چل تین اور لے لینا پانچ پورے ہو جائیں گے۔“

”ایسا کر پانچ کے دس کر لے۔“ راجا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو مجبوراً اس سال میں پہلی اور آخری بار میں نے [illegible] کی بات مان لی۔ مجھ سے آٹھ ہزار مزید وصول کر کے راجا نے کچھ فکر انگیز انکشافات کیے اور آخر میں مجھے مشورہ دیا۔ ”جلیل بیگ لے کر بھاگ چل مجھے یقین ہے اس میں موٹی رقم ہو گی۔“

”بکواس نہ کر۔ وہ میرے پاس نورو بھائی کی امانت ہے۔“

راجا نے مایوسی سے کہا۔ ”تو ہمیشہ احمق رہے گا۔“

”راجا میں چکر چلاتا ہوں پر چکر میں چکر نہیں چلاتا۔ یہ تو اچھی طرح جانتا ہے۔“

”تب کیا کرنا ہے؟“

”تو بدستور نازو کے پیچھے رہے گا۔ وہ حلیہ بدلنے گئی ہے۔“

”آج تو آفت لگ رہی تھی۔“ راجا نے نازو کے لیے [illegible] تعریف کے الفاظ کہے۔

”یہاں سا [illegible] میں سب بدون گزرے ہیں۔“ میں نے آس پاس اشارہ کیا۔

”کاش کہ مجھے پہلے اس جگہ کا پتا ہوتا۔“ راجا نے سرد آہ بھری۔ ”میں نازو پر نظر رکھوں گا لیکن تجھ سے کیسے رابطہ [illegible] گا؟“ [illegible] اندر آتے ہوئے موبائل لے لیا تھا اسی ریچھ [illegible]“

”تو اس کی فکر مت کر میں تجھ پر نظر رکھوں گا۔“

[illegible] مجھے نازو دکھائی دی جو مجھے تلاش کر رہی تھی۔ [illegible] اسکرٹ میں آ گئی تھی۔ راجا نے اس پر ایک جامع [illegible] ناقابلِ اشاعت تبصرہ کیا اور میرے پاس سے رخصت [illegible] نازو مجھے دیکھتے ہی لپک کر میرے پاس آئی۔ اس نے [illegible] ”جلیل جلدی کر بارہ بجنے والے ہیں۔“

[illegible] بار نازو نے دانت پیس کر ناقابلِ اشاعت الفاظ میں بتایا کہ کس کے بارہ کیسے بجنے والے ہیں۔ میں ہنسا۔ ”اب لگ رہا ہے تم اصل فارم میں آ گئی ہو۔“

”جلیل یہ مسخری کا وقت نہیں ہے۔ بیگ مجھے دے۔“

”بیگ میرے پاس نہیں ہے۔“ میں نے پُراطمینان لہجے سے کہا۔

”پھر کہاں ہے؟“

میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی دیوار والی طرف میں کوئی سات فٹ اوپر شاخوں میں اٹکا ہوا ہے۔“

وہ چراغ پا ہو گئی۔ ”تم نے بیگ وہاں رکھ دیا اگر کوئی اٹھا کر لے گیا تو؟“

”تو تمہاری قسمت، ویسے ابھی تو تمہیں جلدی ہو رہی تھی۔“ میں نے اسے یاد دلایا تو وہ تیزی سے درخت کی طرف لپکی۔ اس کے جاتے ہی میں جھاڑیوں کی طرف آیا۔ جیکٹ اتار کر میں نے قمیص پہنی اور پھر چہرے سے شیر کا ماسک اتار کر گوریلے کا ماسک لگایا اور درختوں کی طرف لپکا۔ مجھے یقین تھا کہ راجا نازو پر نظر رکھے ہوئے ہو گا لیکن وہ نہایت شاطر عورت تھی راجا کو جل دے جاتی تو میں مارا جاتا اس لیے میں بھی اس پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔ اتنی دیر میں اسے درخت کے پیچھے سے نکل آنا چاہیے تھا۔ مگر نازو کہیں نظر نہیں آئی۔ اب مجھے راجا کی فکر ہو گئی تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ خود میرے پاس آ گیا۔

”جلیل وہ درخت کے پیچھے سے نہیں نکلی ہے۔“

میں اچھل پڑا۔ ”کیا مطلب؟“

”وہ بس درخت کے پیچھے گئی اور اب تک وہیں ہے۔“

”راجا وہ نکل گئی۔“ میں نے چلّا کر کہا اور ہم درخت کی طرف لپکے مگر نازو وہاں نہیں تھی۔ یہاں دیوار درخت سے زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نازو نے کیا کیا ہو گا، وہ بیگ سمیت درخت پر چڑھ کر دیوار سے باہر کود گئی تھی۔ اگرچہ احاطے کی دیوار دس فٹ بلند تھی لیکن نازو لٹک کر اترتی تو صرف تین فٹ کی بلندی سے نیچے گرتی۔ راجا نے جھنجھلا کر کہا۔ ”بھاگ گئی حرافہ...“

”رقم کے بیگ سمیت۔“ میں نے مرے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے اس نے ان لوگوں کو بھی دھوکا دیا ہے جن کے لیے وہ کام کر رہی تھی۔“

”کام کر رہی تھی۔“ راجا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”جلیل، عقل سے پیدل وہ اسی کا منصوبہ ہو گا۔ اب نورو بھائی

کو جواب دیتے رہتا۔"

"بکواس مت کر میں جلیل الزماں ہوں۔" میں نے غرا کر کہا۔ "یہ بتا وہ کس کس سے ملی تھی؟"

"تجھے بتایا تو ہے، ایک تو لڑکی تھی۔ نازو جتنی عمر اور جسامت کی ہوگی ظاہر ہے میں شکل نہیں دیکھ سکا۔ لیکن اس نے سینڈریلا کا حلیہ بنایا ہوا تھا اور چہرے پر سینڈریلا والا نقاب لگایا ہوا تھا۔ دوسرا گینڈا تھا اور اس نے ماسک بھی گینڈے کا لگا رکھا تھا۔"

"ان کو تلاش کرتے ہیں۔" میں نے راجا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "وہ نازو کے بارے میں جانتے ہوں گے؟"

"تیرا کیا خیال ہے وہ اپنا اتا پتا بتا کر گئی ہوگی۔" راجا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ "مجھے معاف رکھو میں واپس جا رہا ہوں۔"

"بیٹے دس ہزار روپے کس چیز کے لیے ہیں۔" میں نے ہاتھ مار کر اس کی جیب سے بائیک کی چابی نکال لی۔

"رکھ لو چابی میں پیدل چلا جاؤں گا۔" راجا نے ضدی لہجے میں کہا۔

"بیٹے تو بھول رہا ہے کہ تو اندر کیسے آیا ہے۔ اصلی رابن ہڈ باہر تجھے بے تابی سے تلاش کر رہا ہوگا تو نے رابن ہڈ کو لوٹ لیا۔"

راجا کو فوراً عقل آگئی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جلیل تو تو مذاق بھی نہیں سمجھتا۔"

"میں تیرا مذاق ہی نہیں اور بھی بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ تیری عافیت اسی میں ہے کہ میرے ساتھ یہاں سے نکل ورنہ تو سیدھا تھانے جائے گا۔"

اب مجھے سینڈریلا اور گینڈے کی تلاش تھی۔ راجا میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے تجویز دی کہ ہم دونوں الگ الگ تلاش کرتے ہیں۔ ایک کے بجائے دو بھلے ہوتے ہیں لیکن میں نے تجویز مسترد کر دی۔ "راجا میرے ساتھ چکر مت کر... تو دائیں طرف دیکھ میں بائیں طرف دیکھتا ہوں۔"

لیکن کچھ دیر بعد میں نے راجا کو دیکھا تو وہ دائیں طرف کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔ پونے بارہ بج رہے تھے اور نیو ایئر شروع ہونے والا تھا اسی مناسبت سے وہاں موجود افراد کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ بارہ بجے سے ایک منٹ پہلے یہاں کی روشنیاں بجھا دی جاتیں اور پھر کاؤنٹ ڈاؤن کے ساتھ ہی ٹھیک بارہ بجے روشنیاں آن کر دی جاتیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ گیارہ بج کر ستاون منٹ پر مجھے دور عمارت کے ساتھ سینڈریلا کے حلیے کی جھلک دکھائی دی ... نے راجا سے کہا۔ "وہ دیکھ سینڈریلا..."

راجا نے اپنی گدھ نما آنکھوں سے تصدیق کی ... ہے جلدی کر... یہاں لائٹیں بند ہونے والی ہیں۔"

ہم بھیڑ میں راستہ بناتے اس کی طرف لپکے ... سال کے استقبال کے لیے اوپر موجود افراد بھی ... تھے اور لان والا حصہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان ... درمیان جگہ بنا کر آگے بڑھنا بہت مشکل ہو رہا تھا ... میں وحشت تھے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکے ... کو جبراً راستے سے ہٹانا پڑتا تھا۔ راجا زیادہ ... رہا تھا، چاہے وہ اس کے راستے میں بھی نہ ہوں۔ پھر جس کا خطرہ منحوس راجا نے ظاہر کیا تھا گیارہ بج کر ... پر روشنیاں بند کر دی گئیں۔ یکایک چاروں طرف اندھیرا ہو گیا۔ سماعت شکن میوزک بند ہو گیا تھا لیکن ... جگہ خواتین کی ہسٹریائی چیخوں نے لے لی تھی۔ ... ایکسائٹمنٹ میں چیخی تھیں لیکن اکثر اس لیے چلائی تھیں ... کے آس پاس موجود مردوں نے تاریکی کا فائدہ اٹھا ... کا اندازہ چیخوں کے علاوہ دوسری آوازوں سے ہو رہا ... میں سے اکثر ناقابلِ بیان تھیں۔

ایک نے مجھے خاتون سمجھ کر پکڑا تھا کہ میں نے ... کرا سے مکا مارا اور جواب میں نسوانی چیخ نے میرے ... خطا کر دیے۔ یہاں کیس الٹا ہو گیا تھا۔ خاتون نے ... کیا سمجھ کر مجھے پکڑا تھا۔ اس سے پہلے اس کا واویلا ... کو متوجہ کرتا میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس طرف لپکا جہاں ... نے سینڈریلا جیسی لڑکی کی جھلک دیکھی تھی۔ تاریکی ... راجا غائب ہو گیا تھا اور غالباً فرار بھی ہو گیا تھا مگر اب ... کی فکر نہیں تھی کیونکہ میں تقریباً ناکام ہو چکا تھا۔ ... روشنیاں آن ہو گئیں اور ایک بار پھر چیخوں کا ریلا ... کے ساتھ ہی سمندر کی طرف سے آتش بازیاں ... آسمان کو منور کرنے لگیں۔ اس کا اہتمام بھی کلب ... سے تھا۔ سینڈریلا غائب تھی اور راجا بھی آس پاس ... آ رہا تھا۔

میں کچھ دیر احاطے میں چکراتا رہا مگر کچھ ... ہوا۔ نئے سال کا آغاز ہی ناکامی سے ہوا تھا۔ پہلے ... نے بے وقوف بنایا۔ پھر نازو صفائی سے چونا لگا ... میں حسبِ معمول راجا بھی بھاگ نکلا۔ میں ... یہاں چکراتا پھر رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے تک میں ... اور ایک ایک جگہ دیکھ لی لیکن نہ تو سینڈریلا دکھائی ...

گینڈے کا نقاب والا شخص۔ بالآخر میں نے بھی واپسی کا فیصلہ ... درختوں کے پیچھے جا کر میں دوبارہ اپنے حلیے میں آیا اور کلب سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور سیٹ سے ٹیک لگائے ... خراٹے کے انداز میں خراٹے لے رہا تھا جو گاڑی سے باہر تک صاف سنائی دے رہے تھے۔ میں نے شیشہ بجایا تو اس نے آنکھ کھول کر دیکھا اور پھر گاڑی سے اتر آیا۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "کام ہو گیا؟"

"ہاں۔" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "واپس چلو۔"

اس سے پہلے وہ مجھ سے مزید کچھ پوچھتا میں پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ بھی اندر آیا۔ "سیٹھ جی کی چیز کہاں ہے؟"

"وہ میں سیٹھ جی کو دوں گا۔" میں نے غرا کر کہا۔ "دیر مت کرو ورنہ نقصان ہوا تو ذمے داری تمہاری ہوگی۔"

اس نے برا مان کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ "میرا کیا تعلق ہے میں ایک معمولی ڈرائیور ہوں۔"

"تو ڈرائیور رہو، اپنی اوقات سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے اسے مشورہ دیا اور اسی لمحے مجھے بائیک کا خیال آیا۔ چابی میرے پاس تھی تو راجا... لیکن جیب میں ہاتھ ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ چابی نہیں ہے میرے ساتھ پھرتے ہوئے راجا نے اتنی صفائی سے نکالی تھی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ظاہر ہے اب دل ہی دل میں برا بھلا کہنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اگر بائیک یہاں رہ جاتی تب بھی میں نہیں لے جا سکتا تھا ورنہ راز کھل جاتا کہ میں اپنے پیچھے کس کو لگا کر لایا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم نورو بھائی کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے سفید پوش تخت پر خود بگلا بھگت بنا ہوا پان چبا رہا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑا۔

"جلیل تو اسے لایا؟"

"کسے؟"

"جویریہ... میری پوتی۔"

"نورو بھائی تم نے چیز کا کہا تھا کسی پوتی کا ذکر نہیں کیا تھا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں بیگ کے بدلے چیز ... دیا ہوں۔"

"چیز۔" وہ چیخا۔ "وہ رقم جویریہ کا تاوان تھی۔ کسی ... سے اغوا کر لیا تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سیٹھ تم نے مجھے پہلے نہیں ... بتایا۔ ... میری ذمے داری نہیں ہے۔ میں رقم کے بدلے ... دیکھوا ..."

"کیا چیز ... ہے؟"

میں نے جیکٹ کی مختلف جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر نورو بھائی کے سامنے ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ یہ ساری پانچ ہزار کے نوٹوں والی گڈیاں تھیں اور ان کی تعداد درجن بھر تھی یعنی یہ ساٹھ لاکھ روپے تھے۔ جب میں بیگ چھپانے گیا تو مجھے خیال آیا اور میں نے بیگ کا لاک ایک پن کی مدد سے کھول کر رقم نکال کر ایک دوسرے درخت پر چھپا دی تھی اور بیگ میں پتھر بھر کر اسے تقریباً اتنا ہی وزنی کر کے لاک کیا اور درخت کی شاخوں میں چھپا دیا۔ مجھے نازو پر اعتبار نہیں تھا اور اس نے میرے شک کی لاج رکھ لی۔ وہ پتھروں والا بیگ لے کر فرار ہو گئی اور اب یقیناً مجھے گالیاں دے رہی ہوگی۔ نورو بھائی نے مجھے رقم کے بارے میں بتایا تھا اس لیے میری ذمے داری رقم تک محدود تھی۔ میں نے آخری گڈی بھی نکال کر تخت پر پٹخی اور بولا۔ "افسوس کہ تمہارا بیگ گیا لیکن میں بازار سے ویسا ہی دوسرا لا دوں گا۔"

"جابر۔" نورو بھائی نے چلا کر کہا اور وہ فوراً اندر آیا۔ میں نورو بھائی کے تیور بھانپ گیا تھا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا، میں نے جلدی سے کہا۔

"نورو بھائی کوئی غلط فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لو، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

وہ اچھل کر بولا۔ "تو بکواس کرتا ہے جابر اس کی ہڈیاں توڑ دے۔"

جابر نے بھینسے کی طرح سر جھکایا جیسے مجھے ٹکر مار کر دیوار سے چپٹا کر دے گا۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹا تو وہ سچ مچ سر جھکا کر دوڑا۔ جیسے ہی میرا پاس آیا، میں صفائی سے اس کے پھیلے ہاتھوں کے نیچے سے نکلا اور گھوم کر اسے لات رسید کی۔ وہ پہلے ہی فل اسپیڈ میں تھا، لات نے ٹربو کا کام کیا اور وہ سامنے والی دیوار سے ٹکرایا۔ بم جیسا دھماکا ہوا اور جابر وہیں فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے صبح سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ نورو بھائی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "نورو بھائی کوئی اور ہے تو اسے بھی بلا لو۔"

وہ پھر پتنگے کی طرح اچھلا۔ "جلیل میری پوتی کو کچھ ہوا تو میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔"

"سیٹھ تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔ تم نے مجھے استعمال کیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ تمہارا مقصد کیا تھا تم نے مجھے پوری بات نہیں بتائی۔ تمہیں امید تھی کہ جب مجھے پتا چلے گا کہ یہ اغوا کا کیس ہے تو میں اپنی گردن بچانے کے لیے تمہاری پوتی کو

بچاؤں گا۔ لیکن افسوس کہ تمہارا منصوبہ ناکام رہا۔ میں ایسا ہی کرتا لیکن مجرم مجھے بھی دھوکا دے گئے۔ انہوں نے بیگ حاصل کرنا چاہا لیکن میں نے اس میں سے رقم نکال کر انہیں خالی بیگ لے جانے کا موقع دیا۔ رقم تمہارے سامنے ہے اگر میں رقم نہ لاتا تو تم قیامت تک مجھ پر یقین نہ کرتے۔"

"رقم اور تو گیا بھاڑ میں۔" نورو بھائی حلق کے بل چلّایا۔ "میرے کو میری پوتی چاہیے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "نورو بھائی میرا اندازہ درست ہے تو تمہاری پوتی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، وہ کسی وقت بھی گھر پہنچ جائے گی۔"

وہ چونکا۔ "وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ صرف میں ہی نیو ایئر فول نہیں بنا ہوں بلکہ مجھ سے پہلے تم بنے ہو۔ امکان ہے تمہاری پوتی سرے سے اغوا ہی نہیں ہوئی ہو۔ اس نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا تاکہ تاوان کی رقم وصول کی جاسکے۔"

نورو بھائی کی آنکھیں ایک بار پھر پھٹی رہ گئیں۔ "وہ کیوں... میری ساری دولت کی وارث وہی ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "لیکن تم اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہوگے جو اکثر دولت مند اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسے اپنی خواہشیں پوری کرنے کے لیے بہت ساری دولت چاہیے ہوگی اور تم اسے اتنی رقم دیتے نہیں ہوگے کہ کہیں وہ بگڑ نہ جائے۔ تم بھول گئے کہ جنہوں نے بگڑنا ہوتا ہے وہ اس کے راستے نکال لیتے ہیں۔ تم شاید لاعلم ہو کہ جویریہ کے مشاغل کیا ہیں اور وہ کن لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے۔ اس کے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

نورو بھائی نے سر ہلایا اور تھکے انداز میں تخت پر ڈھیر ہوگیا۔ "میں نے بہت کوشش کی پر جویریہ کو وقت نہیں دے سکا۔ اس کا ماں باپ اسے اتنا سا چھوڑ کر خود اللہ کے پاس چلا گیا۔"

"نورو بھائی مجھے افسوس ہے میرا خیال ہے جویریہ اس کلاس کی تمام برائیاں اپنا چکی ہے۔ تم جانتے ہو ان برائیوں کے لیے بہت ساری رقم چاہیے ہوتی ہے۔"

"پر تیرا اندازہ ٹھیک نہیں نکلا اور اسے سچ مچ کڈنیپ کیا ہو تو اب مجرموں کو تاوان نہیں ملے گا وہ اسے کہاں چھوڑے گا؟"

"نورو بھائی صبح تک صبر کرو سب سامنے آجائے گا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تیرا کہنا ہے اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔"

"ہاں لیکن میں انہیں جانتا نہیں ہوں۔ تم جب ... وہاں پارٹی میں سب نے ماسک لگا رکھے تھے۔ ا... نے بھی ماسک لگا رکھے تھے۔ ایک لڑکی تھی اس نے ... کا لباس اور ماسک پہن رکھا تھا مجھے شبہ ہے وہی جویریہ ... اس کے ساتھ ایک گینڈے جیسی جسامت کا آدمی تھا، ... ماسک بھی گینڈے والا لگا رکھا تھا۔ ہاتھ سے وہ سیاہ ... رہا تھا۔"

نورو بھائی نے بے ساختہ جابر کی طرف دیکھا ... نے سر ہلایا۔ "گاڑی کی تلاشی لو میرا خیال ہے بہت کچھ ... گا۔"

"تو نہیں رکے گا۔" نورو بھائی نے کہا اور خود ... گیا۔ وہ پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ... شاپر تھا جس میں گینڈے اور سینڈریلا کا ماسک تھا ... میں سینڈریلا کا میکسی نما لباس تھا۔

"یہ گاڑی کی ڈکی سے نکلا ہے۔" نورو بھائی ... آلود نظروں سے جابر کو دیکھا۔

"اس کا قصور نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جویریہ ... اسے مجبور کیا ہوگا لالچ دیا ہوگا۔ اصل مسئلہ اس کا ہے ... کو سنبھالو۔ جس طرح اپنا بزنس سنبھال کر رکھا ہے۔ اب ... اجازت ہے؟"

نورو بھائی نے سر ہلایا پھر تخت پر پڑی گڈیوں ... سے ایک اٹھا کر اس میں سے کچھ نوٹ الگ کیے ... طرف بڑھائے۔ "یہ لے لے؟"

"میں اپنا معاوضہ لے چکا ہوں۔" میں نے کہا ... ہنسا۔ "اوہ اچھا منہ بند رکھنے کے لیے دے رہے ہو ... ضرورت نہیں ہے نورو بھائی۔ جلیل دو نمبر کام میں ... نہیں کرتا ہے تمہارا راز محفوظ رہے گا۔"

میں باہر آیا اور باغ ... دیگر راجا کو یہ دیکھ ... بہت لمبی مارچ کرنی تھی یہاں سے ٹیکسی ملنے کا بھی ... تھا لیکن میں گلی کے کونے پر پہنچا تو تاریکی سے راجا کی ... ہنسی سنائی دی۔ پھر وہ بائیک اسٹارٹ کرکے میرے ... دیا۔ "میں انتظار کر رہا تھا۔ دو ٹکٹ لیے ہیں ... کے... چل رہا ہے نا؟"

"نیو ایئر تو اسٹارٹ ہوگیا۔" میں اس کے پیچھے ...

"پارٹی تو ابھی باقی ہے۔" راجا چہکا ... دی۔

نجات

بابر نعیم

زندہ رہنے کے موسم ہزاروں مگر جب جان دینے کی رُت آئے تو بڑے بڑے ہمت ہار بیٹھتے ہیں... مگر وہ اپنی ضد ہرا اڑا بیٹھا تھا۔ زہر سے تریاق کی کشید کی جستجو میں جاں سے گزر جانے کی دیوانگی کا قائل تھا۔ موت سے آنکھیں ملاتے ہوئے ہر لمحے کا خوف وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ جان لینے کا آرزو مند تھا

... ہر روپ پر مرم کا ماجرا جو ہار کر بھی جیتنے کی رسم نبھانا چاہتا تھا

"تمہارے بھائی کا کیا حال ہے، مس ...؟" اینڈریو نے ملائم لہجے میں پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے۔" مس ڈیونپورٹ نے اپنی کرسی پر ... ہوتے ہوئے جواب دیا اور ڈکٹیشن لینے کے لیے اپنا پین اور اسٹینوگرافر پیڈ سنبھال لیا۔

گو مس ڈیونپورٹ نے کبھی شارٹ ہینڈ نہیں سیکھی تھی لیکن اس کے لکھنے کی رفتار خاصی تیز تھی اور اس حقیقت کو سراہتی تھی کہ اس صلاحیت کی بدولت اسے سیکریٹری کی

ملازمت مل گئی تھی۔

اینڈریو اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”میرے علم میں نہیں کہ کسی نے حوالے کے لیے تمہارے بھائی کے بارے میں فون کیا ہو۔“

”وہ ابھی کوئی کام نہیں کر رہا ہے۔ جب سے دوسری فیکٹری بند ہوئی ہے اطراف میں میلوں تک کوئی ملازمت دستیاب نہیں ہے۔“ مس ڈیو نے بتایا۔

”تمہیں خوشی ہونی چاہیے کہ ہم اس کے خلاف کوئی الزامات عائد نہیں کر رہے ہیں۔“

”میں انتہائی ممنون ہوں۔“

اینڈریو نے دو بار کھنکارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور پوچھا۔ ”تمہیں ہمارے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“

”لگ بھگ دو سال۔“ مس ڈیو نے جواب دیا۔ اس نے لفظ ”سر“ کی ادائی کو روکنے کے لیے اپنی زبان ہونٹوں تلے دبالی تھی۔ اینڈریو نے اسے سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ وہ اسے ”سر“ کہہ کر کبھی مخاطب نہیں کرے گی۔

”اسلگسیبٹڈ انڈسٹریز کام کرنے کے لحاظ سے ایک عمدہ جگہ ہے اور تم اس دفتر میں ایک قابلِ قبول ملازمت کر رہی ہو۔ اس کے باوجود تمہیں کبھی احساس نہیں ہو سکتا کہ حالات کب بد سے بدتر ہو جائیں گے۔“

”کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے؟“ مس ڈیو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اینڈریو نے ہاتھ لہراتے ہوئے اس کا سوال مسترد کر دیا۔ ”نہیں، غلطی نہیں۔ میں اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اسلگسیبٹڈ انڈسٹری میری زندگی رہی ہے۔ مجھے اس سے وابستگی کا کوئی افسوس نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر بولا۔ ”میں ایک اچھا باس رہا ہوں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں، آپ ہمیشہ نہایت مہربان رہے ہیں۔“ مس ڈیو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے کبھی بھی تمہاری طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی، تمہاری ملازمت برقرار رکھنے کے عوض کبھی تمہیں اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے مجبور نہیں کیا یا ایسا بھی کوئی مطالبہ کیا؟“ اینڈریو نے کہا۔

اس بات پر مس ڈیوینپورٹ اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”ایک خط لکھو۔“

ایک لمحہ توقف کے بعد مس ڈیو دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس نے اسٹینوگرافر پیڈ کھولا اور پین سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”ڈکٹیشن کے لیے تیار ہوں۔“

To whom it may concern”

کہہ کر اینڈریو رکا، پھر بولا۔ ”وقفے کا نشان۔“ ساتھ ہی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

مس ڈیوینپورٹ نے چونکتے ہوئے نگاہ اٹھا کر باس کی جانب دیکھا۔ وہ انتظار کرنے لگی کہ شاید وہ قہقہے کی وضاحت کرے گا۔

لیکن اینڈریو نے اس کی استفہامیہ نظروں پر توجہ نہیں دی اور دوبارہ گویا ہوا۔ ”نیا پیراگراف۔ ہر ایک کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے زندہ رہنے کی وجہ کا دوبارہ سے تعین کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایسا وقت جب کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ درد اور تکلیف میں اتنی طاقت ہے کہ وہ کسی کو عام انسانوں سے جدا کر دے۔ چاہے اسے اپنے طور پر آنے والے کل یا اس کے بعد کے کل تک اس کے بعد بھی برداشت کرنے کی کوشش کروں، ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ساتھ میں مزید غیر انسانی اور وحشی ہو جاؤں گا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کر دوں۔“

آخری جملے پر مس ڈیو کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”پیراگراف کو دوبارہ پڑھو، پلیز۔“ اینڈریو نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

مس ڈیو نے پیراگراف کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا البتہ اس کی زبان بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اس دوران اینڈریو نے اپنی میز کی داہنی دراز کھولی اور اس میں سے ایک ریوالور نکال کر میز کے اوپر اپنے سامنے رکھ دیا۔

ریوالور پر نگاہ پڑتے ہی مس ڈیو نے خط پڑھنا بند کر دیا۔

”پلیز، آگے پڑھو!“

مس ڈیو نے اپنے باس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی توجہ دوبارہ پیڈ پر مرکوز کرنے کی کوشش کی اور ریوالور سے نظریں ہٹائیں۔ پھر اس سے رہا نہ گیا اور وہ اس کی جانب جھکتے ہوئے بولی۔ ”لیکن آپ یقیناً سنجیدہ نہیں ہیں۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔ یقینی طور پر سنجیدہ ہوں۔“

”آپ کا پرابلم کوئی بھی ہو، وہ اتنا پریشان کن نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی جان کے درپے ہو جائیں۔“ مس

سمجھانے والے انداز میں کہا۔

اینڈریو نے ایک بار پھر اپنی سیکریٹری کی ان سنی کر دی اور بولا۔ ”نیا پیراگراف۔ میری گن اسمتھ اینڈ ویسن اعشاریہ تین آٹھ ہے اور اس کے چھ چیمبر میں سے ایک میں ایک راؤنڈ موجود ہے۔ اس کھیل کا نام ’رشین رولیٹ‘ ہے اور چونکہ ٹریگر کو سوچے سمجھے بغیر دبانے سے میری اچانک موت واقع ہو سکتی ہے جس کی بنا پر یہ خط بھی بے ربط ختم ہو رہا ہے۔ آپ کا مخلص...“

”یہ دیوانگی ہے۔ آپ اس طرح اپنی جان نہیں لے سکتے۔“

اینڈریو نے میز پر سے ریوالور اٹھا لیا اور بولا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ تم کسی طرح بھی مجھے روکنے کی پوزیشن میں ہو سوائے اس بات کے کہ اگر تم لنچ کے وقفے میں وزن گھٹانے کی ورزش کرتی رہی ہو۔ جہاں تک مدد طلب کرنے کا سوال ہے تو واضح کر دوں کہ تمہارے عقب میں موجود دروازہ لاک ہے اور تمہیں کمرے میں طلب کرنے سے قبل میں نے اس کا کمبی نیشن تبدیل کر دیا تھا۔ میرا ٹیلی فون اور میرا کمپیوٹر دونوں ہی ڈس کنیکٹ ہیں اور مزید یہ جیسا کہ تم جانتی ہو میرا یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔“

مس ڈیوینپورٹ نے اپنا اسٹینوگرافر پیڈ میز پر رکھ دیا اور بولی۔ ”میں آپ کی خودکشی میں شریک نہیں بننا چاہتی۔“

”ایک بار پھر واضح کر دوں کہ تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔ اگر میں اس کمرے سے زندہ باہر نکلا تو میرا وکیل پولیس کو فون کر دے گا اور تمہارا بھائی جیل چلا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر تم اپنا کام جاری رکھو اور جو کچھ میں کہوں وہ لکھتی رہو تو میرے وکیل کے پاس دس ہزار ڈالرز کا چیک موجود ہے جو تمہارے لیے ہے۔“ اینڈریو نے کہا۔

”یہ تو بلیک میلنگ ہے۔“

”بلیک میلنگ نہیں بلکہ رشوت کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔“ اینڈریو نے تصحیح کی۔

مس ڈیو اپنا ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ ”یہی ایک واحد راستہ تو نہیں ہے۔“

”نہیں، مگر آسان اور بہترین طریقہ ہے۔“ یہ کہہ کر اینڈریو نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی سے لگائی اور ٹریگر دبا دیا۔

کلک کی آواز کے ساتھ ہی مس ڈیو کی چیخ نکل گئی۔ چیمبر خالی ہونے کی بنا پر صرف کھٹکا ہوا تھا اور فائر نہیں ہوا تھا۔

شیروں پر راج۔ یوگی مہاراج کی مہارت کا انجام

”اب مت چیخنا۔“ اینڈریو نے کہا۔ ”تم میرے نشانے پر اثر انداز ہو رہی ہو اور تمہیں اپنے پین کی ضرورت ہے کیونکہ اس کیفیت میں تم میرے آخری الفاظ صحیح طور پر یاد نہیں رکھ سکو گی۔“

مس ڈیو کو اپنی کیفیت پر قابو پانے میں چند لمحے لگے۔ پھر اس نے جھک کر فرش پر سے اپنا پین اور پیڈ اٹھا لیا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑے تھے۔

”نیا پیراگراف۔ پہلی کوشش رائگاں گئی، پانچ ابھی باقی ہیں۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہر کوشش سے قبل مجھے کچھ نہ کچھ کہنے کی پہلے سے تیاری کر لینی چاہیے تھی لیکن چانسز یہ بھی تھے کہ اگر میں نے تیاری کر لی ہوتی اور پہلا ہی چیمبر بھرا ہوا ہوتا تو تب؟ زندگی اس طرح بھی مذاق کرتی

ہے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

اینڈریو نے یہ کہہ کر ریوالور کی نال ایک بار پھر اپنی کنپٹی سے لگا دی اور ٹریگر دبا دیا۔

اس مرتبہ بھی صرف کلک کی آواز آئی اور کوئی فائر نہیں ہوا۔

اس دوران میں مس ڈیوا اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ سکتے۔"

"کیوں جاری نہیں رکھ سکتا؟"

"بس اس بات کو بھول جائیں۔ آپ جو کہیں گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اینڈریو نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور بولا۔ "جو بھی کہوں گا، اس کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں جو بھی کہو گے۔ بس مجھے جانے دیں۔"

اینڈریو نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر سے ہٹا دی اور چند سیکنڈ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔ "نہیں، میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔" ساتھ ہی اس نے ریوالور کی نال ایک بار پھر اپنی کنپٹی سے لگا دی اور بولا۔ "نیا پیراگراف!"

مس ڈیو نے اچانک اپنی کرسی سے اچھل کر اینڈریو پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن میز پار بیٹھا ہوا اینڈریو زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے مس ڈیو کے رخسار پر تیزی سے ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

مس ڈیو نے رونا شروع کر دیا۔

اینڈریو خاموش اسے روتا دیکھتا رہا۔ جب مس ڈیو کی سسکیاں دھیمی ہو گئیں تو اینڈریو بولا۔ "تم اس معاملے کو ہم دونوں کے لیے دشوار بنا رہی ہو۔ دس ہزار ڈالر کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ تم اس رقم سے اپنی بیمار ماں کا علاج کرا سکتی ہو۔ تم چاہو تو اس کی دیکھ بھال کے لیے کسی نرس کی خدمات حاصل کر سکتی ہو؟"

"لیکن میں اس طریقے سے رقم حاصل نہیں کرنا چاہتی۔" مس ڈیوپورٹ نے جواب دیا۔

اینڈریو اپنے ریوالور کو ایک بار پھر ریڈی پوزیشن میں لے آیا۔ "لیکن رقم حاصل کرنے کی بس یہی ایک صورت ہے۔ اب اپنا اسٹینو گرافر پیڈ اٹھا لو۔ اپنا پین اٹھا لو۔ نیا پیراگراف! میں یہ بات واضح کرنے کے لیے ریکارڈ پر لا رہا ہوں کہ مس ڈیو نے مجھے باز رکھنے کی متعدد بار کوشش کی ہے۔ لہٰذا میں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے فیصلے پر کسی طور پر بھی مس ڈیو سے پوچھ گچھ نہ کی جا... ہی اسے میرے اس اقدام کا ذمے دار ٹھہرایا جائے۔

یہ کہہ کر اینڈریو نے اپنی کنپٹی پر رکھے ہوئے ... ٹریگر دبا دیا۔

اس بار بھی ہلکی کھٹکے کی آواز ابھر کر رہ گئی۔

مس ڈیو نے گھٹی گھٹی آواز میں رونا شروع ...

"نیا پیراگراف... میرا خیال ہے اب تک ... کوشش ہو چکی ہے... ہم نے آدھا سفر طے کر لیا ہے۔

اینڈریو کو اس بات کی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ ... جاہے جس برے طریقے سے اپنے ردعمل کا اظہار کر ... لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اسے بالکل صحیح طور پر لکھتی ... تھی۔ یہ اس کی مختصر نویسی کا کمال تھا۔ اب کم از کم ... تحریر کو پڑھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ... پڑے گا۔ "لوگ کینسر کے خلیوں کے بارے میں ... کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ روح کو قدرتی ... کیا کیا نقصان پہنچتا ہے، اس کی کوئی پروا نہیں کرتے۔"

اینڈریو نے یہ کہہ کر قدرے توقف کیا پھر ... جانب جھکتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہاری ماں کبھی تمہیں ... بھی ہے؟"

"کبھی کبھار ایسا اچھا دن بھی آ جاتا ہے جب ... پہچان لیتی ہے۔" مس ڈیو نے جواب دیا۔ البتہ اس کی ... لڑکھڑا رہی تھی۔

"مجھے امید ہے کہ تمہیں جو بونس ملے وہ ... تمہارے لیے کارآمد ثابت ہو گا۔" اینڈریو نے یہ کہ ... کھنکارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور اپنی بات جاری ... ہوئے بولا۔ "نیا پیراگراف ذہنی دباؤ کے باعث میرا ... کپکپانے لگی ہے۔ لہٰذا میں اسے ٹریگر پر سہارا دیتے ہو... دھیرے دھیرے ٹریگر کو دبا رہا ہوں۔"

کلک!

مس ڈیو کے حلق سے بے ساختہ ایک کراہ ... ہوئی۔ "یہ آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ... میں نے آپ کے ساتھ کبھی کچھ ایسا کیا ہے جو آپ ... اس کا بدلہ لے رہے ہیں؟"

"تم نوجوان بھی ہو اور صحت مند بھی۔ تم ... سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔" یہ کہہ کر اینڈریو ... ساقہقہہ لگایا۔ "لیکن کیا ایسا ہم سب کے ساتھ نہیں ...

"میں اس کھیل کا خاتمہ چاہتی ہوں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر اینڈریو ...

ایک بار پھر اپنی کنپٹی پر رکھ دی اور ٹریگر دبا دیا۔

کلک کی آواز ابھر کر رہ گئی۔

مس ڈیو نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔

"نیا پیراگراف! چھ میں سے پانچ کوششیں ہو گئیں۔ سسپنس کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ آخری راؤنڈ رہ گیا اور گولی ... کی چیمبر میں ہو گی۔" اینڈریو نے مس ڈیو کے چہرے پر نظریں جما دیں جو بدستور کانپتے ہاتھوں سے لکھنے میں مصروف تھی۔ یہ غالباً ڈکٹیشن پر توجہ کا نتیجہ تھا کہ جو وہ اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اگر اس کی تمام تر توجہ اس صورتِ حال پر مرکوز ہوتی تو وہ کب کی بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

"نیا پیراگراف! میری انگلی جو میں نے ٹریگر پر رکھی ہوئی ہے اس میں تناؤ پیدا ہوتا ہے، پھر پُرسکون ہو جاتی ہے۔ پھر تناؤ پیدا ہوتا ہے، پھر پُرسکون ہو جاتی ہے۔ میں مس ڈیوپورٹ کے لیے ہمیشہ ایک باس رہا ہوں، کبھی ایک مرد نہیں رہا۔"

مس ڈیو نے آخری جملے پر چونکتے ہوئے اینڈریو کی جانب دیکھا۔

اینڈریو نے مس ڈیو کی نظروں پر توجہ دیے بغیر ٹریگر ایک بار پھر دبا دیا۔

فائر کے بجائے پھر کلک کی آواز ابھر کر رہ گئی۔

"یہ تو بڑی عجیب مضحکہ خیز بات ہوئی۔" اینڈریو نے کہتے ہوئے ریوالور ٹریش کین میں پھینک دیا۔ دھاتی کوڑے دان سے ٹکراتے ہی کمرے میں ایک گونج پیدا ہوئی۔

اب مس ڈیو کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر ... وہ پُرسکون ہو گئی۔

تب اینڈریو نے اپنی میز کی دراز سے ایک اور ... ریوالور نکال لیا۔

دوسرے ریوالور پر نگاہ پڑتے ہی مس ڈیو کے چہرے ... فق ہو گیا۔

"یقیناً میں نے غلط ریوالور اٹھا لیا تھا۔" اینڈریو نے ...

مس ڈیو خالی نگاہوں سے اپنے باس کو دیکھنے لگی۔

اینڈریو نے دوسرا ریوالور میز پر رکھ دیا اور اپنی کرسی ... ہوا۔ پھر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ... مجھے علم نہیں، لیکن میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔"

... اینڈریو واٹر ڈسپنسر کی جانب بڑھ گیا اور اپنے لیے گلاس میں پانی بھرنے لگا۔ جب وہ پلٹا تو دیکھا کہ مس ڈیو کے ہاتھوں میں اس کا دوسرا ریوالور دبا ہوا تھا جس کی نال کا رخ اس کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ البتہ مس ڈیو کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"دروازہ کھول دیں۔" مس ڈیو نے سانپ کے مانند پھنکارتے ہوئے سرگوشی کی۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ ممکن نہیں۔" اینڈریو نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "جیسا کہ کہا جاتا ہے، ہم جنگ ختم ہونے تک یہیں رہیں گے۔ اپنے بھائی کو یاد کرو، اپنی ماں کو یاد کرو۔ میں تمہارے بھائی کو اب بھی جیل بھجوا سکتا ہوں۔ میں تمہاری ماں کے لیے اب بھی زندگی کی امید بن سکتا ہوں۔"

"میں کہتی ہوں، دروازہ کھولو۔"

اینڈریو نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

تب مس ڈیو نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا اور بار بار دباتی رہی حتیٰ کہ اسے احساس ہوا کہ ریوالور خالی تھا اور کسی چیمبر میں کوئی گولی نہیں تھی کیونکہ ایک بار بھی فائر نہیں ہوا۔

اس نے بے بسی کے عالم میں ریوالور فرش پر پٹخ دیا۔

تب اینڈریو گویا ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھ سے ایک اور مہربانی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ کہتے ہیں کہ تیسرا موقع پُرکشش ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پانی کا گلاس دوبارہ واٹر ڈسپنسر پر رکھ دیا اور پلٹ کر اپنی میز پر واپس آ گیا۔

"مس ڈیوپورٹ، اپنی بقیہ زندگی میں بے حد تکلیف میں رہوں گا۔ سو کیوں نہ زندگی بھر کی تکلیف سے نجات پانے کے لیے ایک پل کی تکلیف برداشت کر لی جائے؟" یہ کہہ کر اینڈریو نے اپنی میز کی دراز سے ایک اور ریوالور نکال لیا۔

مس ڈیوپورٹ کے سپاٹ چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔

اینڈریو نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ دی اور مس ڈیوپورٹ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گیا۔ دروازے کے تالے میں ایک ایسا میکنزم موجود ہے جو فائر کی آواز پر اسے کھول دے گا۔ میں نے اس میکنزم کے بٹن کو آن کر دیا ہے۔ گڈ بائے!"

اور یہ کہہ کر اینڈریو نے ٹریگر دبا دیا۔

⁂

للکار

طاہر جاوید مغل

قسط 30

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اُڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر... ایک للکار ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
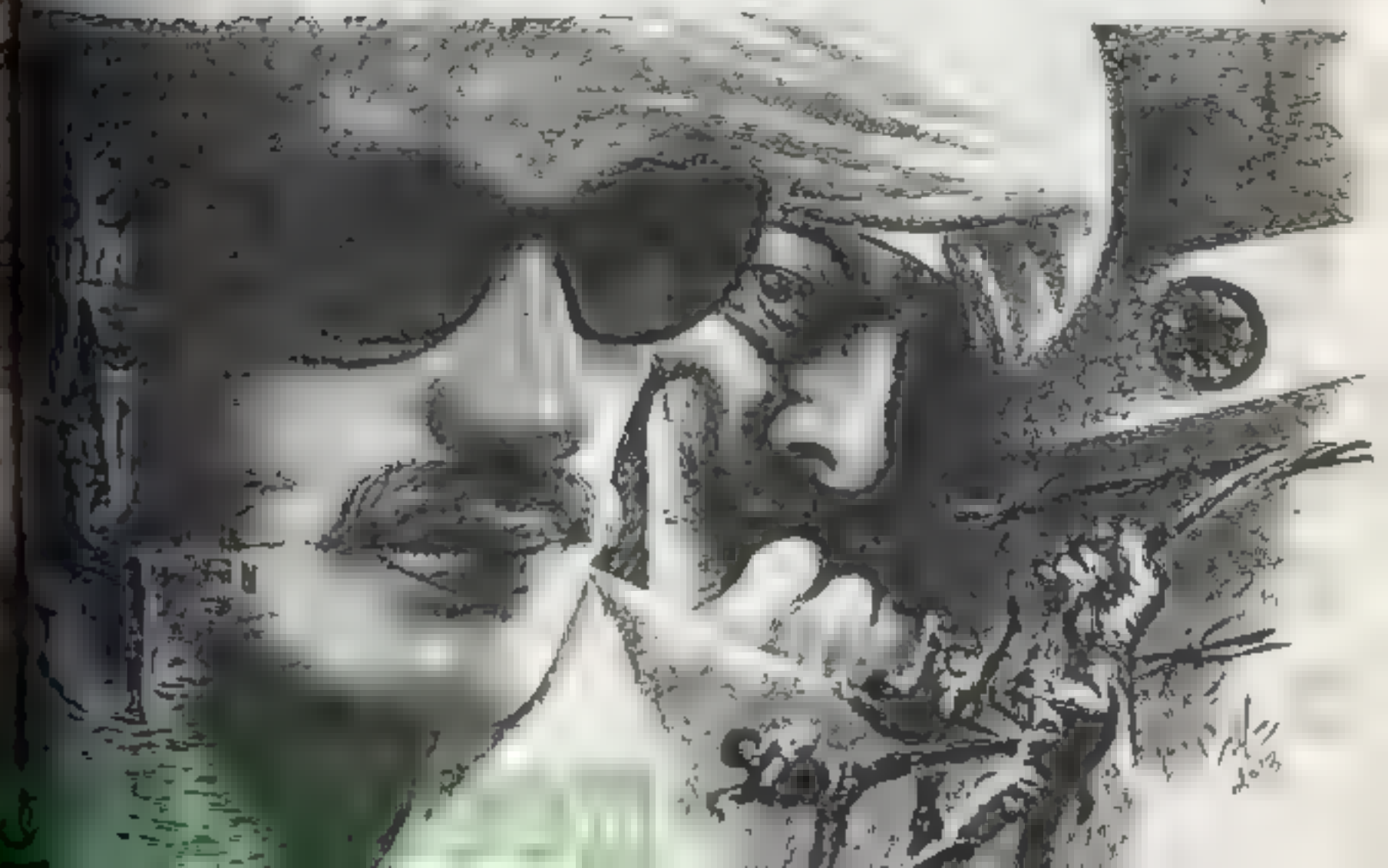
میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واحد عرف واجی نے ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کردیا۔ پھر میری ملاقات عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھی میں رہنے والی ایک میڈم صنوبرا کے لیے کام کرتا ہے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اسی دوران میں ایک اندوہناک موت نے میرے ہوش وحواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں ایک اجنبی لڑکی سلطانہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریہ کو اغوا کرلیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جیکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنایا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کرکے یرغمالیوں کو مارنا شروع کردیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلادی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کرکے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سلطانہ بھی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ پھر مقابلہ ہوا اور ماریہ ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہوکر پرانے قلعے میں آگئے۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور الٰہ آباد پہنچ گئے۔ پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ ڈاکٹر مہ وش نے جلالی سے خفیہ نکاح کر رکھا تھا۔ پھر ایک دن میں نے باغیچے میں فتح محمد کو کسی سے رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور ایک کمرے میں بند کردیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا۔ بعد ازاں ان لوگوں نے فتح کو مار ڈالا۔ جلالی کے سیکریٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ پھر وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا اور عمران تک پہنچ گیا۔ راجا کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران فارم ہاؤس آئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ ہم مہناز کی والدہ کو لے کر ڈیفنس والی کوٹھی پر آگئے۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے تھوڑا سا سراغ ملا۔ ایک دن حیاتی کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ یوسف کسی چکر میں ہے۔ وہ بازار حسن میں ایک کوٹھے پر موجود تھا۔ ہم راجا کے پاس ہوٹل میں موجود تھے کہ ہمیں جاوا کے لوگوں نے گھیر لیا۔ وہاں شدید فائرنگ ہوئی۔ عمران نے حمزہ صاحب کو فون کرکے ان سے مدد لی اور یوں ہم وہاں سے سلامت نکل پائے۔ ہم نے یوسف فاروقی کی ٹوہ لگائی۔ وہ ایک بنگلے میں کسی ڈی ہیروئن کے ساتھ رات گزار رہا تھا۔ وہاں سے واپسی میں اس کا جھگڑا ہوگیا۔ مجھے مدد کے لیے پہنچنا پڑا تاہم اس دوران میں یوسف زخمی ہوچکا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر یوسف اسپتال سے غائب ہوگیا۔ میں نے تیتو عرف کرشمہ کپور کو دیکھ لیا اور اس کا پیچھا کیا۔ میں ایک سرحدی گاؤں پہنچ گیا جہاں پیلی حویلی تھی۔ میں لطیف نامی شخص سے معلومات لے کر آگیا۔ پھر میں اور ثروت دوبارہ گاؤں پہنچے۔ ثروت نے پیلی حویلی میں وقتی ملازمت کرلی۔ ادھر لطیف کی بیوی نے چودھری کو ہمارے بارے میں آگاہ کردیا۔ ہمیں پکڑ لیا گیا تاہم راجا کی مدد سے ہم وہاں سے فرار ہوئے۔ راستے میں راجا کے گولیاں لگیں اور وہ مارا گیا۔ ہمیں چودھری کے گرگوں نے گھیر لیا تاہم میری جنونیت کے آگے وہ سب پسپا ہوگئے۔ ہم وہاں سے بھاگ کر ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہاں چند [illegible] ایک پرانا کوٹھا سا تھا۔ ہم نے وہاں پناہ لے لی۔ ہم یہاں سے جگت سنگھ نامی ایک سکھ کی مدد سے نکل کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ہم پاکستانی بارڈر پار کرگئے تھے۔ اس وقت انڈین علاقے میں تھے۔ جگت سنگھ کی مدد سے ہم نے یوسف کا سراغ لگایا جو ایک سکھ سردار کی حویلی میں قید تھا۔ میں اور ثروت ملازم بن کر سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ یوسف سے کوئی خطرناک کام لیا جانا ہے اور اس کی جان جانا یقینی ہے۔ میں یوسف کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے جگت سنگھ کی مدد لی۔ جس رات یوسف کو خطرناک سفر پر لے جایا جانا تھا، اس دن میں نے کارروائی کی۔ یوسف کی گاڑی میں بم نصب تھا۔ میں بم کو گاڑی سے علیحدہ کرنے لگا تاہم مجھے پکڑ لیا گیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ثروت مجھے غلط تو نہیں سمجھے گی کہ میں اس گاڑی میں بم لگا رہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میری ٹانگ کے ساتھ میرا خم دار چاقو بھی بندھا ہوا تھا مگر وہ نسبتاً دور تھا اور کرپان نزدیک تھی۔ گارڈ کی کمر سے بندھی ہوئی یہ کرپان مجھ سے بمشکل ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے نیچے گرتے گرتے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور پھرتی سے کرپان کھینچ لی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا، میں اٹھا اور تیزی سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھا۔ یہ ٹارگٹ میں پہلے ہی منتخب کرچکا تھا۔۔۔ اور یہ اونچے زرتار شملے والا سردار اوتار سنگھ تھا۔ وہی پرانی کہاوت والا معاملہ تھا۔ بھرے دربار میں بادشاہ نے بڑھیا سے کہا تھا "جس چیز پر ہاتھ رکھو گی، تمہاری ہوجائے گی۔" بڑھیا نے بادشاہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، کہا تھا، جب تم میرے ہو تو سب کچھ میرا ہے۔

میں بھی سردار اوتار سنگھ پر کرپان رکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ میرے قبضے میں آجاتا تو سب کچھ آجاتا۔ اس کی شہ رگ پر کرپان آجانے کا مطلب یہ تھا کہ سب کی شہ رگ پر کرپان آگئی۔ میں تیزی سے اوتار سنگھ پر جھپٹا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا انسان چاہتا ہے۔ یہاں میرے ساتھ بھی قسمت نے تھوڑا سا دھوکا کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اوتار سنگھ تک پہنچتا اور اس کو عقب سے جکڑ کر کرپان اس کی گردن پر رکھتا، ایک چمک دار لاٹھی لہرائی اور بڑے زور سے میرے چہرے پر لگی۔ میں اوتار سنگھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار پھر دندھا کر گیا۔ پچھلی دو چوٹوں کا اثر بھی ابھی دل و دماغ پر موجود تھا۔ اس تازہ ضرب نے مجھے چکرا ڈالا۔

سردار اوتار سنگھ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ساتھ کئی افراد دوبارہ مجھ پر پل پڑے۔ وہ مجھ پر لاٹھیاں اور رائفل کے کندے برسا رہے تھے۔ میرا پورا جسم بے رحم ضربات کی زد میں آگیا۔ خود کو شدید زخمی ہونے سے بچانے کے لیے میں نے اپنا سر اور چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ میری پشت پر تواتر سے لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ تھی۔

"مارو، ہڈیاں توڑ دو اس نمک حرام کی۔" کوئی گرجا۔

"کتے کی موت دو۔ فائر مارو اس کے سر میں۔" ایک پاٹ دار آواز نے آتشیں مشورہ دیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ گولی نہیں چلانی۔" میرے اندازے کے مطابق یہ سردار اوتار کی آواز تھی۔

میرے چہرے سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر رہا تھا اور میرے منہ میں نمک کی طرح گھل رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے آئے اور اوندھے منہ رنگین پھول بوٹوں والے پختہ فرش پر پھینک دیا۔ شدید چوٹوں نے مجھے واقعی بے دم کر ڈالا تھا۔۔۔ ترشولا کے سردار بھی وہی غلطی کر رہے تھے جو معرکے کی رات چودھری انور کے کارندوں نے کی تھی۔ وہ تلاشی کے دوران میں میری ٹانگ سے بندھا ہوا چاقو چھوڑ گئے تھے۔ یہاں بھی یہی ہوا تھا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ زندگی موت کی اس بازی میں ابھی مجھے اپنا یہ پتا استعمال کرنا چاہیے یا نہیں۔ میری طرف دو تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ پیچھے کوکوں والی لاٹھیوں نے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ صورت حال کسی طور بھی مہم جوئی کے حق میں نہیں تھی۔

کچھ فاصلے سے سردار اوتار سنگھ کی گرج دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ اپنے بیٹے ہری سنگھ کو مخاطب کر [illegible] "اس کی پٹی کو دیکھو۔ وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ [illegible]"

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ وہ لوگ زنان خانے کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ ثروت کو بھی کھینچتے ہوئے وہاں لے آئے۔ ثروت کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ خوفناک صورت والے امت سنگھ نے ثروت کو دھکیل کر میرے قریب فرش پر پھینک دیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئیں۔ سردار اوتار سنگھ کے اشارے پر امت سنگھ نے بھرا ہوا پستول میرے سر سے لگا دیا اور کڑک کر بولا۔

"کیا چکر چلا رہے ہو تم؟ کس کے کہنے پر کیا ہے یہ سب؟"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میرے موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ موبائل ہری سنگھ کے ہاتھ میں تھا، اسے میری تلاشی کے دوران میں ملا تھا۔ ہری سنگھ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا پھر کال ریسیو کی۔ میرے خدشے کے عین مطابق یہ میرے مددگار جگت سنگھ کی ہی کال تھی۔ جب میں سخت بے چینی سے اس کال کا انتظار کرتا رہا تھا، یہ نہیں آئی تھی اور اب جبکہ اسے نہیں آنا چاہیے تھا، یہ آگئی تھی۔ ہری سنگھ نے اسپیکر آن کردیا۔ "ہیلو کون؟" ہری سنگھ نے پوچھا۔

دوسری طرف جگت آواز پہچاننے میں ناکام رہا۔ وہ عجلت سے بولا۔ "یار تاپشے! یہاں بڑی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ کچھ بندوں سے ٹاکرا ہوگیا تھا۔ بڑی مشکل سے نکلے ہیں۔ اب کہاں ہو تم؟"

ہری سنگھ نے ذرا توقف کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہیں حویلی میں۔۔۔"

اب دوسری طرف جگت سنگھ ذرا چونکا۔ "ہیلو! کون بول رہا ہے۔۔۔ ہیلو۔"

ہری سنگھ نے فوراً بات بنائی۔ "تاپشے کا دوست! تاپشے ذرا غسل خانے میں ہے۔"

"کون دوست؟" جگت نے پھر چونکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دلیپ سنگھ۔"

"کون دلیپ سنگھ۔۔۔؟" جگت اب پوری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔

ہری سنگھ نے اپنے باپ اوتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ اوتار سنگھ کی بھوری آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ بڑی پُرسوچ نظروں سے مجھے اور ثروت کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مجھے اس منڈے پر پہلے ہی شک تھا۔ میرے خیال میں یہ اکبر علی نہیں، اس کے بھیس میں کمینے نہالوں کا کوئی بندہ ہے۔"

ہری سنگھ نے باپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ اکبر علی نہیں ہے تو پھر یہ زنس بھی ثریا نہیں ہوگی۔"

سردار اوتار سنگھ نے آگے بڑھ کر ثروت کے بال مٹھی

میں جکڑے اور زور سے جھٹک کر بولا۔ ”کون ہو تم دونوں؟ کس چکر میں آئے ہو یہاں؟“

ثروت کی گردن مڑ گئی تھی، وہ بس کراہ کر رہ گئی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اس کی توہین مجھ سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں فوری اشتعال میں آکر کوئی ایسا قدم بھی اٹھانا نہیں چاہتا تھا جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ میں نے ضبط کیا۔ اجیت سنگھ نے میرے سر پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔ میرے سر کا پچھلا حصہ دیوار سے لگ گیا۔ اجیت سنگھ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پستول کو کسی چاقو یا نیزے کی طرح میری کنپٹی میں گھسا دے۔

”بولو، کون ہو تم؟“ وہ خطرناک لہجے میں پھنکارا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا یا ثروت کچھ بولتی، ایک شخص تقریباً دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہری سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ ہری سنگھ کا سرخ و سپید چہرہ بھی ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ سردار اوتار سنگھ سوالیہ نظروں سے بیٹے اور ملازم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردار ہری سنگھ اپنے باپ سردار اوتار سنگھ کے پاس پہنچا اور اس کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ اوتار سنگھ کا چہرہ بھی متغیر ہوا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی کرپان کی طرف بڑھا۔ بہرحال، اس نے کرپان نکالی نہیں۔ سخت اضطراب کے عالم میں وہ زنان خانے کی طرف مڑا۔

ہری سنگھ ہماری طرف اشارہ کر کے کرخت لہجے میں ملازموں سے بولا۔ ”بند کرو ان کو کمرے میں۔ ابھی لیتے ہیں ان کی خبر بھی۔“

ہمارے کمرے کا وزنی چوبی دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ باہر سے وزنی کنڈی چڑھا کر تالا لگا دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیشتر مسلح افراد اس کمرے کے سامنے سے اوجھل ہو گئے۔ میں گرل دار کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔ اردگرد کچھ افراتفری سی نظر آتی تھی۔ ملازم تیز رفتاری سے حرکت کر رہے تھے۔ دروازے بند ہو رہے تھے اور کھل رہے تھے۔ ایک دم ہی جیسے ہمارے والا اہم ترین معاملہ پس منظر میں چلا گیا تھا... اس کی جگہ کسی اور معاملے نے لے لی تھی۔ میں نے گرل دار کھڑکی میں سے دیکھا کہ حویلی کا بڑا پھاٹک بند کر دیا گیا تھا اور اس کے سامنے مسلح افراد کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

میں بے دم سا ہو کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میرے پورے جسم پر ضربات آئی تھیں۔ ایک بازو میں سے مسلسل شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ کہیں فریکچر ہو گیا ہے۔ چہرے پر لگنے والی لاٹھی نے پیشانی کے قریب سے سر پھوڑ ڈالا تھا اور وہاں سے بہنے والا خون میرے پورے چہرے کو لتھڑ رہا تھا۔ میں نے پتلون کے نیچے سے قمیص نکالی اور اس کے دامن سے چہرہ پونچھنے کی کوشش کی۔ ثروت مجھ سے بالکل لاتعلق بیٹھی تھی۔ بلب کی زرد روشنی میں اس کے بال منتشر تھے اور کندھے پر سے قمیص ادھڑی ہوئی تھی۔

”ثروت!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

میں حیران رہ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ چہ جائیکہ وہ میری چوٹوں پر پریشان ہوتی یا مجھے طبی امداد دینے کی کوشش کرتی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! تم نے تین بجے آنے کا کہا تھا، تم آئی کیوں نہیں؟ تمہارے نہ آنے سے بہت کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ یہاں... ایک... بڑا خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے ثروت۔ یوسف کی زندگی کو خطرہ ہے۔“

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ”جو خطرناک کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس کا ”اینڈ“ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

میرے جسم میں سرتاپا ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میرا اندیشہ حقیقت نکلا تھا... وہی ہو رہا تھا جس کا ڈر تھا۔ یہاں موجود بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ثروت بھی غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی اور یہ وہی غلط فہمی تھی جس کی داغ بیل ابھی کچھ دیر پہلے سردار اوتار اور اس کے بیٹے نے ڈالی تھی۔ انہوں نے حویلی میں آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے، بچے جرم کا سارا ملبا مجھ پر ڈال دیا تھا اور صورت حال بھی ایسی ہی تھی کہ بہت سے لوگوں کو اس سفید جھوٹ پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں دھماکا خیز مواد تھا اور میں سیاہ ٹویوٹا جیپ کے نیچے سے برآمد ہوا تھا۔

میں نے ثروت کا شانہ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ثروت کہیں تم بھی تو یہ نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں یوسف کی گاڑی کے نیچے بم لگا رہا تھا...؟“

وہ عجیب بیگانے انداز میں بولی۔ ”میں کچھ نہیں کہہ رہی... میں کچھ نہیں سمجھ رہی... پلیز چپ ہو جائیے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور اپنا سر بے بسی کے انداز میں دیوار سے ٹیک دیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے یہاں ثروت اور یوسف کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا رکھی تھی، اپنے جسم کو زخمی کر رہا تھا اور یہاں ثروت مجھے ہی شک کی نظر سے دیکھ

تھی۔ میں نے کہا۔ ”ثروت! تمہیں کچھ خبر نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ بڑی خطرناک سازش ہو رہی ہے۔ یوسف کو یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ اس کی شکل سردار اوتار سنگھ کے بیٹے سے بہت ملتی جلتی ہے اور اس بیٹے نے قتل کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یوسف کو مارنا چاہتے ہیں اس طرح...“

”پلیز تابش! آپ چپ ہو جاؤ۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں سننا۔ شاید آپ وہ تابش ہو ہی نہیں جسے میں جانتی تھی۔ میں یوسف کی باتوں کو غلط سمجھتی تھی۔ میں انہیں سمجھاتی تھی کہ انہیں دھوکا ہوا ہے۔ تابش ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کا خون ایسے سفید نہیں ہو سکتا لیکن اب تو بہت کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

”تم کس دھوکے کی بات کر رہی ہو... میری وجہ سے یوسف کو کیا دھوکا ہونا تھا؟ کیا کیا ہے میں نے؟“

”آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ بے قصور ہیں۔ یہ سردار بھی بے قصور ہیں۔ جو لوگ انہیں لاہور سے پکڑ کر یہاں لائے ہیں، وہ بھی بے قصور ہیں۔ اصل مجرم میں ہی ہوں۔ آپ مجھے مار دیں۔ آپ کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور میری جان بھی چھوٹ جائے گی۔“ وہ باقاعدہ رونے لگی۔

”ثروت! مجھے بتاؤ تو سہی، میں نے کیا کیا ہے؟“

”آپ سب جانتے ہیں۔ آپ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ آپ نے درد کی گولیوں کے نام پر یوسف کو ایسی گولیاں دیں... آپ ان کی زندگی سے کھیلے... آپ...“ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں سناٹے میں تھا... وہ کوئی ایسی بات کہہ رہی تھی جس کی مجھے مطلق خبر نہیں تھی لیکن وہ بات موجود تھی۔ شاید ثروت اور یوسف کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا کہ شاید یوسف نے جان بوجھ کر ثروت کو کسی غلط فہمی کا شکار کیا ہے۔ اس کا رویہ تو اس کے لکھے ہوئے رقعے سے ہی ظاہر ہو جاتا تھا۔ یقیناً کوئی سنگین بات تھی جس کے سبب ثروت کے رویے میں مجھے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اب عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ جب مجھے دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں ایک ڈر سمٹ آتا ہے۔ جیسے وہ مجھے نہیں کسی خطرناک قاتل کو دیکھ رہی ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس ڈر کا تعلق اس خون ریز لڑائی سے ہے جس میں چوہدری انور کے پانچ بندے مارے گئے تھے۔ ثروت تو... سسکنے کے بعد ایک سکتے کی سی کیفیت میں چلی گئی

میں دکھ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔ میرا جی چاہا کہ اپنے سر پر دوہتڑ رسید کروں۔ خود کو دیواروں سے ٹکراؤں۔ کچھ ایسا کروں کہ میرا زخمی جسم اور بھی لہولہان ہو جائے۔ وہ تو میری زندگی کا محور تھی اور وہی مجھ سے رخ پھیر رہی تھی۔ مجھے محرم سے مجرم بنا رہی تھی۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”ثروت! میری بات سنو... حقیقت وہ نہیں جو تمہیں نظر آ رہی ہے۔ تمہیں پتا نہیں، یوسف کتنے خطرے میں ہے۔ میں نے...“

میرے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ کھڑکی سے آٹھ دس فٹ دور کرسی پر پڑا ہوا ایک موبائل زور زور سے بجنے لگا۔ موبائل کا مالک کسی جانب سے برآمد ہوا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے اس کا کوئی ساتھی خشونت بول رہا تھا۔ خشونت نے پوچھا ہوگا کہ کیا ہوا ہے۔ کال ریسیو کرنے والے نے دبی آواز میں کہا۔ ”خشونت! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ سرتوں بی بی اپنے کمرے وچ نہیں۔ کہیں بھی نہیں ہیں... سب انہیں ڈھونڈ رہے ہیں... نہیں نہیں... یہ تو نہیں ہو سکتا۔ دونوں پھاٹک بند تھے، پہرا بھی تھا... اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے آوازیں پڑ رہی ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

میں ششدر کھڑا تھا۔ یہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔ سرتوں، سردار اوتار سنگھ کی اس بیٹی کا نام تھا جس کی شادی کا ہنگامہ بپا تھا اور وہ غائب تھی۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ سردار اوتار اور اس کے کارندے آناً فاناً ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ میری پیشانی سے ٹپ ٹپ لہو گر رہا تھا۔ ثروت نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔ جسم کی طرح میرے دل کے اندر سے بھی خون رسنے لگا تھا۔

اچانک ایک زوردار آواز آئی اور اس نے ہماری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ آٹومیٹک رائفل کی خوفناک ”تڑتڑ“ تھی۔ یہ پورا ایک برسٹ تھا جو چھوٹے گیٹ کی طرف سے آیا اور کسی قریبی کھڑکی سے ٹکرایا۔ شیشے ٹوٹنے اور گرنے کی آوازیں آئیں۔ جواب میں چند گولیاں چلیں اور پھر ایک دم اندھادھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ ثروت سمٹ کر دیوار سے جا لگی۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ کہیں باہر سے جگت سنگھ وغیرہ نے حملہ کر دیا ہے... لیکن اگر وہ کوئی ایسی کارروائی کرتے تو طے شدہ ٹائم کے مطابق کرتے اور مجھ سے رابطہ کرنے کے بعد کرتے۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی اور لوگ ہیں۔ اگلے دو تین منٹ میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ یہ غالباً وہی اوتار سنگھ کی لڑکی والا معاملہ ہے۔ یقیناً کچھ لوگ یہ شادی نہیں چاہتے تھے اور اب وہی مسلح حالت میں یہاں آن موجود ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک نہایت سنگین سلسلہ ہے۔ یہاں لوگ مر سکتے تھے اور زخمی یا اغوا وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔ یکایک ایک اور آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی بھاری گاڑی حویلی کے بڑے پھاٹک سے ٹکرائی ہے اور اسے توڑ دیا ہے۔ فائرنگ میں ایک دم شدت آگئی۔ میں نے ایک فربہ اندام شخص کو زمین پر گرتے اور لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ اسے شاید کرپان کا زخم آیا تھا۔ گرنے سے اس کی پگڑی کھل گئی تھی اور کیس بکھر گئے تھے۔

دو ہٹے کٹے سکھ اسلحہ لہراتے اور بڑھکیں مارتے بڑے پھاٹک کی طرف لپکے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس کمرے کا عقبی دروازہ بھی موجود ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ زیادہ مضبوط بھی نہیں ہے۔ میرا گھائل جسم مجھے کسی مہم جوئی کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن باروندا جکی کا کہنا تھا کہ جسم سے اجازت مت لو، اس کو حکم دو۔ آنکھیں بند کر کے اسے تکلیف کی بھٹی میں جھونک دو اور پھر دیکھو کہ اس کے جلنے سے راحت کے کیسے پھول کھلتے ہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے چوٹوں کی پروا کیے بغیر خود کو اٹھایا اور چند قدم دوڑ کر کندھے سے دروازے کو زوردار ٹکر رسید کی۔ میری دوسری ٹکر سے دروازے کی دونوں چٹخنیاں اکھڑ گئیں اور پٹ باہر کی طرف کھل گئے۔ میں نے ٹانگ سے بندھا ہوا خم دار چاقو ہاتھ میں لے لیا۔ میرے جسم میں برق دوڑ رہی تھی۔ ”آؤ ثروت!“ میں نے کہا۔

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد میرے ساتھ آگے بڑھی۔ ہم دروازے میں سے نکلے اور عقبی برآمدے میں آگئے۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ میں ایک دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ ثروت میرے پیچھے تھی۔ ہم حویلی کے پچھلے حصے، یعنی زنان خانے میں داخل ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ ہم زنان خانے کے پہلو سے گزرتے ہوئے چھوٹے گیٹ کے قریب پہنچ جائیں گے اور پھر باہر نکلنے کے لیے موقع کا انتظار کریں گے لیکن اچانک سامنے سے دو مسلح افراد آتے دکھائی دیے۔ ان کی نظر سے بچنے کے لیے ہم زنان خانے کے اندر گھس گئے... سامنے ہی بیمار باپو والا کمرا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کمرے کو وقتی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کروں۔ میں چاقو قمیص کے نیچے چھپا کر باپو کے کمرے میں گیا اور ساتھ ہی ثروت بھی آگئی۔

بیمار باپو گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ ان کا [illegible] ہاتھ ان کی گود میں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مزید پریشان ہوئے۔ بہت دھیمی آواز میں بولے۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے اکبر علی؟“

میں نے کہا۔ ”شاید آپ کو پتا نہیں کہ کچھ لوگوں نے حویلی پر ہلا بول دیا ہے۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی ہیں... اور سرتوں بی بی کا بھی کچھ پتا نہیں ہے۔“

یوں لگا کہ بیمار باپو سرتوں کی گمشدگی کے بارے میں پہلے سے جانتے ہیں۔ وہ سرتوں کے بارے میں میری اطلاع کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔ ”اور تمھیں کیا ہوا ہے؟ کہاں سے لگی ہیں تمھیں یہ چوٹیں؟“

”سیڑھیوں سے گر گیا ہوں۔“ میں نے بات بنائی۔

باپو نے مجھے اکبر علی کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ اس واقعے سے بے خبر ہیں جس میں مجھے مارا پیٹا گیا تھا اور مجھ پر دھماکا خیز مواد والا الزام لگایا گیا تھا۔

ایک دم میں چونک گیا۔ میری نگاہ اچانک ہی اس چھوٹے کمرے کی طرف اٹھ گئی تھی جو میں آرام کے لیے استعمال کرتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اس کے پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی ہے۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا اور دنگ رہ گیا... اندر ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی رچی تھی۔ کانوں میں اور گلے میں پھولوں کا زیور تھا۔ وہ ڈری سہمی ہرنی کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں چند سیکنڈ میں پہچان گیا۔ میں نے سرداروں کے خاندانی البم میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ سردار اوتار سنگھ کی بیٹی اور باپو کی پوتی سرتوں کور تھی۔ ساری حویلی میں لوگ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور وہ یہاں اپنے دادا کے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

باپو نے کہا۔ ”میری گل سنو اکبر علی! ادھر آؤ میرے پاس۔“

میں چھوٹے کمرے کا دروازہ بھیڑ کر باپو کے پاس چلا گیا... وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ میں نے کان ان کے ہونٹوں کے قریب تر کر دیا۔ وہ بولے۔ ”اکبر علی! سرتوں میری مرضی سے یہاں چھپی ہوئی ہے۔ اس وچاری کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے ماں پیو اس کا ویاہ اس کی مرضی کے خلاف کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا ہے پر یہ نہیں مانے۔ اب اس کا انت (انجام) ان کے سامنے ہے۔ ساری آن عزت خاک میں مل رہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”باپو! حویلی پر ہلا بولنے والے کون ہیں؟“

”یہ ننہالوں کے لوگ ہیں۔ ننہالوں سے ہی سرتوں کے رشتے کا جھگڑا چل رہا ہے۔ میں نے بڑا سمجھایا تھا پتروں کو، واہگرو کے واسطے دیے تھے لیکن انہوں نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھو ان کی اپنی اولاد ہی ان کے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔“ بوڑھے باپو کا اشارہ یقیناً سرتوں کی طرف ہی تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے سردار اوتار کو مجھ پر ”ننہالوں“ کا بندہ ہونے کا شک ہوا تھا۔

یکایک بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ کچھ لوگ اندھادھند گولیاں چلاتے ہوئے زنان خانے کے اس حصے کی طرف آرہے تھے۔ باپو گھبرا کر بولے۔ ”دیکھو! اگر اوتار سنگھ یا اس کا کوئی بندہ سرتوں کے بارے میں پوچھے تو اسے یہی بتانا ہے کہ وہ ادھر نہیں آئی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ثروت کے ساتھ تیزی سے اسی چھوٹے کمرے میں چلا گیا جہاں سرتوں پہلے سے موجود تھی۔ سرتوں نے اب خود کو لکڑی کی الماری کے پیچھے تاریک خلا میں چھپا لیا تھا۔ میں نے ثروت کو بھی الماری کے پیچھے بھیج دیا۔ چاقو اب پھر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آوازوں سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ باپو کے کمرے میں داخل ہونے والے حویلی کے افراد نہیں بلکہ ننہالوں کے لوگ ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر شخص ہانپی ہوئی بھاری آواز میں باپو سے کہہ رہا تھا۔ ”باپو جی! آپ کے پتر نے سرتوں کو کہیں چھپا دیا ہے... یا پھر مار دیا ہے۔ وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آرہی۔“

جواب میں باپو کی بہت مدھم آواز ابھری۔ ”پالے! سرتوں یہیں ہے میرے پاس... تم اسے لے جاؤ لیکن اگر اسے کچھ ہوا تو میں تمھیں کبھی شما نہیں کروں گا۔“

پالے دوبارہ بولا تو اس کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”نہیں باپو جی! آپ کی پوتی ہے تو میری دھی ہے۔ میں اپنے پران دے دوں گا لیکن اپنی دھی کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں وچن دیتا ہوں آپ کو۔“

اسی دوران میں باہر ہونے والی فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ پالے کے ساتھ آنے والے افراد شاید برآمدے کی طرف چلے گئے اور فائرنگ میں شامل ہو گئے۔

باپو نے سرتوں کو آواز دینے کے لیے غالباً جسم کی ساری طاقت صرف کر دی تھی۔ ”سرتوں... سرتوں... باہر آجا۔“ باپو کی بھرائی ہوئی کمزور آواز ابھری۔

سرتوں الماری کے پیچھے سے نکل آئی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ اپنے دادا... کی بات ماننے کے لیے اور پالے نامی بندے کے ساتھ جانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ میں، ثروت کے پاس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ سرتوں نے ذرا ایڑیاں اٹھا کر دروازے کی چٹخنی کھولی اور باہر نکل گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پالے نامی شخص اس لڑکے کا باپ یا چچا وغیرہ ہے جس سے سرتوں شادی کرنا چاہتی ہے۔ باہر جو بات ہو رہی تھی، اس میں مجھے ”ننکانہ صاحب“ کا نام بھی سنائی دیا۔ یقیناً یہ کوئی سنگین تنازعہ تھا جو بہت عرصے سے چل رہا تھا۔ بوڑھا باپو اس تنازعے میں اپنی پوتی کا طرف دار تھا۔ عین ممکن تھا کہ باپو کی عمر رسیدہ بیوی بھی اپنے شوہر کی ہم خیال ہو۔ شاید ہم اس کہانی کا کلائمیکس سین دیکھ رہے تھے۔

سردار اوتار سنگھ ایک نامی گرامی چودھری کی حیثیت سے لوگوں کے فیصلے کرتا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی کو انصاف نہیں دے سکا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ خود کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھی جن کو اپنے گھر والوں سے زیادہ اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔

فائرنگ اب بالکل ہمارے آس پاس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور حویلی کے دائیں حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا، سرخی مائل روشنی حویلی کے احاطے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک ٹریکٹر کی ڈیزل ٹینکی پھٹنے کا دھماکا تھا۔ پرالی کے بڑے بڑے ڈھیر پاس ہی پڑے تھے۔ انہوں نے بارود کی طرح آگ پکڑ لی۔ فائرنگ بھی مسلسل ہو رہی تھی لیکن اب اس کا زور بس ایک ہی جگہ نہیں تھا۔ حویلی میں ہر طرف افراتفری تھی۔ دھوئیں کے سیاہ مرغولے بڑی تیزی سے بلند ہوئے اور اس افراتفری میں اضافہ کرنے لگے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ سرداروں کی اس خونی حویلی سے نکلنے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ میں نے ثروت کا ہاتھ تھاما۔ میرے دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ ہم بڑے کمرے میں پہنچے تو بیمار باپو خون میں لت پت تھے۔ کسی جانب سے پرواز کر کے آنے والی کوئی گولی ان کے سر میں لگی تھی اور ان کے سفید کیس ”لہورنگ“ ہو رہے تھے۔ یقیناً اب وہ اس دنیا میں نہیں تھے...

ہمارے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں ان کے پاس رکتا، ان کو دیکھتا۔ ہم باہر نکل کر دھوئیں کے مرغولوں میں سے گزرے۔ ثروت نے اپنے منہ کو اوڑھنی کی دوہری تہ سے ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے بھی سانسیں روک لیں۔ جگہ جگہ

گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے اور دیواروں پر گولیوں کے سوراخ تھے۔ برآمدہ نما جگہ پر مجھے بھیانک چہرے والے است سنگھ کی لاش نظر آئی۔ گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی۔ اس کے پاس ہی مجھے ٹرپل ٹو رائفل اور گولیوں والی بیلٹ نظر آئی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اٹھالیں، چاقو دوبارہ لباس میں رکھا اور رائفل کو تیار حالت میں کرلیا۔ رائفل کے وزن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے میگزین میں اب بھی گولیاں موجود ہیں۔ بڑا پھاٹک تو ٹوٹ چکا تھا۔ چھوٹا پھاٹک بھی چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر پھاٹک تک ہمارا سامنا کسی سے نہیں ہوا۔ ہم پھاٹک میں تھے جب اوتار سنگھ کے ایک کارندے نے ہمارا راستہ روکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میری چلائی ہوئی دو گولیاں اس کی چھاتی میں لگیں اور وہ پھاٹک کے ستون سے ٹکرا کر دھوئیں میں گم ہوگیا۔ ثروت بری طرح کھانس رہی تھی۔ میرے سینے میں بھی سانس نہیں سما رہی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ جتنی جلدی یہاں سے دور ہوجائیں گے، اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔ ہم درختوں کی طرف بھاگے۔ اچانک ایک دھواں چھوڑتی گاڑی میرے پاس آکر رکی۔ یہ ایک لوڈر تھا، اس کے عقب میں چارا وغیرہ لدا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر یوسف بیٹھا تھا۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں اس کے چہرے پر نیم گول زخم کا نشان نمایاں نظر آرہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر پکارا۔ ''اندر آجاؤ۔''

میں اور ثروت لوڈر کی طرف لپکے۔ میرے دائیں ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفل تھی اور میں ٹریگر دبانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ یوسف نے گاڑی مکمل نہیں روکی۔ میں نے رینگتی گاڑی میں ثروت کو سوار کرایا مگر اس سے پہلے کہ میں بھی سوار ہوتا، یوسف نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اس کا دروازہ بھی کھلا ہی رہ گیا جو کچھ دور تک لہراتا رہا پھر ایک درخت سے ٹکرا کر بند ہوگیا۔

میں ششدر کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اگر یوسف جان بوجھ کر مجھے چھوڑ کر جا رہا تھا تو بہت بڑی غلطی کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس خطرناک صورت حال میں ثروت کی حفاظت نہیں کر سکے گا بلکہ شاید اپنی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ طیش کی ایک لہر سی میرے اندر ابھری۔ لوڈر مجھ سے پچیس تیس میٹر دور جا چکا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگادی۔ دس پندرہ سیکنڈ میں، میں اس کے نزدیک پہنچ گیا... نہ جانے اس وقت کیوں مجھے عمران کی روداد کا ایک منظر یاد آگیا۔ شاید وہ بدمعاش عورت ماجھاں بھی اسی طرح عمران اور راجا کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ دونوں چھکڑا لوڈر پر سوار تھے۔ پھر ماجھاں کے ہاتھ کا کڑا اچھے لوہے کے کنڈے میں پھنس گیا تھا۔ بہرحال یہاں سچویشن کچھ مختلف تھی...

یہاں کوئی بھی گاڑی کے عقبی حصے میں موجود نہیں تھا۔ بس چارے کے گٹھے تھے جو جھٹکوں کے سبب زور زور سے ہل رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ یوسف عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ سکا یا نہیں۔ بہرحال میں نے لوڈر کا جنگلا پکڑ کر جست لگائی اور چارے کے گٹھوں کے اوپر گرا۔ لوڈر اب رفتار پکڑ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ راستہ نسبتاً ہموار ہوگیا تھا۔ دائیں بائیں درخت تھے۔ عقب میں سرداروں کی حویلی سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھوئیں کے بادل گھٹا کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں اب رک رک کر آرہی تھیں۔ کچھ دور مجھے ایک دل خراش منظر نظر آیا۔ ایک گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اس کی چرمی زین کو آگ لگی ہوئی تھی۔ زین کے ساتھ ساتھ گھوڑے کی پشت کی چربی بھی جل رہی تھی۔ وہ درختوں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا میرے سامنے ایک جوہڑ میں جا گرا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے دو تین بھینسوں کو بھی دیکھا جو ڈکراتی ہوئی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں، یقیناً وہ بھی حویلی میں لگنے والی آگ سے متاثر تھیں۔ میں نے چارے کے گٹھوں پر اوندھے لیٹے لیٹے عقب میں دیکھا۔ کسی گاڑی کی روشنیاں دکھائی نہیں دیں، نہ ہی کوئی گھڑ سوار نظر آیا۔ مطلب یہ تھا کہ ہم تعاقب سے محفوظ رہے ہیں۔ وہاں اتنی افراتفری تھی کہ کسی کو کسی کا ہوش ہی نہیں تھا۔

میری پیشانی کی چوٹ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ پورا بدن جیسے چوٹوں کے سبب پھوڑا بنا ہوا تھا۔ یہ اذیت بھی تھی اور میٹھی بھی۔ درد کی ٹیسیں میرے اندر عجیب سی ترنگ بھر رہی تھیں۔ میں نے وہیں سبز چارے پر لیٹے لیٹے رائفل کو اچھی طرح چیک کیا۔ اس کے میگزین میں اب بھی سات گولیاں موجود تھیں۔ میں نے میگزین فل کرلیا اور رائفل کو الٹ پلٹ کر اس کے میکنزم کو سمجھ لیا۔ میں جانتا تھا کہ آج رات کسی بھی وقت مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے گی۔ بہرحال یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی جلدی پڑ جائے گی۔

یوسف گاڑی کو بھگاتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہاں جانا چاہ رہا تھا؟ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ وہی کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ وہ بس حویلی سے دور ہونا چاہ رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان اسے جدھر بھی بہتر راستہ نظر آتا، وہ اسی طرف ...

موڑ دیتا تھا۔ میں نے سوچا، کیا مجھے ان دونوں کو اپنے بارے میں بتانا چاہیے؟ یہ ذرا مشکل سوال تھا۔ ابھی میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار آہستہ ہوئی۔ ہم حویلی سے سات آٹھ میل دور آچکے تھے۔ میں نے کیبن کی چھت کے اوپر سے دیکھا، آگے راستہ بند تھا۔ ایک بڑی جیپ اس طرح کھڑی تھی کہ پہلو سے نکلنا دشوار تھا۔ جیپ کی چھت پر کافی ساز و سامان لدا نظر آرہا تھا۔ لوڈر کی ہیڈ لائٹس میں، میں نے دیکھا۔ یہ مچھلیاں پکڑنے والے جال تھے اور کیمپنگ کے لوازمات تھے۔ دو تنومند سکھ جیپ سے باہر کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یوسف نے لوڈر روک لیا۔ دونوں تنومند سکھ یوسف والی کھڑکی کی طرف آئے۔ ایک نے کہا۔

''سوری بھراجی! جیپ ذرا بند ہوگئی ہے۔ ابھی سٹارٹ کرلیتے ہیں... کہاں جانا ہے آپ نے؟''

''بس تھوڑی ہی دور۔'' یوسف نے گول مول جواب دیا۔

''جناب عالی! تھوڑی دور کا کوئی نام شام تو ہوگا نا؟'' دوسرے شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں تیسرا شخص بھی جیپ سے نکل کر لوڈر کی طرف آگیا۔ اس نے پتلون قمیص پہنی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کے ہونٹوں میں سگریٹ ہے اور وہ نشے کے سبب واضح طور پر لڑکھڑا رہا ہے۔ اس نے سب سے پہلے ثروت والی کھڑکی میں ہی دیکھا اور ہانک لگائی۔ ''او تینوں چین گے نصیبوں والے... نشے دیے بند بوتلے... ہو بند بوتلے۔''

اسی دوران میں پہلے والے دونوں سکھوں نے یوسف سے چند اور سوال پوچھے جن کے وہ مناسب جواب نہ دے سکا۔ پہلا شخص بولا۔ ''بھراجی! مینوں تے لگتا ہے کہ آپ نے آج رات راستہ بھولنا ہی بھولنا ہے۔ ہم کو آپ کی مدد کرنی چاہیے... ویسے آپ دونوں کہیں سے ''نس'' کر تو نہیں آئے؟''

یوسف بولا۔ ''آپ کیسی باتیں کرتے ہو سردار جی! کیا ہم آپ کو ایسے لگتے ہیں؟''

شرابی بولا۔ ''ایسے نہیں لگتے تو ویسے بھی نہیں لگتے۔ یہ حق معشوقی کرنا کوئی اپرادھ تو نہیں ہے یار جی۔''

''آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔'' یوسف کی سٹپٹائی ہوئی آواز آئی۔

سرخ پگڑی والے نے کہا۔ ''پریمی کو پریمی کہنا کوئی دشنام نہیں ہوتی سجن پیارے... تم نے وہ گانا نہیں سنا۔ پیار کیا ہے کوئی چوری نہیں کی...''

یوسف نے دوبارہ لوڈر اسٹارٹ کیا۔ غالباً وہ چاہ رہا تھا کہ وہ لوڈر کو ریورس کرکے دوسری طرف سے نکل جائے۔ فوراً ہی انجن بند ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی چابی کی چھن چھن سنائی دی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نوواردوں میں سے کسی نے پھرتی سے اگنیشن میں سے چابی کھینچ لی ہے۔ معاملہ بگڑتا جا رہا تھا۔

شرابی نے لہک کر کہا۔ ''چپ چپ بیٹھے ہو ضرور کوئی بات ہے... لمبی ملاقات ہے جی لمبی ملاقات ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی میں سے ثروت کے ساتھ کوئی چھیڑ کی۔

میں نے چانٹے کی آواز بالکل صاف سنی۔ یقیناً یہ ثروت کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ توقع کے عین مطابق تھا۔ شرابی شخص نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ثروت کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ ''یہ کر اچھا! اتنے سوہنے گال، مارنے کے لیے نہیں چومنے کے لیے ہوتے ہیں۔''

وہ ڈکرایا۔ ''اوئے چوچی ہے میری جتی۔ میں تو اس کا حشر نشر کردوں گا۔''

یوسف جلدی سے آگے آیا اور لرزتی آواز میں بولا۔ ''ہمارے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔''

شرابی اچو بولا۔ ''منتیں بھی کرتے ہو اور چھیڑیں بھی مارتے ہو۔ تمہاری تو...'' اس نے یوسف کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لوڈر کی سائڈ سے ٹکرایا اور کراہنے لگا۔ اس میں اتنا دم خم ہرگز نہیں تھا کہ ان ڈشکروں کی مزاحمت کرسکتا۔ وہ تائی لگا کر سارا دن کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنے والا شخص تھا۔ ان تینوں کی نیت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ان میں سے ایک سرخ پگڑی والا، قدرے بھلا مانس تھا لیکن باقی دونوں ایک دم حرصی غنڈے نظر آتے تھے۔ وہ شکار کے لیے نکلے ہوئے تھے... لیکن مچھلی کے بجائے ایک خوب صورت لڑکی جال میں آگئی تھی اور وہ اس صورت حال پر نہال نظر آرہے تھے۔

اسی دوران میں ان میں سے ایک نے لوڈر کے عقب کا معائنہ شروع کردیا۔ یقیناً وہ چارا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے پہلے میری ٹانگیں دیکھیں۔ پھر ناریچ چلائی اور تیزی سے میری طرف آیا۔

''اوئے، یہ کون ہے؟'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ٹرپل ٹو رائفل کا کندا بڑی طاقت سے اس کے منہ پر

مارا۔ وہ کسی ایسے حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اچھل کر ایک کیکر سے ٹکرایا اور پھر ثروت کے پاؤں کے پاس جا گرا۔

میں چھلانگ لگا کر نیچے آگیا۔ شرابی اجو خطرہ بھانپ کر جیپ کی طرف لپکا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتا ہے۔ میں نے بے دریغ اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی وہ چلایا اور تڑپ کر لمبی گھاس میں گرا۔ باقی دونوں افراد سکتے کی کیفیت سے نکلے اور مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے دیوانہ وار مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے ان کے چہروں پر ٹکریں رسید کیں اور ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ حوصلہ افزا صورت حال دیکھ کر یوسف نے ایک شخص کو عقب سے جکڑ لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر پانسا پلٹ گیا۔ میں نے ان دونوں افراد کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔ وہ باقاعدہ چلانے لگے۔ انہیں ایسی شدید مزاحمت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ان میں سے ایک تو خود کو چھڑا کر جنگل میں بھاگ گیا۔ دوسرا بھی اسی تاک میں تھا۔ جونہی موقع ملا، اس نے بھی دوڑ لگا دی۔ اتفاقاً ان دونوں بھگوڑوں کے رنگ برنگے موبائل فون وہیں پر گر گئے تھے۔

شرابی اجو سنگھ لمبی گھاس میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ٹریل ٹو کی گولی، دہکے انگارے کی صورت اس کی فربہ ران میں گھس گئی تھی۔ میں نے اسے ٹھوکر رسید کی اور اوندھا کر کے اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ ایک بٹوا اور چند دیگر اشیا ملیں۔ پھر میں جیپ کی طرف آگیا۔ جیپ میں سامانِ خورونوش موجود تھا۔ انڈین وسکی کی دو بوتلیں اور سگریٹوں کے پیکٹ پچھلی نشست پر نظر آرہے تھے۔ اگلی نشست کے نیچے سے ایک بھرا ہوا پستول بھی نکل آیا۔ اجو سنگھ یقیناً یہی پستول لینے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے پستول اپنی بیلٹ میں اڑس لیا اور وہ بیگ بھی اٹھایا جس میں قیمے والے پراٹھے، آلو کے تلے ہوئے قتلے اور کوک کے ٹن وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑے سائز کی گرم چادر بھی میں نے جیپ میں سے نکال لی۔

ثروت اور یوسف حیرت سے میری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ میری موجودگی سے ایک ہی وقت میں خوش بھی تھے اور پریشان بھی۔ میں نے ان سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ بس اتنا کہا۔ ”آگے راستہ بالکل نہیں۔ درخت ہی درخت ہیں۔ ہمیں گاڑی چھوڑنی پڑے گی۔“

یہ بات یقیناً یوسف کی سمجھ میں بھی آرہی تھی۔ دو ہی آپشن تھے۔ گاڑی چھوڑ دی جائے یا پھر واپس پلٹا جائے۔ پلٹنے میں شدید خطرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یوسف خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ”ضائع کرنے کے لیے [illegible] بالکل نہیں ہے تمہارے پاس۔ یہاں ایک فائر ہو چکا ہے۔ کسی وقت کوئی بھی یہاں تک آسکتا ہے۔ ہمیں جلدی [illegible] چاہیے اور بہتر ہے کہ ان کی جیپ پر سے تھوڑا بہت شکار کا سامان بھی اتار لیا جائے۔“

”وہ کس لیے؟“ یوسف نے پہلی بار زبان کھولی۔

”ابھی کچھ دیر پہلے جب ان غنڈوں نے تم سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو تو تمہاری زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ ہمارے پاس شکار کا سامان ہوگا تو بتا سکیں گے کہ شکار پر نکلے ہیں۔“

میرے خشک لہجے کو محسوس کر کے یوسف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور جیپ کی چھت پر بندھے ہوئے سامان کو کھولنے میں مدد کی۔ ہم نے ایک جال اور کچھ کنڈے وغیرہ سامان سے علیحدہ کر لیں۔ زمین پر گرے ہوئے دونوں موبائل فون ثروت نے اٹھا کر مجھے دے دیے۔ شرابی اجو سنگھ کو وہیں لوٹ پوٹ ہوتے چھوڑ کر ہم تیزی سے گھنے درختوں کی طرف بڑھ گئے۔ ٹریل ٹو رائفل کو چھپانے کے لیے اس چادر نے بہت مدد کی جو مجھے جیپ سے ملی تھی۔ میں نے یہ چادر بکل کی طرح اپنے اردگرد لپیٹ لی۔

مجھے ایک گھنٹا پہلے والا افسوسناک تجربہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ یوسف مجھے چھوڑ کر آنافاناً اوجھل ہوا تھا۔ اب وہ پھر کوئی ایسی حماقت کر سکتا تھا۔ میں یوسف اور ثروت کے پہلو میں چل رہا تھا مگر ہر وقت انہیں اپنی نظر میں بھی رکھے ہوئے تھا۔ عجب صورت حال تھی۔ ایک دو روز کے اندر ہی ہمارے تعلق میں کتنی دوری آگئی تھی۔ میں ثروت اور یوسف کے لیے بوجھ ہو رہا تھا اور اب وہ مجھے ہی اپنا دشمن سمجھ رہے تھے۔

یوسف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیا کوئی بیچ کا طریقہ نہیں ہو سکتا؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

ثروت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہم کسی پولیس اسٹیشن تک نہیں پہنچ سکتے؟“

”پہنچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پھر وہاں سے نکل نہیں سکتے۔ وہ لوگ سب سے پہلے ہم سے پاسپورٹ، ویزا مانگیں گے۔ اس کے بعد ہم جاسوس یا دہشت گرد قرار دیے جائیں گے اور ہم سے بے رحم قسم کی تفتیش کا آغاز ہو جائے گا۔۔۔ فی الحال تو کسی جگہ، کسی کے پاس پناہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ محبت سے یا زبردستی۔۔۔ چار پانچ دن بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا پھر ہی کسی طرف نکل سکیں گے۔“

”جگت سنگھ سے مدد نہیں لی جا سکتی؟“ ثروت نے پوچھا۔

”لی جا سکتی ہے پر ابھی نہیں۔ ابھی ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔“

”فون کر کے دیکھ لیں۔“ ثروت منمنائی۔

”ابھی ٹرائی کی تھی۔ اس کا فون بند ہے۔ ویسے بھی ابھی سگنل آرہے ہیں، کبھی نہیں۔“

سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میری ساری چوٹیں ٹھنڈی ہو کر زیادہ تکلیف دینے لگی تھیں۔ پیشانی کے عین اوپر سر سے بار بار خون رسنے لگتا تھا جسے میں ایک رومال سے پونچھتا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں پٹی بھی نہیں باندھی جا سکتی تھی۔

یوسف نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ مجھے سر کی یہ شدید چوٹ کیسے لگی ہے۔ ثروت نے بھی اس چوٹ کی کیفیت دریافت نہیں کی۔ یقیناً وہ دونوں اپنے طور پر خجالت بھی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے حویلی میں ایک خطرناک سچویشن میں مجھے تنہا چھوڑنے کی کوشش کی۔ خاص طور سے یوسف تو یقیناً خجل تھا اور اب اسے یہ بھی پتا تھا کہ میں دوبارہ اسے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنے دوں گا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں ہم لوڈروالی جگہ سے چار پانچ کلومیٹر آگے نکل آئے۔ ثروت بری طرح تھک چکی تھی۔ آخر وہ ایک جگہ بے بس ہو کر بیٹھ گئی۔ ہم نے بھی بوجھ اتارا اور بیٹھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر موبائل آن کیا اور جگت سنگھ کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ میرے والا موبائل تو سرداروں کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ یہ موبائل ان دو میں سے ایک تھا جو اجو سنگھ کے ساتھی بھاگتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ ایک بار پھر جگت سے رابطہ نہیں ہو سکا۔

میرے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔ میں یوسف سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے بس ایک ہی بات پوچھی۔ میں نے کہا۔ ”یوسف! تم نے ثروت سے کہا ہے کہ میں نے تمہیں ”پین کلر“ کے نام پر زہریلی گولیاں کھلانے کی کوشش کی۔ یہ جھوٹ کیوں بولا تم نے؟“

یوسف چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”ان سوالوں کے جواب کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے تابش! کسی محفوظ جگہ پہنچ کر جو پوچھنا ہو پوچھ لینا۔“

میں نے کہا۔ ”کون کہہ سکتا ہے کہ محفوظ جگہ پہنچنے تک تم میرے ساتھ ہو گے یا مجھے کہیں چھوڑ جاؤ گے۔ اگر تمہارے پاس میرے سوال کا جواب ہے تو ابھی دے دو۔“

یوسف میرا مصمم ارادہ دیکھ کر بولا۔ ”میں نے ثروت سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نے مجھے زہریلی گولیاں دی تھیں۔ میں نے بس یہ کہا ہے کہ ان کی ”ڈیٹ“ دو سال پہلے ایکسپائر ہو چکی تھی اور جس قسم کی وہ دوا تھی، وہ ایکسپائر ہونے کی صورت میں بندے کی جان بھی لے سکتی ہے۔۔۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے یوسف کہ تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے گولیوں کا جو پتا تمہیں دیا تھا اس پر خود ڈیٹ پڑھی تھی۔ وہ ایکسپائرڈ نہیں تھیں۔ مجھے ٹھیک سے یاد ہے۔“

”اب میں کیا کہوں۔“ یوسف کمزور آواز میں بولا۔ ”میں نے خود بھی ڈیٹ پڑھی ہے۔ بندے سے غلطی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو۔“

”اور تم سے نہیں ہو سکتی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہوگا۔ وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ میری بدقسمتی تھی کہ اس سفید جھوٹ کو موجودہ صورت حال بھی سہارا دے رہی تھی۔ وہاں چند گھنٹے پہلے، حویلی میں جو کچھ ہوا، وہ سراسر یوسف کے حق میں جاتا تھا۔ سردار اوتار نے اپنے درجنوں مہمانوں کے سامنے اپنا جرم میرے سر تھوپا تھا۔ کالی جیپ کے نیچے سے نکلنے والے تقریباً چار کلو دھماکا خیز مواد کا تعلق میرے ساتھ بنا دیا گیا تھا۔

اچانک فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ وہی اجو سنگھ کے ساتھی والا رنگ برنگا فون تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ مجھے امید تھی کہ شاید دوسری طرف جگت سنگھ ہو لیکن ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”ہیلو! میں انسپکٹر انوپ سنگھ بول رہا ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہارے حق میں بہت اچھا ہوگا۔ ہم تمہیں پوری سیکیورٹی دیں گے۔ جو کارروائی بھی ہوگی، قانون کے عین مطابق ہوگی۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ہمیں کیسے پتا چلے کہ تم واقعی پولیس والے ہو۔ اور اگر ہو بھی تو پولیس والوں کی بات پر اعتبار کرنا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر آواز ابھری۔ ”وشواس تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ تم نالے کا پل پار کر چکے ہو۔ نالے اور سوہا روڈ کے درمیان تین چار مربع کلومیٹر کے علاقے میں موجود ہو۔ ہمیں زیادہ دوڑاؤ گے تو پھر ہم سے رعایت کی آشا بھی نہ رکھنا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سے پہلے کچھ اور لوگ تم تک پہنچ جائیں۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ پولیس والا نہیں ہے۔ یہ ان شکاریوں میں سے کوئی ہو سکتا تھا یا پھر ممکن تھا کہ سرداروں میں سے کچھ لوگ ان شکاریوں تک پہنچے ہوں اور ان سے فون نمبر لے کر کال کر رہے ہوں۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں خطرات کے مہیب سائے رینگ رہے تھے۔ فون کرنے والے نے جو معلومات دی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں۔ ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے ایک برساتی نالے کا بوسیدہ پل پار کیا تھا۔

اپنی پیشانی کے اوپر سر میں سے بہنے والا خون بند کرنے کے لیے میں نے اس میں تھوڑی سی چکنی مٹی بھر دی۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں یوسف کو بتانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ آج رات کیا ہونے جا رہا تھا۔ اسے کس طرح دھماکے کا شکار بنایا جانا تھا اور کس طرح سردار اوتار کے مفرور بیٹے اشوکا سنگھ کی مشکلیں آسان ہونا تھیں... لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری کسی بات پر اعتبار نہیں کرے گا اور شاید ثروت بھی نہ کرے۔ میں جو بھی کہوں گا، یہ دونوں اسے کسی سازش کے زمرے میں لائیں گے۔

ہمیں وہاں بیٹھے آدھ پون گھنٹا گزر چکا تھا۔ ہم اٹھنے کی تیاری ہی کر رہے تھے جب اچانک مجھے جھاڑیوں میں ایک چمک سی نظر آئی۔ اس کے بعد سرسراہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی جانور تیزی سے گزرا ہو۔ یوسف اور ثروت بھی چونک گئے۔ ثروت نے ڈری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی جاندار اردگرد موجود ہے۔ وہ کوئی جانور ہو سکتا تھا، کوئی جنگل واسی یا پھر ہمارا کوئی دشمن۔

دفعتاً ایک برسٹ سے قرب و جوار لرز اٹھے۔ یہ برسٹ غالباً ہوا میں چلایا گیا تھا۔ گھونسلوں میں دبکے ہوئے بہت سے پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے محو پرواز ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نہایت کرخت آواز ابھری۔ ”خبردار! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔“

میں ایک لحظے میں پہچان گیا۔ یہ وہی آواز تھی جو ایک گھنٹا قبل موبائل فون پر سنائی دی تھی۔ یہ لوگ توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہم تک آن پہنچے تھے۔

”چلو نکلو۔“ میں نے ثروت اور یوسف سے کہا۔

وہ سامان اٹھا کر جھاڑیوں کی طرف لپکے۔ میں انہیں ”کور“ دیتا ہوا الٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ایک اور برسٹ چلا۔ میرے پاؤں کے اردگرد بھربھری مٹی کئی فٹ تک ہوا میں اچھلی اور شاخیں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے جوابی برسٹ چلایا۔ رات کا سناٹا تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اٹھا۔ کوئی چلایا اور زخمی ہو کر درختوں میں گرا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ بڑے قیامت خیز تھے۔ میں، یوسف اور ثروت کے پیچھے تھا۔ انہیں کور دیتا ہوا کبھی الٹے اور کبھی سیدھے قدموں بھاگ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چھوٹے برسٹ چلا رہا تھا۔ ہمارے اردگرد انگارے سے بکھر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اور شخص میری فائرنگ سے زخمی ہو کر گر گیا ہے۔ میگزین میں گولیاں کم تھیں۔ میں سنگل شاٹ چلانے لگا۔

یکایک مجھے لگا کہ فائرنگ ختم ہو گئی ہے۔ دو افراد زخمی ہو گئے تھے، تیسرا شاید اسے سنبھالنے میں لگ گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ تین ہی ہوں اور اگر زیادہ تھے تو پھر دو ٹولیوں میں ہو سکتے تھے۔ کوئی دوسری ٹولی ہمارے آس پاس نہیں تھی... فائرنگ ختم ہو گئی تو ہم زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یوسف کی ٹانگ میں پرانے زخم کی وجہ سے ابھی تک ہلکی لنگڑاہٹ موجود تھی تاہم ثروت پاؤں کی موچ سے پوری طرح ابھر چکی تھی اور تیزی سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔

...قریباً ایک گھنٹا مسلسل چلنے کے بعد ہمیں رکنے کے لیے ایک بڑی مناسب جگہ نظر آئی۔ غالباً تین چار ہفتے پہلے تیز آندھی کی وجہ سے یہاں دو تین درخت اوپر نیچے گرے تھے۔ ان تناور درختوں کے نیچے ایک خلا تھا۔ اس خلا کو اوپر سے زرد پتوں اور شاخوں نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اس خلا میں گھس کر خود کو پوری طرح کیموفلاج کیا جا سکتا تھا۔ یوسف اور ثروت تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ہم نے گرے درختوں میں موجود اس قدرتی پناہ گاہ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی یہ جگہ قدرے بلندی پر تھی۔ ہم اردگرد نگاہ رکھ سکتے تھے۔ پہلے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل کر اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی مدد سے جگہ کا جائزہ لیا۔ یوں لگا جیسے میں انسانی کوشش سے بنائی گئی کسی جھونپڑی میں آ گیا ہوں۔ یہ محفوظ تھی۔ یوسف اور ثروت بھی میرے ہی انداز میں اندر آ گئے۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔

ہم تینوں خاموش تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ چند گھنٹوں کے اندر جو کچھ بیتا تھا، وہ کسی ایکشن مووی کی طرح ذہن کے پردے پر متحرک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ثروت اور یوسف کی کیفیت بھی مختلف نہیں ہوگی۔ حویلی میں ننھیال برادری کے افراد بیمار باپو کی رضامندی سے اس کی پوتی کو کہیں لے گئے تھے۔ پتا نہیں کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ یقیناً سردار اوتار سنگھ جلے پاؤں کی بلی

ہوا ہوگا۔ وہ اور اس کے ہرکارے پورے علاقے میں دندنا رہے ہوں گے۔ یقینی بات تھی کہ وہ سرتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی تلاش کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ خاص طور سے یوسف ان کے لیے بہت بہت اہم تھا۔ وہ ان کے لیے منہ سے گر جانے والے نوالے کی طرح تھا... اور یہ نوالہ یقیناً سونے کا تھا۔ یہ نوالہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے لازماً جاوا گروپ کو خطیر رقم ادا کی ہوگی۔ آج رات وہ اسے چبا جانا چاہتے تھے مگر ان کے دانتوں کے نیچے آنے سے ذرا پہلے وہ گر گیا تھا۔

میں، ثروت اور یوسف کو اندر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ شکار کا سامان، جال اور کنڈیاں وغیرہ باہر پڑی تھیں۔ میں نے سب چیزیں ایک ایک کر کے اندر بھیج دیں... اور خود درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رائفل میری گود میں تھی۔ اس کے ٹھنڈے بیرل میں سے ابھی تک بارود کی بو آ رہی تھی۔ میں نے بیلٹ میں سے گولیاں نکال کر میگزین ایک بار پھر لوڈ کر لیا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ قیمے کے پراٹھوں والا چھوٹا بیگ باہر ہی پڑا رہ گیا ہے۔ میں نے وہ بیگ اٹھایا اور ثروت سے کہا کہ وہ اندر رکھ لے۔

''کیا ہے اس میں؟'' ثروت نے پوچھا۔

''کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔''

''لیکن اندر تو جگہ نہیں ہے۔ آپ باہر ہی رہنے دیں۔''

''نہیں، ان کو اپنے پاس رکھو۔ زیادہ محفوظ رہیں گی۔'' میں نے زخمی لہجے میں کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ گئی کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ یوسف نے مجھ پر یہ بھونڈا الزام لگایا تھا کہ میں نے اسے زہریلی گولیاں دینے کی کوشش کی ہے۔

میں باہر بیٹھا رہا۔ ٹھنڈ میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا تھا۔ بھاگ دوڑ میں تو جسم گرم تھا، اب پھر چونٹیں تکلیف دینے لگیں۔ اندر سے کبھی کبھی باتوں کی مدھم آواز آتی تھی۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے اندازہ ہوا کہ اندر انہوں نے پراٹھوں والا ٹفن کھولا ہے۔ کچھ دیر بعد خلا کے سرے پر ثروت کا ہیولا نظر آیا۔ وہ رومال پر رکھا ہوا پراٹھا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آپ بھی کھا لیں۔''

''نہیں، بھوک نہیں۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''تھوڑا سا لے لیں۔''

''نہیں۔''

وہ بوجھل انداز میں واپس چلی گئی۔

پتا نہیں کیوں میری آنکھوں کے گوشے بے ساختہ نم ہو رہے تھے۔ میں خود کو ایک دم بیگانہ محسوس کر رہا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر دشمن... ایک ایسا دشمن جس کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ جیب میں پستول اور وہ کسی بھی وقت یوسف کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ان لمحوں میں، میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا، اگر اس قسم کے حالات پیدا ہونے تھے تو پھر ثروت اتنی جلدی مجھے ملی ہی کیوں تھی؟ دل میں یہ آس تو رہتی کہ ابھی کسی موڑ پر اس نے پھر سے ملنا ہے۔ کوئی معجزہ ہونا ہے، کسی کرشمے نے جدائیوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ لیکن وہ مل گئی تھی اور پھر بچھڑ بھی رہی تھی۔ دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے۔ سرداروں کی حویلی میں، میں نے ثروت کی آنکھوں میں جو غیریت دیکھی تھی، اس نے سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ ایک ایسا زخم دیا تھا جس سے بہت دیر تک لہو بہنا تھا۔

...ثروت! میں ایسا تو نہیں تھا... میں تو کبھی ایسا نہیں تھا، پھر تم نے کیوں سوچا اس طرح؟ ساری دنیا مجھے ملزم ٹھہرا دیتی لیکن تم تو ایسا نہ کرتیں۔ تم تو کہہ دیتیں کہ نہیں، یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے پیار کیا ہے، بڑے صبر سے جدائیوں کا زہر پیا ہے اور آئندہ بھی پیے گا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو محبت کرتے ہیں اور محبت کے نام پر بڑی خاموشی سے ذبح ہو جاتے ہیں۔ اف تک نہیں کرتے۔ آہ تک نہیں بھرتے۔ یہ میری زندگی کو لہولہان کیسے کر سکتا ہے؟ یہ میرے شریک حیات کو مجھ سے کیسے چھین سکتا ہے؟ تم کو کہہ دینا تھا ایسے... میں نے تصور میں اسے مخاطب کیا۔

ہوا چل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ تیز ہوتی گئی۔ پھر اس نے آندھی کی سی شکل اختیار کر لی مگر ایک دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اس لیے اس آندھی میں گرد نہیں تھی۔ ہوا کی شدت دیکھ کر یوسف نے خلا میں سے سر باہر نکالا اور بولا۔

''تابش! اندر آ جاؤ۔ ہم نے جگہ بنا لی ہے...''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں... ویسے بھی میرا باہر رہنا ضروری ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے دوبارہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر خاموش رہ گیا... یوں لگتا تھا کہ اس نے بھی بس حجت ہی پوری کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ مجھے اندر بلانے کی اسے کچھ زیادہ چاہت نہیں تھی۔

ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کے ہیولے دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ خشک پتے اڑتے ہوئے آتے اور میرے چہرے سے ٹکراتے۔ تیز ہوا کی

موجودہ دور کے حقائق

1- ماں کے علاوہ کوئی وفادار نہیں۔
2- عزت صرف پیسے کی ہے، انسان کی نہیں۔
3- غریب کا کوئی دوست نہیں بنتا ہے۔
4- انسان جس شخص کے لیے دل سے مخلص ہو، وہی دکھ دیتا ہے۔
5- لوگ اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

(حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی، نور نگہ میانوالی)

لشکارے تھے۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بیرل کا رخ میرے سر کی طرف تھا۔ وہ جنونی انداز میں دہاڑا۔ ''خبردار! میں گولی چلا دوں گا... میں گولی چلا دوں گا۔''

وہ اتنے سخت تناؤ میں تھا کہ گھبرا کر بھی ٹریگر دبا سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اس نے ٹانگ کی زوردار ٹھوکر سے رائفل کو مجھ سے سات آٹھ فٹ دور کر دیا۔ پھر اسے ہاتھ سے اٹھا کر مزید کچھ پیچھے پھینک دیا۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی میرے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا رہا تھا۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ میں ہوا بن کر اڑ جاؤں گا... پستول دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے عین میرے سر کا نشانہ لیا اور چلا کر بولا۔ ''ثروت! بڑا بیگ لے کر باہر آ جاؤ۔''

چند سیکنڈ بعد ثروت ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل کر خلا میں سے باہر نکل آئی۔ دن کی روشنی میں اس کے رنجیدہ چہرے پر کئی خراشیں اور نیل نظر آ رہے تھے۔ نیل تو یقیناً کل رات کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ تھے جو سرداروں کی حویلی میں اس سے ہوئی تھی۔ خراشیں رات کے وقت درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرتے وقت آئی تھیں۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ یوسف کے قریب کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''یوسف! تم وہی بے وقوفی کر رہے ہو جو تم نے رات کو کی تھی۔ تم اکیلے یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔''

وہ پھر چنگھاڑا۔ ''ہمیں تمہاری ضرورت نہیں... نہیں ہے ہمیں تمہاری ضرورت... تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ دفع ہو جاؤ۔''

''مجھے تمہارا پیچھا کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ثروت سے بچنے کے لیے میں تھوڑا سا تر چھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اندر شاید یوسف اور ثروت تھک کر لیٹ گئے تھے۔ مجھے ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر حویلی کے خونی ہنگامے کی فلم سی چلنے لگی۔ یکایک میں چونک سا گیا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب سرتوں چھوٹے کمرے میں چھپی ہوئی تھی اور اس کا دادا نہالوں کے ''پالے'' ہی شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس گفتگو میں ننکانہ صاحب کا نام بھی آیا تھا۔ مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ جب چند روز پہلے میں پاکستان میں تھا اور جوہر پور کے قریب کریانہ فروش لطیف کے گھر میں رہ رہا تھا تو لطیف نے مجھے چودھری انور کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔ ان باتوں میں اس نے کسی ایسی سکھ لڑکی کا ذکر بھی کیا تھا جس کا کسی پاکستانی سکھ سے رومانس چلا تھا اور وہ اس سے شادی کرنے کے لیے کسی طرح ننکانہ صاحب پہنچ گئی تھی۔ مگر بعد میں اس لڑکی کو زبردستی پھر سے اس کے والدین کے پاس انڈیا بھیج دیا گیا تھا۔ اس لڑکی کو چودھری انور کے ذریعے ہی دوبارہ بارڈر پار کرایا گیا تھا... تو کہیں یہ سرتوں وہی لڑکی تو نہیں؟ میں سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اگر یہ واقعی وہی سلسلہ تھا تو پھر اس کو کوئی بڑا ڈرامائی انجام ہونے والا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ سرتوں نامی لڑکی پھر سے ننکانہ صاحب پہنچ جاتی۔

رات آخری پہر میں غنودگی محسوس کرنے لگا لیکن رائفل پھر بھی میری گود میں رہی... میری سماعت اردگرد کی آوازوں اور آہٹوں پر لگی ہوئی تھی۔ احتیاطاً میں نے موبائل بھی آف کر دیا تھا۔

☆☆☆

...میں نیم غنودگی کی کیفیت میں درخت کے سہارے نیم دراز تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دن چڑھ آیا ہے اور درختوں پر لاتعداد پرندے چہچہا کر ایک نئی صبح کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ پستول میری پتلون کی جیب میں نہیں ہے۔ مجھے اس کا وزن اور چبھن محسوس نہیں ہوئی۔ میرا ہاتھ بے ساختہ پتلون کی جیب پر آیا، جیب خالی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ پستول جیب سے پھسل کر گھاس پر گر گیا ہے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

''خبردار'' ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

میرے سامنے یوسف فاروقی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں خوف آمیز طیش کے

کی مجبوری دیکھ کر میں اس کے ساتھ یہاں آیا ہوں اور حالات نے ثابت کیا ہے کہ مجھے آنا چاہیے تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ تم ثروت کی مجبوری دیکھ کر نہیں، اپنی مجبوری سے یہاں آئے ہو۔ اور تمہاری مجبوری کیا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور شاید یہ بھی جانتی ہے... تم... تم صرف ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے کے لیے ہمارے ساتھ چمٹے ہوئے ہو۔ میں اتنا اندھا نہیں ہوں کہ دیکھ نہ سکوں، سمجھ نہ سکوں۔ انسانی ہمدردی کا جو بھوت تمہارے سر پر چڑھا ہوا تھا، میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے نصرت کی بیماری کو سیڑھی بنایا ہوا تھا، ثروت تک پہنچنے کے لیے۔ تمہارے پیٹ میں رات دن نصرت کے علاج کا جو مروڑ اٹھ رہا تھا، اس کی وجہ مجھے بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ تیرے جیسے خسیس کتے کسی کو دمڑی نہ دیں پر تو اور تیرا وہ دوست نصرت کے لیے حاتم طائی کی قبر پر لاتیں مار رہے تھے... میں سب جانتا ہوں۔ ایک ٹکے کا روزگار نہیں ہے تمہارا... وہ اتنی بڑی بڑی رقمیں کہاں سے آرہی تھیں؟ سب حرام کا مال تھا، کالے دھندوں کی کمائی تھی۔ بولو کمائی تھی یا نہیں؟" اس نے جنونی انداز میں پستول کو میرے سر کے کچھ اور قریب کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ٹریگر دبا دے گا۔

میں نے کہا۔ "تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں بحث کرنا نہیں چاہتے؟" وہ چلّایا۔ "رات کو تو تم پورے وکیل بنے ہوئے تھے۔ اپنی صفائی میں دلیلیں دے رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ وہ گولیاں زہریلی نہیں تھیں۔ اب بتاؤ وہ تھیں زہریلی یا نہیں؟ بتاؤ تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی یا نہیں... بتاؤ؟"

اس کا انداز ڈرانے والا تھا لیکن وہ مجھے ڈرا نہیں سکا۔ میں سکون سے بیٹھا رہا۔ ڈر صرف ایک بات کا ہی تھا کہ کہیں وہ خود ڈر کر گولی نہ چلا دے۔ میں نے کہا۔ "یوسف! دو ہی باتیں ہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو یا پھر تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اس نے پستول پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کی اور بولا۔ "اور یہ بھی غلط فہمی ہی ہے کہ کل رات تم نے مجھے راستے سے ہٹانے کی پلاننگ کی۔ جب ثروت نے تمہیں بتایا کہ کالی ٹیوٹا گاڑی پر مجھے یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے تو تم نے اس گاڑی کو شکار بنا لیا۔ اس کے نیچے بارود لگانے کے لیے گھس گئے... وہ ریموٹ کنٹرول ڈیوائس تم نے لگائی یا نہیں؟"

"میں بارود لگانے کے لیے نہیں اتارنے کے لیے گھسا تھا۔ تمہاری جان بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا تھا..."

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں۔ سارا پتا تمہیں ہی ہے۔ ہمیں تو بس غلط فہمیاں ہی ہو رہی ہیں۔ غلط فہمیوں کا ٹھیکا لیا ہوا ہے ہم نے۔ اور یہ ثروت تو ایک بے وقوف جاہل ہے کہ اپنا اچھا برا سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم اس کے سہاگ کو بچانے کے لیے اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے، اس کے ساتھ ہارون آباد جانے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔ پر یہ تمہیں بتائے بغیر بس اڈے چلی گئی۔ تم نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، اس کے پیچھے گئے۔ اس کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ ہوٹلوں کے کھانے زہر مار کیے، اپنی جان خطرے میں ڈالی، کس لیے؟ صرف اس لیے کہ اس کا سہاگ بچ جائے۔ تمہارے جیسے کزن تو سونے میں تولنے کے قابل ہوتے ہیں۔ چچا اور ماموں زاد بہنوں کی شادیاں خاندان سے باہر بھی ہو جائیں تو وہ پرانی باتیں بھولتے نہیں۔ ان کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی زندگی کو گل و گلزار بنانے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے اعلیٰ پائے کے خدائی خدمت گار ہوتے ہیں یہ کزن۔"

میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "یوسف! تمہارے اندر ایک شکی شوہر بول رہا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔"

"شٹ اَپ... آئی سے شٹ اَپ۔" وہ دہاڑا۔ "ایک لفظ اپنی گندی زبان سے نہ نکالنا... اور نہ ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کبھی مکھی تک نہیں ماری لیکن... لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو میں شوٹ کر دوں گا تمہیں۔ شوٹ کر دوں گا۔"

میں نے ثروت کی طرف دیکھا۔ سینے میں بھرا ہوا دکھ کا دھواں کچھ اور گہرا ہو گیا۔ ثروت کی آنکھوں میں مجھے اپنائیت کم اور خوف زیادہ نظر آیا۔ وہ واضح طور پر مجھ سے ڈری ہوئی لگتی تھی۔

یوسف الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ اس نے ٹریول ٹور اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکائی۔ ایک بیگ اپنے ہاتھ میں لیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نظریں مجھ پر سے نہیں ہٹائی تھیں۔ پستول اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔

"چلو ثروت۔" اس نے کہا۔

ثروت نے ایک بار بے بسی سے میری طرف دیکھا اور پھر شوہر کی ہدایت پر عمل کیا۔ یوسف نے ایک بار پھر خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ یہی وقت تھا جب اسے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ درمیانی فاصلہ دس بارہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ میں جھپٹا۔ اس نے لیٹے لیٹے گولی چلائی۔ دھوئیں کے سے شعلہ نکلا۔ گولی میرے چہرے کو سینٹی میٹرز کے حساب سے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کر سکتا، میں اس کے اوپر تھا۔ میں نے سب سے پہلے، اس کے پستول ہی کو دبوچا۔ پورے زور سے اس کی کلائی مروڑ کر میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ میں نے چند زوردار گھونسے اس کے نہایت گورے چٹے چہرے پر رسید کیے۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پیٹ میں لات رسید کی۔ پھر چہرے پر گھٹنے کی بھرپور ضرب لگا کر دور پھینک دیا۔ میرا دماغ انگارہ بنا ہوا تھا۔ میں نے مٹی میں لتھڑا ہوا پستول اٹھایا۔ رائفل ابھی تک یوسف کے کندھے سے جھول رہی تھی لیکن اسے استعمال کرنے کا اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اسے اس کے سیفٹی کیچ کا ہی پتا نہیں تھا۔ میں نے پستول اس کی گردن میں دھنسا دیا، وہ بلدی زرد گھاس پر چت پڑا تھا۔

"پلیز تابش!" ثروت لپک کر آگے آگئی۔

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "کتے! اگر میں تیری جان ہی لینا چاہتا تو اب تک بہت سے موقع ملے تھے۔ میں... اب بھی تجھے مار کر یہاں دفن کر سکتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ بتا مار دوں؟ چلا دوں گولی؟"

وہ سکتہ زدہ پڑا تھا۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چہرہ خون سے لتھڑتا چلا جا رہا تھا۔

ثروت تھر تھر کانپ رہی تھی اور بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے یوسف کی گردن پر سے پستول ہٹا لیا۔ اس کے کندھے سے رائفل بھی اتار لی اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔ "یوسف! تو بہت بڑا احسان فراموش ہے۔ اس کی سزا تجھے ضرور ملے گی۔ میں نہیں تو کوئی اور دے گا... اور یہ بھی یاد رکھ... تو آج مجھ سے جو بھی کہہ لے لیکن سچ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو ظاہر کر کے رہتا ہے۔ تیرا سچ بھی ضرور ظاہر ہوگا... اور شاید وہی تیری سزا بھی ہوگی۔"

اچانک میری جیب میں پڑے ہوئے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ فون میں نے دو گھنٹے پہلے ہی پھر آن کیا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی اور دل دھڑک اٹھا۔ یہ جگت سنگھ کا نمبر تھا۔ رات کو جب میں اس سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا، ایک مس کال اس تک پہنچی تھی۔ اب جگت "کال بیک" کر رہا تھا۔

میں نے اپنی نگاہ یوسف پر رکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ جگت کی آواز آئی... "ہیلو، کون؟"

میں نے تصدیق کے لیے کہا۔ "ہیلو! آپ کون ہیں؟"

"آپ کی مس کال آئی تھی۔" جگت فوری طور پر میری آواز نہیں پہچانا۔

اب تصدیق ہو چکی تھی کہ یہ جگت ہی تھا۔ میں نے کہا۔ "جگت! میں تابش بول رہا ہوں۔ بندۂ خدا کہاں ہو تم؟ پچھلے دس بارہ گھنٹوں میں بہت کچھ ہو چکا ہے۔"

"یہاں بھی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے بادشاہ زادے! دماغ کی بینڈ بج گئی ہے۔ تیرا اپنا موبائل فون کہاں ہے؟"

"وہ سرداروں کی حویلی میں رہ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تو خود نہیں ہے سرداروں کی حویلی میں؟"

"نہیں۔"

"یہ تو پھر بڑی چنگی گل ہے۔ وہاں تو بڑی تباہی مچی ہے۔ چھ سات بندے مرے ہیں۔ چودہ پندرہ زخمی ہوئے ہیں۔ ابھی تک آگ لگی ہوئی ہے وہاں۔ پر تم اس ویلے کہاں ہو اور چھوٹی تو خیر خیریت سے ہے نا؟"

"ہاں، خیریت سے ہے۔ ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ سرداروں کے لوگ ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزار لی ہے ہم نے، پر دن نہیں گزرے گا۔ تم کسی طرح ہم تک پہنچو۔"

"لے بادشاہ زادے! تو نے کہا اور ہم پہنچ گئے۔ تو ذرا اپنے آلے دوالے کے بارے میں بتا... اور اگر کوئی نشانی بھی آس پاس ہے تو اس کے بارے میں بھی تو دے مجھ کو۔"

ہم ذرا بلندی پر تھے۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ دور کچھ فاصلے پر ایک بھٹا خشت کا کھنڈر سا نظر آیا۔ میں نے اس بارے میں جگت سنگھ کو بتایا۔ وہ بولا۔ "میرے خیال میں یہ ایک نہیں دو بھٹے ہوں گے۔ ذرا غور سے دیکھ میرے

شہزادے۔" میں نے انکار میں جواب دیا تو وہ بولا۔ "نہیں نکلیں، دو ہوں گے۔ ذرا آگے پیچھے ہو کے دیکھ۔"

میں نے تھوڑا سا دائیں بائیں ہو کر دیکھا۔ جگت سنگھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ دوسرے بھٹے کا مینارہ پہلے بھٹے کی بالکل اوٹ میں ہو گیا تھا۔ یہ دونوں بھٹے نہ جانے کتنی مدتوں سے بند پڑے تھے۔ میں نے جگت کو بتایا کہ میں نے دوسرا بھٹا بھی دیکھ لیا ہے۔

وہ جوش سے بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا لیکن اب ایک کام کرنا ہے تم نے۔ جہاں پر ہو، وہاں سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہلنا نہیں۔ یہاں ہر جگہ سرداروں کے بندے گھوم رہے ہیں۔ روک روک کر لوگوں کی تلاشیاں لے رہے ہیں اور ان کو بے عزت کر رہے ہیں۔ ہم بڑے طریقے سے پہنچیں گے یہاں۔ بس تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور ایک گل تو میں بھول ہی گیا۔ چھوٹی کا پتی ملا ہے یا نہیں؟"

"ہاں مل گیا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں یوسف کو دیکھ کر کہا جو ابھی تک گھاس پر چت پڑا تھا۔

"مبارکاں... بہت بہت ودھائیاں۔ واہگرو نے تم کو سپل کیا ہے۔ چھوٹی تو اب خوش ہے نا؟"

"ہاں ہاں، خوش ہے... بس اب تم آنے والی بات کرو۔"

"سمجھو کہ ہم چل پڑے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے تم تک۔"

... اگلا ڈیڑھ گھنٹا بڑے اضطراب میں گزرا۔ یہاں بھی ایک گولی چل گئی تھی۔ ڈر تھا کہ اس گولی کی آواز جگت سنگھ سے پہلے ہی سرداروں کے ہرکاروں کو یہاں نہ پہنچا دے۔ میں نے یوسف اور ثروت کو دوبارہ درختوں کی قدرتی جھونپڑی میں بھیج دیا تھا اور خود باہر پہرا دے رہا تھا۔ ثروت اندر یوسف کا خون آلود چہرہ دھلا رہی تھی۔ دراصل یوسف رات ہی سے کسی موقع کی تاک میں تھا۔ تھکن کے سبب جب مجھے کچھ دیر کے لیے نیند آئی تو شکاری اجو سنگھ والا پستول میری پینٹ کی جیب سے پھسل کر گھاس پر گر گیا۔ تب تک اجالا ہو چکا تھا۔ پستول یوسف کو نظر آ گیا۔ یہ موقع اس کے لیے بڑا غنیمت تھا۔ اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

قریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ جگت سنگھ ہمارے آس پاس پہنچ چکا ہے۔ درختوں میں کچھ لوگوں کے حرکت کرنے کے شواہد تھے۔ پھر جگت کی کال بھی آ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں ایک مختصر سا جلوس نظر آیا۔ دس پندرہ بندہ تھے۔ دیکھنے میں یہ ارتھی کا جلوس تھا۔ چارپائی پر کوئی فربہ سدھ لیٹا تھا۔ چھ سات افراد چارپائی کو کندھا دیئے لا رہے تھے۔ ان میں چوڑا چکلا جگت سنگھ سب سے نظر آیا۔ اس کا چھوٹا بھائی گوبندر بھی اس مختصر جلوس میں شریک تھا۔

وہ لوگ سیدھے ہمارے پاس پہنچے اور ڈر... والے انداز میں چارپائی درختوں کے نیچے رکھ دی۔ اُدھر دیکھ کر جگت سنگھ میرے پاس آیا... میرے چہرے پر چوٹوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ "اوئے! یہ کیا کیا ہے... زادے! یار بیلی ہر چیز رل مل کر کھاتے ہیں، تم نے اکیلے ہی مار کھا لی اور وہ بھی پیٹ بھر کے۔"

"بس ہو گیا تھا کچھ ایسا... اور یہ چارپائی پر... ہے؟"

"ہے ایک مریض... ڈاکٹروں نے لاجواب کر... اسپتال سے واپس بھیج دیا ہے، اس کو اس کے پنڈ پہنچانے... پر تو بتا، چھوٹی اور اس کا پتی کہاں ہیں؟"

"اندر... ان ٹہنیوں کے پیچھے۔" میں نے قدرتی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا پتی ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟ میرا مطلب... کوئی چوٹ شوٹ؟"

"نہیں، کوئی ایسی خاص نہیں۔"

"پھر تو اتنا چپ چپ کیوں ہے... کوئی خوشی نہیں... تیرے چہرے پر؟"

"تیرا کیا خیال ہے، مجھے قہقہے لگانے چاہئیں... ہم جانی دشمنوں کے گھیرے میں ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو... ہے ہمارے ساتھ۔"

"اوہ، اب کچھ نہیں ہو گا میرے جگر کے ٹوٹے... (ہم) آ گئے ہیں نا۔ سب سنبھال لیں گے۔"

"یہ چارپائی پر واقعی کوئی مریض ہے یا ڈ... ہے؟"

جگت دھیمی آواز میں بولا۔ "مریض بھی ہے اور... بھی۔ یہ بندہ واقعی کینسر کا مریض ہے۔ دلی کے ڈاکٹروں نے لاعلاج کر کے بھیج دیا ہے۔ یہ لوگ اسے واپس پنڈ... جا رہے ہیں چارپائی پر ڈال کر۔ ترشولا سے تم... آگے تک ٹریکٹر ٹرالی پر آئے ہیں، اب پیدل جا رہے... ان میں سے ایک بندہ گوبندر کا واقف نکل آیا ہے... یہ اسی پنڈ کے ہیں جہاں گوبندر کا رشتہ ہونے والا ہے... نے کہا کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ آپ...

...ی بھی ہو جائے گی۔"

"اسلحہ وغیرہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

جگت سنگھ نے اپنی ڈبی دار سوتی چادر کی بکل ذرا سی کھولی۔ "یہ دیکھ، یہ ہے تیری لاڈلی ایل ایم جی۔ اس کی گولیاں دکھرے تھیلے میں ہیں فروٹ کے نیچے۔ دو اور رائفلیں بھی ہیں، وہ بھی اسی طرح بکلوں میں ہیں۔ دو تین پستول بھی ہیں یار لوگوں کے پاس۔ اس کے علاوہ آدھی درجن کالے لا رہے ہیں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کتنے لوگ ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"ہم گوبندر سمیت کل نو بندے ہیں۔ اگر کہیں سرداروں سے ٹاکرا ہو گیا تو دیکھنا چھکے چھڑا دیں گے... پر یار! تو نے بتایا نہیں تیرے موبائل پر رات کو بول کون رہا تھا؟"

"وہ اوتار کا بیٹا ہری سنگھ تھا۔ اس وقت انہوں نے مجھے پکڑا ہوا تھا۔"

"لگتا ہے کہ لمبی اسٹوری ہے۔ چل پھر پنڈ پہنچ کر ہی سنیں گے۔"

مریض کے وارثوں کے پاس کھانے پکانے کے برتن، بستر اور کپڑے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سامان وہ اسپتال میں قیام کے دوران میں استعمال کرتے رہے تھے۔ دور دراز دیہات میں رہنے والے لوگ اسی طرح بمع فیملی اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ میرے اور یوسف کے کپڑے بہت خستہ حال تھے۔ میری شرٹ پر خون کے بڑے بڑے داغ بھی تھے۔ گوبندر سنگھ نے مریض کے لواحقین کو بتایا کہ کچھ بدمعاشوں نے ہم دونوں کو مارا پیٹا ہے... اور ہمارے حلیے خراب کیے تھے۔ گوبندر کے کہنے پر ان لوگوں نے دو جوڑے ہمیں فراہم کر دیے جو میں نے اور یوسف نے پہن لیے۔ یہ قریباً ہمارے ناپ ہی کے تھے۔ دراصل دھوتی کا تو کوئی ناپ ہی نہیں ہوتا، کرتے ہمیں ٹھیک آئے۔ جگت نے ثروت کو ایک بڑی سی دیہاتی چادر فراہم کر دی جس نے اسے سرتاپا چھپا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم جگت اور گوبندر کے ہمراہ، چارپائی کے پیچھے پیچھے روانہ ہو رہے تھے۔ جگت اور اس کے ساتھی باری باری چارپائی کو کندھا بھی دے رہے تھے۔ جگت نے کہا تھا... گاؤں پہنچنے تک مجھ سے میری روداد نہیں سنے گا... وہ صبر نہیں کر سکا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا... "یار! وہاں حویلی میں تو بڑا کہرام مچا ہے۔ پتا چلا ہے کہ سردار اوتار سنگھ کی دھی کا معاملہ تھا۔ وہ کسی پاکستانی مسلمان سے پریم کرتی تھی۔ کوئی سکھ منڈا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھاگ کر پاکستان بھی چلی گئی تھی۔ پر یہ لوگ اسے واپس لے آئے۔ اب زور ازوری اس کا ویاہ کر رہے تھے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی ننکانہ صاحب والا معاملہ تھا جس کا تھوڑا سا تذکرہ کریانہ فروش لطیف نے کیا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں جگت! کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ اب کیا حالات ہیں، کچھ پتا چلا ہے لڑکی کے بارے میں؟"

"بس یہی کہ ننہال برادری کے لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب وہ کچھ دن اسے کہیں چھپا کر رکھیں گے، پھر ہو سکتا ہے، کسی طرح پاکستان بھیج دیں یا وہ منڈا یہاں آ جائے اور لڑکی کے ساتھ پھیرے کر لے۔ وہ ننہال برادری کا ہی منڈا ہے۔ ننہالوں کے کچھ رشتے دار یہاں انڈیا میں ہیں، کچھ پاکستان میں۔"

"اور کیا پتا چلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس وہی خون خرابے کی باتیں ہی ہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "اس لڑائی میں ننہالوں کے تین اور سرداروں کے چار بندے مارے گئے ہیں۔ مرنے والوں میں لڑکی کا دادا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ کس کی گولی سے مرا ہے۔ حویلی کا بھی کافی نقصان ہوا ہے۔ کچے حصے میں چھتیں گر گئی ہیں۔ پکے حصے میں دیواروں میں تریڑیں پڑ گئی ہیں۔ دو تین تھانوں کی پولیس بھی آ گئی ہے وہاں۔ لیکن تم بتاؤ، تم کیسے نکلے وہاں سے؟"

"بس اسی بھگدڑ اور افراتفری میں ہمیں نکلنے کا موقع مل گیا۔"

"تم کہتے ہو کہ تمہیں سردار اوتار نے پکڑ لیا تھا؟"

"ہاں، وہی یوسف والا چکر جو تمہیں کل بتایا تھا۔ ان کمینوں نے یوسف کی گاڑی کے نیچے بارود لگایا ہوا تھا۔ ڈائنامیٹ کے ساتھ آٹھ ڈنڈے تھے۔ تمہارے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے سب کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ اب یوسف کی جان چلی جائے گی تو میں نے گاڑی کے نیچے گھس کر بارود اتار لیا۔ اس دوران میں پہرے داروں نے مجھے دیکھ لیا اور پکڑ لیا۔ بہت سے مہمان موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ سردار اوتار نے بات بنائی کہ بارود" میں نے "گاڑی کے نیچے لگانے کی کوشش کی ہے۔ میرے بعد ثروت کو بھی پکڑ لیا گیا..." میں نے ساری بات جگت کو بتائی۔

وہ بڑی حیرت سے سنتا رہا۔ اس بات پر وہ سخت افسردہ نظر آیا کہ یوسف میرا احسان مند ہونے کے بجائے مجھے شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کچھ ناراض بھی ہے۔

جگت بڑا جہاندیدہ شخص تھا۔ وہ بہت پہلے سے جان چکا تھا کہ میرا ثروت کا جذباتی تعلق موجود ہے۔ اس نے جو پور میں مجھ سے اس کی تصدیق بھی کرنی چاہی تھی مگر میرے خشک جواب کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ اب بھی وہ ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جگت! یہ جو کچھ بھی ہے ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بارے میں تم یوسف یا ثروت سے کوئی بات نہیں کرو گے اور اگر تم نے کی تو پھر میرا تمہارا تعلق بالکل ختم۔“

اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ تاہم وہ پُرتحمل انداز میں بولا۔ ”بادشاہ زادے! تجھے کہا ہے نا، آپاں یاروں کے یار ہیں۔ جو یار نے کہہ دیا، وہ پتھر پر لکیر ہو گیا۔ آپاں اس بارے میں جیتے جی زبان نہیں کھولیں گے۔ باقی تمہاری ساری کہانی بڑی چنگی طرح سمجھ میں آ گئی ہے اور کہانی بھی کون سی نئی ہے۔ وہی سدا کا رونا۔ پریم... وچھوڑا... شادی اور پھر وہی جیون کا روگ۔“

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”گوبندر کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔“

”نہیں بتاؤں گا۔“

”وچن ہے؟“

”وچن ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ایک جگہ ہمیں چند مسلح گھڑ سوار نظر آئے۔ ان کی رنگ برنگی پگڑیاں گھوڑوں کی چال کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ اندیشہ تھا کہ یہ سرداروں کے ہرکارے ہیں۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے مجھے اور یوسف کو اپنے درمیان کر لیا۔ یوسف کے حلیے کو مزید تقویت دینے کے لیے اس کے سر پر سامان کی ایک گٹھڑی بھی رکھ دی گئی۔ گھڑ سوار ہمارے قریب سے ہمیں گھورتے ہوئے گزرے۔ ایک شخص نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”لنگڑی پورہ۔“ جگت سنگھ نے جواب دیا۔

”رستے میں کوئی شہری بندہ تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں جی۔“ جگت نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

”کوئی شہری کڑی؟“

”نہیں چودھری جی۔“

گھڑ سوار کچھ مزید قریب آ گئے۔ وہ شکلیں دیکھ رہے تھے۔ چادر کے نیچے میرے ہاتھ بے ساختہ رائفل کے دستے کی طرف رینگ گئے۔ یقیناً جگت وغیرہ بھی الرٹ ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں چارپائی پر لیٹا ہوا مریض بُری طرح کھانسنے اور ابکائیاں لینے لگا۔ اسے اٹھانے والوں نے چارپائی نیچے رکھ دی اور پانی وغیرہ پلانے میں مصروف ہو گئے۔ گھڑ سوار گھوڑے دوڑاتے اور مٹی اڑاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

جگت سنگھ نے کہا۔ ”یہ سرداروں کے پالتو کتے ہیں، مجھے پورا وشواس ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پولیس والے ہوں، سادہ کپڑوں میں۔“

”نہیں یار! پولیس یا پی ایس ایف والے کو میں میل دو میل دور سے دیکھ کر پہچان لیتا ہوں...“

”اور چھ میل دور سے اس کی بو سونگھ لیتے ہیں بھائی...“ گوبندر نے بڑے بھائی کا فقرہ مکمل کیا... اور معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ رات کو مجھ سے فون پر رابطہ کرنے والا بھی کوئی انسپکٹر... سرداروں کا ہی کارندہ تھا۔

☆☆☆

ہم جس گاؤں میں پہنچے اس کا نام عجیب تھا... لنگڑی پورہ... پنجاب کے دیہات میں اکثر نام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہم جس گھر میں اترے، وہ جگت کے چھوٹے بھائی گوبندر کا ہونے والا سسرال تھا۔ اس گھر میں گوبندر کی ہونے والی بیوی رجنی کور اور اس کی بوڑھی ماتا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ رجنی کور بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود وہ شہری رنگ ڈھنگ کی لڑکی تھی۔ ماتا کی نظر خاصی کمزور تھی اور وہ دن کے وقت بھی بمشکل دیکھ پاتی تھی۔ میں نے جگت سے مشورہ کر کے ثروت اور یوسف کا اندرونی کمرا دیا۔ آج سویرے والے واقعے کے بعد... یوسف پر اعتبار کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں نے جگت کو بھی کہہ دیا تھا کہ گھر میں یوسف کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے۔

جگت کے باقی ساتھی جو صورتوں سے ہی ... کرنے والے لوگ نظر آتے تھے، ایک نزدیکی گاؤں چلے گئے تھے۔ یہاں ہمارے علاوہ صرف گوبندر ہی تھے۔ پھر گوبندر بھی چلا گیا۔ میں نے جگت سے پوچھا۔

”وہ کہاں گیا ہے؟“

جگت وسکی کے پوّے میں سے گھونٹ بھر کر بولا۔ ”جو پور۔ کل سویرے تک آ جائے گا۔“

”خیریت ہے؟“

”آ ہو یار! وہ آشا کو لینے گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کچھ دن یہاں رہنا پڑے۔ گوبندر کی ہونے والی وہوٹی واستان کی تیاری کر رہی ہے۔ ہماری روٹی شوٹی کون پکائے گا؟“

پتا نہیں کہ گوبندر کو اس طرح کے موقع ویسے ہی مل جاتے تھے یا جگت جان بوجھ کر دے دیتا تھا۔ اب جگت یہاں تھا اور گوبندر آشا کو لینے گیا ہوا تھا۔ رات کو ان دونوں نے کیسے ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع ان دونوں ”چور پریمیوں“ کے لیے بڑے قیمتی تھے۔

مجھے یہ ساری فیملی ہی کچھ کھلی ڈلی لگتی تھی۔ کہنے کو یہ لوگ دیہاتی تھے لیکن شہریوں سے زیادہ ایڈوانس نظر آتے تھے۔ گاؤں میں اپلے تھاپنے والی لڑکیوں کے پاس بھی موبائل موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سیل فون اور اس سے وابستہ قباحتوں کے حوالے سے انڈیا، پاکستان سے بھی آگے ہے۔ رجنی کور قلانچیں بھرتی ہوئی آئی اور اپنا گورا چٹا کندھا جگت سنگھ کے سامنے عریاں کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو وڈے بھا... آپ کے لاڈلے بھرا نے کیا کیا ہے؟“

کندھے پر گہرا نیل نظر آ رہا تھا۔ ”یہ کیا ہے رجو؟“ جگت نے پوچھا۔

”یہ چونڈی کاٹی ہے آپ کے لاڈلے نے۔ مجھ سے کہتا تھا اوپر چھت پر آؤ۔ میں نہیں مانی تو چونڈی وڈ کر چلا گیا۔“

جگت سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”آپ ہنس کر ٹال دیتے ہیں، اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ پر اتنا ظلم کرتا ہے، بعد میں کیا کرے گا۔ پچھلی بار پولی میں نے کہہ دیا تم اتنے بڑے کھلاڑی ہو، مجھے بھی تھوڑی سی جوڈو دکھا دو... چھت پر لے گیا اور ایسے شکنجہ لگایا مجھے کہ میرا سانس رکنے لگا۔ بے بے نے مشکل سے جان بچائی میری۔“ جگت ہنس ہنس کر سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بولتی جا رہی تھی۔ بڑی شوخ تھی۔ میرے دل سے ہوک سی اٹھی۔ کوئی زمانہ تھا، ثروت بھی ایسے ہی ہوا کرتی تھی۔

جگت نے بہت کہا کہ میں اپنے سر کی چوٹ کا کچھ علاج کروں لیکن مجھے ان چوٹوں کی طرف سے غافل رہنا اچھا لگ رہا تھا... رات کا کھانا رجنی اور ثروت نے مل کر بنایا۔ تاہم کھانا سرو کرنے کے لیے رجنی ہی آئی۔ ثروت اپنا اور یوسف کا کھانا کمرے میں لے گئی تھی۔ رجنی میرے سامنے ماش کی دال اور مکی کا پراٹھا رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ خاص آپ کے لیے ہے ویر جی! ثروت دیدی کہہ رہی تھیں کہ آپ شوق سے کھاتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ بھوک کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے جگت سنگھ اور رجنی کا ساتھ دینے کے لیے بس ایک دو لقمے زہر مار کیے۔ رجنی ٹھنک کر بولی۔ ”آپ کھا کیوں نہیں رہے؟ ثروت دیدی کہہ رہی تھیں، آپ نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

”ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ بھوک ہوئی تو خود کہہ دوں گا۔“

”کہیں آپ میں اور ثروت دیدی میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟ آپ ایک دوجے کی طرف دیکھ کر بات بھی نہیں کرتے۔“

جگت سنگھ نے ذرا گھور کر رجنی کو دیکھا تو وہ خاموش ہو گئی... اس کے مزید سوال جواب سے بچنے کے لیے میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

حسبِ عادت بستر کے بجائے ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ جسم پھوڑا بنا ہوا تھا۔ اسے نرم بستر اور دوا دارو کی ضرورت تھی لیکن میں ایسی آسائشوں کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد جگت سنگھ بھی میرے پاس چلا آیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ”بادشاہ زادے! کچھ اور نہیں تو یہ اپنے سر کے پھٹ پر ہی کوئی مرہم پٹی کروا لو۔“

”نہیں، خود ہی ٹھیک ہو جائے گا اور دیکھنا جلدی ٹھیک ہوگا۔“

”تم وکھری ٹائپ کے بندے ہو۔ لگتا ہے کہ کوئی جنگل واسی آبادی میں آ کر رہنے لگا ہے۔ شاید تم جان بوجھ کر اپنے شریر کو تکلیف میں رکھتے ہو۔ شریر کو اور من کو بھی۔“

”کیا مطلب؟“

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر وسکی کا ایک آتشیں گھونٹ لیا اور بولا۔ ”بادشاہ زادے! تجھے بڑا پسند کرنے لگا ہوں میں۔ مجھے لے تجھ سے کوئی عشق سا ہو گیا ہے۔ کسی بڑے کی طرح تیری عزت بھی کرتا ہوں۔ یار بیلی کی طرح تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں اور وڈے بھرا کی طرح تجھ پر لاڈ بھی آتا ہے۔ ایک گل کرنا چاہتا ہوں تجھ سے... بُرا نہ ماننا۔“

میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”کہو۔“

”بادشاہ زادے! دنیا دیکھی ہے میں نے۔ جس دن میں نے تجھے اور چھوٹی کو دیکھا تھا، اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم پریمی ہو یا پھر کسی وقت پریمی رہے ہو۔ اب میں نے چھوٹی کے پتی دیو کو بھی دیکھ لیا ہے اور اس سے باتیں شاتیں بھی

کرلی ہیں۔ اتنی جلدی کسی بندے کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا پر میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ بندہ چنگی طبیعت کا نہیں ہے۔ میں نے جو پور میں بھی تجھے اس کے بارے میں بتایا تھا نا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"وہی اس کے پچھن، اس کا بڑی مہنگی طوائف کے ساتھ رات گزارنا اور پھر اس پر بالکل لاٹو ہو جانا۔ اسے منہ مانگی رقم پر اپنے حق میں بٹھانے کی گل کرنا۔ اور یہ تو اس کا بس ایک ہی کارنامہ ہے نا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے کئی اور بھی گل کھلا رکھے ہوں..."

"تم کہنا کیا چاہتے ہو جگت؟"

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "یارا! یہ چھوٹی بڑی معصوم ہے۔ بالکل کبوتری کی طرح۔ یہ ایسے جنگلی بلے کے ساتھ جیون کیسے گزارے گی؟ ابھی تو ان کے ویاہ کو بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کوئی بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے ان کا۔ یہ اپنے اپنے رستے وکھرے کر سکتے ہیں۔"

"وہ عاقل بالغ ہے جگت! وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے۔"

"بادشاہ زادے! فیصلے تو وہ تب کرے گی نا جب اس کو کچھ پتا ہوگا... وہ تو انجان ہے۔ تمہیں پتا ہے اور تم کچھ بتاتے نہیں ہو۔ یہ تو کوئی گل نہیں یار... ایک سجن بیچارا اندھے کھوہ میں گرنے والا ہو، ہمیں پتا بھی ہو اور ہم اسے کچھ بتائیں نہ... اسے روکنے کی کوشش نہ کریں۔"

میں نے کہا۔ "یار! وہ اتنی انجان بھی نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ اندازہ ہے اسے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اسے سب کچھ پتا چل جائے تب بھی وہ شاید اپنی آنکھیں بند کرلے گی۔ وہ شوہر پرستی میں بہت آگے نکلی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف سوچنے کو بھی گناہ سمجھتی ہے..."

"لیکن میری بات کا برا نہ ماننا... وہ تم سے پریم بھی کرتی ہے۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

"وقت نے ان دو آنکھوں کو بہت کچھ دکھایا ہے بادشاہ زادے! چہرے اور من کے کنکشن کی بڑی جانکاری ہے آپاں کو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ اس کے مضبوط دانت تھوڑا اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے جو اس کی سخت جانی اور جسمانی طاقت کے غماز تھے۔

"ہر بندے کے بارے میں ہر اندازہ درست ثابت نہیں ہوتا جگت سنگھ۔"

"پر کچھ بکھیڑے ایسے ہوتے ہی یارا جو ہر ملک میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔" پتی پتنی اور... بکھیڑا بھی ایسا ہی ہے۔ بڑی پرانی اسٹوری ہے۔ میں نے ان دو چار دنوں میں بڑا کچھ دیکھ لیا ہے یارا۔ یہ بندہ ان شوہروں میں سے ہے جو خود تو اپنے آپ کو ہر کام سے آزاد سمجھتے ہیں لیکن اپنی پتنیوں کی ذرا ذرا سی بات پر ... کرتے ہیں۔ اور جب شک کرنے کا چنگا بھلا کارن ہو... یہ شک اگ کا بھبھڑ بننے لگتا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو... لاہور سے انڈیا تک کا سفر "چھوٹی" کے ساتھ کیا ہے... یا نہیں؟ رات دن اس کے ساتھ رہے ہو۔ میرے گھر اکٹھے ایک کمرے میں رہتے رہے ہو۔ یہ ساری باتیں پھر... نے اسے بتائی ہوئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ان باتوں سے ... لیے اسے شما کرے گا۔ ان کا جیون اور بھی کٹھنائی میں پڑنے والا ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "جگت! مجھے تمہاری عقل سمجھ پر شک نہیں۔ پر میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ اور طرح کا معاملہ ہے۔ تمہاری چھوٹی کے دماغ میں کچھ ایسے وہم بیٹھ گئے ہیں جن کو نکالنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ تم اس بارے میں سوچ کر خوامخواہ اپنا دماغ پور مت کرو... تم اگر کر سکتے ہو تو کسی طرح میرے لیے ایک کام کردو۔"

"میرے سوہنے! تو ترلا منت کرتا ہے تو میں زمین میں دھنس جاتا ہوں۔ تو ایسا مت کیا کر۔ بس آرڈر دیا کر مجھے۔ بتا کیا کرنا ہے؟"

"کسی طرح ہمیں پاکستان واپس بھیجنے کا وسیلہ کر دے۔ میں جانتا ہوں، بارڈر کے آر پار تیرے جاننے والے ہیں۔ بی ایس ایف والوں سے بھی تیرا لنک ہے۔ تو ایسا کر کہ ہم جس طرح آئے ہیں، اسی طرح واپس چلے جائیں۔"

وہ اداس ہوگیا۔ "تو تو واپس چلا جائے گا؟"

"او ئے تو بھیجے گا تو جاؤں گا نا۔"

"اب تو نے آرڈر کر دیا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"لیکن جو کچھ کرنا دل سے کرنا۔" میں نے کہا۔

"اوئے ظالماں! دل سے ہی کروں گا۔ پر ابھی نہیں۔ ابھی چھ سات دن ہمیں بالکل چپ چاپ رہنا پڑے گا۔ باہر والا معاملہ کچھ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر کچھ ہو سکتا ہے... ہیں۔"

"اچھا یارا! کسی طرح پاکستان سے کوئی ٹیلی فون کا رابطہ نہیں ہوسکتا؟"

"ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔ تھوڑا سا خرچے والا کام ہو گا لیکن کوئی گل نہیں۔ میں پتا کر لیتا ہوں۔" جگت نے کہا۔

"ہاں... میں نے تمہیں ایک اور کام کہا تھا جگت! راجا کا کچھ پتا چلا یا نہیں؟"

"یارا! ابھی تک کوئی ٹھوس بات تو معلوم نہیں ہوئی۔ یہ جانکاری ملی ہے کہ انور گنجے کی پچلی حویلی سے تین چار فرلانگ دور تم لوگوں کی جیپ بند ہوگئی تھی اور وہاں پر جھڑپ ہوئی تھی۔ وہاں دو بندے زیادہ گھائل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی حالت خراب تھی۔ اسے شاید ہارون آباد بھیجا گیا تھا۔ اب یہ پتا نہیں کہ وہ تمہارا بندہ تھا یا چودھریوں کا... اگر میں اب تک جو پور میں ہوتا تو کوئی کھوج کھرا لگا چکا ہوتا لیکن اب میں یہاں آگیا ہوں۔"

میں نے جگت کو ٹیلی فون کا انتظام کرنے کو کہا تھا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کا حل نکال لے گا۔ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ وہ ایک موبائل سیٹ لے کر آگیا۔ اس میں کافی بیلنس بھی موجود تھا۔ جگت نے بتایا کہ وہ میری خاطر سویرے چھ بجے کا یہاں سے نکلا ہوا ہے۔ ایک ساتھ والے گاؤں میں اس کا ایک شہری دوست رہتا ہے۔ یہ اسی کا موبائل ہے اور میں اس کے ذریعے پاکستان میں چھوٹی سی کال کر سکتا ہوں۔

اس نے کہا۔ "یہ کال کسی اور ملک کے رستے پاکستان جائے گی۔ لمبا چکر کاٹے گی اس لیے کافی "پیٹرول" خرچ ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ تم بس پرارتھنا کرو کہ رابطہ ہو جائے۔ رابطہ ہوگیا تو وہ لوگ مجھے خود ہی کال کر لیں گے۔"

میں نے عمران کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی دو کوششیں ناکام ہوئیں۔ تیسری کوشش کا رزلٹ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا منہ بولتا ثبوت تھا اور ایسے ثبوت اس اکیسویں صدی میں ہمیں اکثر ملتے ہی رہتے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے اس دور دراز گاؤں کے اس تاریک کمرے میں سے میں نے جو کال کی وہ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتی اور کن سرحدوں کا چکر کاٹتی پاکستان پہنچی اور اس نے کروڑوں لوگوں میں سے اس بندے کو ڈھونڈ لیا جس کی آواز میں سننا چاہتا تھا۔ پہلے عمران کا مخصوص بیل ہوئی... اڈی اڈی جا تو ان ہوا دے... پھر کال ریسیو ہوئی۔ شور سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی میں ہے اور کسی سڑک پر رواں ہے۔ وہ عمران کی زندگی بخش آواز تھی۔ "ہیلو، کون؟"

"میں تابش بول رہا ہوں۔" میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چلایا۔ "او شاہین! ذرا میرے بازو پر چٹکی تو کاٹنا۔ کہیں میں کوئی سندر سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔"

اس کا مطلب تھا کہ وہ اور اس کی گرل فرینڈ شاہین کسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ "عمران! میں اس وقت تمہاری مزاحیہ باتوں کا مزہ بالکل نہیں لے سکتا۔ بہت سیریس حالات ہیں۔ میں یہاں انڈیا میں فرید کوٹ کے قریب لنگڑی پورہ نام کے گاؤں میں ہوں۔ میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ اس نمبر پر مجھے فون کرو فوراً..."

میں نے اسے نمبر لکھوایا اور فون بند کر دیا۔

اس تھوڑی سی گفتگو میں ہی بیلنس کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ میں نے وہ موبائل فون آن کرلیا جو شکاری چھوڑ کر بھاگے تھے۔ اس کی سم ابھی تک بلاک نہیں ہوئی تھی۔ جعلی پولیس انسپکٹر کی کال کے علاوہ اس پر کوئی کال بھی نہیں آئی تھی۔ ابھی میں نے عمران کو اسی موبائل کا نمبر لکھوایا تھا۔

پانچ منٹ بعد ہی اس فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا اور دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ گئیں۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ اپنے پوسٹ پیڈ نمبر سے کال کر رہا تھا۔

"ہیلو تابی! کہاں ہو؟" وہ بہت جذباتی لہجے میں بولا۔ "تم نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔ شیخ (جیلانی) اور اقبال دیوانوں کی طرح تمہیں ہارون آباد اور فقیر والی میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تم خیر سے انڈیا میں بیٹھے ہو۔ ثروت اور راجا تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟"

"ثروت تو ٹھیک ہی ہے لیکن راجا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہاں پچلی حویلی سے نکلتے ہوئے ٹھیک ٹھاک فائرنگ ہوئی تھی۔ راجا زخمی ہوگیا تھا..."

"اس فائرنگ کا تو ہمیں بھی پتا چل چکا ہے۔ کرشمہ کپور کی موت کی اطلاع بھی ہے... لیکن تمہیں تو بھاگ کر ہارون آباد یا لاہور کی طرف آنا چاہیے تھا، تم ہنومان کے دیس کیسے جا پہنچے؟"

"یہ لمبی کہانی ہے عمران۔ چودھری انور کے پالتو کتوں نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ ہم غلطی سے بارڈر کی طرف نکل گئے تھے۔ بارڈر کے پاس چودھری کے غنڈوں سے ہماری بڑی سخت جھڑپ بھی ہوئی۔ ان سے پیچھا چھڑا کر میں اور ثروت

ایک جگہ چھپ گئے۔ صبح ہمیں پتا چلا کہ ہم انڈیا میں ہیں۔ یہ طویل روداد ہے یار! اس میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ تم کیا کرسکتے ہو؟"

"یار! بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگا سکتا ہوں اور اس دوران میں تین قلابازیاں بھی کھا سکتا ہوں۔ ریوالور کے چیمبر میں ایک یا دو گولیاں رکھ کر اور چرخی گھما کر خود پر فائر بھی کرسکتا ہوں... اس جانبازی کے بڑے فائدے ہیں جگر! یہ شاہین اسی امید پر مجھ سے چمٹی رہتی ہے کہ میں نے کون سا زیادہ جینا ہے۔ کسی نہ کسی دن تو چرخی غلط گھومے گی اور گولی چلے گی۔ جونہی یہ بیوہ ہوگی، کروڑوں کی جائداد اسے مل جائے گی اور ایک چلا چلایا نیوز چینل بھی۔"

شاہین کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ عمران کے لتّے لے رہی تھی۔ عمران چہکا۔ "سن لیا نا تم نے... یہ ابھی سے نیوز چینل کی سینئر اینکر پرسن لگنے لگی ہے۔ نئے رواج کے مطابق اینکر پرسن بننے کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے، وہ ہے لمبی سانس۔ دراصل ٹاک شوز میں اصل مقابلہ تو لمبی سانس کا ہی ہوتا ہے۔ مخالف فریق کو بولنے کا موقع تب ہی ملتا ہے جب آپ کی سانس ٹوٹتی ہے۔ جب آپ سانس ہی نہیں لیں گے تو وہ بولے گا کیسے؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب لمبی سانس والے غوطہ خور بھی اینکر پرسن بن رہے ہیں اور ٹاک شوز میں مہمان آرہے ہیں۔ ایک نجی ٹی وی کے شوز میں حصہ لینے والا ایک غوطہ خور مہمان اتنا مشہور ہوا ہے کہ لوگ اش اش کررہے ہیں۔ وہ پروگرام شروع ہونے کے فوراً بعد بولنا شروع کرتا ہے اور چوتھے "بریک" سے پہلے سانس نہیں لیتا۔ اس کے بعد وہ اکثر بے ہوش ہوجاتا ہے اور باقی کا پروگرام اسے سنبھالنے میں گزر جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا، اب تمہیں بھی بے ہوش ہونا ہے یا میری بات سنّی ہے؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "واقعی جگر! چکر تو مجھے بھی آگیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم کیا کرسکتے ہو، ہمیں پاکستان واپس لانے کے لیے؟"

"یار! تم پاکستان واپس لانے کی بات کرتے ہو، تم حکم کرو تو انڈیا کو ہی پاکستان بنا دوں۔ لیکن پہلے مکمل معلومات تو دو کہ میرا یار کس حال میں ہے۔ کیا واقعی شیر لوہے کے جال میں ہے؟"

"لوہے کے نہیں، فولاد کے جال میں۔ بڑے سخت لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ بڑی زہریلی قسم کی مردار [illegible] اوپر سے جاوا گروپ کا ڈر بھی ہے۔"

"یار! جاوا کا نام لے کر تم نے میرا خون گرما دیا۔ جی چاہتا ہے کہ للکارا مار کر انڈیا کی فلم انڈسٹری میں جاؤں اور امیتابھ بچن سمیت سارے ڈانوں کا صفایا کر دوں۔"

شاہین کی چلّاتی ہوئی آواز آئی۔ "خبردار! امیتابھ کا نام لیا تو، وہ میرے فیورٹ ہیں۔ ویسے بھی وہ اصلی نہیں، فلمی ڈان تھے۔"

"گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے راجا کمار۔ اس سنگل پسلی، لمبے بانس کو کس نے کہا تھا کہ ڈان بنے۔ ڈان تو ہوتا ہے اپنے مصطفیٰ قریشی اور شفقت چیمہ جیسا... یا اپنے تابش جیسا۔ شکل دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ قتل کیے ہیں، عزتیں وغیرہ لوٹی ہوئی ہیں۔"

"کیا میں فون بند کردوں؟"

دھمکی کارگر رہی۔ وہ پٹڑی پر آگیا۔ میں نے اسے مختصر طور پر سارے واقعات سے آگاہ کیا اور دیگر حالات بتائے۔ یہ جان کر وہ حیران ہوا کہ یوسف بھی انڈیا پہنچ گیا ہے۔ وہ بولا۔ "یار! کتنا اچھا ہوتا کہ تیرے اس رقیب روسیاہ کو گمشدگی راس آجاتی۔ کہیں ایسا گم ہوتا کہ تاریخ میں لکھوایا جاتا۔ لیکن لگتا ہے کہ آج کل کے لونڈوں کو نام کمانے کا شوق ہی نہیں۔ ویسے مجھے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ حضرت کو انڈیا پہنچایا کیوں گیا ہے؟"

"اس کی شکل ایک ایسے بندے سے ملتی ہے جسے علاقوں کی پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

میں عمران کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خود بھی سوال کررہا تھا۔ مجھے دوسری طرف کے حالات کا بھی علم ہورہا تھا۔ عمران کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مہناز ابھی تک لاپتا ہے۔ وہ آخری بار راولپنڈی میں دیکھی گئی تھی۔ کالے شیشوں والی ایک بہت مہنگی گاڑی میں جارہی تھی... عمران کے چند ساتھی پنڈی پہنچ چکے تھے اور اس کی تلاش میں تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ "جلالی صاحب کا کیا حال ہے؟"

"جلالی صاحب کے بارے میں بُری خبر ہے۔ بڑے بڑے سینئر ڈاکٹر ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ زندہ بچ گئے ہیں۔"

"زندہ بچ گئے ہیں؟"

"ہاں یار! مجھے نہیں لگتا کہ اب امریکا انہیں زندہ چھوڑے گا۔ ان کا کوئی تحقیقی ادارہ ضرور انہیں اٹھا کر لے جائے گا اور کھوج لگائے گا کہ حیات بعدالموت کے کتنے رخ ہیں اور اس اڑیل بوڑھے نے عزرائیل کی آمد کے وقت اپنی جان کو اپنے جسدِ خاکی کے کس تہ خانے میں چھپایا تھا۔ اُف یار، عجیب آزاد مرد ہے۔ اپنے پاؤں پر چل کر اسپتال سے نکلا ہے اور اپنی آثارِ قدیمہ مرسیڈیز میں بیٹھا ہے۔ آج کل باقاعدگی سے ورزش کررہا ہے اور لاہور سے حکیمی کشتے وغیرہ منگوا رہا ہے۔ پرسوں پتا چلا ہے کہ جناب نے اپنی ساس کو، جو ان سے بارہ تیرہ سال چھوٹی ہے، لاہور سے شیخوپورہ بلایا ہے اور اس کو رام کرنے کی کوشش فرمارہے ہیں۔"

"مہناز کے ساتھ جلالی کی شادی کی خبر تو ایک راز تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو راز ہی ہے لیکن لگتا نہیں کہ زیادہ دیر رہے گی۔ بزرگوار جوان بیوی کی فرقت میں بہت پریشان ہیں۔ خفیہ طور پر ہرکارے دوڑا رکھے ہیں تاکہ محترمہ کا کھوج مل سکے۔ دراصل جب انہوں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر مختار کے سپرد کیا تو اس وقت انہیں یقین تھا کہ وہ بچ نہیں سکیں گے لہٰذا ڈاکٹر صاحب سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ اس مورتی کے ساتھ کہاں غرقاب ہوں گی۔ اب پچھتا رہے ہیں۔ دن رات اس انتظار میں ہیں کہ کہیں سے مہناز کا فون آئے۔ بہانے بہانے سے اس کا ذکر کرتے ہیں اور ذکر سننا پسند کرتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے عمران! مہناز، جلالی صاحب کے ساتھ وفادار ہے؟"

"لگتا تو ایسے ہی ہے لیکن یار ان عورتوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔ بندے بے چارے دھوکے پہ چلے جاتے ہیں۔ یہ ٹی وی ڈرامے دیکھ دیکھ کر اتنی نڈر ہوجاتی ہیں کہ مردوں کو کٹھ پتلی کا ناچ نچا دیتی ہیں۔"

شاہین کے چلانے کی آواز آئی۔ "تابش بھائی! ہم تو سچے ہیں اور ان جیسے حضرات ڈرامے کرتے ہیں۔ یہ مرد باہر کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں صرف ایک ہستی کو ہر وقت پتا ہوتا ہے کہ اس کا میاں کہاں ہے... اور وہ ہے عورت۔"

"کہو تابی! مجھے شوہر بنانے سے پہلے ہی کیا کیا سوچ لیا ہے۔ بھئی اگر بیوہ بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے بیوی بننا پڑے گا۔"

"میں آپ جناب کی نہیں ایک جنرل بات کررہی ہوں حضور۔"

"دیکھا نا، یہ بھی ایک خاتون رائٹر کے لکھے ہوئے ڈرامے کا فقرہ ہے۔ اُف یہ ڈرامے تو گھس گئے ہیں ان خواتین کے اندر۔"

مجھے راجا کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ "عمران! میں راجا کے لیے پریشان ہوں۔ اس کا کچھ پتا کرو۔"

وہ ذرا سنجیدہ ہوکر بولا۔ "آج صبح اقبال سے فون پر میری بات ہوئی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ باقی طرف سے دھیان ہٹا کر راجا کا کھوج لگاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ زخمی حالت میں چودھری انور کی حویلی میں ہی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے ہارون آباد کے کسی پرائیویٹ اسپتال میں بھیج دیا گیا ہو۔ سرکاری اسپتالوں میں تو اقبال اور جیلانی اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔"

"بہرحال، ان سے کہہ دو کہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کریں۔ چودھری انور خطرناک بندہ ہے اور اب تو اور بھی خطرناک ہوگیا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"میرے ساتھ لڑائی میں اس کے کچھ بندے مرے ہیں۔ تفصیل تمہیں پھر بتاؤں گا۔"

"اوئے خوش کیا ہے جگر پارے! شیر کا بچہ لگا ہے۔ تم سامنے ہوتے تو تمہارا منہ چوم لیتا۔ افسوس تم دور ہو۔ ہاں تم چاہو تو چوم سکتے ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"یار! شاہین سے کہو کہ تمہاری طرف سے میرا منہ چوم لے۔ یہ سامنے ہی تو دھرا ہے... آٹھ دس انچ کے فاصلے پر۔"

شاہین نے غالباً اسے کوئی پرس وغیرہ مارا تھا۔ اس نے منہ سے اوئی کی باریک آواز نکالی۔

میں نے کہا۔ "کال بہت لمبی ہورہی ہے۔ ہزاروں روپے بل آجائے گا تمہارا۔"

وہ چہکا۔ "تو یہ شاہین کس لیے ہے یار! بڑی موقع شناس لڑکی ہے۔ آج کل مجھے نرگس اور ریما کے چنگل سے نکالنے کے لیے بڑی کوشش کررہی ہے۔ مالی، جانی، جسمانی، ہر طرح کی قربانی دے رہی ہے۔" اس نے "جسمانی" پر زور دیا۔

شاید شاہین ایک بار پھر اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ چند

سیکنڈ تک کشتی کی سی آوازیں آتی رہیں۔ غالباً وہ دونوں گاڑی کے اندر تھے اور گاڑی کسی تنہا جگہ پر پارک تھی۔ چند سیکنڈ بعد موبائل فون شاہین کے ہاتھ میں چلا گیا۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ”السلام علیکم تابش بھائی! آپ کیسے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں شاہین! ثروت بھی خیریت سے ہے۔ تم فرح اور عاطف کی سناؤ۔ اور بالو کا کیا حال ہے؟“

”وہ تینوں ڈیفنس والے گھر میں ہیں، بالکل خیریت سے ہیں۔ یوں تو ہم سب ہی آپ کے بغیر اداس ہیں لیکن فرح بہت زیادہ محسوس کرتی ہے۔“

”ثروت کی چھوٹی بہن کا کیا حال ہے؟“

”ہاں، نصرت کی طبیعت چند دن خراب رہی ہے۔ ثروت کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں آ رہی تھی نا۔ پرسوں عمران اس کی طرف گئے تھے۔ تسلی تشفی دے کر آئے ہیں۔ آپ ثروت سے بھی کہیں کہ ایک بار نصرت سے بات کر لے۔“

”اچھا، میں کہوں گا۔“

”ثروت سے بات ہو سکتی ہے؟“ شاہین نے پوچھا۔

”نہیں شاہین... اس وقت تو مشکل ہے۔ کل کوشش کروں گا مگر تم نے اسے نصرت کی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں تابش بھائی! اب نصرت کافی بہتر ہے۔ ہمیں زیادہ پریشانی آپ لوگوں کی طرف سے ہے۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیں... آپ کہاں پھنس گئے ہیں؟“

اسی دوران میں عمران نے پھر فون پکڑ لیا۔ میں نے عمران سے سنجیدہ ہونے کی پُرزور درخواست کی جسے اس نے قبول کیا۔ میں نے اسے جگت سنگھ والا فون نمبر بھی لکھوا دیا۔ عمران نے کہا کہ وہ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہے گا اور کل تک اپنا لائحہ عمل بتائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کل تک مجھے راجا کے بارے میں بھی حتمی رپورٹ دے گا۔

دوپہر کے فوراً بعد گوبند سنگھ پھر اپنی ”جیلی“ بھابو آشا کو لے کر لنگڑی پورہ پہنچ گیا۔ آشا بھی میرے چہرے کی چوٹوں اور سوجن کو دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اس نے آتے ساتھ ہی کچن سنبھال لیا اور کام کاج میں لگ گئی۔ گاہے بگاہے رجنی نے بھی اس کی مدد کی۔ ثروت یوسف فاروقی کے ساتھ کمرے میں تھی۔ جگت نے یوسف پر مسلسل نظر رکھی ہوئی تھی۔ رات کا کھانا پُرتکلف تھا۔ آشا نے دیسی مرغی کا پلاؤ بنایا تھا۔ ساتھ میں قورمہ اور میٹھی سویاں تھیں۔ ان سویوں کو پوٹوں کی سویاں کہا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد وہی دودھ پتی تھی جو آشا خاص چاؤ سے بناتی تھی اور واقعی مٹھاس بھر دیتی تھی۔

جگت اور آشا کا دل رکھنے کے لیے میں نے چند لقمے لیے۔ آشا کو بھی اب پتا چل چکا تھا کہ ثروت کا پتی میں نہیں بلکہ یوسف ہے اور میں یوسف کی تلاش میں ثروت کی مدد کر رہا تھا۔ ثروت کے شوہر کے طور پر یوسف، آشا کو پسند نہیں آیا تھا۔

کھانے کے دوران میں بھی گوبند اور اس کی اسپل منگیتر رجنی کے درمیان چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ رجنی بڑی بے حجابی سے ہر کسی کو اپنے دودھیا بازو پر ”چونڈی“ کا نیلا نشان دکھایا۔ اس الہڑ لڑکی کے سراپا میں عجیب سی حرارت تھی۔

عمران نے کہا تھا کہ وہ کل فون کرے گا۔ تاہم فون رات دس بجے کے قریب ہی آ گیا۔ یہ فون جگت والے نمبر پر آیا تھا۔ عمران کی آواز میں مجھے ہلکا سا بوجھل پن محسوس ہوا۔ ”ہیلو عمران، خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”ویسے تو خیریت ہے لیکن ایک خبر اچھی نہیں۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ”راجا ہمیں چھوڑ گیا تابش۔ وہ زخمی ہونے کے دو دن بعد ہارون آباد کے ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔“

میں کتنی ہی دیر سناٹے میں رہا۔ عمران بھی خاموش تھا۔ میری آنکھوں میں راجا کے آخری مناظر گھوم گئے۔ اچھے بھلے چودھریوں کے چنگل سے نکل آئے تھے۔ ہم نے ان کی گاڑی کا ٹائر ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن راجا کا ایک معمولی لالچ اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ وہ زیور والا رومال اٹھانے کے لیے جیپ سے اترا اور اسے گولی لگ گئی۔ پتا نہیں کیوں اس وقت میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ اب ہم راجا کو نہیں دیکھ سکیں گے۔

عمران کی آواز فون سیٹ پر ابھری۔ ”یہی زندگی ہے پیارے۔ اگلے موڑ پر کیا ہے، کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دیکھو ہم جلالی کے بارے میں ناامید تھے لیکن وہ ڈھانچا اسپتال سے خود چل کر باہر آ گیا اور چنگا بھلا ہو گیا۔ اب وہ اپنی ساری خامیوں، خوبیوں سمیت

ہے۔“ میں نے کہا۔ ”عمران! وہ جیسا بھی تھا لیکن اس کی وہ ساری رات مجھے نہیں بھولے گی... سچ پوچھو تو اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس رات اس نے بہت تفریح بھی کی۔ کئی نخرے بھی موں لیے اور پھر موت کا سامنا بھی کیا۔ اس کی باتوں سے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ چودھریوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ تمہیں بھی پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن عین موقع پر اس نے اصل روپ دکھایا۔ ہمیں وہاں سے نکال لایا... اس نے ایک پہرے دار کو پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ رکھوالی والے خونخوار کتے بھی اسے دیکھ کر رام ہو گئے۔ اس نے زبردست پلاننگ کر رکھی تھی۔“

عمران بولا۔ ”بس، ہماری اپنی پلاننگ ہوتی ہے اور قدرت کی اپنی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ اس کے باوجود وہ شاید بچ جاتا مگر پہلے چودھریوں نے پھر پولیس نے اسے ہسپتال پہنچانے میں بہت دیر کی۔ قریباً ایک گھنٹا تو وہ موقع پر ہی تڑپتا رہا۔“

”پولیس کو کیا بتایا گیا؟“

”وہی جو ایسے چودھری بتاتے ہیں۔ راجا پر ڈاکے اور قتل کا الزام لگا ہے۔ گہنوں والے رومال اور کرشمہ کی موت کو ثبوت بنایا گیا ہے۔ تم دونوں بھی شریک ملزمان کے طور پر نامزد ہو۔ لیکن اس کی فکر نہ کرو۔ میں نمٹ لوں گا اس نامزدگی سے... لیکن یہ بتاؤ کہ کیا واقعی نیتو عرف کرشمہ کو راجا نے مارا؟“

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”شاید ایسا ہی ہے لیکن راجا کی نیت ایسی نہیں تھی۔ دراصل کرشمہ نے راجا کو تاڑ لیا تھا۔ وہ شور مچانا چاہتی تھی۔ راجا نے اسے دبوچ لیا اور اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ مزاحمت کرتی رہی اور اسی میں اس کا دم گھٹ گیا۔“

ہم نے چند منٹ تک راجا کے سوگوار موضوع پر بات کی پھر عمران نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے تابی! مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کمینہ جادوا بھی بھارتی پنجاب میں ہی ہے۔ اپنے بھائی کے دو قاتلوں کو سرعام گولیاں مارنے کے بعد اس نے ان کی لاشوں کو شہر کی سڑکوں پر گھسیٹا ہے۔ اب وہ ان کے بچے کھچے ساتھیوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ جادوا اور جالندھر کے سردار اوتار سنگھ میں پرانی واقف کاری ہے۔ سردار اپنی بیٹی کو بازیاب کرانے کے لیے رات دن بھاگا پھر رہا ہے۔ اسے ثروت کی اور یوسف کی تلاش ہے۔ اس کے لیے اس نے جادوا سے رابطہ کیا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ بڑی خطرناک صورت حال بن سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں احتیاط کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کوشش کرو کہ اس گاؤں میں بھی کسی کو تمہاری اور یوسف کی موجودگی کا پتا نہ چلے۔“

”نہیں، ابھی تک تو ہم کسی کے سامنے نہیں آئے۔“

عمران نے ذرا توقف سے کہا۔ ”میں تمہاری واپسی کا انتظام کر رہا ہوں۔ اس کام میں تھوڑے دن تو لگیں گے لیکن کام پرفیکٹ ہوگا۔ پہلے مرحلے میں تمہیں حفاظت سے نئی دہلی یا میرٹھ پہنچایا جائے گا۔ وہاں نئی دہلی میں اپنے دو پکے سجن موجود ہیں۔ ایک کا نام شہباز احمد ہے، دوسرا ڈاکٹر رتن سنگھ۔ یہ دونوں کل یا پرسوں ایک ایمبولینس گاڑی پر تم تک پہنچیں گے۔ آنے سے کم از کم چھ گھنٹے پہلے تمہیں فون کریں گے۔ اس کے بعد تمہیں تیار رہنا ہے۔ جس دیہاتی حلیے میں تم لوگ ہو، یہی آگے بھی کام دے گا... ہاں سفر کے دوران میں تم نے ایک اور ضروری بات ذہن میں رکھنی ہے۔ یہ بات میں شہباز اور ڈاکٹر رتن کو بھی بتا دوں گا۔“

”کیا؟“

”یہ بات تم ثابت کر چکے ہو کہ یوسف کو صرف اس لیے پکڑا گیا اور انڈیا پہنچایا گیا کہ اس کی شکل سردار اوتار کے بیٹے، بدنام قاتل اشوکا سنگھ سے ملتی ہے۔ اشوکا سنگھ واقعی کئی صوبوں کی پولیس کو مطلوب ہے۔ پانچ سال ہو گئے ہیں پھر بھی اس کی تلاش کا کام رکا نہیں۔ اب سفر کے دوران میں اگر کہیں چیکنگ وغیرہ ہوئی اور یوسف پولیس کی نظر میں آیا تو عین ممکن ہے کہ اسے واقعی اشوکا سمجھ لیا جائے۔“

”ہاں، تمہارا یہ پوائنٹ واقعی غور کرنے والا ہے۔“

”کسی طرح کوشش کرنی ہے کہ یوسف، پولیس یا کسی بھی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی کی نظر میں نہ آئے۔ ورنہ وہ اشوکا کی جگہ نقصان اٹھا سکتا ہے۔“

عمران نے مجھے میرے مددگاروں شہباز احمد اور ڈاکٹر رتن کے بارے میں کچھ مزید معلومات دیں اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کو ان دونوں افراد پر بھرپور اعتماد ہے۔

جگت کا چھوٹا بھائی گوبند بے شک شراب سے پرہیز نہیں کرتا تھا اور عورتوں میں بھی دلچسپی رکھتا تھا، اس کے باوجود اس میں کھلاڑیوں والی عادتیں بھی تھیں۔ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا، خوراک کا خیال رکھتا تھا اور ورزش بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ وہاں جو پور گاؤں میں اس نے اپنا

’’جم‘‘ بنا رکھا تھا۔ اس جم میں میرا اور اس کا باقاعدہ مقابلہ ہوا تھا۔ اب وہ مجھے میرے اصلی نام تابش سے ہی بلاتا تھا۔ شام کو بولا۔ ’’آؤ تابش بھاجی… ذرا جاگنگ کر کے آئیں۔‘‘

اس کی منگیتر رجنی فوراً بولی۔ ’’یہ جس کو تھوڑی سی جاگنگ کہتا ہے، یہ دس پکے میل کی دوڑ ہوتی ہے۔ رستے میں کوئی سوہنی کڑی مل جائے تو اس کے چاروں طرف بھی چکر لگاتا ہے۔ اس طرح یہ دوڑ پندرہ سولہ میل کی ہو جاتی ہے۔‘‘

گوبندر اس پر جھپٹا تو وہ بھاگ گئی۔ وہ بولا۔ ’’بھاجی… تسی آپ ہی سوچو، نیشنل کھیلوں میں حصہ لینا ہے میں نے… کوئی چھوٹے مقابلے نہیں ہوتے دلی میں… بڑے بڑے سورما پڑے ہیں۔ کچھ کروں گا تو لڑوں گا نا… آجائیں آپ بھی۔ پانچ چھ کلو میٹر کی دوڑ میں آپ کا کیا بگڑتا ہے۔‘‘

’’نہیں گوبندر! اس وقت موڈ نہیں۔ سوری یار۔‘‘

وہ خود ہی چلا گیا… لیکن اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہی ہو گئی۔ میں اسے اتنی جلدی واپس دیکھ کر حیران ہوا۔ ’’کیا ہوا گوبندر؟‘‘ میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ’’تابش بھائی! کچھ پتا ہے آپ کو۔ ایک بڑا ہی خطرناک بندہ ہمارے آس پاس ہے۔‘‘

’’خطرناک بندہ؟‘‘

’’جاوا کا نام سنا ہوا ہے آپ نے؟‘‘

میری ریڑھ میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے کہا۔ ’’نہیں… کون ہے یہ؟‘‘

وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ’’بہت وڈی بلا ہے بھاجی! ممبئی کے پانچ چھ بڑے ڈاکوؤں میں سے ایک ہے۔ مہاراشٹر اور مدھیا پردیش وغیرہ میں لوگ کانپتے ہیں اس کے نام سے۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ یہاں ہے۔‘‘

’’تمہیں کیسے پتا ہے کہ وہ یہاں ہے؟‘‘ میں نے عام لہجے میں پوچھا۔

’’مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے بچے بچے کو پتا ہے۔ بڑی دہشت پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ ہم تو باہر نہیں نہ نکلے، ہمیں جانکاری ہی نہیں۔ میں ابھی کھیتوں تک ہی پہنچا تھا کہ نمبردار صاحب مل گئے۔ کہنے لگے، اس ویلے پنڈ سے باہر نہ نکلو۔ حالات خراب ہیں۔ میں نے پوچھا کیا خراب ہیں، تو انہوں نے جاوا کا نام لیا۔ پہلے تو مجھے وشواس نہیں ہوا لیکن جب انہوں نے تفصیل بتائی تو وشواس کرنا پڑا۔ کہنے لگے کہ یہ بندہ اور اس کے ساتھی ابھی کوئی دشمنی چکانے کے لیے مہاراشٹر سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بندے کا نام بعد میں پوچھتے ہیں، پہلے گولی مار دیتے ہیں۔ لوکل پولیس ان سے کانپتی ہے۔ ایم پی اے تک کو کٹھرے کھڑا کر دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے دو بڑے مگر… کی ہتھیا کی ہے اور لاشوں کو انبالہ کی گلیوں میں گھسیٹا… ساتھ ساتھ کئی پردہ داریوں کو بھی ننگے سر گشت کرایا…

عمران کی اطلاع درست ثابت ہو رہی تھی۔ ریشم… نشان جاوا اس علاقے میں موجود تھا اور اپنا آپ دکھا رہا… لاہور میں ہمیں پتا چلا تھا کہ جاوا کے چھوٹے بھائی… کرخت سنگھ پولیس آفیسر نے قتل کر دیا ہے۔ یہ ما… شاخسانہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے یوسف کو دیکھا۔ وہ مٹی کی… ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی چھت پر جا رہا تھا۔ دیہاتی… کے بند لباس میں ہونے کے باوجود وہ ’’نیم شہری‘‘ سا لگ… جگت سنگھ نے ہر وقت اس پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے… آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ اوپر جا رہا ہے۔ میں خود بھی چاہتا… کہ یوسف سے دو منٹ تنہائی میں بات کر سکوں۔ میں اوپر… تو وہ چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دیہات… گھروں کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں۔ منڈیر… نہیں ہوتی۔ یہاں بھی دور تک نظر آ رہا تھا۔ گاؤں سے… کھیت اور کھیتوں سے آگے درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ… مدھم چاندنی نشیب و فراز کو نمایاں کرنے کی ناکام کوشش… کر رہی تھی۔ گھر کے سامنے ہی گلی میں کوئی نشئی دیوار سے… ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اپنی بھونڈی آواز میں ہیر کی تان… کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے میں نے کل بھی دیکھا تھا۔

میں یوسف کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ’’یوسف… میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا بتانا… ہوں کہ میں تمہیں کسی طرح کا نقصان پہنچانے کے لیے… تمہاری مدد کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ مجھے بہت افسوس… سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نے دشمن کو دوست اور دوست کو… سمجھا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، سردار اوتار سنگھ نے… تمہیں مہمان بنانے کے لیے اور تمہاری خاطر مدارات… کے لیے تمہیں حویلی میں رکھا ہوا تھا؟‘‘

یوسف روکھے لہجے میں بولا۔ ’’اوتار سنگھ کا کہنا… یہ ایک گہرا چکر ہے…‘‘

’’گہرا چکر ہے؟‘‘

یوسف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’تمہیں… بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ لوگ معروف لوگوں کے ہم شکل یا ملتے جلتے چہرے ڈھونڈتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی… طرح ڈھونڈا۔ ان کا کہنا ہے کہ میری شکل انڈیا کے ایک… شخص سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ وہ مجھے ایک بڑے ٹی وی چینل پر مستقل کام کرنے کی آفر کر رہے ہیں۔ جو معاوضہ وہ… رہے ہیں، وہ بھی میری توقع سے بہت بڑھ کر ہے۔ دو… پہلے چینل کے مینجنگ ڈائریکٹر سے میری ملاقات بھی کرائی گئی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے اس بات پر بہت معذرت بھی کی ہے کہ درمیان کے کچھ لوگوں نے مجھے یہاں تک لانے میں زبردستی کا رویّہ اپنایا بلکہ ایسا تاثر ملا کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے۔ سردار اوتار بھی اس پر بہت شرمندہ تھا۔ اب یہ لوگ مجھے باعزت طریقے سے واپس پاکستان روانہ کر رہے تھے۔‘‘

میں نے سر پکڑ لیا۔ ’’یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے یوسف! تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ سراسر بکواس اور جھوٹ ہے۔ تمہاری شکل کسی انڈین گلوکار سے نہیں ملتی… تمہاری شکل اس خبیث اوتار سنگھ کے مفرور بیٹے اشوکا سے ملتی ہے۔ اس بیٹے کو انڈیا میں کئی برسوں سے ایجنسیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ اس کا نام ’’ای سی ایل‘‘ میں ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ یہ لوگ تمہیں مار کر اشوکا کا پیچھا قانون سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پوری پلاننگ کی ہوئی تھی۔ تمہیں پولیس ناکوں کے درمیان سے گزارا جانا تھا اور جب پولیس تمہیں پہچان لیتی تو تمہاری گاڑی کو ریموٹ کنٹرول بم سے اڑا دیا جانا تھا۔ تاثر یہی ملتا کہ شاید اشوکا نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خود کے پرخچے اڑا لیے ہیں… اگر تم ایک بار اشوکا سنگھ کی تصویر دیکھ لو تو ساری بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔‘‘

میں نے اس سازش کا سارا تانا بانا یوسف کے گوش گزار کیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری کچھ باتیں اس کے دل کو لگ رہی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کل رات میں نے اس کی اور ثروت کو بچانے کے لیے کس طرح اندھا دھند… کا سامنا کیا۔ وہ سب کچھ جان رہا تھا، اس کے باوجود اس کے چہرے کی تختی اور کدورت کم نہیں ہو رہی تھی۔

آخر اس نے چارپائی پر پہلو بدلا اور مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’تابش! میں ایک بات کہوں، برا نہ…‘‘

’’جو کہنا چاہتے ہو، کھلے دل سے کہو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تابش! مجھے اندازہ ہے کہ تم دل کے برے نہیں ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کل رات تم نے ہمارا دفاع کیا اور سارا پریشر اپنے اوپر لیا۔ میں اپنی غلطی بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تم پر گولی چلائی۔ اس کے علاوہ اس میں بھی شک نہیں کہ تم نے مجھے ڈھونڈنے میں ثروت کا ساتھ دیا ہے لیکن… لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اپنا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں پاتا۔ شاید… اگر تم… میری جگہ ہوتے تو تمہارا رویّہ بھی یہی ہوتا۔ بات کڑوی ہے پر حقیقت ہے تابش۔ میرے اور تمہارے درمیان رقابت کا رشتہ بنتا ہے اور یہ بڑا ظالم رشتہ ہوتا ہے۔ معاف کرنا، تم مجھے سونے کا بن کر بھی دکھا دو گے تو میرا دل تمہیں قبول نہیں کرے گا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’یوسف! تم ہر چیز پر رقابت کو حاوی کیوں کر رہے ہو؟ ہم انسان بھی تو ہیں اور مشکل حالات میں ہیں۔ اگر تم ماضی کو بنیاد بنا کر میری شکل دیکھنا نہیں چاہتے تو میں واقعی تم دونوں کو کبھی شکل نہیں دکھاؤں گا لیکن… کم از کم… موجودہ حالات کی مجبوری تو سمجھو۔ ہمیں مل جل کر اس گھیرے کو توڑنا ہے۔ جگت جیسے لوگ ہماری بے لوث مدد کر رہے ہیں۔ وہ کیا اثر لیں گے جب ہمیں آپس میں ہی لڑتا جھگڑتا دیکھیں گے؟‘‘

’’تو میں اب کیا کہہ رہا ہوں تم سے؟ جو غلطی پر سوں مجھ سے ہوئی ہے اس کے لیے تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ میں نے تم پر گولی چلائی، مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔‘‘ وہ روکھے لہجے میں بولا۔

’’بات معافی کی نہیں یوسف بلکہ مجھ سے بھی زیادتی ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس وقت ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا ہو گا۔ یکجہتی دکھانی ہوگی۔ دل سے کدورت کو ختم کرنا ہوگا۔‘‘

وہ بولا۔ ’’تابش! میں صاف گو بندہ ہوں۔ میں وہی بات دہراؤں گا۔ یہ بہت کڑوی حقیقت ہے۔ ہمارے درمیان کدورت وغیرہ کا نہیں، رقابت کا رشتہ ہے اور یہ بہت تلخ رشتہ ہوتا ہے۔ اپنے دل پر میرا بس نہیں… میں تمہیں دیکھتا ہوں تو…‘‘ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ’’رک کیوں گئے؟ تم سے کہا ہے نا، جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔‘‘

وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر بولا۔ ’’تم نے ثروت کے ساتھ سفر کیا ہے نا۔ دن رات اس کے ساتھ رہے ہو۔ تم ایک کمرے میں سوتے رہے ہو۔ جگت سنگھ کے گھر میں بھی خود کو میاں بیوی بتاتے رہے ہو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں وہ سارے نقشے پھرنے لگتے ہیں۔ تم نے

کیا باتیں کی ہوں گی؟ کس طرح سوئے ہوں گے؟ کس طرح جاگے ہوں گے... کس طرح ہنسے بولے ہوں گے؟ اُم... میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ میں تمہیں سچ بتاتا ہوں تابش! تم جتنی بار میرے سامنے آؤ گے، یہی ہوگا۔ وہ میری بیوی ہے۔ اگر میری جگہ تم ہوتے تو تمہارے ساتھ بھی یہی ہوتا... یہی ہوتا۔"

وہ تیزی سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ اس نے آج وہی بات کہی تھی جس کا اندیشہ جگت سنگھ نے ظاہر کیا تھا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہم مرد بھی کبھی بڑے اندرون بین ہو جاتے ہیں۔ بس اپنی ذات کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ یوسف بھی تو اپنی جرمن محبوبہ کو ثروت کی رقیب بنا کر گھر میں لایا تھا۔ تب اس نے رقابت کی تلخی اور شدید کڑواہٹ کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اب بھی وہ ایک خوب صورت لڑکی کو KEEP رکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اب بھی اسے ثروت کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی۔

چند سال پہلے میرے سینے میں جدائی کے جو زخم لگے تھے، ان میں سے پھر خون رسنے لگا۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس پہلی جدائی کو ہی آخری اور حتمی جدائی سمجھوں۔ جلد از جلد ثروت اور یوسف سے دور ہو جاؤں۔ یہاں میرے لیے تو بین محبت اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ عمران نے کہا تھا کہ جلد ہی اس کے بھیجے ہوئے مددگار ہم تک پہنچ جائیں گے اور چند روز کے اندر ہمیں یہاں سے نکال لیں گے۔ میرا دل چاہا کہ یہ چند روز بس جلدی سے ختم ہو جائیں۔ میں ثروت کی طرف سے سرخرو ہو کر اسے الوداع کہہ دوں۔ میں اٹھ کر مٹی کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو اچانک چونک گیا۔ کچھ فاصلے پر کھیتوں میں تین چار گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں جو تیزی سے اچھلتی کودتی گاؤں کی طرف آرہی تھیں۔ گاؤں کے نمبردار کے پاس تو گاڑی نہیں تھی۔ یہ کون لوگ تھے؟

میں نے جگت سنگھ کو آواز دی۔ "جگت! اوپر آؤ۔"

جگت کے بجائے گوبندر اوپر آگیا۔ "کیا بات ہے جی؟ جگت بھاجی تو باہر گئے ہیں۔"

"یہ کون لوگ آرہے ہیں یہاں؟" میں نے روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں گاؤں میں داخل ہو گئیں۔ آوارہ کتے ان کے اردگرد شور مچا رہے تھے۔ ہیڈ لائٹس میں دھول کے بادل اڑتے نظر آتے تھے۔ یہ کل تین گاڑیاں تھیں۔ دو بڑے سائز کی شاندار جیپیں، ایک ہائی روف...

"کہیں یہ... جاوا کے لوگ ہی نہ ہوں۔" ... نے سرسراتی آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی گاڑیاں عین اس مکان ... آن کھڑی ہوئیں جس میں ہم سب موجود تھے۔ ... ذہنوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میری ... پستول تھا۔ ایل ایم جی نیچے کمرے میں تھی۔ میر... بھی وہیں تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا... میرے عقب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کمرے ... کئی افراد اندر گھس آئے۔ انہوں نے میری توقع سے ... زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے ... نے پانچ فٹ اونچی کچی چار دیواری پھلانگی تھی اور ... آدھمکے تھے۔ اندازہ ہوا کہ انہیں، ہر چیز کی پہلے ہی ... یہاں تک معلوم تھا کہ گھر میں کتنے افراد اور کہاں کہاں ... ان کے ہاتھوں میں جدید آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور وہ ... سے ہی خطرناک مجرم نظر آتے تھے۔ مجھے اندازہ ... پستول نکالنا بیکار ہے۔ نصف درجن افراد مجھے بھون کر دیتے اور میرے ساتھ ہی یوسف، ثروت اور آشا دیوی ... زندگی بھی سخت خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

"ہینڈز اَپ... ہینڈز اَپ۔" کئی للکارے گونجے ... میں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

گوبندر اور یوسف نے بھی تقلید کی۔ ایک شخص ... بڑے کرخت انداز میں میری جیب سے پستول نکال ... موبائل بھی...

"پکڑو، جانے نہ پائیں۔" اچانک ایک ... چلایا۔

حملہ آوروں کی توجہ ہماری طرف تھی۔ ثروت ... چلاتی ہوئی باہر بھاگ گئی تھیں۔ حملہ آور ان کے پیچھے ... تاریک صحن میں دو گولیاں بھی چلیں۔ دو رائفلوں ... میرے سر سے چھو رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ یہی کیفیت گوبندر اور یوسف کی تھی۔

چند سیکنڈ بعد اندازہ ہوا کہ حملہ آوروں نے ... دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ آشا کے رونے اور بولنے کی آواز ... سنائی دے رہی تھی۔

وہ حملہ آور جو اپنے طور اطوار سے ماہر ... تھے، ہمیں گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ... اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے کا موٹا چوبی ... باہر سے بند کر دیا گیا۔ یہ بڑی تشویشناک صورت...

... بُری طرح گھر گئے تھے۔ کم و بیش دو درجن افراد یہاں ... تھے۔ میں نے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے ... دور اُنہیں اس جانب سے بھی ہمیں نشانے پر لیے ... ہوئے تھے۔

وہ لوگ آشا کور کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ساتھ ... برآمدہ نما کمرے میں لے آئے۔ وہ ممبئی اسٹائل کی ... اردو بول رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے رنگ سانولے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جاوا گروپ کے لوگ ہیں۔ گوبندر کا زرد رنگ بھی یہی گواہی دے رہا تھا۔ دو افراد ... آشا کو دونوں طرف سے دبوچ رکھا تھا اور اسے بار بار ... دھمکا کر خاموش کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ ... وہ ثروت کو نہیں پکڑ سکے۔ کم از کم وہ ابھی تو ان کے ہاتھ نہیں ... لگی۔ بدترین صورت حال میں یہ ایک چھوٹی سی مثبت ... بات تھی۔ کیا وہ گاؤں والوں کی مدد حاصل کر سکے گی؟ کیا ... وہ ہماری مدد کو آئیں گے؟ کیا پولیس متحرک ہو سکے گی؟ ... بے کئی سوالات تھے۔

میں، گوبندر اور یوسف جس کمرے میں تھے اس میں ... بند دروازے کے علاوہ فقط ایک کھڑکی تھی۔ اس میں لوہے کی ... موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ کوشش کرکے بند دروازے کو شاید توڑا ... جا سکتا لیکن باہر پھر مسلح افراد موجود تھے۔ مزاحمت کا بہترین ... موقع وہی تھا جب ہم اس کمرے میں آئے تھے مگر اس وقت ... آشا اور ثروت بھی کمرے میں موجود تھیں۔ مزاحمت سے ان ... کی زندگی فوراً داؤ پر لگ جاتی۔

اچانک مجھے گوبندر کی منگیتر رجنی کا خیال آیا۔ وہ بھی ... گھر میں ہی تھی مگر ابھی تک اس کی آواز سنائی دی تھی اور نہ وہ ... سامنے آئی تھی۔ شاید وہ خود کو کہیں گھر کے اندر ہی ... چھپانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"یہ جاوا گینگ کے لوگ ہی ہیں۔" گوبندر نے ... لہجے میں لرزتی سرگوشی کی۔

"لیکن جاوا خود یہاں نظر نہیں آرہا۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ نے اسے دیکھا ہوا ہے؟"

"ایک دفعہ تصویر دیکھی تھی۔" میں نے بات بتائی۔

کھڑکی سے باہر برآمدے میں تین شاندار فولڈنگ ... کرسیاں اور ایک میز رکھ دی گئی۔ میز پر منرل واٹر کی بوتل، ... سگریٹ، لائٹر اور اس طرح کی ایک دو اشیا رکھ دی ... گئیں۔ یہ سارا سامان یہ لوگ یقیناً ہائی روف گاڑی میں اپنے ... ساتھ لے کر آئے تھے۔ سرکاری دربانوں کی طرح دو مسلح ... افراد میز کے ساتھ اٹین شین کھڑے ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ جاوا آرہا ہے۔ وہ غالباً ابھی تک گاڑی میں ہی بیٹھا تھا...

کچھ دیر بعد اس کی آمد ہوئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا۔ اس کا نہایت گٹھا ہوا جسم پتلون قمیص میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی خونخوار سرخی تھی جو مجھے انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں نظر آئی تھی۔ اس نے سلاخ دار کھڑکی کے باہر سے مجھ پر ایک تمسخر بھری نظر ڈالی... پھر یوسف کو گھورا اور بڑے ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھ گیا... اس کے قریباً ایک درجن مسلح ساتھی اس کے اردگرد موجود تھے اور اس کے کسی بھی اشارے کے منتظر تھے۔

تب میں ایک بار پھر چونکا۔ میری نظر اس دوسرے شخص پر پڑی جو جاوا کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ یہ بارڈر پار روہی وال گاؤں کا چودھری انور تھا... جسے جگت سنگھ چودھری انور گنجا بھی کہتا تھا۔ چودھری انور کلف لگے سفید شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی سفاکی اس کے چوڑے جبڑے اور اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں سے عیاں تھی۔

جاوا نے بے تکلفی سے چودھری انور کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "واہ بھئی واہ... ایک بادام میں سے دو گریاں نکل آئی ہیں۔ اس کو کہتے ہیں کہ جب اوپر والا دیتا ہے تو چھت پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"ایک بادام میں دو گریاں؟" چودھری انور نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں بھئی، دیکھو نا ایک ساتھ دو بچے مل گئے... اور دونوں کی تلاش تھی ہمیں۔ ایک یہ سردار اوتار سنگھ کا بھگوڑا مہمان یوسف اور دوسرا یہ ہیرو عمران کا جانگیا تابش... ایک بادام میں دو گریاں۔" اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

اسی دوران میں دو مسلح افراد پھٹے پرانے کپڑوں والے ایک شخص کو پکڑ کر اندر لے آئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے گلی میں گاتے دیکھا تھا لیکن اب یہ شخص ٹھیک ٹھاک ہوش میں نظر آرہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بھی قدرے بدلا ہوا تھا۔ اس نے جاوا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور لرزتی آواز میں بولا۔ "مجھے بالکل پتا نہیں تھا جناب کہ اس بندے کا سمبندھ آپ سے ہے۔ میں سوگند کھاتا ہوں جی۔ بڑی سے بڑی سوگند کھاتا ہوں۔ مجھے پتا ہوتا کہ اس کی آپ کو ضرورت ہے تو کبھی تھانے نہ جاتا... میں اتنی جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا مائی باپ۔"

جاوا بولا۔ ’’لیکن اب تو جرأت ہو چکی میاں مٹھو۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو معاملے کو ٹھیک کرنا ہی ہوگا نا۔‘‘

سانولے رنگ والے دبلے پتلے شخص نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور جاوا کے پاؤں میں گر پڑا۔ اس کے پاؤں پکڑ کر بولا۔ ’’میں بے خبر تھا جناب! مجھے ایک دفعہ معاف کر دیں۔ میں وچن دیتا ہوں سرکار! آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ آپ جو کچھ کہیں گے کروں گا۔‘‘ وہ جاوا کے پاؤں پر سر رگڑنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ نشئی کے روپ میں یہ بندہ شاید پولیس کا انفارمر تھا اور اس نے پولیس تک کوئی ایسی اطلاع پہنچائی جو نہیں پہنچانی چاہیے تھی۔

جاوا نے اطمینان سے کہا۔ ’’میں مانتا ہوں میاں مٹھو کہ تم نے یہ غلطی نہیں کی لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ بندے کو اسی کرم کی سزا ملے جو اس نے کیا ہے۔ اسے اپنے کسی پہلے کارنامے کی سزا بھی تو مل سکتی ہے۔‘‘

’’آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ، مجھے بخش دیں۔‘‘ وہ گھگیایا اور جاوا کے پاؤں سے چمٹ گیا۔

جاوا نے پریشانی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ’’اب یہ کیسے ہو سکتا ہے میاں مٹھو... تو انسپکٹر چاؤلہ کے بارے میں جان گیا ہے۔ اب تو لاکھ بھی قسمیں کھائے لیکن اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔ تو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تو مخبر ہے میاں مٹھو۔ تیرا تو کام ہی سننا اور ٹیں ٹیں کرنا ہے۔‘‘

’’میری زبان کاٹ دیں سرکار۔ آپ کہیں تو میں اپنے ہاتھ سے کاٹ لیتا ہوں۔ میرا وشواس کریں سرکار۔‘‘ وہ باقاعدہ بلکنے لگا۔ موت کے خوف سے اس کا پورا جسم لرزاں تھا۔

جاوا کے تمتمائے چہرے پر سوچ کی لکیریں نظر آئیں۔ اس نے دو گہرے کش لیے پھر اپنے ایک کارندے کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’چھوڑ دو!! اسے ابھی لے جاؤ۔ اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔‘‘

جاوا کے لہجے میں لچک محسوس کر کے مخبر کی حالت ذرا سنبھلی۔ اس نے اپنا سر ایک بار پھر جاوا کے پاؤں پر رکھا اور اس سے جاں بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔ جاوا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا اور بولا۔ ’’ابھی جاؤ... کچھ سوچیں گے۔‘‘ اس کے ساتھ ہی اس نے پاؤں کی حرکت سے مخبر کا سر پیچھے ہٹا دیا۔

دونوں مسلح افراد مخبر کو لے کر روانہ ہوئے۔ چند قدم دور جا کر ایک مسلح شخص نے مڑ کر دیکھا۔ جاوا نے اسے ایک خطرناک اشارہ کیا۔ یہ مار دینے کا اشارہ تھا... گلے سے خیالی چھری چلانے کا اشارہ۔ مخبر یہ منظر نہیں دیکھ پایا۔ مسلح افراد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

بمشکل ایک منٹ بعد کسی کمرے کے اندر سے چھینے کی آواز آئی۔ یہ گولی سائلنسر لگے پستول سے چلائی گئی تھی۔ سب سمجھ گئے کہ مخبر کا کام تمام ہو چکا ہے۔

اس تماشے کے دوران میں ایک قریبی کمرے سے آشا کے پکارنے کی آواز آتی رہی تھی۔ وہ بار بار دروازہ پیٹ رہی تھی۔ اسے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں ایک ہی بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید گوبند رجبی یہی کچھ محسوس کر رہا تھا۔ اسی دوران میں باہر ایک اسکوٹر رکنے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ جانے کیوں اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے لگا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔ وہ بادامی رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔

’’لو بھئی چاؤلہ! تمہاری پریشانی ختم ہو گئی۔ وہ میاں مٹھو گیا۔‘‘ جاوا نے کہا۔

چاؤلہ نے ہاتھ جوڑ کر دھنیواد کہا اور جاوا کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ یقیناً یہی وہ مقامی تھانے دار تھا جس کا ذکر چند منٹ پہلے ہوا تھا۔

’’بیٹھ جاؤ چاؤلے۔‘‘ جاوا نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

’’نہیں جناب! یہ گستاخی نہ کروائیں۔‘‘ تھانے دار چاؤلہ نے کہا اور اسی طرح کھڑا رہا۔ جاوا نے دو مسلح افراد کے سوا باقی سب کو باہر بھیج دیا۔

’’اوتار سنگھ کے پتر کو نہیں دیکھو گے انسپکٹر؟‘‘ چودھری انور نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

’’کہاں ہے؟‘‘

چودھری انور نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ تھانے دار چاؤلہ کی نگاہیں یوسف فاروقی پر جم کر رہ گئیں... وہ حیرت کی تصویر تھا۔ ’’زبردست... یہ تو چنگا ہے جی... انیس بیس کا فرق ہوگا۔‘‘ انسپکٹر چاؤلہ نے متحیر اور مسرور ہو کر کہا اور کھڑکی کے قریب آ گیا۔

’’کیا خیال ہے، کام دے گا؟‘‘

’’ہنڈرڈ پرسنٹ دے گا جی... اس سے گ... گھ... کو...؟‘‘

’’یہ دوسری کام ہے بھئی۔‘‘ جاوا نے کہا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں تھانے دار چاؤلہ، وہ...

وغیرہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے ساری بات کا پتا چل گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جان کی بازی ہارنے والے پولیس کے انفارمر کا نام روہیل سنگھ تھا۔ ایسے انفارمرز کو عام طور پر شدید مطلوب افراد کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ بدقسمت روہیل کو بھی سردار اوتار کے مفرور بیٹے اشوکا سنگھ کے بارے میں علم تھا۔ دو دن پہلے جب ہم یہاں وارد ہوئے تو روہیل نے بھی کئی دوسرے لوگوں کی طرح، یوسف کو دیکھا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے اسے اشوکا ہی سمجھا۔ اگلے روز اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ مقامی تھانے دار چاؤلہ سے اس کے گھر پر جا کر ملا اور اسے بتایا کہ سردار اوتار کا مفرور بیٹا کچھ دیگر افراد کے ساتھ گاؤں میں موجود ہے۔ تھانے دار چاؤلہ سے رابطہ کرنا روہیل کی بدقسمتی ثابت ہوا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ یہ ہندو تھانے دار، جاوا کے پرانے نمک خواروں میں سے ہے اور محکمے سے زیادہ جاوا کا وفادار ہے۔ اسے یوسف کی ساری روداد معلوم تھی۔ جانتا تھا کہ یوسف اپنی شکل و شباہت کی وجہ سے جاوا اور سردار اوتار کے لیے بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ لہٰذا اپنے مخبر کی اطلاع پر تھانے دار چاؤلہ نے خود کوئی کارروائی کرنے کے بجائے جاوا کو اطلاع پہنچائی اور جاوا اپنے جاں بازوں کے ساتھ آناً فاناً یہاں آ دھمکا۔

یوسف بالکل گم صم کھڑا تھا۔ میں نے کوئی ایک گھنٹا پہلے ساری صورتِ حال کھول کر اس کے سامنے بیان کر دی تھی۔ اب میرے سارے بیان کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ گلوکار سے مشابہت والی ساری بات ڈھونگ تھی۔ اصل چکر وہی اوتار سنگھ کے بیٹے والا تھا۔ تھانے دار چاؤلہ کھڑکی میں سے یوسف کو اسی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جس دلچسپی سے پنجرے میں بند جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ ’’یہ تو کمال ہے جاوا صاحب۔‘‘ وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ’’یہ گال والے نشان کے بعد تو یہ اشوکا بابو کی کاربن کاپی لگنے لگا ہے... بس آواز اور قد کاٹھ کا تھوڑا بہت فرق ہوگا۔‘‘

اس سے پہلے کہ جاوا جواب میں کچھ کہتا، ایک بندہ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے جاوا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’نہیں جاوا صاحب! ابھی کچھ پتا نہیں چلا حرامزادی کا... لیکن وہ گاؤں کے اندر ہی ہے۔ ہم آس پاس کے گھروں میں دیکھ رہے تھے۔‘‘

جاوا پھنکارا۔ ’’اگر وہ نہ ملی تو میں کاٹ دوں گا تجھے بیچ سے۔ حرام کے جنے! تین تین کلو کڑاہی گوشت دس منٹ میں اندر ڈال لیتے ہو۔ ایک چھوکری نکل گئی تمہاری ٹانگوں

ہری اور لال مرچیں

☆ محبت سوز ہے یا ساز؟
اس وقت تک ساز ہے جب تک شادی کا مرحلہ نہ آئے۔

☆ چور کے پکڑے جانے میں کب مزہ آتا ہے؟
جب اس نے کسی کا دل چرایا ہو۔

☆ شہنائی کی آواز میں درد کیوں ہوتا ہے؟
شاید دولہا کو آنے والے وقت کے لیے خبردار کرنے کے لیے۔

☆ رائی کا پہاڑ کب بنتا ہے؟
بیوی کے سامنے ماں کی تعریف کر کے دیکھ لیں۔

☆ کیا واقعی ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں؟
جی جناب، میزبانوں کے لیے۔ اگر آنے والے مہمانوں کے ساتھ 9 بچے بھی ہوں۔

(ریاض بٹ، حسن ابدال)

کے نیچے سے۔ جاؤ ڈھونڈو اسے۔‘‘ جاوا کے آخری الفاظ کسی دہاڑ سے مشابہ تھے۔ کارندے کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بڑا جسیم اور رعب دار شخص تھا مگر جاوا کا غصہ دیکھ کر بو کھلا گیا۔ اپنے موٹے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

یقیناً یہ ثروت کا ذکر ہی ہوا تھا۔ رجنی کے بارے میں تو ابھی ان لوگوں کو علم ہی نہیں تھا۔

چودھری انور گنجے نے میری طرف کینہ توز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ’’ہمیں پتا چلا ہے کہ ایک اور کنجر سنگھ بھی تیرے ساتھ تھا۔ وہ کس ماں کے پاس ہے؟‘‘ چودھری انور کا اشارہ یقیناً جگت سنگھ کی طرف تھا۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ جگت سنگھ کو تھوڑا بہت جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ’’مجھے کسی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ جگت اپنے کسی کام سے نکلا تھا۔‘‘

جاوا کا ایک کارندہ بولا۔ ’’اور ایک اور چھوکری بھی تو تھی یہاں۔ گوبند سنگھ کی منگیتر؟‘‘

’’وہ بھی جگت کے ساتھ ہی گئی تھی۔‘‘ میں نے فوراً کہا۔

’’یہی تو پوچھ رہے ہیں بچے کہ وہ دونوں گئے کہاں ہیں؟‘‘ جاوا نے سفاک انداز میں پوچھا۔

’’میں نہیں جانتا۔‘‘

’’تم جو جو کچھ نہیں جانتے، آج سب جان جاؤ گے۔

اگلی پچھلی ساری کسر نکلے گی۔ وہاں پاکستان میں تو وہ گندے گوشت کا بیوپاری زریان اپنی ماں کا ولیمہ کھانے پہنچ گیا اور تم بچ نکلے مگر اس بار نہیں بچو گے بچے! تم اپنے ہاتھوں سے نادر کے ہتھیارے (عمران) کو گولی نہ مارو تو پھر مجھ خاکسار کو جاوا کون کہے گا۔" پھر وہ اپنے کارندے سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چوپڑا! ذرا سردار اوتار کو فون لگاؤ۔"

میں نے پہلی بار اس چوپڑا نام کے کارندے کو دھیان سے دیکھا اور یوں لگا کہ میں کسی انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ یہ بندہ مشہور انڈین ولن پریم چوپڑا سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہی پھیلی ہوئی ناک، وہی ابھرے ہوئے رخسار... زیادہ نہیں تو ستر اسی فیصد تک ضرور وہ انڈین اداکار سے ملتا تھا۔ اس کا جسم تھوڑا سا فربہ ہوتا تو یہ مشابہت مزید بڑھ جاتی۔

اس نے قیمتی موبائل فون پر کال ملائی اور پھر فون جاوا کی طرف بڑھا دیا۔ جاوا مخصوص انداز میں بولا۔ "ہاں سردارا! کیا حال ہے تیرا... بیٹی والا معاملہ کچھ ٹھیک ہوا کہ نہیں؟"

دوسری طرف سردار اوتار سنگھ نے جو کہا، وہ جاوا نے قدرے بے پروائی سے سنا... جاوا کے چہرے پر چیچک کے مدھم نشان تھے جو اس کی ہیبت میں اضافہ کرتے تھے۔ سردار اوتار کی بات سننے کے بعد جاوا نے کہا۔ "چل کوئی نہیں، زیادہ پریشان نہ ہو۔ یہ تیرا ایک لفڑا تو حل ہو گیا ہے۔ وہ چھوکرا یوسف پکڑ لیا ہے ہم نے... ساتھ میں وہ جعلی اکبر علی بھی ہے۔ اس ماسٹر پیس کا اصل نام تابش ہے... اس چندا کے لوٹے سے اپنی پرانی واقف کاری نکل آئی ہے۔"

دوسری طرف سے یقیناً ثروت کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ جاوا نے کہا۔ "وہ چھوکری بھی ساتھ ہی ہے لیکن ابھی کہیں سنک گئی ہے۔ گاؤں کے اندر ہی ہے کہیں۔ لڑکے ڈھونڈ رہے ہیں۔ شکاری کتوں سے پالتو خرگوشنی بھی بچ سکی ہے۔ یہ بھی نہیں بچے گی۔"

دوسری طرف سے سردار اوتار سنگھ نے کچھ کہا جسے جاوا نے غور سے سنا اور اپنے بھدے ہونٹ سکوڑے۔ ساتھ ہی مجھے بھی گھورا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "میرے بچے اور کتنے پنگے لے گا تو؟ پنگے پر پنگا، دنگے پر دنگا... وہاں سردار اوتار کے ایک بندے کو بھی پھڑکایا ہے تو نے؟ حویلی کے اندر واٹر پمپ کے کھڈے سے اس کی لاش ملی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ سردار اوتار کے خاص ساتھی کیدار ناتھ کی بات کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ جاوا کچھ اور کہتا ایک بار پھر آشا زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ جاوا نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے چودھری انور کو دیکھا۔ "عورت زوردار ہے انورا۔ ذرا دیکھ تو جا کر کتنا "زور" ہے اس میں۔"

چودھری انور بس مسکرا کر رہ گیا۔ اس کے انداز سے پتا چلا کہ وہ رنگین مزاج ہونے کے باوجود فی الحال اس قسم کی مہم جوئی کا ارادہ نہیں رکھتا۔

جاوا نے سفاکی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "جاؤ لڑکو! تم میں سے ہی کوئی چپ کراؤ اس پنجابن خیار کو... بلکہ تو ہی جا چوپڑا۔ تو کافی مہینوں بعد جیل سے نکلا ہے۔"

چوپڑا کی چوڑی ناک کچھ اور پھیل گئی۔ وہ واقعی فلمی ولن نظر آنے لگا۔ فرق صرف عمر کا تھا۔ اصلی پریم چوپڑا تو کافی بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہ اسی کی دہائی کا پریم چوپڑا لگ رہا تھا۔

"جو حکم جاوا صاحب۔" چوپڑا نے ادب سے کہا اور واپس مڑا۔

میرے پہلو میں کھڑا گوبند سنگھ چلّایا۔ "رک جاؤ... خبردار جو اسے ہاتھ لگایا تو۔ میں... میں مار دوں گا اور مر جاؤں گا۔"

جاوا زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ چودھری انور سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو، یہ کٹی گردن والا مرغا کہہ رہا ہے کہ مار دوں گا یا مر جاؤں گا... اوئے گندی ماں کے بچے مرتو تو پہلے ہی چکا ہے، اب اور کیا مرے گا۔"

"دیکھو جاوا... ہم... میں جانتا ہوں... آپ بہت بڑے لوگ ہو۔ میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں... لیکن ہمیں اس طرح ذلیل کرنے سے پہلے ہمارا دوش بتا دو۔ ہم نے کیا کیا ہے؟ آپ کی دشمنی اس تابش بھاجی سے ہوگی یا یوسف سے ہوگی..."

"جو جاوا کے دشمن کو پناہ دے گا، وہ جاوا کا دشمن ہی ہوگا نا۔" جاوا نے گلاس میں شراب انڈیلی اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ کرسی اس کے صحت مند بوجھ کے نیچے چرچرا رہی تھی۔

"میں سوگند کھاتا ہوں جی۔ اگر ہمیں شک بھی ہوتا کہ اس معاملے میں آپ کا نام آ رہا ہے تو ہم ان کے قریب بھی نہ پھٹکتے۔ ہمیں بالکل جانکاری نہیں تھی۔" گوبند بولا۔

"مگر بچے! تو تو اب بھی دشمنی فرما رہا ہے۔ تیرا بھائی جگت اس گھر میں تیرے ساتھ تھا یا نہیں؟ وہ جہاں گیا ہوگا تم لوگوں کو بتا کر ہی گیا ہوگا۔"

"میں واہگرو کی سوگند کھاتا ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اس بارے میں نردوش ہوں۔ ہم دونوں بھائی نردوش ہیں۔"

جاوا شراب پیتے ہوئے بولا۔ "دیکھ کاکے! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے بک چکا ہوں کہ بالکل نردوش ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بندے کو سزا ہی نہ ملے۔ سزا تو بندے کو کسی بھی سے کی پرانی غلطی کی وجہ سے مل سکتی ہے، جیسے ابھی اس سسرے مخبر کو ملی ہے۔ اور دیکھ بچے! سزا کی وجہ سے من چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ آتما کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہے۔"

پھر وہ چوپڑا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اوئے کتے! تو تو جا... تو کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟"

گوبند چلّایا۔ "نہیں جاوا صاحب! ایسا نہ کرو۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ۔ رحم کرو ہم پر..." اس نے کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر جھنجوڑا۔

جاوا نے بڑے غور سے گوبند کو دیکھا اور بولا۔ "میرے بچے! یہ صرف تیری بھاوج ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ بڑا درد ہے تیری آواز میں۔ لگتا ہے سہگل صاحب تیری آواز میں گھس گیا ہے۔"

جاوا نے یہ بات نیم سنجیدگی سے کہی تھی لیکن یہ حقیقت بھی تھی۔ میں چند رات پہلے اس حقیقت کا گواہ بنا تھا۔ گوبند اور اس کی جعلی بھاوج میں ایک اور تعلق بھی تھا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں گوبند نے بہت منت سماجت کی۔ بیچ بیچ میں اس نے غضب ناک لہجے میں جاوا کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی۔ لیکن جاوا تو جیسے ایک کالے پتھر کا نام تھا جس پر کوئی داد فریاد اثر کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں کچھ بولا تو نہیں مگر میرے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ گہری نیلی آگ جو اردگرد کی ہر شے کو جاوا سمیت راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ اس آگ کو نکلنے کے لیے راستہ چاہیے تھا مگر راستہ کہیں نہیں تھا۔ عقب میں پختہ لکڑی کا بھاری دروازہ تھا اور سامنے سلاخ دار کھڑکی۔

قریبی کمرے سے پہلے آشا کی منت سماجت کی آوازیں آتی رہیں پھر وہ رونے چلّانے لگی اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی یہ پکار مدھم ہو گئی اور بالکل گھٹ کر رہ گئی۔ یقیناً پریم چوپڑا نے اکیلے یا اپنے کسی ساتھی کی مدد سے آشا پر قابو پا لیا تھا۔

گوبند بہت تڑپا مچلا لیکن ہم تینوں آشا کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ یہ ایک بھرا پُرا گاؤں تھا۔ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، یقیناً اردگرد والوں کو اس کی خبر ہو چکی تھی... اس کے باوجود کوئی مدد کے لیے نہیں آیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ثروت بھی یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ خوف کی وجہ سے کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی۔ اس نے یقیناً گاؤں والوں کو اندر کی صورتِ حال سے آگاہ کیا ہوگا۔ مگر ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ ہر کسی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ باقی رہی پولیس جس کو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا ہوتی ہے تو پولیس کا کرتا دھرتا چاؤلہ خود یہاں موجود تھا اور شراب پی رہا تھا۔ جاوا کے اصرار پر اب وہ اس کے پاس ہی مؤدب انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اگر خدانخواستہ ثروت پکڑی جاتی اور اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا تو کیا ہوتا؟ میں کیا جیتے جی یہ سب کچھ دیکھ سکتا اور جھیل سکتا؟ جب ثروت لاہور سے یوسف کی تلاش میں نکل رہی تھی، میں نے اسے بہت روکا تھا۔ ہارون آباد کے ہوٹل سے بھی میں نے اسے واپس لاہور بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہمارا پالا بُرے لوگوں سے پڑنے والا ہے مگر حالات اس درجہ سنگین ہوں گے، یہ میں نے تب بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ درندوں کا گروہ تھا، خونی قاتلوں کا جتھا تھا... اور یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ یہ فلم نگری ممبئی سے وارد ہوئے تھے۔ ممبئی، رنگ و بو اور روشنیوں کا مرکز لیکن اس کے ساتھ ساتھ جرائم کا تاریک ترین گڑھا۔ ایشیا کے ناسوروں میں سے ایک ناسور۔ اور مشرقی پنجاب کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ممبئی کا یہ کالا عفریت جاوا، ہمارے سامنے پھیل کر ایک فولڈنگ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور سرخ رنگ کی نہایت قیمتی شراب اپنے اندر انڈیل رہا تھا۔ شراب انسان کو جانور بناتی ہے اور جو پہلے ہی جانور اور درندہ ہو، اس کی بربریت کا کیا ٹھکانا ہوگا...

جاوا، چودھری انور اور چاؤلہ کے سامنے اب دو فولڈنگ میزوں پر کئی لوازمات سجا دیے گئے تھے جن میں ڈرائی فروٹ کے علاوہ تلے ہوئے آلو اور اس قسم کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ جاوا اور چودھری انور کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے یہ خوشگوار انکشاف ہو رہا تھا کہ سردار اوتار کی بیٹی سرتوں اپنے گھر والوں کے ہاتھ نہیں آ سکی اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ کسی طرح سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ چکی ہو... یکایک کہیں پاس سے ایک بار پھر چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے غور سے سنا اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ گوبند کی منگیتر چنچل رجنی کی آواز تھی۔

وہ "بچاؤ بچاؤ" پکار رہی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد جاوا کے کارندے اسے کھینچتے ہوئے جاوا کے سامنے لے آئے۔ رجنی کے تراشیدہ بالوں میں بھوسے کے بہت سے تنکے اٹکے ہوئے تھے۔ اس کے شوخ رنگوں والے لباس پر بھی تنکے تھے۔ جاوا کے کارندے نے رجنی کو سر کے بالوں سے دبوچا ہوا تھا۔ دوسرا کارندہ اسے عقب سے زوردار ٹھوکے دے رہا تھا۔ ان ٹھوکوں کے لیے وہ رائفل کا کندا استعمال کر رہا تھا۔

کارندے نے کہا۔ "جاوا صاحب! یہ وہاں کوٹھری میں پرالی کے اندر چھپی ہوئی تھی۔"

جاوا نے اسے سرتاپا گھورا اور بولا۔ "کیا نام ہے تیرا؟"

وہ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔" پھر اس کی نظر کھڑکی میں سے گزر کر گوبندر پر پڑی۔ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہ گوبندر کی طرف بڑھی۔ اس کے بال کارندے کی مٹھی میں تھے۔ اس نے بے رحمی سے جھٹکا دیا۔ رجنی کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ ایک بار پھر چلّانے لگی۔ "بچاؤ... رب کا واسطہ ہے بچاؤ۔" اس کی آواز باریک تھی۔ خوف کی وجہ سے کچھ اور بھی باریک ہو گئی تھی۔

جاوا نے کہا۔ "یہ چھوکری بول رہی ہے یا سیٹی بجا رہی ہے۔"

کارندے نے رجنی کی آواز بند کرنے کے لیے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا تو جاوا زہریلے انداز میں بولا۔ "نہ لئے دو اس کو۔ دیکھتے ہیں کہ کون آتا ہے اس کی سیٹی سن کر۔"

چودھری انور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ "کوئی نہیں آئے گا جاوا صاحب! کسی کے کانوں تک آواز نہیں پہنچے گی اور اگر پہنچے گی تو وہ سنے گا نہیں۔ لگتا ہے کہ اس پنڈ میں بس ایک ہی جی دار بندہ ہے... اور وہ، یہ چاؤلہ صاحب ہمارے ساتھ بیٹھا ہے۔"

شاید انور ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اردگرد موجود سب لوگوں نے اپنے کان بند کرلیے تھے۔ یقیناً وہ پُرشکوہ گاڑیاں دیکھتے ہی جاوا کی آمد کے بارے میں جان گئے تھے۔ اس آمد کے بعد یہاں کم از کم تین گولیاں بھی چلی تھیں۔ گولیوں کی آواز نے اہلِ دیہہ کو مزید سہا دیا تھا۔

میری نظر چودھری انور کے چہرے پر پڑی۔ وہ بھی جاوا کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا۔ اس کے سیاہی مائل ہونٹوں کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ رجنی کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کھینچا تانی میں رجنی کا دوپٹا اتر چکا تھا اور وہ بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔

جاوا نے مخمور نظروں سے چودھری انور کو دیکھا۔ "ہاں انور بھیا! یہ چھوکری چلے گی؟"

اس مرتبہ چودھری انور کے چہرے پر انکار نظر نہیں آیا۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی تھیں۔ ایک تو اب اسے شراب چڑھ چکی تھی، دوسرے وہ شہری لڑکیوں کا رسیا تھا۔ آٹھ دیہاتن تھی جبکہ رجنی گاؤں میں رہنے کے باوجود سرتاپا شہری نظر آتی تھی۔ چودھری انور نے تلے ہوئے آلو کے بہت سے قتلے ایک ساتھ اپنے منہ میں رکھے اور چاؤلہ کے کان میں کوئی بہکی ہوئی سرگوشی کی۔ چاؤلہ مؤدب انداز میں مسکرا دیا۔

جاوا نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ روتی چلّاتی رجنی کو کھینچ کر اسی طرف لے گئے جدھر تھوڑی دیر پہلے بدقسمت آشا گئی تھی۔ گوبندر اپنے سینے کی پوری قوت سے دہاڑنے لگا۔ "جاوا صاحب! ایسا مت کرو۔ میں تمہارے گلے لگ کر مر جاؤں گا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جاوا صاحب..." وہ سلاخوں پر مکّے برسانے لگا۔ انہیں جھنجوڑنے لگا۔ میں جانتا تھا، اس ساری تڑپ پھڑک سے اسے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔

چودھری انور گنجے کے چہرے پر شیطانی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر جاوا کی "مہربان آفر" قبول کرلی ہے۔ جگت سنگھ نے مجھے بتایا تھا، ماضی میں لاہور کی کسی شریف فیملی کی لڑکی نے چودھری انور کو دھتکار دیا تھا۔ اس دھتکار کا بدلہ اس نے کسی اور انداز میں لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے شہر سے تعلق رکھنے والی دو لڑکیوں کو رکھیلوں کے طور پر پچھلی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ اس کی بیویاں کہلاتی تھیں۔

کچھ دیر بعد چودھری انور اٹھا اور جھومتا ہوا سا ہماری نظروں کی رینج سے نکل گیا۔ گوبندر کا بُرا حال تھا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا اور خود کو دیواروں سے ٹکرا رہا تھا... اسی دوران میں پریم چوپڑا اپنا "سیاہ کارنامہ" انجام دے کر واپس آگیا۔ اس کے چوڑے چہرے پر لعنت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔

جاوا نے جھومتی آواز میں پوچھا۔ "ہاں چوپڑے! کتنا زور تھا...؟" اس سے پہلے کہ چوپڑا اپنی گندی زبان کو حرکت دے کر کچھ منحوس بولتا، دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی شیشے کی چیز چھناکے سے ٹوٹی۔ اس کے بعد آشا کی آوازیں ابھریں۔ وہ ایک بار پھر چلّا رہی تھی لیکن اب اس کے چلّانے کی نوعیت مختلف تھی۔ اندازہ ہوا کہ وہ جاوا کے کارندوں کو نوعمر رجنی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس کا کہا ہوا کوئی کوئی فقرہ ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ بے توقیری اور ذلت کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد اس نے حجاب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ جاوا کے کارندوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے منہ کالا کرلیں لیکن رجنی کو چھوڑ دیں۔ پریم چوپڑا بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر آوازوں کی طرف لپک گیا۔ بے شک آشا بھی اخلاقی طور پر ایک گری ہوئی عورت تھی لیکن ان آفت کی گھڑیوں میں اس کا کردار قدرے مختلف نظر آ رہا تھا۔ وہ رجنی کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یوں لگا جیسے آشا کو پیٹا اور گھسیٹا جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر بے بسی کے عالم میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مزاحمت کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دل سینے میں سو ٹکڑے ہو رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد جاوا کے کارندے آشا کو کھینچتے ہوئے جاوا کے سامنے لے آئے۔ اس کا بالائی جسم نیم عریاں تھا اور اسے اس عریانی کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ سرخ انگارہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک درانتی تھی۔ تاہم درانتی والے ہاتھ کو ایک بڑے کٹے شخص نے مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کا دوسرا بازو بھی ایک تنومند ڈشکرے کی گرفت میں تھا۔ ہم نے دیکھا، پریم چوپڑا کے کندھے پر ایک گہرا زخم تھا۔ اس نے کندھے کو ہاتھ سے دبایا ہوا تھا اور خون ہاتھ کی انگلیوں کی درزوں سے ابل رہا تھا۔ چوپڑا کا چہرہ اذیت سے پیلا ہو رہا تھا۔

ایک کارندہ بولا۔ "اس کتیا نے حملہ کیا ہے جی۔ اپن اس کو پکڑتا نہیں تو یہ اور نقصان کرتی۔"

جاوا کھڑا ہو گیا۔ چاؤلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ رنگ میں بھنگ پڑ گئی تھی۔ چودھری انور گنجا بھی اندر سے آگیا۔ جاوا کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ اس نے آشا کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور اس کی شکل کو بگاڑتے ہوئے بولا۔ "بلیدان دے رہی ہو؟ اس چھوکری کے بدلے خود کو بھینٹ چڑھانا چاہتی ہو؟ لیکن تیرے کھوپڑے میں شاید بھس بھرا ہوا ہے۔ جوان ہرنی کی جگہ جوان ہرنی ہی بھینٹ چڑھائی جا سکتی ہے... بڈھی بھینس نہیں...۔"

ہتک کو غم و غصے نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ اس نے درانتی سمیت جاوا پر حملے کی کوشش کی لیکن تنومند کارندوں نے اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہیں دیا۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر جاوا پر چلّانے لگی، اس کو گالیاں اور بددعائیں دینے لگی۔ پھر بے بسی کے عالم میں اس نے جاوا پر تھوک دیا۔ اس کا خون آلود تھوک... آخ تھو... کی آواز کے ساتھ جاوا کے کندھے پر پڑا۔

جاوا چند سیکنڈ کے لیے ساکت و جامد رہ گیا۔ پھر اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں واقعی انگارے دہکنے لگے ہیں۔ جاوا کے کارندوں نے درانتی آشا کے ہاتھ سے نکال لی۔ وہ اسے بے رحمی سے مارنا پیٹنا چاہ رہے تھے مگر جاوا نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اس کے تھانے دار چاؤلہ کو بھی روک دیا جو خطرناک انداز میں آشا کی طرف بڑھا تھا۔

جاوا نے اپنے کُرتے کے نیچے سے پستول نکالا۔ اس نے آشا کی گردن پر ذرا دباؤ ڈالا تو آشا کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس نے پستول کا لمبا بیرل آشا کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ دو افراد نے دو اطراف سے آشا کا سر پکڑ رکھا تھا۔ جاوا کسی غضبناک ناگ کی طرح پھنکارا۔ "بتاؤ کہاں سے تھوکا تھا؟ یہاں سے یا کچھ اور آگے سے؟"

آشا پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن گلے سے بس غوں غاں کی آواز ہی نکال پا رہی تھی۔ کمرے میں گوبندر، جاوا سے رحم کی درخواستیں کر رہا تھا۔

جاوا کا دھیان فقط آشا کی طرف تھا۔ وہ دوبارہ جنونی آواز میں بولا... "بتاؤ کہاں سے تھوکا تھا؟" اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کا بیرل کچھ اور بھی آشا کے گلے میں گھسیڑ دیا۔ وہ ابکائیاں لینے لگی۔ جاوا نے اوپر تلے دو فائر کیے اور پستول آشا کے منہ سے کھینچ لیا۔ وہ لہرا کر گری اور ساکت ہو گئی۔ ایک گولی غالباً اس کی گردن کے پچھلے حصے سے باہر نکل گئی تھی۔

"آخ تھو۔" جاوا نے اس پر تھوکا اور پھر اپنے پستول کے لعاب آلود بیرل کو آشا کے کُرتے سے صاف کیا۔

کمرے کے اندر گوبندر سنگھ جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو کمرے کے چوبی دروازے سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ میں نے دو منٹ پہلے دیکھا تھا کہ گوبندر نے آہنی سریے کا ڈیڑھ دو فٹ لمبا ایک نکیلا ٹکڑا اپنی شرٹ کے نیچے چھپایا تھا۔ وہ ایک زبردست فائٹر تھا۔ وہ کسی طرح باہر نکل جاتا تو کھلبلی مچا سکتا تھا مگر یقینی بات تھی کہ وہ لوگ اسے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ اور پھر یہی ہوا، جاوا نے اسے بس ایک وارننگ دی پھر گولی چلا دی۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی، وہ گر کر تڑپنے لگا۔ دوسری گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور اس نے اسے فوراً ہی ساکت کر دیا۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ جاوا نے خونی نظروں سے مجھے

اور یوسف کو دیکھا۔ موت جیسے سرد لہجے میں بولا۔ ”تم میں سے بھی کسی کو دروازے کے ساتھ زور آزمائی کرنی ہے؟“

یوسف نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ گوبندر دروازے کے قریب ہی گرا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون دروازے کی نچلی درز سے باہر کی طرف رینگنے لگا جیسے وہ بھی اس کمرے سے آزادی کا خواہاں ہو۔ سریے کا ٹکڑا اس کی شرٹ کے نیچے سے نکل کر فرش پر لڑھک گیا تھا۔

جاوا نے یہ ٹکڑا دیکھ لیا... اس نے جنونی لہجے میں مجھے حکم دیا کہ میں یہ ٹکڑا اٹھا کر اسے دوں۔ میں نے ٹکڑا اٹھا کر سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

بے شک گوبندر نے صدمے کے زیرِ اثر سنگین غلطی کی تھی۔ اس وقت ہم کسی بھی طرح مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ جاوا گرجا۔ ”اگر تم دونوں کے پاس بھی کوئی ایسی شے ہے تو نکال دو۔“

”نہیں، کچھ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”چلو وشواس کر لیتے ہیں۔ جو بندہ ایک دو گھنٹوں میں بھگوان کو پیارا ہونے والا ہو، اس کی بات پر وشواس کر لینا چاہیے۔“

پریم چوپڑا نے آشا کی لاش پر ایک کپڑا ڈالا پھر دو افراد اسے اٹھا کر لے گئے... خون پر پہلے چولہے کی راکھ ڈالی گئی پھر جھاڑو سے صاف کر دیا گیا۔ گوبندر کی لاش اسی طرح پڑی رہی اور ماحول کی سراسیمگی میں اضافہ کرتی رہی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ زندگی سے بھرپور یہ نوجوان اپنے تمام تر ہنر اور زندگی کے سارے منصوبوں سمیت مٹی کا ڈھیر بن چکا ہے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ رجنی شاید وقتی طور پر بچ گئی ہے۔ چودھری انور اب جاوا اور تھانے دار چاؤلہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ یہاں آناً فاناً جو خون خراب ہوا تھا، اس نے غالباً چودھری انور کا موڈ بھی بدل دیا تھا۔ اس کی توجہ اب رجنی کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ بہر حال توجہ ہٹنے کی ایک وجہ کچھ اور بھی تھی، جس کا پتا ہمیں تھوڑی دیر بعد چلا... رجنی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ ہی گھر میں کسی جگہ سے جدوجہد کے شواہد مل رہے تھے۔ جاوا موبائل فون پر کسی فلمی بندے کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ اسے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ فلاں کیس کی پیروی سے باز نہ آیا تو ممبئی واپس پہنچتے ہی سب سے پہلے وہ اس کو الٹا لٹکائے گا۔ اس کی فلم ڈبوں میں بند ہو جائے گی اور اس کی فیملی کا کوئی بندہ کسی فلم اسٹوڈیو میں بھی قدم نہیں رکھ سکے گا۔

اسی دوران میں پینٹ شرٹ والا ایک سکھ نوجوان کمرے میں داخل ہوا... اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا اسٹیتھو اسکوپ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس گاؤں کا کمپاؤنڈر یا ڈاکٹر ہے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر ہی تھا... اسے ایک مسلح شخص لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔ اس کا میڈیکل باکس بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ قریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر دوبارہ کھڑکی کے سامنے نظر آیا۔ تھانے دار چاؤلہ نے بارعب آواز میں اس سے پوچھا۔ ”ہاں جسونت! کیا رپورٹ ہے؟“

ڈاکٹر لرزاں آواز میں بولا۔ ”میں نے انجکشن دے دیا ہے جی، ہوش میں آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ چنتا کی کوئی بات نہیں جی۔“

اسی دوران میں دبلے پتلے ڈاکٹر کی نظر کھڑکی سے گزر کر اندر آئی اور گوبندر کی لاش پر پڑی۔ وہ کچھ اور بھی ہراساں دکھائی دیا۔

تھانے دار چاؤلہ نے کڑے لہجے میں کہا۔ ”جسونت! یہاں جو کچھ دیکھا ہے... اس کے بارے میں باہر کسی سے ایک شبد (لفظ) بھی نہیں بولنا۔ بہت تکلیف میں آ جاؤ گے۔“

”نن... نہیں جی، بالکل نہیں۔“

جاوا نے کہا۔ ”جو لڑکی یہاں سے بھاگی ہے، اس کے بارے میں کوئی جانکاری ہے تمہیں؟“

”جی بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی لڑکی بھاگی ہے اور آپ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہیں...“

”دھیان رکھو، کوئی جانکاری ملے تو فوراً بتاؤ۔“ تھانے دار نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور لڑکھڑاتا ہوا سا باہر نکل گیا۔ ایک مسلح شخص میڈیکل باکس کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا۔

بہت جلد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ بے ہوش ہونے والی گوبندر کی منگیتر... بلکہ ”سابقہ منگیتر“ رجنی کور ہے۔ وہ صورتِ حال کی تلخی نہیں جھیل سکی تھی۔ اسے آوازوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آشا پر کیا بیتی ہے۔ وہ اس وقت بے ہوش ہوئی تھی جب جاوا نے آشا پر دو فائر کیے تھے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ابھی اسے گوبندر کی موت کا پتا نہیں۔

جاوا کے قریب دو موبائل فون رکھے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون کی بیل ہونے لگتی تھی اور وہ گفتگو میں مصروف

ہوجاتا تھا۔ اس کی یہ ساری گفتگو، ممبئی کے ایک خطرناک ڈان کی ”شان“ کے عین مطابق تھی۔ اس کے اکثر فقروں میں گندی گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ ہمارے سامنے ہی ممبئی کی ایک معروف ہیروئن کی کال بھی آئی۔ جاوا نے اس سے قدرے بہتر انداز میں بات کی... تاہم گندی گالیوں سے مکمل پرہیز اس نے پھر بھی نہیں کیا۔ اس نے ہیروئن سے کہا کہ اگر اب اسے انکم ٹیکس آفیسر کا فون آئے تو وہ اسے بتائے۔ وہ اس کی پتلون گیلی کرنے کا مکمل انتظام کردے گا۔

کچھ دیر بعد تھانے دار جاؤلہ تو جاوا سے اجازت لے کر اور اس کے پاؤں چھو کر واپس چلا گیا تاہم باقی افراد وہیں موجود رہے۔ وہ زرخرید غلاموں کی طرح جاوا کے اردگرد جدید رائفلیں اٹھائے کھڑے تھے اور جاوا کی ابرو کے ایک اشارے پر کسی کو بھی چھلنی کرسکتے تھے۔ جاوا اور چودھری انور مسلسل شراب پی رہے تھے۔ گاہے بگاہے وہ مدھم آواز میں بات بھی کرنے لگتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس گفتگو کا محور میں ہوں۔

اسی دوران میں زخمی کندھے والا پریم چوپڑا اندر آیا۔ اس نے بڑے ادب سے جھک کر جاوا کے کان میں سرگوشی کی۔ جاوا نے سر اثبات میں ہلایا۔

پریم چوپڑا واپس چلا گیا اور چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے سکھ کو لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر پگڑی کے بجائے جوڑا تھا... وہ ذرا ڈرا سا جاوا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

”کیا بات ہے؟“ جاوا نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

نووارد نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا جیسے دوسروں کی موجودگی میں بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ جاوا پھنکارا۔ ”جو بکنا ہے سب کے سامنے بک دے۔ سمجھ لے یہاں ہر جگہ میں ہی تیرا باپ کھڑا ہوں۔“

نووارد نے تھوک نگلا۔ ”جناب! مجھے پنڈ کے نمبردار چودھری گلاب نے بھیجا ہے... کُڑی کا پتا چل گیا ہے جی۔“

”کہاں ہے؟“ جاوا کی بے قراری نمایاں تھی۔

”ہماری بیٹھک میں ہے جی۔ پناہ لینے کے لیے آئی تھی۔“

”تو پھر کیا خیال ہے... پناہ دیتی ہے اس کو؟“ جاوا نے پوچھا۔

نووارد نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”نمبردار صاحب ایسا سوچ بھی نہیں سکتے جی۔ آپ کی دوشی کو چھپا کر ہم نے اپنی گردن اتروانی ہے۔“

”تو پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟“

”نمبردار جی نے ایک بنتی کی ہے جی، اگر آپ مان لیں تو... ان کا خیال ہے کہ وہ خود کُڑی کو یہاں لائے تو پنڈ والے بعد میں باتیں بنائیں گے۔ آپ اپنے دو چار بندے بھیج کر کُڑی کو پکڑ لیں...“

میری دھڑکنیں زیروزبر ہورہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا ہے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ نمبردار کا نمائندہ جاوا کو جو اطلاع دے رہا ہے، وہ ثروت کے بارے میں ہی ہے۔ وہی ہورہا تھا جس کا بدترین اندیشہ میرے دل میں موجود تھا۔ ثروت یہاں سے تو بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن وہ گاؤں والوں کی بے حسی اور کم ہمتی کے جال سے نہیں نکل پائی تھی۔

باہر نمبردار کا نمائندہ خوف زدہ لہجے میں جاوا سے کہہ رہا تھا۔ ”جناب! آپ جیسا حکم کریں گے ویسا ہی ہوگا۔ لیکن اگر اس طرح ہوجائے تو ہماری تھوڑی سی عزت رہ جائے گی۔ آپ چاہیں تو ابھی آجائیں۔ بے شک ایک دو گولیاں بھی چلا دیں۔ تھوڑا سا ماحول بن جائے گا...“

جاوا سفاک مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ایک دو گولیاں مار ہی نہ دیں نمبردار کے ہیجڑوں کو؟“

نمائندے نے ہاتھ جوڑے۔ ”آپ مائی باپ ہیں جی۔ اپنے چاکروں پر کرپا ہی کریں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں بھیجتا ہوں بندے تھوڑی دیر میں... اس دوران میں اس کا دھیان رکھو۔ وہ بھاگ گئی تو تم میں سے کسی کو اپنی چھوکری دینی پڑے گی۔“

نووارد نے بار بار جھک کر نمستے کیا اور الٹے قدموں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں اس نے بڑی نیازمندی سے اپنی گردن جھکائے رکھی تھی۔ نہ اس نے ہماری شکلیں دیکھی تھیں، نہ کمرے کے فرش پر پڑی گوبندر کی لاش پر اس کی نظر پڑی تھی۔

جاوا نے یوسف سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”لے بھئی، آگئی تیری پتنی بھی ہمارے اس بوچڑ خانے میں۔ لیکن تجھ سے زیادہ پریشانی تو تیرے اس یار تابش کو ہوگی۔ اس کا اصل پتی تو یہی ہے نا... تُو تو بس کاغذی خاوند ہے چھوکری کا...“

لگتا تھا کہ میرے اور عمران کے بارے میں جاوا کافی معلومات حاصل کرچکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماضی میں ثروت میری منگیتر رہی ہے۔

یوسف بالکل خاموش اور ساکت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس وقت اسے اپنی جان سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ وہ گوبندر کی لاش سے نگاہیں چرانے کی کوشش کررہا تھا لیکن گاہے بگاہے نگاہ لاش پر پڑ ہی جاتی تھی۔ اس صورت میں اس کے چہرے پر گہرا زرد سایہ لہرا جاتا تھا۔

چودھری انور نے کہا۔ ”جاوا صاحب! یہ تابش اصل پتی بھی ہے اور پرانا عاشق بھی۔ ہمارے پنڈ میں یہ دونوں ایک کریانہ فروش کے گھر میں میاں بیوی کی طرح اکٹھے رہتے رہے ہیں۔ سنا ہے کہ اس کتے جگت سنگھ کے گھر میں بھی یہ پرانے عاشق معشوق ایک ہی کمرے میں سوتے رہے ہیں۔“

جاوا نے شرابی انداز میں ہاتھ ہلایا اور بولا۔ ”ہاں بھئی ہاں، وہ کیا گانا ہے اپنے کشور کمار کا جس کی دھن اس بنگہ بھاگی آرڈی برمن نے بنائی تھی... پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے... پرانی عاشقیاں ہیں بھئی، پرانی شراب کی طرح تیز اور نشے والی۔ کوئی بات نہیں، اس عاشقی کا بھی حساب کتاب فرما لیتے ہیں۔ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ عاشق بچہ اپنی لیلیٰ کے لیے کتنی بڑی اوکھلی میں سر گھسیڑ سکتا ہے۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“

ذرا توقف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اوئے پریم کپورا! تو بولتا کیوں نہیں؟ منہ میں کیا ایلفی لگائی ہوئی ہے؟“

چودھری انور نے کہا۔ ”جاوا صاحب! یہ جتنا اوپر ہے اس سے زیادہ نیچے ہے۔ بڑا خطرناک ہے۔ آپ کی طرح مجھ پر بھی ایک چڑھاوا چڑھایا ہوا ہے اس نے۔“

”کیسا چڑھاوا؟“ جاوا نے پوچھا۔

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ اس نے اپنی معشوق کے ساتھ مل کر جب بارڈر پار کیا تو میرے بندے اس کے پیچھے تھے۔ اس نے جگت کے ساتھ مل کر گھات لگائی اور میرے پانچ بندوں کی جان لی۔ ان کا خون میری چھاتی پر دھرا ہوا ہے جی۔“

”کوئی بات نہیں انورے! سارے حساب ایک جگہ جمع کرلیں گے۔ پورا اٹل بنا دیں گے اس کو۔ تم چنتا مت کرو۔ لیکن ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں۔ یہ اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کے پیچھے ایک بڑا ہائی پاور انجن ہے جو اس کو چلاتا ہے... جب تک اس انجن کی ٹینکی میں چینی ڈال کر اس کا ڈلورام نہیں کریں گے، کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس انجن کا نام شاید تم نے بھی سنا ہو۔ عمران... عمران ہیرو۔ اصل کام تو یہ ہے کہ اس کو ہیرو بنانے والے اس کے سارے پوشیدہ تار کاٹ دیے جائیں۔ اس کو ایک دم پاور لیس، ہیجڑا انجن بنا دیا جائے۔ نہ خود چلے، نہ اس پنجے کو دھکا لگائے... او ہو ہو ہو... ہیجڑا انجن۔“ جاوا نے اپنے فقرے پر خود ہی لطف لیا۔

میں نے دل ہی دل میں چودھری انور گنجے کے جھوٹ پر لعنت ارسال کی۔ اپنے پانچ بندوں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے میرے ساتھ جگت وغیرہ کو بھی نتھی کردیا تھا۔ شاید اسے جاوا کو یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی تھی کہ میں نے اکیلے ہی اس کے پانچ بندوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔

ثروت کے حوالے سے اب امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ پھر بھی یہ آس ختم نہیں ہورہی تھی کہ شاید وہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوجائے۔

کچھ دیر بعد جاوا اور چودھری انور اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ پریم چوپڑا اور اس کے مسلح خونخوار ساتھی ہمارے اردگرد موجود رہے۔ یوسف سرگھٹنوں میں دیے یکسر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ صورت حال سے سخت خوف زدہ اور مایوس نظر آتا تھا۔ ان باتوں کی خجالت بھی اس کے چہرے پر موجود تھی جو تھوڑی دیر پہلے جاوا اور چودھری انور نے کی تھیں۔ چودھری انور نے بڑی بے شرمی سے یہ الزام عائد کردیا تھا کہ میں اور ثروت ایک ہی کمرے میں اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ یقیناً ان باتوں نے یوسف کے دل و دماغ میں رقابت کے زہریلے نقش کچھ اور گہرے کیے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے کہا۔ ”یوسف! تم پر کم ازکم یہ بات تو ثابت ہوگئی ہے نا کہ تمہاری شکل کسی گلوکار وغیرہ سے نہیں اسی کتے سردار اوتار کے بیٹے سے ملتی ہے۔ اور اسی لیے تمہارے لیے موت کا اسٹیج بھی تیار کیا جارہا تھا۔“ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سرگوشیوں میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی مگر اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

اسی دوران میں گھر سے باہر ایک گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ثروت یہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس کے چلانے کی گھٹی گھٹی آواز سنی پھر شاید کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی شخص گرج کر بولا۔ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ثروت کو کھینچ کر اندر لے آئے ہیں۔ بہرحال ہم اسے دیکھ نہیں سکے۔

میری بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں کسی طرح اس پنجرہ نما کمرے سے باہر نکل سکوں۔ ثروت کو بچا لوں یا خود ختم ہوجاؤں۔ میں نے جاوا کو پکارنا شروع کردیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میری پکار کا اتنی جلدی جواب ملے گا۔ زخمی پریم

بعد از مرگ

تنویر ریاض

معاشرے کا شعار جھوٹ بن جائے تو پھر بنا ملاوٹ کے سچ کم ہی سامنے آتا ہے... ایک ایسے ہی معاشرے میں بسنے والوں کی داستان... جن کے ظاہری میل جول میں قربتیں تھیں مگر دلوں کے درمیان دوریاں حائل تھیں... قربتوں اور فاصلوں... محبتوں اور ریا کے درمیان جھوٹ اور سچ کی کشمکش کا ہوش ربا احوال...

پردیسی معاشرے میں مکمل ڈوبی ہوئی ایک تیز رفتار کہانی...

شیری کا انکشاف میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ ریستوران میں گونجنے والی موسیقی کا شور اچانک ہی ختم ہو گیا ہو۔ میں نے فوراً ہی اپنے ذہن میں حساب لگانا شروع کر دیا اور مجھے یہ جان کر خاصا اطمینان ہوا کہ اس پورے قصے میں میرا کوئی کردار نہیں، ورنہ شیری نے یہ کہہ کر مجھے ڈرا ہی دیا تھا کہ وہ امید سے ہے۔ کسی زمانے میں اس کے ساتھ تعلقات ضرور رہے تھے لیکن وہ بات پرانی ہو گئی تھی۔ اس لیے میں اپنے آپ کو اس جرم میں شریک نہیں سمجھ رہا تھا۔

''تم نے کچھ کہا نہیں۔'' وہ میرا ردعمل جاننا چاہ رہی تھی۔

چوپڑا اندر سے آیا۔ اس نے مجھے خونی نظروں سے گھورا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''دو منٹ چھری کے نیچے سانس لو۔ بھیا صاحب (جاوا) خود تم سے بات کریں گے۔''

... قریباً پندرہ بیس منٹ بعد مجھے حیرت کا دھچکا لگا، جب واقعی مجھے اس منحوس کمرے سے باہر نکال لیا گیا۔ یوسف اندر ہی رہا۔ ایک رائفل کی نال میرے سر سے لگی ہوئی تھی۔ دو اور رائفلیں مجھے دائیں بائیں سے نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔ وہ لوگ ذرا سا رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ پریم چوپڑا بولا۔ ''تمہارے لیے بچت کی ایک راہ نکل رہی ہے۔ اپنی کسی بے وقوفی سے اسے ضائع مت کر دینا۔ جو کہہ رہے ہیں، چپ چاپ کرتے جاؤ۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے ہاتھوں کو پشت پر ایک ہینڈ کف لگا دیا گیا... اور پھر دو تین کمروں کے اندر سے گزار کر جاوا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جاوا ایک پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ایک کارندہ اس کے پاؤں دبانے میں مصروف تھا۔ میں پہنچا تو جاوا نے اسے بھی کمرے سے نکال دیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب اس بند کمرے میں جاوا اور میں تنہا تھے۔

جاوا بولا۔ ''میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا بچے! تیرا اور عمران ہیرو کا سارا حساب کتاب میں نے اس چٹ پر لکھ دیا ہے، ایک نظر ڈال لے۔'' اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے نظر دوڑائی۔ ایک فہرست سی بنائی گئی تھی۔ اوپر سے نیچے اس طرح لکھا تھا۔ مال روڈ لاہور والی کوٹھی میں نادر ٹی اور اس کے ایک ساتھی کی ہتھیا کی۔ سلطان چٹا کے کان میں گولی سے سوراخ کیا۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں دو بندوں کو زخمی کیا۔ شیخوپورہ کے قریب اشور یا مائے کی عزت خراب کی۔ اندرون لاہور کے ہوٹل لالہ زار میں سیکریٹری ندیم کی ٹانگ توڑ کر اسے جیپ بے جا میں رکھا اور اسی ہوٹل میں سلطان کے دو بندوں کو شوٹ کیا، دونوں کی موت ہوئی۔ چودھری انور کی پہلی حویلی میں مینو عرف کرشمہ کپور کی جان لی... میں نے سوالیہ نظروں سے جاوا کو دیکھا۔

وہ بولا۔ ''یہ صرف میرا حساب کتاب ہے۔ چودھری انور اور سردار اوتار وغیرہ کے بہی کھاتے اس کے علاوہ ہیں۔ اس میرے حساب کتاب کے مطابق ہی تمہیں دو تین دفعہ کتے کی موت مارا جا سکتا ہے اور تیری اس سندر معشوقہ پر اسی گاؤں میں بیس بیس روپے کا ٹکٹ لگایا جا سکتا ہے۔ اور میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں وشواس دلاتا ہوں، یہاں دو دو سو کوس تک کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ پنچایت سے لے کر پولیس تک... اور بی ایس ایف سے لے کر فوج تک کوئی نہیں۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''ایک سودا۔ میں اپنی سوگند واپس لے لوں گا۔ عمران ہیرو کی اور تمہاری زندگی بخش دوں گا اور ساتھ ساتھ تمہاری سندر معشوقہ کی بھی۔ چودھری انور اور سردار اوتار کو بھی سمجھ بجھ لوں گا۔ وہ لفڑا کریں گے لیکن سنبھال لوں گا۔''

''بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''اس گوشت کے پہاڑ حرامی ریان ولیم کے منہ میں شکست کا گوبر بھرنا ہوگا... اسے یادگار مات دینا ہوگی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

جاوا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگلے مہینے ممبئی کے ایک بڑے جوا خانے میں ایک بہت بڑا گیم ہو رہا ہے۔ اس کو ''گریٹ گیم'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس میں دنیا کے مانے ہوئے قریباً دو درجن گیمبلر حصہ لیں گے۔ وہ چنے ہوئے نڈر لوگ جن کو اپنی "LUCK" پر وشواس ہے اور قسمت کی دیوی جن پر اپنی مہربانیوں کی بوچھاڑ رکھتی ہے۔ گیم بھی کوئی ایسا انوکھا نہیں ہے۔ تمہارا ہیرو عمران قسمت کا دھنی ہے۔ ایک خلقت اس کی خوش بختی کو مانتی ہے۔ اور جو کچھ اس گریٹ گیم میں کیا جانا ہے، وہ بھی تمہارے ہیرو کے لیے نیا نہیں ہوگا۔''

''میں سمجھ نہیں۔''

''ریوالور میں گولی رکھ کر کنپٹی پر فائر کرنا۔ لیکن اس میں رسک کچھ زیادہ ہوگا۔ ظاہر ہے اگر انعام بہت بڑے تو رسک تو ہوگا نا۔''

''کیسا رسک؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''پانچ خانے میں گولی، ایک خانہ خالی۔ ہر بندے کو بس ایک فائر کرنا ہوگا۔ جو بچے گا، دولت میں غرق ہو جائے گا۔''

''جاوا صاحب! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟ ایسا کون کر سکتا ہے... ایسا کون کرے گا؟''

جاوا کی آنکھوں میں زہریلے ناگ پھن پھیلائے کھڑے تھے... وہ بولا۔ ''بہت سے لوگ کریں گے جیسے تم...''

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے والے حساب دل کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

"سوچ رہا ہوں کہ مبارک باد دوں یا تم سے اظہارِ ہمدردی کروں۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پُرہجوم ڈائننگ ہال میں نظریں دوڑانے لگی۔ یہ ریستوران اس پولیس اسٹیشن سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا جہاں میں کام کرتا تھا۔ شیری ٹی وی رپورٹر تھی اس لیے اس کا زیادہ وقت خبروں کی تلاش میں یہاں گزرتا۔ وہ بے حد پُرکشش تھی اور لوگ اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

"کیا کوئی مسئلہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ہو تو بتاؤں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو میرا باس ہے۔ جیک میلانو۔"

"تم اپنے اسٹیشن منیجر کی بات کر رہی ہو..... وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"اسے لڑکیوں کی غلطیاں تلاش کرنے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ وہ میرے ساتھ ایک کنونشن میں شریک ہوا تھا۔ اس دوران اس سے تھوڑی سی بے تکلفی ہو گئی۔ تبھی سے وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی اس پر کڑی نظر رکھتی ہے۔"

"کیا تم نے اسے اس بارے میں بتا دیا؟"

"یہ چھپنے والی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اسے بتا دینا ہی مناسب سمجھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ یہ سن کر ڈر جائے گا لیکن اس نے فضول باتیں شروع کر دیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر میرے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گا۔ یہ میرے لیے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ویسے ہی لوگوں کی چھانٹی ہو رہی ہے۔ اگر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جیک کے ساتھ میرا کوئی تعلق ہے تو انتظامیہ ہم دونوں کو نکال باہر کرے گی۔"

"یہ تو واقعی ایک مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف یہی ایک مسئلہ نہیں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"رابرٹ گلکرسٹ۔" میرا ذہن نہ جانے کیوں اس جانب چلا گیا۔

"تم نے اس کا نام کیوں لیا؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔

"ایک افواہ یہ بھی ہے کہ تم اس سے ملتی رہی ہو۔"

"کیا تم میری جاسوسی کرتے ہو؟" وہ جل کر بولی۔

"یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور ایسی باتیں بہت جلد پھیل جاتی ہیں۔ رابرٹ تو ویسے بھی کافی مشہور شخصیت ہے۔"

"تمہیں میرے بارے میں ایسی باتیں نہیں سننا چاہئیں۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ تم ہمیشہ سے ہی اونچی اڑان کا خواب دیکھا کرتی تھیں اور رابرٹ کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں۔"

"او میرے خدا! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اتنی سطحی سوچ رکھتی ہوں؟"

میں ہاں کہہ کر کوئی نئی بحث شروع کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لیے بات بدلنے کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"ڈیلن! مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔"

"تم مجھ سے مشورہ کیوں مانگ رہی ہو؟" میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

"بے شک ہمارے درمیان تعلق ختم ہو گیا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں اب بھی میری تھوڑی بہت پروا ہے اور میں تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو..... بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تم رابرٹ کے بارے میں مجھ سے مشورہ چاہتی ہو؟"

"نہیں بلکہ اس صورتِ حال کے بارے میں جس سے دوچار ہو گئی ہوں۔"

"اوہ۔" میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ وہ میرے ساتھ دوبارہ تعلق بحال کرنا چاہتی ہے لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ ہمارا تعلق ختم ہو چکا ہے۔

"تم جانتے ہو کہ ماں بننا کتنی بڑی ذمے داری ہے اور میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تم نے اس بارے میں اپنا ذہن بنا لیا ہے۔"

"اس کے باوجود جاننا چاہوں گی کہ تم اس بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ فیصلہ عورت کو ہی کرنا چاہیے۔ کیا تم نے اس کے باپ کو بتا دیا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تم جانتی ہو کہ اس بچے کا باپ کون ہے؟"

"نہیں۔" اس نے مضطرب انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "اور تم اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگاؤ گے۔"

"میں تم پر پتھر پھینکنے والا آخری آدمی ہوں گا لیکن اگر مجھ سے مشورہ مانگ رہی ہو تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس بچے کا باپ کون ہے۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اگر وہ رابرٹ ہے تو تمہیں میلانو سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ جاننے کے بعد کہ تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو، ممکن ہے کہ رابرٹ تم سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اگر تم ایسا چاہتی ہو اور اگر تم نے جھوٹ بولنے کا فیصلہ کیا....."

"جھوٹ اور اس معاملے میں؟ او میرے خدا، تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

"تم میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ دل کے معاملات میں ہمیشہ سچ نہیں بولا جاتا۔ اگر تمہارا نیا چاہنے والا یہ پوچھے کہ ماضی میں کتنے لوگوں سے تعلق استوار کر چکی ہو تو ضروری نہیں کہ تم اسے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔"

"بس اتنا کافی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم نے ہمیشہ کی طرح مجھے صحیح مشورہ دیا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوچنے لگا کہ کیا وہ واقعی سچ کہہ رہی ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ تعلق ختم ہو جانے کے باوجود میں اس کا پہلے کی طرح خیال رکھ رہا تھا اور وہ بھی یہ بات جانتی تھی، اسی لیے اس اہم معاملے میں مجھ سے مشورہ کرنے چلی آئی۔

"تم میرے لیے ایک اور کام بھی کر سکتے ہو۔" وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟"

"کیا تم میرے لیے ان کا پس منظر چیک کر سکتے ہو تاکہ میں کسی ممکنہ خطرے سے اپنے آپ کو بچا سکوں۔"

"تم ایک رپورٹر ہو اور خود بھی یہ کام کر سکتی ہو۔"

"مقامی ٹی وی پر خبریں پڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری طرح سراغ رساں بن گئی ہوں۔ میں اپنے باس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اسٹیشن کے ذرائع استعمال نہیں کر سکتی اور نہ ہی میری رسائی قانون نافذ کرنے والے معلوماتی نیٹ ورک تک ہے۔"

اس کا آخری جملہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"یہ نیٹ ورک تو مشتبہ مجرموں کے لیے ہے۔ میں اسے ذاتی معلومات حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ ان کے نام اس نیٹ ورک پر کیوں ہوں گے؟"

"مجھے بھی یہی امید ہے لیکن....."

"کیا ایسی کوئی بات ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہیں؟"

"نہیں لیکن....."

"لیکن کیا؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "اس کی وضاحت کرنا کچھ مشکل ہے۔ ڈیلن! تم میرے پس منظر سے واقف ہو۔ میں نے بہت مشکل حالات میں پرورش پائی ہے۔ اس پیشے نے مجھے حقیقت پسند بنا دیا ہے لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔"

"مثلاً؟"

"میں نہیں جانتی۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو لیکن اگر تم یہ کام کر دو گے تو میں شاید بہتر محسوس کرنے لگوں۔ میں تمہارے وقت کی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔ جانتی ہوں کہ ایک پولیس والے کی تنخواہ کتنی قلیل ہوتی ہے۔"

"میں روٹی کے لیے ہی کام کرتا ہوں لیکن تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانوں کا ذائقہ کبھی نہیں بھولا۔"

"تم جب چاہو مجھے فون کر سکتے ہو۔ میں تمہاری پسندیدہ ڈش بنا دوں گی۔" وہ جانے کے لیے اٹھی پھر اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور فرش کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "کبھی کبھی تم بہت یاد آتے ہو۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

اس لمحے مجھے شدت سے اپنے نقصان کا احساس ہوا۔ وہ بالکل مختلف قسم کی عورت تھی۔ اس کا ہر انداز دلکش اور ہر ادا دل موہ لینے والی تھی۔ جب وہ ریستوران سے چلی گئی تو مجھے شدت سے اکیلے پن کا احساس ہونے لگا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی سمجھا نہیں۔ ہمارے درمیان محبت کا شعلہ جس تیزی سے بھڑکا تھا، اسی تیزی سے بجھ بھی گیا۔ اب محبت کا رشتہ ختم ہو گیا تھا لیکن ہم دوستوں سے بڑھ کر تھے۔ اسی لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی مشکل میں ہے تو فوراً اس سے ملنے چلا آیا۔ وہ زبان سے اپنی پریشانی بیان کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہو رہا تھا اور یہی چیز مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی۔

اس کے علاوہ میں نے بھی اسے آدھا سچ بتایا تھا۔ نارتھ شور کرائم یونٹ کا سراغ رساں ہونے کے باوجود میں

قانونی طور پر کسی کا پس منظر چیک نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں نیٹ ورک میں کسی کا نام ڈالتا تو اس کے لیے مجھے کیس نمبر، بیج نمبر اور اپنے ذاتی پاس ورڈ کا بھی حوالہ دینا پڑتا اور یہ تمام معلومات کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتیں لیکن یہ نیٹ ورک ہی معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نہیں تھا۔ انٹرنیٹ سے بھی ہر ایک کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ جیک میلانو اور رابرٹ گلکرسٹ کے بارے میں مجھے کچھ دلچسپ اور مفید باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے فوراً ہی شیری کے وائس میل پر پیغام بھیج دیا لیکن اس نے مجھے کال بیک نہیں کیا کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

دوسرے روز صبح چھ بجے میں نہا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے میری ساتھی زینا رینڈن بول رہی تھی۔

"ڈیلن! کیا تم جاگ رہے ہو؟"

"ہاں، کیا ہوا؟"

"ایک قتل ہو گیا ہے۔"

"کیا میں مقتول کا نام جان سکتا ہوں؟"

"شیری سوسن، ٹی وی رپورٹر۔"

مجھے لگا کہ جیسے قریب ہی کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ میرے کان کے پردے پھٹنے لگے پھر بھی میں نے ہمت کر کے کہا۔ "میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔"

"نہیں، تم جہاں ہو وہیں ٹھہرو۔ تمہارے لیے یہی حکم ہے۔"

"لیکن تم مجھے ایسا کوئی حکم نہیں دے سکتیں۔"

"یہ میرا نہیں بلکہ چیف کازمارک کا حکم ہے۔ تم اس کیس پر کام نہیں کر سکتے اور اس کی وجہ بھی جانتے ہو گے۔"

میں اعتراض کرنا چاہ رہا تھا لیکن خاموش رہا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ "ٹھیک ہے لیکن یہ تو بتا دو کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟"

"اس کی کار شہر کے مغرب میں واقع بیم ہل کے موڑ پر حفاظتی جنگلا توڑتی ہوئی کھائی میں جا گری۔ اس کی لاش وہاں سے ہٹا لی گئی ہے اور تفتیشی عملہ جائے وقوعہ کا معائنہ کر رہا ہے۔"

"یہ حادثہ کس وقت پیش آیا؟"

"ابھی وقت کا تعین نہیں کیا گیا لیکن کم از کم چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ شاید یہ قتل کی واردات ہے؟"

"ہاں۔ اس کی کار کی ڈگی کو کچھ نقصان پہنچا ہے جیسے اسے کسی نے پشت کی جانب سے دھکا دیا ہوا ہے لیکن وہاں کسی دوسری گاڑی کے آثار نہیں ملے۔ اس کے گلے پر زخموں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ ڈاکٹروں کو شبہ ہے کہ وہ اس ٹکر کے نتیجے میں ہلاک ہوئی ہے۔"

"اور کچھ؟" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ اس شہر کی جانی پہچانی شخصیت تھی، اور بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں تمہارا بھی اس کے ساتھ تعلق رہ چکا ہے۔ اس وجہ سے تمہارا نام بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ تم تو طریقۂ کار سے واقف ہو۔ اس لیے ہم چاہیں گے کہ پہلے تمہاری پوزیشن صاف ہو جائے۔ تم آخری بار اس سے کب ملے تھے؟"

"گزشتہ جمعے کو..... ہم نے جیوری ان، میں کافی پی تھی۔"

"یہ سماجی ملاقات تھی یا رومانی؟"

"سماجی..... وہ تعلق بہت پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن ہم اب بھی اچھے دوست تھے۔"

"جیسے ہی موت کے وقت کا تعین ہو تو مجھے تمہاری طرف سے ایک بیان درکار ہو گا جس میں تم جائے وقوعہ سے اپنے دور رہنے کا ثبوت پیش کرو گے۔ چیف نے مجھے اس کیس پر کام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اس دوران میں تم اس معاملے سے دور ہی رہو گے۔ کیا اس وجہ سے ہمارے درمیان کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔ "ڈیلن!"

"میں کچھ سوچ رہا ہوں۔"

"کچھ مت سوچو۔ یہ چیف کا حکم ہے اور تم اس کے اختیارات کے بارے میں جانتے ہو۔"

میں پھر بھی کچھ نہیں بولا تو وہ جھنجلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا۔"

"تم اس معاملے سے دور رہو گے۔"

"میں اس معاملے سے دور رہوں گا۔" میں نے یہ بات دہرائی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب تم سرکاری طور پر اس معاملے سے علیحدہ ہو گئے ہو۔ یہ بتاؤ کہ میرے لیے تمہارے پاس کیا اطلاع ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں ایک کے بجائے دو کیسوں پر کام کرنا ہو گا۔" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، میں جلدی سے لباس تبدیل کر کے جیپ میں سوار ہوا اور بیم ہل کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے جائے وقوعہ سے دور رہنے کا وعدہ نہیں کیا تھا اور زینا یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اکتوبر کے آخری ایام تھے اور ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو زینا پہلے سے موجود تھی اور ٹائروں کے نشانات دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہم دونوں کافی عرصے سے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ہم اچھے دوست تھے اور ہماری اچھی ٹیم بن گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران تو نہیں ہوئی لیکن خوش بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کیا مجھے تمہارے ساتھ لڑنا چاہیے؟" وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا اور اب بھی اس پر قائم ہوں۔ لیکن شیری میری دوست تھی اور میں ایک طرف ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔ ہم آپس میں ایک معاہدہ کر لیتے ہیں۔ تمہیں جو کچھ معلوم ہے، وہ مجھے بتا دو اور میں جو جانتا ہوں وہ تمہیں بتا دوں گا۔"

"پہلے تم بتاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ شیری کی کار کو کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ وہ اس سڑک سے چند میل کے فاصلے پر برائر ووڈ میں رہتی تھی اور اس راستے سے اچھی طرح واقف تھی۔ یہ جگہ محبت کرنے والوں کے لیے جنت ہے اور یہاں کسی سے چھپ کر ملنا بہت آسان ہے۔"

"کسی سے مراد تم بھی ہو سکتے ہو۔"

"ہاں، ایک سال پہلے ہم یہاں آئے تھے جب ہمارے درمیان علیحدگی ہوئی تھی۔ اب تم کچھ بتاؤ۔"

"اس کار کو سب سے پہلے ایک شخص نے دیکھا جو صبح کی سیر کے لیے نکلا تھا۔ کار کھائی میں گری ضرور لیکن زور سے نہیں ٹکرائی تھی اور اگر وہ ہوش میں ہوتی تو کار سے باہر آ سکتی تھی۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ وہ کار کے گرنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔"

"تم نے فون پر بتایا تھا کہ اس کی گردن پر زخموں کے نشان ملے ہیں؟"

"مجھے نہیں لگتا کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ البتہ وہاں ایک سیاہ نشان ضرور نظر آیا اور زبان کی جڑ کے نیچے والی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے نرخرے پر جوڈو کا وار کیا گیا ہو۔"

"کیا اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی ہے؟"

"اس کے کوئی آثار نہیں ملے۔ اس کے جسم پر زخموں کے نشان تھے اور نہ ہی کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ یہ بتاؤ کہ تم دونوں کے درمیان تعلق ختم کرنے کا خیال کس کا تھا؟"

"میرا۔"

"کیوں؟"

"یہ ایک طویل اور پیچیدہ کہانی ہے۔"

"ہر کہانی ایسی ہی ہوتی ہے۔ تم مجھے مختصراً بتا دو۔"

"وہ میرا ائرفورس میں آخری سال تھا۔ میری تعیناتی عراق میں تھی۔ چھٹیوں میں گھر آیا تو شیری نے اپنے ٹی وی کے لیے میرا انٹرویو کیا اور یہیں سے ہمارے تعلق کی ابتدا ہوئی۔ واپس جانے کے بعد بھی میں اس سے رابطے میں رہا۔ تقریباً روزانہ اسے ای میل کرتا اور جب چھٹی ملتی تو اس کے ساتھ سارا وقت گزارتا۔"

"گویا معاملہ کافی سنجیدہ تھا۔" زینا دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"ہاں، میں نے تو اس کے لیے انگوٹھی بھی خریدی تھی۔"

"واؤ۔" زینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "پھر کیا ہوا؟"

"عراق سے واپس آنے کے بعد میری پوسٹنگ لوزیانا کے ائربیس پر ہو گئی۔ میں ائرفورس پولیس میں سراغ رساں تھا۔ ہفتے کے اختتام پر شیری مجھ سے ملنے آئی تو میں اس کے ساتھ ڈسکو چلا گیا۔ رات بھر رقص کا پروگرام چلتا رہا۔ تین بجے مائیک پر اعلان ہوا کہ اگلی دھن ٹاپ لیس ہو گی۔ شیری بھی اس ڈانس میں شامل ہو گئی۔ مجھے اجنبی لوگوں کے درمیان اس کا نیم عریاں حالت میں ناچنا اچھا نہیں لگا اور میرے دل میں اس تعلق کے بارے میں شبہات جنم لینے لگے۔"

"صرف اس لیے کہ وہ تمہاری مرضی کے خلاف رقص کر رہی تھی؟" زینا نے کہا۔ "تم اتنے قدامت پرست تو نہ تھے۔"

"ہرگز نہیں۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا بلکہ یہ اس کی غلطی تھی۔ دراصل اسے لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا اچھا لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے پہچانیں اور اس کے نام سے واقف ہو جائیں۔ میں اسے ساری خوشیاں دے سکتا تھا لیکن مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ کیمرے کے سامنے اس طرح

اپنے آپ کو نمایاں کرے۔"

"اور تم نے اس وجہ سے تعلق ختم کر لیا؟"

"اس وقت تو نہیں البتہ ایک ماہ بعد ہم خوش اسلوبی سے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد میں ڈیٹرائٹ فورس میں چلا گیا اور کچھ عرصے تک ہمارے درمیان رابطہ نہ رہا لیکن جب یہاں آیا تو دوبارہ اس سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔"

"گویا راکھ میں دبی چنگاری پھر شعلہ بن گئی؟"

"پہلے والی بات نہیں تھی لیکن دوستی کا رشتہ قائم تھا۔"

"تمہارا کہنا ہے کہ گزشتہ ہفتے اس سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہاں، اس نے مجھے فون کیا تھا اور ہم کافی پینے اس ریستوران میں چلے گئے۔"

"ملاقات کی وجہ جان سکتی ہوں؟"

"کوئی خاص نہیں۔ بس ہیلو ہائے سمجھ لو۔"

زینا نے مجھے تیز نظروں سے گھورا۔ "تم نے کہا تھا کہ یہ دہرا قتل ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ حاملہ تھی۔"

"ہاں، ہم نے اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"کیا وہ تمہارا بچہ تھا؟"

"نہیں، اس کا تو کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"پھر اس بچے کا باپ کون ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"کیا اسے معلوم تھا؟"

"اس نے مجھے نہیں بتایا۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "تم غلط آدمی سے یہ سوالات کر رہی ہو۔"

"پھر مجھے کس سے پوچھنا چاہیے؟"

میں نے اس کی بات پکڑ لی اور بولا۔ "اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رابرٹ فلکرسٹ سے ملتی رہی ہے۔"

"میں اس بارے میں پہلے ہی سن چکی ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اور؟"

اس بار میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زینا جانتی تھی کہ میں اس سے کچھ چھپا رہا ہوں لیکن اس نے اصرار نہیں کیا اور گفتگو کو نیا رخ دیتے ہوئے بولی۔ "کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟"

"ظاہر ہے کہ کسی سے ملنے ہی آئی ہو گی۔ وہ اس کا محبوب بھی ہو سکتا ہے یا کوئی ایسا شخص جس کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ چل رہا ہو۔"

حالانکہ یہ سچ نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے شادی شدہ باس جیک میلانو سے ملنا چاہتی تو اس کے لیے یہ مناسب جگہ نہ تھی کیونکہ وہ اس سے شہر میں کسی دوسرے مقام پر بھی مل سکتی تھی۔ ان کے تعلق کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل سکتی تھی جس کا نقصان دونوں کو ہوتا۔

شیری نے مجھ سے میلانو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا اور اس کے لیے میں نے اپنا قیمتی وقت بھی صرف کیا۔ اگر میں کچھ تیزی دکھاتا تو شاید وہ بچ جاتی لیکن میں ہمیشہ سے ہی سست واقع ہوا ہوں۔ اب میں میلانو کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"کوئی اور بات جو تم مجھے بتانا چاہو۔" زینا میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔"

میں نے اس سے جھوٹ بولا اور وہ بھی یہ بات جانتی تھی چنانچہ ناگواری سے بولی۔ "بہتر ہو گا کہ اب تم گھر جاؤ۔ اگر چیف نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ہم دونوں مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"میں تو پہلے ہی مشکل میں ہوں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

مقامی معیار کو دیکھتے ہوئے جیک میلانو کا مکان کسی محل سے کم نہیں تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت کم از کم پچاس لاکھ ڈالرز ضرور ہو گی۔ یقیناً ایک اسٹیشن منیجر اتنا مہنگا مکان افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں نے ڈور بیل بجانے سے پہلے وقت دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے اور زینا کا کم از کم ایک گھنٹا جائے وقوعہ پر رکنے کا امکان تھا اور میرے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ میلانو کے کام پر روانہ ہونے سے پہلے اس سے کچھ باتیں کر سکوں۔ پہلی بار گھنٹی بجانے پر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے غصے میں آ کر دوسری بار زور سے گھنٹی بجائی۔ اس بار اسپیکر پر ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"پولیس، میرا نام سارجنٹ ڈیلن لاکروز ہے۔ کیا مسٹر میلانو گھر پر ہیں؟"

"انتظار کرو۔ میں نیچے آ رہی ہوں۔"

چند لمحوں کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے ایک طویل قامت عورت سلک کا گاؤن پہنے کھڑی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی۔ اس نے چشمے کی اوٹ سے میرا جائزہ لیا اور بولی۔ "تم نے اپنے آپ کو پولیس والا بتایا تھا۔"

"ہاں۔ میرا نام سارجنٹ ڈیلن لاکروز ہے۔ میں

قتل کا کیس تھا اور میرا تعلق میجر کرائم سے ہے۔" میں نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرے شوہر ایک کانفرنس کے سلسلے میں نیویارک گئے ہوئے ہیں۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ کیا تم مس شیری کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہو؟"

میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہم اسٹیشن سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔" اس نے ایک طرف ہو کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ "اس کی موت کی خبر نمایاں طور پر نشر ہوئی تھی۔ میں کافی پی رہی تھی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

وہ میرا جواب سنے بغیر کچن کی طرف چلی گئی۔ شاید وہ اپنے احکامات کی تعمیل کروانے کی عادی تھی۔ میں لیونگ روم سے گزرتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ لیونگ روم کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی دیواروں پر پانچ بڑی ٹی وی اسکرینیں لگی ہوئی تھیں جن پر اسٹیشن کی لائیو نشریات چل رہی تھیں۔ ایک اسکرین پر لائیو پروگرام چل رہے تھے جبکہ تین پر دوسرے نیٹ ورک سے بریکنگ نیوز دکھائی جا رہی تھیں اور یہ خبریں شیری کے بارے میں ہی تھیں۔

اس کا کچن کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کچن سے کم نہ تھا اور مجھے شبہ تھا کہ مسز میلانو نے زندگی میں کبھی خود کچھ پکایا ہو لیکن اس وقت وہ کافی ضرور بنا رہی تھی۔

"تم نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا کہ وہ نیویارک میں ہے۔" میں نے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ وہاں کب گیا تھا؟"

"وہ نیویارک میں ایک ہفتے سے ہے۔" اس نے میرے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کافی کا کپ میری جانب بڑھا دیا۔

"کیا تمہارے پاس وہاں کا نمبر ہے کیونکہ میرے لیے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔"

"اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس بات میں شک ہے کہ وہ تمہارے ساتھ تعاون کرے گا۔ تم اس سے کوئی مفید بات معلوم نہیں کر سکو گے۔ شاید میں تمہاری زیادہ مدد کر سکوں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"وہ شیری سے اپنا تعلق چھپانے کے لیے تم سے جھوٹ بولے گا جبکہ میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔"

مجھے اس کے انداز پر کافی حیرانی ہوئی۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "گویا تم اپنے شوہر اور شیری کے تعلق کے بارے میں جانتی تھیں؟"

"پہلی بار ایسا نہیں ہوا۔ جیک ایک پرکشش مرد ہے۔ اسی لیے میں نے بھی اس سے شادی کی تھی۔ جانتی تھی کہ کوئی بھی عورت اس پر فدا ہو سکتی تھی لہٰذا میں نے شادی سے پہلے ہی اس کے ساتھ ایک مضبوط معاہدہ کر لیا۔ وہ مجھ سے مالی طور پر بہت کمزور تھا۔ ہماری بہت بڑی خاندانی جائداد اور اثاثے تھے جبکہ جیک کو ہمیشہ ملازمت پر گزارہ کرنا پڑا۔ اسی لیے اس کے پاس محدود امکانات تھے۔ اس کے باوجود وہ ادھر ادھر منہ مار لیا کرتا تھا۔"

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا مسز میلانو۔"

"تم مجھے بیسا کہہ سکتے ہو۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ جیک اور شیری کا تعلق مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ میں پچھلے ہفتے شیری سے ملی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ جیک کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے تنبیہ کی اور یہ بھی کہا کہ اگر ضروری ہوا تو اسے ملازمت سے فارغ کر دیا جائے گا۔"

"اس کا ردعمل کیا تھا؟"

"وہ بڑی پرجوش لڑکی تھی اور اس کے دل میں لاتعداد خواہشیں پل رہی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے ایک بڑے اسٹیشن سے ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی اور اگر وہ وہاں چلی جائے تو یہ ہم سب کے حق میں بہتر ہو گا۔"

"پھر وہ کیوں نہیں گئی؟"

"اس کا کہنا تھا کہ ان دنوں کسی دوسری جگہ جانا خاصا مہنگا پڑتا ہے۔"

"تم اسے ڈرانے گئی تھیں لیکن اس کے بجائے پیسے دے کر اسے راستے سے ہٹا دیا۔"

"یہی اس مسئلے کا آسان ترین حل تھا۔"

"کیا تم نے اس بارے میں اپنے شوہر کو بتا دیا؟"

"بالکل، پہلے تو وہ خاصا برہم ہوا لیکن جلد ہی اسے عقل آ گئی۔ جانتا تھا کہ اگر اسے نوکری سے نکال دیا گیا تو موجودہ حالات میں اسے آدھی تنخواہ پر بھی ملازمت نہیں ملے گی۔"

"اس طرح تم اسے اپنی طرف واپس لانے میں کامیاب ہو گئیں؟"

"دراصل وہ کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ شیری جیسی لڑکیاں اس کے لیے کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں

اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی ہوں اور شاید تمہیں یہ سن کر تعجب ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی تمام تر غلطیوں کے باوجود میں اس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہوں۔ شیری کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے لیکن میرے شوہر کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر تم ہماری مشکلات کو سمجھتے ہو تو ہمارا نام میڈیا میں نہیں آنا چاہیے۔ ایسے کسی بھی اسکینڈل سے اس کی ملازمت خطرے میں پڑ سکتی ہے جو کہ اس کے لیے بہت اہم ہے۔ اگر کچھ خرچ کرنا پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔ اگر کچھ اخراجات ہوئے تو اس بارے میں مطلع کر دوں گا۔ اب چلتا ہوں۔ تمہارے قیمتی وقت کے لیے شکریہ۔"

مجھے یقین تھا کہ مسز میلانو جھوٹ نہیں بول رہی۔ شیری اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی کیونکہ وہ اسے خرید چکی تھی اور اگر شیری نے واقعی اس سے کوئی رقم لی تھی تو اس کی تصدیق اس کے بینک اکاؤنٹ سے ہو سکتی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ میلانو کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا نام رابرٹ کلکرسٹ کا ہو سکتا تھا۔ میں زینا کی نظروں سے بچ کر میلانو کے گھر تک تو پہنچ گیا لیکن رابرٹ تک کھلے عام رسائی ممکن نہ تھی۔ بھانڈا پھوٹ جانے کی صورت میں مجھے معطل کیا جا سکتا تھا یا میری نوکری ہی ختم ہو جاتی۔ لیکن یہ مسئلہ رابرٹ نے خود ہی حل کر دیا۔

میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے کارپورل نے انٹرکام پر اطلاع دی۔ "سارجنٹ! تمہارا کوئی دوست ملنے آیا ہے۔ وہ اپنا نام کلکرسٹ بتاتا ہے۔"

"رابرٹ کلکرسٹ..... ٹھیک ہے۔ اسے اندر بھیج دو۔"

وہ میرا دوست نہیں بلکہ معمولی جان پہچان ضرور تھی۔ وہ اسکول میں مجھ سے دو سال آگے تھا اور باسکٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی تھا جبکہ میں ہاکی کھیلتا تھا۔ ہماری ملاقات اکثر و بیشتر لاکر روم میں ہوا کرتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس کا تعلق امیر کبیر گھرانے سے ہے۔ میں نے اسے کئی سالوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اب بھی پہلے کی طرح خوش مزاج اور خوش لباس تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں سے ویرانی جھلک رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ شیری کی موت ہو۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ کیا میں امید کروں کہ ہماری گفتگو صیغۂ راز میں رہے گی؟"

"کیا تم شیری کے بارے میں کچھ کہنا چاہو رت..."

اس نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "...

مجھے اس سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہے۔"

"کس طرح کی مدد؟" میں نے اپنے لہجے ... رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم کسی بھی طرح اس معاملے میں ... ہو؟"

"قطعی نہیں۔" وہ اپنی کرسی کو مضبوطی سے پکڑ... ہوئے بولا۔ "وہ میری بہترین دوست تھی۔"

"میرے خیال میں تمہارے درمیان دوستی سے ... کر بھی کوئی رشتہ تھا۔"

"نہیں، یہ میرا مسئلہ ہے۔ ہم ایک حد سے آگے ... بڑھے تھے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں رابرٹ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "تم میر... خاندان کے بارے میں کیا جانتے ہو ڈیلن؟"

"یہی کہ تم لوگ جدی پشتی رئیس ہو اور اس شہر کی ... تہائی آبادی تمہارے لیے کام کرتی ہے۔"

"پورے کاروبار پر میرے دادا کا قبضہ ہے۔ و... اسّی سال کا ہو گیا ہے لیکن مرنے کا نام نہیں لیتا۔ سمجھتا ... قیامت تک زندہ رہے گا۔ اب وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ... شادی کر لوں تاکہ خاندان کی نسل آگے بڑھ سکے۔ ... شیری بہت پسند تھی اور وہ روزانہ اسے ٹی وی پر خبریں پڑھتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری جوڑی بہت اچھی رہے گی۔"

"لیکن تم یہ نہیں چاہتے تھے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "سچ تو ... کہ مجھے عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی قربت پسند ..."

"لیکن تمہاری تو دوسری لڑکیوں سے بھی دوستی ... ہے؟"

"مانتا ہوں کہ شیری ان سب میں بہترین تھی ... جب میرے ساتھ ہوتی تو ہر ایک کی نظریں اس پر ... اور لوگ مجھے دنیا کا خوش قسمت ترین مرد سمجھنے لگتے۔ ... کے اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کرنے کے علاوہ اسے جیب ... بھی دیا کرتا تھا لیکن یہ سب کچھ میں دادا کو مطمئن کر... لیے کر رہا تھا اور شیری بھی خوش تھی کہ میں نے ... مسائل حل کر دیے تھے۔"

"کیا تم جانتے تھے کہ شیری حاملہ ہے؟"

"ہاں، اس نے مجھے بتایا تھا لیکن میں اس ..."

... بچے کا باپ نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے ... کی پیشکش کی تاکہ دادا کو اطمینان ہو جائے اور وہ سکون ... رکھیں۔ بعد میں شیری کو طلاق دے دیتا اور اس کے ... میں اسے ایک معقول رقم مل جاتی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ ... ملازمت چھوڑنے پر تیار نہیں تھی جبکہ ہمارے خاندان ... عورتیں نوکری نہیں کرتیں۔ لیکن صرف یہی ایک مسئلہ نہیں ... جب میں نے دادا کو بچے کے بارے میں بتایا تو میرا ... خیال تھا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑیں گے لیکن اس وقت تک ... ہماری شادی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ڈاکٹری معائنے ... پر اصرار کیا تاکہ تصدیق ہو سکے کہ یہ بچہ میرا ہے۔ میرے ... لیے جھوٹی رپورٹ حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن شیری ... نے کہا کہ وہ اس بارے میں سوچے گی۔ اس کے بعد ہماری ... ملاقات نہیں ہوئی پھر یہ حادثہ پیش آ گیا۔"

"تم نے مجھے ضرورت سے زیادہ ہی کچھ بتا دیا ہے۔ ... بعد میں وکیل کی آڑ لے کر اس سے مکر بھی سکتے ہو۔ اب تم مجھ ... سے کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ آگے کی ... طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "ایسے معاملات میں بوائے فرینڈ پر ... سب سے پہلے شبہ کیا جاتا ہے جبکہ میں اسے کوئی نقصان نہیں ... پہنچا سکتا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ تھی۔"

"تم چاہتے ہو کہ تمہاری ذاتی زندگی پر کوئی حرف نہ ... آئے؟"

"ہاں اور یہ کام بلا معاوضہ نہیں ہوگا۔ تم اپنی ڈیمانڈ ... بتاؤ۔"

"خوب! ہر کوئی مجھے خریدنا چاہ رہا ہے۔" میں نے ... "یہ بڑے شرم کی بات ہے۔"

"پھر کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو رابرٹ! اگر تم بے قصور ہو تو میں تمہاری پوری ... مدد کروں گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ شیری کے ساتھ تمہارا کس ... قسم کا تعلق تھا اور اس کے لیے میں تم سے کوئی معاوضہ بھی ... نہیں لوں گا۔ لیکن اگر تم کسی بھی طرح اس معاملے میں ... ملوث پائے گئے تو تمہاری ساری دولت بھی ناکافی ہوگی۔"

... رابرٹ کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک دیوار کو ... گھورتا رہا۔ میں نے اس سے پہلے سو سے زائد قتل کے کیس ... حل کیے تھے اور ان سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ... جیسے محبت، دولت، منشیات یا گھریلو تشدد وغیرہ لیکن ... اس کیس میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اب تک کی تفتیش سے تو

Moss

مطالعہ!

یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ میلانو اور رابرٹ دونوں ہی اس کے قتل میں ملوث نہیں ہیں پھر تیسرا شخص کون ہو سکتا ہے؟ مجھے معلوم تھا کہ شیری ان دنوں کسی کہانی پر کام کر رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اسے اس سلسلے میں دھمکی آمیز پیغامات مل رہے ہوں لیکن میری ان تک براہ راست رسائی ممکن نہ تھی، ورنہ میری نوکری خطرے میں پڑ جاتی لیکن اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا تھا۔

شیری جس اسٹیشن میں کام کرتی تھی، وہاں میرا ایک جاننے والا میکس گیلارڈ بھی تھا۔ وہ کویت میں میرے چچا ریمنڈ کے ساتھ کام کر چکا تھا اور ان دونوں کے درمیان خاصی گہری دوستی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اس نے ٹی وی چینل میں ہیڈ کیمرامین کے طور پر ملازمت کر لی اور اب وہ نیوز ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود وہ مجھ سے اسٹیشن کے کیفے ٹیریا میں ملنے کے لیے

راضی ہو گیا۔ ہم نے کونے کی ایک میز منتخب کی تاکہ وہاں آنے والے عملے کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ وہ میرے چچا کی عمر کا ہی تھا لیکن کافی چاق و چوبند اور صحت مند نظر آرہا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔ ”ہمیں مختصر بات کرنا ہوگی۔ میلانو نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر عملے کا کوئی فرد پولیس سے بات نہ کرے۔“

”میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔ چچا نے بتایا ہے کہ تم محاذ کی تصویریں لینے کے لیے گولیوں اور بموں کی پروانہ کرتے ہوئے بھی اگلے مورچوں تک چلے جاتے تھے اور اب تم میلانو جیسے شخص سے ڈر رہے ہو؟“

”شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں اپنی بیوی کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہوں۔“

”اسے کیا ہوا؟“

”وہ ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکی ہے جس سے اس کا دماغ اور ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی ہے اور وہ کافی عرصے سے بستر پر ہے۔ میرے لیے اس کے علاج کا خرچہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لیے ڈبل شفٹ میں کام کر رہا ہوں تاکہ مکان کو گروی ہونے سے بچا سکوں۔ میلانو سے ڈرنے کی وجہ یہی ہے کہ فی الوقت میں اس ملازمت سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ خیر، تم بتاؤ کس سلسلے میں آئے ہو؟“

”رہنے دو۔“ میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے لیے کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا۔“

”بیٹھ جاؤ۔ میں اتنا خوف زدہ بھی نہیں ہوں کہ اپنے عزیز دوست کے بھتیجے کی مدد نہ کر سکوں۔ تم غالباً شیری کو ملنے والی دھمکیوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“

”کیا اسے ایسی کوئی دھمکی ملی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چینل پر کام کرنے والوں کو اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے خود گزشتہ چند ماہ میں بیس سے زائد دھمکیاں مل چکی ہیں جن کے پرنٹ میں نے تمہاری ساتھی زینا رینڈن کے حوالے کر دیے تھے۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”چیف، تمہارے اور شیری کے سابقہ تعلق کے بارے میں جانتا ہے۔ اسی لیے تمہیں اس معاملے سے الگ رکھا گیا ہے۔ پھر تم یہ بھاگ دوڑ کیوں کر رہے ہو؟“

”میں اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہ رہا ہوں۔ زینا بہت تیز عورت ہے اور وہ ان لوگوں تک ضرور پہنچ جائے گی جن کے نام تم نے اس کے حوالے کیے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ شیری کو ملنے والی دھمکیاں سنجیدہ نوعیت کی کتنی تھیں۔ مجھے ان کی ایک نقل چاہیے۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر میلانو کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ میرا استعفیٰ لینے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگائے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں دوبارہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی لیکن تمہاری پریشانی کے بارے میں جان کر افسوس بھی ہوا۔“

”ہر طرف مسئلے ہی مسئلے ہیں۔“ اس نے ایک نیپکن پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا جسے میں نے فوراً ہی اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

اس کے بعد وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نیپکن کو کھول کر نہیں دیکھا جس پر دو نام لکھے ہوئے تھے..... پیچ میکوئے اور ایلین گوتھی۔ میں ان دونوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میکوئے ایک مقامی لڑکا تھا اور اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ میں نے اسے شیری کے ساتھ ٹی وی پر دیکھا تھا جب وہ گھریلو تشدد کے بارے میں ایک پروگرام کر رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کے بارے میں نیٹ سے معلومات حاصل کیں۔ وہ پہلے ہی ایک اور جرم میں جیل میں گزشتہ دس روز سے بند تھا۔ اس پر بیس سے زائد سنگین نوعیت کے جرائم تھے لیکن شیری کے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

گوتھی خاندان کا معاملہ مختلف تھا اور کم از کم نو گھرانے خونی رشتوں یا شادی کے تعلق کی وجہ سے ان سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ سب جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کا کام کرتے تھے اور یہ اندرونی شمالی علاقے میں سب سے الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس خاندان کی درجنوں شاخیں تھیں لیکن مس ایما لائن کو ان سب پر برتری حاصل تھی۔ وہ سات بیٹوں کی ماں اور بہت سے پوتے پوتیوں کی دادی تھی۔ میں اسے بچپن سے جانتا تھا اور وہ بھی میرے خاندان سے اچھی طرح واقف تھی۔ لہٰذا میں نے خاندان کے دوسرے لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے براہِ راست ایما لائن سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

اس خاندان نے سرکاری جنگل کے ساتھ ملحق زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا اور اس کے زیادہ حصے پر انہوں نے اپنے فارم بنا رکھے تھے۔ وہ برسوں سے ان زمینوں پر اپنے اور باغات لگاتے چلے آرہے تھے مگر وقت بدلنے کے ساتھ انہیں بھی عقل آگئی تھی اور وہ جان گئے تھے کہ ہریالی اگانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ منافع چرس کی کاشت میں ہے۔ ایما لائن کا فارم اونچائی پر واقع تھا اور وہ برآمدے میں بیٹھ کر سورج نکلنے اور ڈوبنے کا منظر واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اسی طرح اس کے صحن کی طرف بڑھنے والا کوئی بھی شخص بہت پہلے اس کی نظروں میں آجاتا تھا۔

جب میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ شاید میرا ہی انتظار کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بظاہر وہ تنہا نظر آرہی تھی لیکن اس کے عقب میں واقع گودام کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور وہاں سے میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا ایما کے پاس پہنچا اور تعظیماً جھک کر بولا۔ ”میرا نام——“

”تم ڈیلن لاکروز ہو۔“ وہ اپنی اون اور سلائیاں ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے مادام۔“

”وہ بہت اچھی عورت ہے۔ میں بازار جاتی ہوں تو دوسرے دکان دار میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے لیکن جب بھی تمہاری ماں کی دکان پر گئی تو اس نے مجھے ہمیشہ کافی پلائی اور دکان پر آیا ہوا نیا اسٹاک بھی دکھایا۔ ہم پرانے دنوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم دونوں کا بچپن اور جوانی ساتھ گزری ہے۔ گو کہ وہ لکڑہاروں کی نسل سے نہیں لیکن اپنی جڑوں کو نہیں بھولی۔“

”میں یہاں اپنی ماں کے بارے میں بات کرنے نہیں آیا مادام۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔

”پھر تو مجھے اپنے وکیل کو بلانا ہوگا۔“

”یہ تمہارا حق ہے۔ اگر اس کی ضرورت محسوس کرتی ہو تو ضرور بلا لو۔“

”میں خود بھی ہر مشکل سے نمٹنا جانتی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“

”شیری..... میں اسی کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں۔“

”اچھا وہ ٹی وی والی لڑکی۔“ وہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں سنا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ عرصہ قبل تم دونوں کے درمیان بھی تعلقات تھے۔ تم یہاں پولیس والے بن کر آئے ہو یا ذاتی حیثیت میں؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کس حیثیت میں آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیری کے ساتھ تمہارا کوئی تنازعہ ہوا تھا۔ میں اسی کے بارے میں جاننا چاہ رہا ہوں۔“

”ہاں، ہمارے درمیان کچھ مسائل ہو گئے تھے۔“ وہ اعتراف کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرے انتظار میں گھات لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک دن میں جیسے ہی شاپنگ مال سے باہر آئی تو وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور میرے منہ کے آگے مائک کر کے سوالات پوچھنے لگی جبکہ اس کے ساتھ آیا ہوا کیمرا مین اس منظر کی عکس بندی کرنے لگا۔“

”وہ کیا چاہ رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو تم لوگ ہمیشہ چاہتے ہو۔ اس نے میرے بارے میں کچھ افواہیں اور جھوٹی خبریں سن رکھی تھیں۔“

”اور اس نے تمہارے خاندان کا پولیس ریکارڈ بھی چیک کیا ہوگا؟“

”ممکن ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شیری کا کہنا تھا کہ وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے والوں کی غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کر رہی ہے۔“

”اور اس کے لیے اس کی نظر تمہارے ہی خاندان پر گئی؟“

”اس کے ذہن میں ایسی ہی کوئی بات تھی۔ تم جانتے ہو کہ میری برادری کتنی وسیع ہے۔ ان میں بہت سے جوان لڑکے ہیں جن سے کبھی کوئی غلط حرکت سرزد ہو سکتی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر اس نے اپنے ذہن میں غلط مفروضہ قائم کر لیا۔ میں نے اسے کیمرے اور مائک کے بغیر گھر آنے کی دعوت دی تاکہ ہم بے تکلفی سے باتیں کر سکیں۔ وہ میرے کہنے پر چلی آئی اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کے بعد معاملہ طے پا گیا۔“

”وہ کس طرح؟“

”جیسا کہ اس طرح کے معاملات میں ہوتا ہے۔ یعنی میں نے اسے خرید لیا۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا۔“

”ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ یقیناً تمہاری بھی ہوگی۔ کامیاب تجارت کا راز یہ ہے کہ آپ کتنی قیمت لگاتے ہیں۔ شیری کو پیسوں کی زیادہ پروا نہیں تھی کیونکہ رابرٹ گلکرسٹ اس کا سارا خرچا اٹھا رہا تھا۔“

”پھر تم نے اس کی کیا قیمت لگائی؟“

”میں نے اس کے بدلے ایک بہتر اسٹوری کی پیشکش کر دی۔“

”کیسی اسٹوری؟“

تو وہ اس نے اس وقت تک اسے وہ نقشہ نہیں دیا تھا۔ اس کسی کے لیے خطرہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ جس مقام پر شیری کی کار کو حادثہ پیش آیا، وہ کسی اجنبی شخص سے ملنے نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے اس شخص کا تعلق کوچی خاندان یا مجرموں کے گروہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کسی ایسے شخص سے ملنے گئی ہوگی جس پر وہ بھروسا کر سکتی ہو۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ زینا کا نمبر تھا، وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں شیری کے اپارٹمنٹ سے بول رہی ہوں۔ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ فوراً یہاں آجاؤ۔'' وہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہاں میں نے شیری کے ساتھ اپنی زندگی کا بہترین دور گزارا تھا۔ مرکزی دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں یادوں کے ہجوم میں کھو گیا۔ زینا اس کی میز پر بیٹھی کچھ کاغذات تلاش کر رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے مجھے دیکھا اور برہم ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ رابرٹ گلکرسٹ تم سے ملنے آیا تھا اور اس سے ملاقات کے بعد تم کسی کو بتائے بغیر دفتر سے غائب ہو گئے۔''

''گلکرسٹ سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ میرے خیال میں وہ مجرم نہیں ہے۔''

''یہ تمہارا دردِسر نہیں ہے۔ تمہیں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

اس وقت مجھے زینا پر بہت غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ ''تم یہی بات فون پر بھی کہہ سکتی تھیں۔ مجھے دوڑ لگوانے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟''

''ہاں، کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔'' اس نے کچھ کاغذات میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم انہیں دیکھ سکتے ہو لیکن یہ آف دی ریکارڈ ہے۔''

میں نے ان کاغذات پر نظر ڈالی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''اسے ایک طرح کا ڈی این اے ٹیسٹ سمجھ لو جس میں ولدیت کے بجائے شجرۂ نسب معلوم کیا جاتا ہے اور اس میں باپ سے تعاون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شیری جاننا چاہتی تھی کہ اس بچے کا باپ کون ہے۔ ٹیسٹ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی امریکین ہے جبکہ گلکرسٹ کا تعلق کسی یورپین ملک سے ہے۔ لہٰذا تم ہی اس بچے کے باپ ہو سکتے ہو۔ بہتر ہے کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔''

میں آنکھیں پھاڑے اس رپورٹ کو دیکھتا رہا۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور میں کچھ بولنے سے قاصر تھا۔

''یہ ٹیسٹ حتمی نہیں لیکن تمہارا ڈی این اے کروانے کے بعد اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔''

''شیری کے ساتھ میرا ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔'' میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بچے کا باپ کوئی اور ہے۔ ہمیں اسی کو تلاش کرنا ہے۔''

اس کے بعد میں نے کوئی بات نہیں کی اور وہاں سے چلا آیا۔ اب میری کار میکس کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اپنے لان کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھا پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور اس کا رخ میری جانب کرتے ہوئے بولا۔ ''کار سے باہر آجاؤ ڈیلن۔''

''یہ تم کیا کر رہے ہو میکس؟''

''کھیل ختم ہو چکا ہے اور ہم دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ گاڑی سے باہر آجاؤ اور میرے آگے آگے گیراج کی طرف چلو۔ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔''

اس کے ہاتھ میں ہتھیار تھا اس لیے مجھے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ اس نے اندر پہنچ کر ایک بٹن دبایا تو گیراج کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے وہ مہینے بھر سے نہ سویا ہو۔ اس نے سرد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''یہی کہ تم نے شیری کو قتل کیا ہے۔ میں وقت سے پہلے یہ انکشاف نہ کرتا لیکن اب کر رہا ہوں۔''

''وہ میری غلطی تھی۔''

''جانتے ہو کہ وہ حاملہ تھی اور تمہارے بچے کی ماں بننے والی تھی۔''

''وہ ایک اور غلطی تھی حالانکہ ہم دونوں کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہم رپورٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہیں ہوٹل میں قیام کے دوران تنہائی میسر آئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب ہو گیا۔ لیکن اس وقت ہم نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔''

''لیکن اس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اس نے مجھے فون کر کے اس جگہ ملنے کے لیے کہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے وہاں کیوں بلا رہی تھی؟''

وہ کچھ ہچکچائی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''سوچ رہی ہوں کہ تم پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے ایپرن کی جیب سے سفید پاؤڈر کی ایک تھیلی نکالی اور میری طرف اچھال دی جسے میں نے لپک کر پکڑ لیا۔ اس کا وزن کم از کم ایک پاؤنڈ تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''تم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے؟ اس کی قیمت سونے سے بھی بڑھ کر ہے۔''

''اور اسے اپنے پاس رکھنے کے جرم میں مجھے بیس سال قید بھی ہو سکتی ہے۔''

''اس کا انحصار تمہاری قسمت پر ہے۔ میں تمہیں بھی وہی پیشکش کر رہی ہوں جو تمہاری گرل فرینڈ کو کی تھی۔ تم جانتے ہو کہ سرکاری جنگل کا رقبہ کئی ملکوں سے بھی زیادہ ہے۔ ان جنگلوں میں چرس بڑی تیزی سے پروان چڑھتی ہے۔ میرے لڑکے ہر سال کچھ پودوں کی کاشت کرتے ہیں اور اسے بیچ دیتے ہیں لیکن اس کی مقدار ایک دو پاؤنڈ سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن کچھ دنوں سے ہم دیکھ رہے تھے کہ ہمارے علاقے میں غیر متعلقہ افراد کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک کا میرے لڑکے سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں یہ تھیلی ملی لیکن اس پر صرف ایک لیبارٹری کا نشان بنا ہوا تھا جبکہ اس طرح کی کم از کم چھ لیبارٹریز کام کر رہی تھیں۔ اگر ہم ان کے خلاف کوئی کارروائی کرتے تو بڑے پیمانے پر خون خرابا ہوتا اور کئی لوگ مارے جاتے۔''

''تم نے شیری کو اس بارے میں بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں اور اس سلسلے میں ہمارے درمیان ایک معاہدہ بھی ہو گیا تھا جس کے تحت وہ ہمارے چند لڑکوں کی چھان بین کرنے کے بجائے ان بڑے گروہوں کا پتا لگاتی جو سرکاری زمین پر زہر کی تیاری میں مصروف تھے۔ جب اس نے اس موضوع کو اچھالا تو گروہ کے ارکان کاکروچ کی طرح اِدھر اُدھر پھیل گئے۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ہی شیری کی گردن توڑ کر اسے کار سمیت کھائی میں پھینک دیا ہو۔''

''میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہی ہوں۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ حرکت انہوں نے ہی کی ہوگی کیونکہ وہ کسی ایک جگہ پر ایک یا دو ہفتے سے زیادہ قیام نہیں کرتے۔ میں نے اپنے لڑکوں سے کہہ کر ایک نقشہ بنوایا ہے جس میں ان لیبارٹریز کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کی مدد سے تم وہاں تک پہنچ سکتے ہو لیکن اس کے بدلے میں تمہیں میری طرف سے آنکھیں بند کرنا ہوں گی۔ اگر تم یا تمہارے آدمی جنگل کے اس حصے سے گزریں جہاں پوست کی کاشت ہوتی ہے تو اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جاؤ گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے لڑکے پوست کی کاشت کرتے ہیں جو اتنا نقصان دہ نہیں لیکن سفید پاؤڈر تو ایک زہر ہے۔ میں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اگر تم لوگ ان لیبارٹریز کا خاتمہ نہیں کر سکتے تو یہ کام میرے لڑکے کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ ''تم وہ نقشہ مجھے دے دو۔ ہم تمہارے ساتھ کچھ رعایت کر دیں گے لیکن تم اپنے آدمیوں کو ان لوگوں سے دور رہنے کے لیے کہو گی۔ اب جنگل میں کوئی جھگڑا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ان لوگوں سے نمٹ لیں گے۔''

ہم دونوں نے آپس میں ہاتھ ملایا اور اس طرح یہ معاہدہ طے پا گیا۔

وہاں سے واپس آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے سو فیصد سچ نہیں بولا تھا۔ اس نے کچھ باتیں بتائیں اور کچھ نہیں بتائیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے دو بھتیجے بھی ہیروئن کی تیاری میں ملوث تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے خاندان کے کچھ افراد اس کاروبار میں شامل ہو چکے تھے جس کے بارے میں وہ جانتی تھی۔ البتہ اس نے مجھے وہ نقشہ ضرور دیا جس میں ان لیبارٹریز کی نشاندہی کی گئی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ یہ لیبارٹریز اس کی زمین پر ناجائز طریقے سے تعمیر کی گئی تھیں۔ چند ہفتے بعد ہرن کے شکار کا موسم شروع ہونے والا تھا اور اس کے لیے ہزاروں شکاری شمال کا رخ کرتے۔ اگر ان میں سے کسی کی نظر ان لیبارٹریز پر چلی جاتی تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ اس لیے ایسا چاہتی تھی کہ میں پولیس فورس کی مدد سے ان لیبارٹریز کا خاتمہ کر دوں۔

وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے شیری کو بھی یہی پیشکش کی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خاندان کا نام خبروں میں آئے چنانچہ اس نے شیری کو اس کے بدلے میں ایک دوسری بڑی اسٹوری دے دی جو شیری کے لیے بے پناہ شہرت کا باعث بن سکتی تھی۔ اور یہ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی جس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑ گئے جبکہ ایبا کا کہنا تھا کہ شیری کے ساتھ معاہدہ فائنل نہیں ہو

"اس نے احتیاطاً ایسا کیا۔ اگر میلانو کو اس ملاقات کا پتا چل جاتا تو وہ ایک منٹ میں تمہیں ملازمت سے نکال دیتا۔"

"اسے یہ بات مجھے نہیں بتانی چاہیے تھی۔ میں ویسے ہی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میری بیوی مر رہی ہے اور میں اسپتال کے اخراجات برداشت کرتے کرتے پاگل ہو گیا ہوں۔ شاید ہمیں مکان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس روز وہاں کیا ہوا تھا؟"

"وہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں یا کیا چاہتا ہوں۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں اس پر جھپٹ پڑا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے زندگی میں کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔"

"تم نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ اس کا نرخرا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"اور اب تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا ورنہ مجھے جیل جانا پڑے گا۔ پھر میری بیوی کا کیا بنے گا۔ وہ ساری عمر خیراتی وارڈ میں گزار دے گی۔" یہ کہہ کر اس نے فائر کر دیا۔ گولی میرے کان کے پاس سے گزر گئی۔ اس نے دوسرا پھر تیسرا فائر کیا۔ دونوں گولیاں میرے قریب سے گزر گئیں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ ابھی بھی اس کے چیمبر میں تین گولیاں باقی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر میرے سر کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ کلک کی آواز آئی۔ گویا اس کا چیمبر خالی ہو چکا تھا۔ میں نے پھرتی دکھاتے ہوئے اپنا ہتھیار نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیے۔ وہ لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گیا۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور آخری سانسیں لینے لگا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے جھک کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔ اس نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ میں نے اسے فرش پر لٹا دیا پھر آہستہ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً کسی پڑوسی نے فائر کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دے دی ہوگی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ہی پہلی پولیس کار وہاں پہنچ گئی اور اس میں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے۔ میں انہیں جانتا تھا۔ اس کے باوجود گیراج سے باہر آ گیا اور اپنا ہتھیار زمین پر رکھ دیا۔ اس کے بعد ضابطے کی کارروائی شروع ہو گئی۔

مجھے پورا دن تفتیشی کمرے میں گزارنا پڑا جہاں دو سراغ رساں ہینڈرکس اور کولن مجھ سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ ہینڈرکس کسی زمانے میں میرے ساتھ ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ اس کے سوالات چبھتے ہوئے لیکن معقول تھے لیکن وہ کچھ ثابت نہ کر سکا۔ دوسرا سراغ رساں اس کے برعکس تھا۔ وہ خاصا جارحانہ تھا۔ اس نے مجھ سے اس طرح سوال کیے جیسے میں کوئی گلی کا آوارہ لڑکا ہوں۔ جب وہ میرے جواب سے مطمئن نہ ہوا تو اس نے دو مرتبہ جھوٹا کہہ کر پکارا لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔

میں ان دونوں سراغ رسانوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ میکس نے ایک نہیں بلکہ کئی جرم کیے تھے۔ اس کے گیراج سے برآمد ہونے والی ہیروئن کی مقدار سے ثابت ہو گیا تھا کہ وہ منشیات کی تجارت میں ملوث تھا۔ اسے بیوی کے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ شیری ان دنوں اسی کاروبار کے بارے میں ایک اسٹوری پر کام کر رہی تھی۔ جب اس کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے میکس کو اس جگہ بلایا جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میکس کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن اس نے شیری کو مار ڈالا۔ میکس نے مرنے سے پہلے میرے سامنے اس جرم کا اعتراف کر لیا تھا اور جب میں نے پولیس والوں کو وہ کاغذات دکھائے جو میں نے میکس کی جیب سے نکالے تھے تو انہیں میری بات کا یقین آ گیا۔

اگلی صبح سورج نکلنے سے پہلے ان لیبارٹریوں پر چھاپہ مارا گیا اور یہ کارروائی پورے ہفتے جاری رہی۔ اس خبر کو پورے ملک کے ٹی وی چینلز پر نشر کیا گیا۔ میں نے یہ کہانی بھاری معاوضے پر فروخت کی اور اس کا سارا کریڈٹ شیری کو دیا۔ وہ پلک جھپکتے میں اسٹار بن گئی۔ ہر کوئی اس کے نام سے واقف ہو گیا اور وہ راتوں رات لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کی آخری رسومات بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئیں۔ میڈیا نے اس پوری کارروائی کو براہ راست نشر کیا۔ تمام بڑے چینلز کے سربراہ اس موقع پر موجود تھے اور شیری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس موقع پر میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کاش وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی۔ اسے شہرت کی تمنا تھی، وہ زندگی میں نہ سہی، مرنے کے بعد مل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی روح یہ سارا منظر دیکھ رہی ہوگی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اس منظر سے دور نہیں کر سکتی۔ اسے اس کی محنت کا صلہ مل گیا تھا اور وہ ہر ایک کی نگاہ بن گئی تھی۔ اس نے اپنی جان دے کر ہزاروں زندگیوں کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا اور اس قربانی کا صلہ ممکن نہ تھا۔

طویل رفاقتوں میں محبت کا جذبہ نہ ہو تو ایسی قربتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں... خصوصاً میاں بیوی کا رشتہ محبت... قربت اور چاہت کے جذبوں کا محتاج ہوتا ہے... قربت ہونے کے باوجود ان دونوں میں طویل فاصلے حائل تھے... دونوں نے ان فاصلوں کو مٹانے کا حل سوچ لیا تھا...

ایک ہی وقت میں رونما ہونے والی دو وارداتوں کا سنسنی خیز احوال

مثالی جوڑا

سلیم انور

ہماری ازدواجی زندگی کے اعتماد کو ختم کر دینے والے ناخوشگوار واقعے کا آغاز اس وقت ہوا جب ڈیٹکٹیو جیف اسکاٹ نے ہمارے داخلی دروازے پر دستک دی۔ وہ مجھ سے اور میری بیوی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اشارہ دیا کہ وہ ایک بُری خبر لایا ہے۔

میں نے سیلی کو لیونگ روم میں بلا لیا۔ وہ اپنی سنہری زلفوں کو اپنے مخصوص انداز میں چہرے سے ہٹاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ جب ڈیٹکٹیو جیف اسکاٹ نے اپنا تعارف کرایا تو سیلی کی نیلی آنکھوں میں چھائی اداسی کچھ اور گہری ہو گئی۔

ہم دونوں اس سنجیدہ پولیس سراغ رساں کے روبرو بیٹھ گئے اور اس بُری خبر کا انتظار کرنے لگے جو وہ ہمارے لیے لایا تھا۔ مجھے پولیس کی آمد کی توقع تو تھی لیکن اس کے باوجود میں قدرے نروس تھا۔ وہ یہاں ہمیں سیلی کے باپ کی غیر متوقع موت کی خبر سنانے کے لیے آیا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ

ہم سے بہت زیادہ سوالات نہیں کرے گا۔

”مجھے افسوس ہے کہ یہ خبر مجھے اس انداز سے سنانی پڑ رہی ہے۔“ جیف نے سیلی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ کے باس مسٹر ڈیوڈ ایورگرین جمعے کی سہ پہر اپنے دفتر سے چند بلاک کے فاصلے پر واقع واٹر فرنٹ پارک میں مردہ پائے گئے ہیں۔“

”اوہ... نہیں۔“ سیلی کی چیخ نکل گئی اور وہ میرے بازوؤں میں گر پڑی۔ اس نے بے قابو انداز میں رونا شروع کر دیا۔ میرے خیال سے اس کی سسکیاں اس لحاظ سے قدرے طویل ہو گئی تھیں جو ایک ملازم کو اپنے باس کے مرنے کی خبر سن کر نکلنی چاہیے تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ سراغ رساں جیف بھی کہیں اس پہلو پر غور کرنا نہ شروع کر دے۔

بہرحال، سیلی نے خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیا اور جیف کی جانب متوجہ ہو کر بولی۔ ”اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“

”یہی تو انہونی انوکھی بات ہے...“

میں جیف کی بات پر اپنی توجہ مرکوز نہ رکھ سکا۔ میرے خیالات تو تیزی سے لگ بھگ چھ ماہ پہلے کی طرف چلے گئے۔

سیلی اپنے دفتر کے ایک ساتھی کو ہمارے یہاں ڈنر پر مدعو کرنا چاہتی تھی۔ اس ساتھی کی عمر پینتیس برس تھی اور وہ ایک کامیاب شخص تھا۔ اس کے بال سنہری اور جسم کسرتی تھا۔ ساتھ ہی وہ بذلہ سنج بھی تھا۔

میری اس شخص سے ملاقات ہونے سے قبل ہی میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ سیلی کے فرصت کے اوقات کو اپنے بیشتر دفتری پروجیکٹس پر بحث مباحثے کے لیے اپنے تصرف میں لے آتا تھا۔ سیلی ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتی تھی جس کے پاس بہت سی کمپنیوں کے اکاؤنٹس تھے۔

ہر ہفتے سیلی اور ڈیوڈ اپنے آپ کو دفتر میں بند کر کے جدت آمیز اور اکسا دینے والے پیغامات پر کام کیا کرتے تھے جو نو عمر افراد کے لیے ہوا کرتے تھے اور اس طرح ڈیزائن کیے جاتے تھے کہ ان کے ٹارگٹس کے والدین کی جیبوں سے ہر اضافی سینٹ اچک لیا جائے۔ بعض اوقات وہ صبح سویرے وقت ملنے پر بھی آفس بند کر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔

کھانے کے بعد ہم نے اپنے ڈرنکس مکس کیے اور باتیں شروع کر دیں۔ گفتگو کا رخ کام کی جانب پلٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جیسا کہ اکثر ایسی پارٹیوں میں ہوتا ہے جہاں ساتھی ورکرز اکٹھا ہوں۔

میں اور جینس اٹھ کر کچن میں آ گئے اور ... بہلانے لگے۔

”میں کام کے بارے میں باتیں سن سن کر ... ہوں۔“ جینس نے کہا۔ ”اگر ڈیوڈ کام پر نہیں ہوتا تو ... کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ... محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کی پابند سامع ہوں اور ... بھی کوئی اچھا کام سرانجام دیتا ہے تو ہر مرتبہ مجھے اس ... ایک اچھے سامع کی طرح تالیاں بجانا پڑتی ہیں۔ مجھے ... طرح یاد ہے، ایک وقت وہ تھا کہ جب وہ میری پوجا ... تھا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے کہنے کا کیا مطلب ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میری بھی سیلی ... ویک اینڈز کے علاوہ کبھی ملاقات نہیں ہوتی۔ اب تو ... کے کونے پر واقع کیفے میں روزانہ ڈنر کی میری عادت ... گئی ہے۔“

”یہ ایسا ہے جیسے ہم شادی شدہ ہیں اور اکلوتی ... گزار رہے ہیں۔“ جینس نے کہا۔ ”اس کی اپنی دنیا ہے ... میرے پاس... میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“

یہ بالکل ایسا تھا جیسے ہماری بکھری ہوئی کائنات ... ٹکڑے اچانک اپنی صحیح جگہ پر جڑ گئے ہوں۔ ہم ... کام کے دشمن رفیقِ حیات کے ستائے ہوئے پارٹنرز کا ... تائیدی گروپ تشکیل دے دیا ہو۔

بقیہ شب جینس اور میں تنہائی کی ناآسودگی کے ... میں باتیں کرتے رہے۔

اس نے بتایا کہ زندگی میں اس کا کردار ایک ... مصروف گھریلو بیوی کا ہے جس کی کوئی اولاد نہیں اور اس ... پاس شاپنگ کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ ... سہیلیاں شادی شدہ تھیں اور سب ہی ملازمت کرتی ... انہیں اس کی حالت پر کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی کیونکہ ... کا دکھ نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ وہ خود کو مصروف رکھنے کے ... رضاکارانہ طور پر کوئی کام سرانجام دے دیتی تھی ... اٹینڈ کرنے لگتی تھی اور کبھی گالف کھیلنا شروع کر دیتی تھی ... میں وہ بور ہو جاتی تھی۔

اس کی زندگی بے معنی تھی کیونکہ اس کے ساتھ ... کے معاملات کو شیئر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس وقت میں خود بھی بہت اچھی شخصیت کا ... میرا حلیہ تباہ حال یا نروس زدہ اس شخص کے مانند ... جس کا مظاہرہ میں نے سراغ رساں جیف ... کیا تھا۔ میں روزانہ ورزش کرتا تھا۔ میرا ...

... ملٹی کلر کے بال اور نیلی آنکھیں اب بھی چند خواتین کو ... مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ اس کے باوجود کہ سیلی ... میری شادی کو سات برس ہو چکے تھے۔

ڈنر کے دوران میں نے دیکھا کہ جینس بھی مجھ پر ... بھری نگاہ ڈال رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ ... مسکراہٹ تھی جیسے کہنا چاہ رہی ہو کہ یہ تجربہ بہرحال اتنا برا ... ثابت نہیں ہوگا۔

ڈیوڈ ایورگرین ہوسن ایڈورٹائزنگ کا ونڈر بوائے ... وہ بہت تیزی سے اوپر جا رہا تھا۔ وہ جلد ہی کمپنی کا ... پریذیڈنٹ بننے والا تھا اور وہ سیلی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ... وہ کسی شعبے کی وائس پریذیڈنٹ انچارج کے عہدے پر ... فائز ہونے والی تھی۔

”میں ڈیوڈ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔“ ڈنر کی شب سیلی نے مجھ سے کہا۔ ”اپنی ترقی کے بعد وہ مجھے اپنی پوزیشن پر لانے کے لیے تیار کر رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم ... سے پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ہمیشہ مجھے واپس کام کی طرف ... کھینچ لیتا ہے۔ لیکن تم اس میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کرنا جو تمہیں پسند آ جائے اور تم اس بنا پر اسے چاہنے ... لگو... میری خاطر!“

مجھے ڈیوڈ سے متعلق جو واحد چیز اچھی لگی، وہ اس کی بیوی جینس تھی۔

جینس کی عمر بتیس برس تھی۔ اس کے بال اخروٹی رنگت کے تھے اور ہونٹ بھرپور۔ اس کی قامت بھی دل آویز تھی۔ میرا قد بھی چھ فٹ تین انچ تھا اور میرے خیال میں دراز قامت عورتیں اشتعال دلانے والی ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب جینس نے ہمارے چھوٹے سے گھر کے دروازے سے ڈنر کے لیے اندر قدم رکھا تو میں اسی وقت اس کی پُرجلال شخصیت سے مرعوب ہو گیا۔ اس کا جسم نہایت سڈول تھا اور چال سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی جیسے کسی فیشن شو... کی ماڈل کے چلنے کا انداز ہوتا ہے۔

بے شک اس وقت میں اپنی بیوی سے بدستور محبت کرتا تھا۔ لہٰذا میرے ذہن کے پردے پر کسی قسم کے خیالات اچھل کود نہیں کر رہے تھے لیکن خیالات بہرحال موجود تھے۔

تھوڑی سی نظربازی اور دل میں قدرے غلط خیالات کا لڈ آنا تو کسی حد تک ٹھیک رہتا ہے لیکن اگر آپ محتاط نہ ہوں تو کوئی بھی آپ کی نظروں کے انداز یا آپ کے غلط تاثرات کو بھانپ سکتا ہے... اور خاص طور پر یہ تاڑنے والی آپ کی بیوی نہ ہو اور نہ ہی وہ جسے آپ حریصانہ نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔

میں نے بھی جینس کو اپنے بارے میں بتایا کہ میرا کام ایک فری لانسر کا ہے اور میری کوشش تھی کہ میں اپنا ایک ناول فروخت کرسکوں اور سیلی نے کس طرح میرے لکھنے کی خواہش...... پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ پہلے سال تو تحریر کی دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش میں، میں تقریباً پاگل سا ہوگیا تھا۔ میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا چاکلیٹ اور کوکیز کھاتا رہتا تھا اور ذہن میں کسی اچھوتے پلاٹ کی آمد کا انتظار کرتا رہتا تھا۔

اس مشق کے نتیجے میں، میں بور ہوتا چلا گیا اور پھر ڈپریشن کا شکار ہوگیا۔ میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی جدوجہد کررہا تھا... کچھ بھی۔

پھر میں نے اسے اپنی پہلی تحریر ایک مقامی میگزین کو فروخت ہونے کی بات بتائی۔ وہ گھر میں مقیم اس شخص کی مشکل صورتِ حال کی مختصر کہانی تھی جو اسی جیسی بور ہونے والی بیویوں اور ملازمت نہ کرنے والی خواتین سے دل بہلانے والے تعلقات کے بارے میں تھی جن کے لیے وہ... بے روزگار مرد ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔

''اس کے بعد میری بیس سے زیادہ مختصر کہانیاں شائع ہونا شروع ہوگئیں۔''

''میں متاثر ہوں کہ تم ایک شائع شدہ رائٹر ہو۔'' جینس نے اپنی رسیلی آواز میں کہا۔

''زیادہ متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لوگ رائٹنگ کو گلیمرس تصور کرتے ہیں اور کسی حد تک اسے مالی کامیابی سے تعبیر کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کہانی کو بار بار لکھنے اور گھنٹوں ایک سے دوسرے پبلشر کے پاس اس کی مارکیٹنگ کے لیے دھکے کھانے کے بعد مجھے لگ بھگ پچاس سینٹ فی گھنٹا کے حساب سے معاوضہ ملتا ہے اور جب کبھی بھی میں اس کام سے دست برداری کا فیصلہ کرتا ہوں تو کوئی نہ کوئی ایڈیٹر اس بات کا احساس کرلیتا ہے کہ میرا خود کو اذیت پہنچانے کا دور ختم ہونے کو ہے اور وہ ایک ارجنٹ نوٹس کے ذریعے مجھے مطلع کرتا ہے کہ وہ میری کہانیوں میں سے ایک کو خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میری انا پارہ پارہ ہوجاتی ہے اور میں خود کو یقین دلانے لگتا ہوں کہ کسی روز میں بھی مشہور ہوجاؤں گا اور یہی ایڈیٹر، پبلشر میرے پیچھے مارے مارے پھریں گے۔''

ہماری گفتگو اس وقت رک گئی جب سیلی ٹہلتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔ ''ارے، تو تم لوگ یہاں ہو۔ ڈیوڈ اور میں حیران تھے کہ تم دونوں کہاں چلے گئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس

نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے سنہری بالوں میں [illegible] پھیریں اور کن انکھیوں سے جینس کی جانب دیکھتے ہوئے [illegible] دلی سے مسکرانے لگی۔ شک اس کی نظروں سے عیاں تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ڈیوڈ اور میں دو [illegible] بارے میں فضول گوئی میں لگ گئے تھے۔ آئی [illegible] جیمز!'' یہ کہہ کر سیلی نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ [illegible] اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

اسی دوران میں ڈیوڈ بھی کچن میں آگیا۔ اس [illegible] گرے کوٹ اتارا ہوا تھا اور ٹائی بھی ڈھیلی کی ہوئی [illegible] کے بال بھی قدرے بکھرے ہوئے تھے اور اس کے [illegible] انداز معذرت خواہانہ تھا۔ ''لگتا ہے کہ ہم تم دونوں کو [illegible] کیے ہوئے تھے۔'' اس نے جھینپی سی ہنسی ہنستے ہوئے [illegible] پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی اسکاچ ہے، جیمز؟''

''ریفریجریٹر کے اوپر کیبنٹ میں تھوڑی رکھی [illegible] ہے۔'' میں نے اشارے سے بتایا۔

وہ کیبنٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ''ہاں، مل گئی۔'' [illegible] کہا۔ ''دراصل سیلی اور میں آئیکون اکاؤنٹ کے [illegible] نئے آئیڈیے کے متعلق متفقہ غور وخوض کررہے تھے۔ دونوں بُرا نہ مناؤ تو ہم اپنی گفتگو کو اختتام تک لے جا[illegible] ہمیں صرف چند منٹ اور لگیں گے۔''

اور کسی جواب کا انتظار کیے بغیر ڈیوڈ نے اپنا [illegible] کی کمر کے گرد حمائل کردیا اور اسے لے کر لیونگ [illegible] جانب چل دیا۔ اسکاچ کی بوتل اس نے ہاتھ میں تھامی [illegible] تھی۔

میں یقیناً ان دونوں کو کڑی نظروں سے دیکھ [illegible] اس بات کا احساس مجھے جینس کے رویّے سے ہوا۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''میں ان دو [illegible] جانب سے پریشان نہیں ہوتی۔ ڈیوڈ جب ڈرنک [illegible] ہے تو قدرے بے تکلف ہوجاتا ہے۔ لیکن اس سے آگے نہیں بڑھتا۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا۔'' [illegible] قدرے چونکتے ہوئے کہا۔ ''میں سیلی پر مکمل بھروسا [illegible] ہوں۔''

''ہاں، میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں [illegible] ہے۔ بعض اوقات میری خواہش ہوتی ہے کہ ڈیوڈ [illegible] بے وفائی کا مرتکب ہوجائے۔ کم از کم یہ ایک ایسی [illegible] جس کے خلاف میں سبقت لے جانے کی کوشش [illegible] ہوں۔''

''کیا تم ان بور گھریلو خواتین میں سے ایک ہو جو اپنی [illegible]ڈگی میں چاشنی پیدا کرنے کی تلاش میں ہوں؟'' میں نے [illegible] پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے وجود بھی میں کسی بالغ کے ساتھ ذہانت کی باتیں شیئر کرنا چاہوں گی۔ میں ہر وقت خود سے باتیں کرنے سے بور ہوجاتی ہوں۔ حتیٰ کہ جب میں ڈیوڈ کے ساتھ بات کررہی ہوتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ سے باتیں کررہی ہوں۔''

میں نے ہمدردی میں سر ہلادیا۔

''اور سیلی کا کیا رویّہ ہوتا ہے؟'' جینس نے پوچھا۔ ''کیا وہ تمہاری مخلصانہ کوششوں میں تمہاری مدد پر مائل رہتی ہے؟''

''اوہ، وہ میرے گھر تک محدود رہنے اور میرے لکھنے کے معاملے میں میری مدد کرتی ہے اور میں جب بالآخر کوئی کہانی فروخت کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہوں تو وہ میری پیٹھ بھی تھپتھپاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات میں اس سے کہیں زیادہ کا خواہاں ہوتا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے جو کچھ وہ کرتی ہے اس کے مقابلے میں، میں کچھ بھی نہیں کرتا۔''

''ہمیں ایک معاہدہ کرلینا چاہیے۔'' جینس نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم ہفتے میں ایک بار ملاقات کرلیا کریں... جیسے کی پر یا کچھ اور... اور ایک دوسرے کی اخلاقی مدد کریں۔''

مجھے جینس اچھی لگی۔ اپنے عمدہ نقوش کے علاوہ وہ [illegible] ذہین اور کشادہ دل واقع ہوئی تھی اور مدد کرنے پر [illegible] تھی۔

اور یوں ہمارے چھوٹے سے سپورٹ گروپ نے جنم [illegible] لیا۔

سیلی اور ڈیوڈ دونوں اس بات پر بے حد خوش ہوئے [illegible] ہم نے بالآخر ایک ایسا حل تلاش کرلیا ہے جس میں ان [illegible] سے کسی کا بھی وقت درکار نہیں ہوگا۔

ہم نے منگل کے دن کا انتخاب کرلیا اور لنچ پر مختلف [illegible] میں ملاقاتیں کرنے لگے۔ ابتدائی چند ہفتوں کے [illegible] ہم اپنے اپنے رفیقِ حیات سے متعلق اپنی [illegible] کے بارے میں ایک دوسرے کو آگاہ کرتے [illegible] پھر ہماری ملاقاتیں بتدریج دیگر باتوں کی طرف [illegible]

[illegible] اب ہم [illegible] مصروفیات، ذاتی کامیابیوں اور فلسفوں کو [illegible] تھے۔ ہماری معمول کی ملاقاتیں دوستی

میں تبدیل ہوگئیں اور یہ ملاقاتیں بھی بڑھ گئیں۔ میں نے اسے قائل کرلیا کہ وہ میرے ہمراہ قدیم وضع کے چھوٹے بک اسٹورز میں مقامی مصنفین کی ریڈنگز اٹینڈ کیا کرے اور وہ مجھے اپنے ہمراہ مختلف آرٹ کی نمائشوں میں گھسیٹ کر لے جانے لگی جن کے وجود سے میں قطعی لاعلم تھا۔

ہماری اس دوستی کو ڈیوڈ نے نہیں تو سیلی نے ضرور نوٹ کرلیا۔

ایک رات وہ مجھ سے بولی۔ ''آج کل تم اور جینس ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملاقاتیں کررہے ہو۔'' وہ اسی وقت شاور لے کر باتھ روم سے باہر نکلی تھی اور اس کے بدن سے پانی کے قطرے بیڈروم کے کارپٹ پر ٹپک رہے تھے۔ اس کے بال ایک چھوٹے سے تولیے میں لپٹے ہوئے تھے۔ بقیہ جسم بے لباس تھا۔

''ہم ہفتے میں دو ایک بار ملاقاتیں کرلیتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہمارا ارینجمنٹ ان ازدواجی پارٹنرز کے سپورٹ گروپ کا ہے جن کو ان کے رفیق نظرانداز کیے ہوئے ہیں۔ ہم اس گروپ کو قومی پیمانے پر تشکیل دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔''

''آئی ایم سوری، ہنی!'' سیلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں اگلے ہفتے تمہاری تمام شکایات کی تلافی کرنے کا پلان بنارہی ہوں۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمارا ساحل پر تفریح کے لیے جانے کا پروگرام ابھی برقرار ہے؟''

سیلی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''تم یقین رکھو۔''

''ایک ایسے کیبن میں جو کسی پر آشکار نہ کیا گیا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں نہ کوئی فون کالز ہوں گی اور نہ ہی کام کے بارے میں کوئی بات۔ بس میں ہوں گا اور تم۔ ہم ہفتے بھر بیڈ پر لیٹے رہیں گے۔ لیکن پہلے ہمیں تمام شاپنگ مکمل کرنی ہوگی۔ میں کسی بھی شے کے لیے کیبن سے نکلنے پر رضامند نہیں ہوں گا۔''

''یقیناً، ہنی!'' سیلی نے اپنا گاؤن پہنتے ہوئے کہا۔ ''ڈیوڈ مجھ پر زور دے رہا ہے کہ میں ایک دو دن میں لوٹ آؤں لیکن میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میں اتنی جلدی واپس نہیں آؤں گی کیونکہ ہم نے پہلے سے پلان بنا رکھا ہے۔ وہ اس بات پر خوش نہیں تھا۔ اس لیے کہ یہ کام مکمل کرنے کا آخری ہفتہ ہوگا۔ اس سے اگلے ہفتے آئیکون اکاؤنٹ کی پریزنٹیشن ہے۔''

جب وہ یہ بات کہہ چکی تو میں سمجھ گیا کہ اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ ہمیں ایک ساتھ ساحل پر کچھ وقت گزارنے کا موقع میسر آجائے۔ وہ ابھی سے اس بات کے لیے مجھے تیار کررہی تھی۔

بعد میں، میں نے خواب دیکھا کہ سیلی اور میں ساحل پر ایک دور دراز کیبن میں ہیں۔ لیکن جس عورت کو میں ریت پر اپنی جانب دوڑتے ہوئے آتے دیکھ رہا تھا، وہ سیلی نہیں بلکہ جینس تھی۔ اس کی اخروٹی رنگت کی زلفیں ہوا سے اس کے شانوں پر لہرا رہی تھیں اور اس کی ہلکی سبز آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں چونک کر بیدار ہوگیا۔

اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

دو دن بعد جینس نے خیال ظاہر کیا کہ ہمیں ایک مقامی پارک میں پکنک منانی چاہیے۔ اس نے ایک پکنک باسکٹ تیار کی جس میں دھوئیں کے اثر سے سیاہ کی ہوئی سامن مچھلی، فنگر سینڈوچز اور تھوڑی سی وائن موجود تھے۔

ہم نے پارک میں مرغابیوں کے تالاب سے ملحقہ ایک سدا بہار مخروطی درخت کے سائے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ جگہ سیر کرنے والوں اور سیاحوں سے خاصے پرے تھی۔ یہ آرام دہ اور بے تکلفانہ ملاقات کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔

کھانا بھی بے حد لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران میں ہم مرغابیوں کے جھنڈ کو پرواز کرتے اور پھر پانی کی پُرسکون سطح پر مہارت کے ساتھ اترتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بہت زیادہ لطف آرہا تھا۔

لنچ کے بعد جب ہم گھاس پر پھیلائے ہوئے کمبل پر بیٹھے تو میں نے جینس کو کھویا کھویا سا محسوس کیا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم پہلے بھی کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھیں اور اب دوبارہ بھی۔“

”اس کا سبب ایک ایسی بات ہے جو ڈیوڈ نے کل مجھ سے کہی تھی۔“ جینس نے آہستگی سے کہا۔ ”اس بات نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہم آپس میں رقم کے بارے میں بات کررہے تھے تو میں نے اس سے کہا کہ میں علیحدہ اپنا ذاتی اکاؤنٹ کھولنا چاہتی ہوں۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ ایک جوائنٹ اکاؤنٹ میں ہے اور تب اچانک اس نے کہا کہ وہ سارا پیسا اس کا ہے جس کی بدولت ہماری قسمت چمکی ہوئی ہے اور میرا جو پیسا تھا وہ کنزرویٹو اسٹاکس میں لگا ہوا ہے۔“

مجھے معلوم تھا کہ سیلی اور میرے برعکس ڈیوڈ اور کے پاس خطیر دولت تھی۔ یہ دولت جینس کو ورثے میں اور ڈیوڈ نے اپنی رقم سے اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کا ہوئی تھی۔

”عجیب سی بات ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔ ”پھر ت کیا کہا؟“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔ میں اسے بتایا کہ میں تو صرف اپنا ذاتی اکاؤنٹ کھولنا چاہتی ہوں تاکہ اپنے پیسے سے مسلسل باخبر رہوں۔ میں سمجھتی کہ ہمارے اکاؤنٹس مخلوط ہونا ایک اچھا آئیڈیا ہم نے شادی سے پہلے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے ہماری شادی سے قبل جو کچھ ہماری ملکیت تھا یا جو کچھ بھی نے کمایا تھا، وہ ہمارا ہی رہے گا اگر کبھی ہمارے درمیان ہوگئی تو... یہ اس وقت مجھے ایک اچھا ارینجمنٹ لگا تھا۔ پھر اس نے اپنی سرمایہ کاری میں میری رقم لگادی۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو ا نے کہا۔

”تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ میری گنوا بیٹھا ہے اور اس نے اپنی رقم سے جو سرمایہ کاری کی اس کی آمدنی اس کی رقم کی ہے۔ اور یوں میں کنگال ہو ہوں۔ میرا خیال ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ کسی روز میں طلاق نہ دے دوں۔ اس لیے وہ مجھے مالی طور پر پابند رکھنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے پاس انتہائی ہوشیار ذی فہم قسم کے وکیلوں کی ایک فوج ہے جو عدالت میں وہ کچھ ثابت کرسکتے ہیں جو وہ ان سے ثابت کرانا چاہے گا۔“

میں نے ہمدرد بننے کی کوشش کی لیکن اندر ہی اند اطمینان کا ایک احساس ابھر رہا تھا۔

میں ڈیوڈ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ مکروہ، جابر، خودغرض اور اپنی ذات میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ مجھے احساس میرے تحت الشعور میں ڈیوڈ سے حسد کرنے کے دو وجوہ ہوئے تھے۔

اس نے اس حسین عورت سے شادی کی ہوئی تھی میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ سیلی کے گرد ریشمی جال بُن رہا تھا۔ یہ بات مجھے مزید اشتعال دلا تھی۔ میں جینس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اندر ہی رہا تھا کہ وہ کمینہ اس کا ساتھ چھوڑ دے تاکہ وہ جائے۔

”کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم اسے طلاق دے دو، جینس؟ صاف ظاہر ہے کہ تم اس کے ساتھ خوش نہیں ہو۔ یہ بالکل ہی ہے جیسے تم نے پہلے کہا تھا۔ تم اور ڈیوڈ شادی شدہ تو ہو، لیکن الگ الگ زندگی بسر کررہے ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے لیے ایسے پُرعزم اور مضبوط وکیل تلاش کرسکتی ہو جو تمہاری دولت کو مکمل تحفظ فراہم کرسکیں۔“ میں نے اسے راہ دکھانے کی کوشش کی۔

”بات صرف دولت کی نہیں ہے۔ اسے اپنی شہرت بھی برقرار رکھنی ہے۔ ایڈمز ہرسٹ اینڈ وینڈر ہوسن ایک بہت قدامت پسند فرم ہے جو مضبوط خاندانی اقدار کو بے حد اہمیت دیتی ہے۔ اس فرم کے پارٹنرز طلاق پر یقین نہیں رکھتے۔ ڈیوڈ اس فرم کا پریذیڈنٹ بننے کی کوشش کررہا ہے۔ وہ اس وقت علیحدگی کے بارے میں کسی قسم کے معمولی سے اشارے کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔“ جینس نے وضاحت کی۔

”اگر اس کی فرم شادی اور خاندانی اقدار کے بارے میں اتنے مضبوط عقائد رکھتی ہے تو پھر وہ ڈیوڈ اور سیلی کو گھنٹوں تک ایک ساتھ الگ تھلگ کام کرنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں؟ انہیں چاہیے کہ ان دونوں کی اس بات پر حوصلہ افزائی کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ہمارے ساتھ گزاریں... میرا مطلب ہے کہ اپنے اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ۔“ میں نے منطق کی بات کی۔

جینس نے میرے وفورِ جذبات کو محسوس کرلیا۔ وہ کمبل پر میرے نزدیک کھسک آئی اور میرے بازو پر تھپکی دیتے ہوئے بولی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ تم میرے بارے میں فکرمند مت ہو۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ یہی ناکہ میں ڈیوڈ کے ساتھ شادی کے بندھن میں جکڑی رہوں گی چاہے میں اس سے محبت کروں یا نہ کروں۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ صحیح کہتے ہیں، مصلحت کی شادی یہی ہوتی ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نگاہیں دوسری طرف گھمالیں۔ البتہ اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو نہ چھپا سکی۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پاکر اس کے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ ابھر آئی۔

میں نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرنا شروع کیں تو اس نے آگے جھک کر میرے رخسار کو ہلکے سے چوم لیا۔

ہم قدرے ہچکچائے اور پھر سہمے سہمے انداز میں ایک دوسرے سے یوں چمٹ گئے جیسے اسکول کے دو بچے ہوں۔

میرے اندر جیسے ایک توانائی سی پھٹ پڑی۔ میرے جذبات انتہائی حساس ہورہے تھے۔ اس کی وجہ جینس سے شدید لگاؤ اور اس شخص سے شدید نفرت کے جذبات تھے جس نے ہم دونوں کی زندگیاں برباد کی ہوئی تھیں۔

اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تو ہم دونوں ایک دوسرے میں اس طرح کھو گئے جیسے گرمیوں کی سہ پہر میں دو ٹین ایجرز کسی پبلک پارک میں تنہائی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے ہیں۔

یہ اسی جذباتی کیفیت اور محبت میں ابال آنے کا نتیجہ تھا کہ میں نے اسی لمحے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ میں جینس کو اس کے شوہر سے آزادی دلا کر رہوں گا۔

☆☆☆

یہ موقع مجھے غیر متوقع طور پر جلد ہی میسر آگیا۔

جب میں جینس کے ہمراہ پکنک منا کر گھر واپس آیا تو کچن کاؤنٹر پر سودے سلف کے کئی تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ جینس کے ہمراہ میری پکنک کا دورانیہ اس وقت سے کہیں آگے نکل گیا تھا جس کا منصوبہ میں نے بنایا تھا اور سیلی میری توقع سے خاصا پہلے گھر پہنچ گئی تھی۔

کچن کاؤنٹر پر چوہے مار زہر کا وہ پرانا ڈبا بھی دکھائی دیا جو اسٹوریج شیڈ میں ایک عرصے سے پڑا ہوا تھا۔ اسے سیلی وہاں سے اٹھا کر لائی تھی اور میرے لیے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے کئی ہفتے قبل مجھ سے کہا تھا کہ میں زہر سے چھٹکارا حاصل کرلوں کیونکہ اس نے پڑوس کے دو بچوں کو شیڈ میں کھیلتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ بچوں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

چوہے مار دوا کے بکس پر موجود تحریر کے مطابق اس کا موثر جزو وارفرین یا کچلا تھا جو کہ چوہوں اور انسانوں دونوں کے لیے خطرناک اور زوداثر زہر تھا۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی کیونکہ ڈیوڈ میری نظر میں انسان اور چوہا دونوں ہی تھا۔ ساتھ ہی ذہن میں ایک چھوٹا سا آئیڈیا بھی آگیا۔ اس چوہے مار زہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ ہی میں بعض دیگر مسائل بھی حل کرسکتا تھا۔

اگلے روز میں نے اپنے پلان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

میں نے اپنے گھر کے فون سے اس نمبر پر فون کیا جسے سیلی نے پہلے سے پروگرام میں فیڈ کیا ہوا تھا۔

دوسری جانب سے فون ڈیوڈ نے اٹھایا۔

”ڈیوڈ! میں جیمز بول رہا ہوں۔ سنو، کیا آج

دوپہر ہم لنچ میں ملاقات کر سکتے ہیں؟ مجھے اپنے ایک ذاتی پرابلم کے سلسلے میں مشورہ درکار ہے اور میرے ذہن میں بے ساختہ تمہارا نام آگیا۔ مجھے معلوم ہے کہ سلی آج دفتر میں موجود نہیں ہے، سو مجھے امید ہے کہ تم دوپہر میں فری ہوگے۔''

''کیا؟ نہیں، میں اس بارے میں فون پر بات کرنے کو ترجیح نہیں دینا چاہتا۔ یہ ایک قسم کی شرمندہ ہونے والی بات ہے۔ سلی کا کہنا ہے کہ تم مسائل کو حل کرنے کے معاملے میں بے حد ذہین ہو۔ میں توقع کر رہا ہوں... ساڑھے بارہ بجے؟ گریٹ... کیا ہم تمہارے دفتر کے قریبی پارک میں ملاقات کر سکتے ہیں؟ سی وال کے نزدیک؟ پرفیکٹ۔ میں سینڈوچز لیتا آؤں گا۔ تم کیا پسند کروگے؟''

☆☆☆

دوپہر ساڑھے بارہ بجے ہم دونوں پارک میں ملاقات کرنے پہنچ گئے۔ ہم نے بھیڑ بھاڑ سے دور ایک الگ بینچ کا انتخاب کیا۔ ڈیوڈ ندیدوں کی طرح ٹرکی ڈیلکس پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ہی لیمونیڈ کی بوتل سے گھونٹ بھی لیتا رہا۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ میں مسٹرڈ کا اپنا جار لے کر آیا تھا اور چوہے مار دوا کے کڑوے پن کو ختم کرنے کے لیے میں نے ڈیوڈ کے سینڈوچ پر کچھ زیادہ مسٹرڈ چھڑک دیا تھا۔ پھر لیمونیڈ نے اس کے ذائقے کو مزید ڈھانپ دیا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں سلی سے اپنی شادی کے بارے میں فکرمند ہوں کیونکہ وہ وقت کا ایک بڑا حصہ گھر سے باہر گزارتی ہے۔

''ہم کئی ماہ سے ایک ساتھ تعطیلات منانے کا پروگرام بنا رہے تھے، ڈیوڈ! اور ہم نے تمام تیاریاں مکمل کرلی ہیں اور پروگرام فائنل ہو چکا ہے لیکن اب سلی قدرے غل مچا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اسے نہیں معلوم وہ ہفتہ بھر کی چھٹی لے بھی سکے گی یا نہیں۔''

''ویل۔'' ڈیوڈ نے قدرے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دراصل چند پیچیدگیاں پیش آرہی ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ ہم سلی کو ایک ہفتے کے لیے تو کیا شاید ایک دن کے لیے بھی چھٹی دے سکیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم اپنی یہ مختصر سی تعطیلات منانے کا پروگرام دو ہفتوں کے لیے موخر کردو؟ اس وقت تک تمام معاملات نمٹ جائیں گے۔''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم نے تمام ریزرویشنز بہت پہلے کرالی تھیں۔ اب عین وقت پر انہیں تبدیل کرانا ناممکن ہوگا۔''

''میں دیکھتا ہوں کہ میں اس معاملے میں ... ہوں۔ لیکن تم اپنی امیدیں باندھے مت رکھنا۔'' ... نے اپنا سینڈوچ کھانا شروع کر دیا۔

اچانک اس کے چہرے پر الجھن کی کیفیت ... ہونے لگی۔ ''سنو، کیا تمہارے سینڈوچ کا ذائقہ عجیب ... ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''قدرے کڑواہٹ ہے۔'' میں نے اس سے ... کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تیل اور سرکے کا آرڈر ... شاید اس نے سرکہ زیادہ ڈال دیا ہے... تم نے کسی کو ... بتایا کہ تم مجھ سے ملاقات کرنے جا رہے ہو؟''

''نہیں، بس یہ کہا تھا کہ میں ایک بزنس لنچ کے ... میں باہر جا رہا ہوں۔''

''گڈ! میں یہ بات سلی کے علم میں نہیں ... کہ میں نے تم سے کسی قسم کی سفارش کی ہے۔ وہ مجھے ... ڈالے گی۔''

لیکن ڈیوڈ نے میری بات نہیں سنی۔ اس کا چہرہ ... ہوگیا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی لیمونیڈ کی بوتل ... پر گر پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھ... اور ہانپنے لگا۔

''مجھے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی ہے۔'' ... ہانپتے ہوئے بولا۔ ''اوہ........ میرا معدہ!... اس ... شدید جلن ہو رہی ہے جیسے آگ لگی ہو۔''

''تم ٹھیک تو ہو نا؟ تمہاری طبیعت صحیح نہیں لگ ... ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ اپنا پیٹ تھامے کراہنے لگا۔

''تم یہیں ٹھہرو، میں تمہارے لیے کسی مدد کا ... کرنے جاتا ہوں۔'' میں یہ کہہ کر بینچ پر سے اچھل کر کھڑ... اور چاروں طرف دیکھنے لگا کہ شاید کوئی مدد مل جائے۔ ... آس پاس تو کوئی بھی موجود نہیں تھا جو ڈیوڈ کو اس تکلیف ... مبتلا دیکھ کر ادھر متوجہ ہوتا۔

تب میں بے تعلقی سے چلتا ہوا پارک کے ... جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

میں نے جینس سے رابطہ قائم کرنے کی ... کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ مجھے یہ اچھا نہیں ... کی موت کی خبر جینس کو کسی پولیس مین کے ذریعے ... کے بُرے وقت میں، میں اسے دلاسا دینے کے ... پاس موجود نہ ہوں۔

لیکن دوسری جانب مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں اس منظر نامے سے جتنی دور رہوں، یہ ہم دونوں کے حق میں اتنا ہی بہتر رہے گا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ معاملے کو جوں کا توں رہنے دیا جائے جب تک ڈیوڈ کے مرنے کی خبر کا اعلان نہیں ہو جاتا۔

یہ جمعے کی سہ پہر تھی اور سلی اس روز سیلز کالز پر دفتر سے باہر ہوتی تھی۔ ڈیوڈ کی موت کی خبر اس تک پیر سے پہلے پہنچنا مشکل تھی۔ ہاں اگر وہ اسے گھر پر فون کر کے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتی تو الگ بات تھی۔

میں جینس کے ہمراہ ایک نئی زندگی کے تصور میں کھو گیا۔ ہم دنیا بھر کی سیر کرنے نکل جائیں گے۔ دیس دیس گھومیں پھریں گے اور تمام وقت اکٹھا گزاریں گے۔

مجھے احساس ہوگیا کہ میں جینس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں اور میں نے سوچا کہ یقیناً وہ بھی میرے بارے میں یہی سوچتی ہوگی کیونکہ اپنے شوہر کے ساتھ درپیش اپنی تلخ زندگی کے مسئلے کے حل کے لیے اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور اپنے تمام دکھڑے میرے روبرو بیان کر دیے تھے۔

میں سکون محسوس کر رہا تھا جبکہ مجھے مطمئن نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تو اس بات پر زیادہ پریشان ہونا چاہیے تھا کہ کہیں ڈیوڈ کی موت سراغ رساں جیف کو مجھ تک تو نہیں لے آئی ہے۔ مجھے ڈیوڈ... کی موت کے اسباب جاننے کے لیے جیف کی بات زیادہ دھیان سے سننی چاہیے تھی۔

میں تو جاگتی آنکھوں سے ایک خوش گوار خواب دیکھ رہا تھا جبکہ یہ ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہونے جا رہا تھا۔

اس لیے کہ جیف نے ایک ایسی بات کہی تھی جس نے مجھے میرے خیالات سے بُری طرح چونکا دیا تھا۔

''تم نے کیا کہا؟'' میں نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں تم دونوں متوفی جوڑے کو بہ خوبی جانتے تھے۔''

''متوفی جوڑا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، ڈیوڈ اور جینس ایورگرین۔''

یہ بات سن کر میرے سینے میں میرا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ مجھے یقین آگیا، یہ دھڑکن ان دونوں کو بھی بہ خوبی سنائی دے رہی ہوگی۔ میرا حلق خشک ہو کر سکڑنے لگا۔

''کیا؟'' مجھ سے رہا نہ گیا۔ ''متوفی ڈیوڈ ہوسکتا ہے، جینس نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے مسٹر جیمز۔'' جیف نے کہا۔ ''ڈیوڈ اور مسز ڈیوڈ دونوں ہی کل ابتدائی سہ پہر کے وقت واٹر فرنٹ پارک کی دو مختلف بینچوں پر ایک دوسرے سے صرف تین سو گز کے فاصلے پر مردہ پائے گئے تھے۔'' یہ کہہ کر اس نے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا کہ کیا میں اس کی بات دھیان سے سن رہا ہوں؟

لیکن اب تو میں ہمہ تن گوش تھا۔

''موت کے تفتیشی افسر کا کہنا ہے کہ ان دونوں کی موت اسٹرکنین زہر کھانے سے واقع ہوئی ہے۔ یہ زہر ان سینڈوچز میں سے موجود تھا جو ان دونوں نے لنچ ٹائم میں کھائے تھے۔

''ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے انہوں نے باہمی خودکشی کا معاہدہ کیا تھا لیکن دونوں علیحدہ علیحدہ مردہ پائے گئے۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ایک ممکنہ قتل اور خودکشی کا کیس ہوسکتا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک نے دوسرے کو قتل کیا پھر وہاں سے اٹھ کر قدرے فاصلے پر جانے کے بعد خودکشی کے طور پر خود بھی اپنا زہر آلود سینڈوچ کھا لیا۔'' جیف نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

میں نے غضب ناک نظروں سے سلی کی طرف دیکھا۔ مجھے وہ چوہے مار زہر یاد آگیا جو میں نے کھلے ہوئے بکس میں سے چمچے کے ذریعے نکال کر ایک چھوٹی سی تھیلی میں ڈالا تھا۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ جب میں نے وہ بکس شیڈ میں رکھا ہوا دیکھا تھا تو اس وقت ڈبا مکمل طور پر پیک شدہ تھا اور کھلا ہوا ہرگز نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ڈبے میں سے میرے زہریلی دوا نکالنے سے قبل کسی نے اسے کھولا تھا۔

اور میں سمجھ گیا کہ یہ حرکت سلی کے سوا اور کسی کی ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ سلی نے جینس کو بالکل اسی طریقے سے ہلاک کیا تھا جیسے میں نے ڈیوڈ کو قتل کیا تھا۔

یہ بات ناقابل یقین حد تک سچ تھی کہ ہم دونوں کے ذہنوں نے نہ صرف بالکل ایک جیسی اسکیم اختراع کی تھی بلکہ ہم نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ہی دن، ایک ہی وقت اور ایک ہی پارک کا انتخاب کیا تھا۔

لیکن سلی کو جینس کو قتل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی؟ یہ بات میرے لیے الجھن کا باعث تھی۔

ہم دونوں میاں بیوی الجھی نظروں سے ایک دوسرے کو بار بار دیکھ رہے تھے جبکہ جیف اپنی ایناپ شاپ ہانکے جا رہا تھا۔

جب جیف رخصت ہونے کے لیے اٹھا تو میں اور سیلی سکتے اور صدمے کی سی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم اس وقت تک دروازے میں کھڑے رہے جب تک ہمیں جیف کے سیڑھیوں سے نیچے اترنے اور ہمارے گھر سے چلے جانے کا یقین نہیں آگیا۔

پھر میں نے اپنے گھر کا داخلی دروازہ بند کر دیا اور پلٹ گیا۔

میرے پلٹتے ہی سیلی مجھ پر جھپٹ پڑی اور اپنے لمبے ناخنوں سے میرے چہرے کو نوچنے لگی۔ میں نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تو اس نے میرے پیٹ میں مُکے مارنا شروع کر دیے۔

"تم نے اسے مار ڈالا، احمق کہیں کے۔" وہ چلّانے لگی۔ "میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔"

"تم نے جینس کو کیوں ہلاک کیا، کتیا؟"

ہم دونوں ایک دوسرے سے الجھے فرش پر لوٹ کھنیاں کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو گھونسے مار رہے تھے۔ بالآخر تھک ہار کر ہانپتے ہوئے فرش پر الگ الگ گر پڑے۔ اس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے کو نشانہ بنایا تھا جبکہ میرے چہرے پر اس کے ناخنوں کے لگائے ہوئے کھرونچوں سے بہتے ہوئے خون نے میری قمیص پر کئی جگہ دھبّے ڈال دیے تھے۔

"کیسا مذاق ہے؟" سیلی ہچکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "تم جینس سے محبت کرتے تھے اور میں ڈیوڈ کو چاہتی تھی۔"

بے یقینی کے صدمے سے میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ "کیا تمہارے اور ڈیوڈ کے درمیان معاشقہ چل رہا تھا؟"

سیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں اتنا احمق کیونکر تھا کہ اندازہ نہ لگا سکا؟" میں نے خود کو کوستے ہوئے کہا۔ "تب تو پھر وہ مرنے کا مستحق تھا۔"

میں اپنے نقصان پر رنجیدہ تھا۔ جینس مر چکی تھی اور میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ اب میں کبھی بھی اس کی اعتماد بحال کر دینے والی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ اس کی جگمگاتی ہلکی سبز آنکھیں کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب مجھے صبح سویرے بیدار ہونے اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"سو تم نے جینس کو اس لیے قتل کیا کہ تم... تم ڈیوڈ کو حاصل کر سکو؟" میں نے کہا۔

"وہ اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ ہم دونوں کے یکجا ہونے کا بس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ جینس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹ جائے۔ پھر ایک مناسب وقت گزرنے کے بعد میں تمہیں طلاق دے دیتی اور ڈیوڈ سے شادی کر لیتی۔"

جینس کو کھو دینے سے زیادہ جو واحد بدترین بات تھی، وہ سیلی کے ہمراہ مستقل رہنا تھا۔ ہم نے اپنی اپنی ترجیحات اور صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ہمیں چند برس تک اسی دکھاوے کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے جیسے ہمارے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہمیں ایک دوسرے سے اتفاق کرنا پڑا۔ یہ ہماری مجبوری تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ سراغ رساں جیف جیسا کوئی شخص معاملے کے تانے بانے بننے اور گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کرے۔

اس لیے اپنے دوستوں، سیلی کے دفتری ساتھیوں اور پولیس کے مفاد کی خاطر ہم دونوں نے بطور میاں بیوی زندگی کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اس دکھاوے کی ازدواجی زندگی میں ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے تھے کہ ڈیوڈ اور جینس کے مرنے سے قبل پہلے کبھی اتنے نزدیک نہیں ہوئے تھے۔

بہرحال، اب ہم دونوں اپنا اپنا کھانا خود تیار کرتے ہیں اور دونوں ہی روزانہ گھر بھر میں یہ چیک کرتے ہیں کہ کہیں کوئی زہریلی شے یا کوئی ایسا تباہ کن ہتھیار تو موجود نہیں جو ہماری زندگی کا خاتمہ کر دے۔

یقیناً ہماری اس احتیاط کی بنا پر کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب نہ ہو جائے، ہم محتاط رہنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور دیکھنے والوں کو یہی لگتا ہے کہ جیسے ہمارے درمیان گہری محبت ہے۔ ہمارے تمام دوست اب بھی ہمیں ایک پرفیکٹ جوڑا تصور کرتے ہیں۔

اور ہمیں خود کو اس وقت تک پرفیکٹ جوڑے کا تاثر دیتے رہنا ہے جب تک ہم میں سے کوئی ایک... ایک اور بے عیب، غلطی سے مبرّا اور پرفیکٹ قتل کے ارتکاب میں کامیاب نہیں ہو جاتا!

گیڈا کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے سوئیڈن میں پھیل گئی۔ اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ وہ سونے کا دل رکھنے والا شخص تھا اور اس نے اپنی زندگی میں کسی کیڑے کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اس لیے اس کے قتل پر سبھی کو حیرت ہو رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اثاثوں کی مالیت 50 ارب کرونے کے قریب تھی۔ اس کا شمار سوئیڈن کے بڑے صنعت کاروں میں ہوتا تھا۔ ساٹھ سال کی عمر ہونے کے باوجود اس نے شادی نہیں کی تھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سوائے اس کے بٹلر پلسن اور چھبیس سالہ گولڈی کے جو اس کے ساتھ گزشتہ تین سال سے کمپیوٹر اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہی تھی اور مچھلی کے شکار کے دوران بھی اس کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ یہ بات صرف اس کا وکیل الفرڈ اولی ہی جانتا تھا کہ وہ گولڈی کو اپنی بیٹی بنانے کا ارادہ کر چکا ہے۔ وکیل کے لیے یہ اطلاع حیران کن تھی۔ وہ بولا۔

ایک نازک اندام دوشیزہ کے گرد بُنے گئے جال کی باریکیاں

ماضی اور حال کے حوالوں سے مستقبل کے امکانات کی نشاندہی ہو جاتی ہے... اور وہ اپنے گزشتہ حوالوں سے وہ امیدیں باندھ لیتا ہے... جو اگر پوری نہ ہوں تو اس کے جذبات و اندازِ فکر میں دراڑ پڑ جاتی ہے... ایک ایسے ہی وفادار شخص کی کتھا جو اپنی وفاداری و اطاعت گزاری کا اپنی مرضی کے مطابق بدل چاہتا تھا...

مارِ آستین

عبدالقدیر

"تم مذاق تو نہیں کر رہے؟" اس نے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تو اسے تمہاری داشتہ سمجھتا تھا اور تم اسے بیٹی بنانے کی بات کر رہے ہو؟"

"یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟" گیڈا نے پوچھا۔ "شاید یہ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔"

"نہیں۔" اوڈی نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اسے تمہارے بیڈروم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"ہاں۔" گیڈا مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ ہر شام مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے میرے کمرے میں آتی ہے۔ بعض اوقات پولسن بھی وہاں موجود ہوتا ہے۔ یہ لوگ میرے لیے گھر کے افراد جیسے ہیں۔"

اوڈی سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

اس گفتگو کے چند روز بعد گیڈا اپنے باغ میں مردہ پایا گیا۔ اسے نائن ایم ایم کی گن سے نشانہ بنایا گیا تھا اور گولی اس کے دماغ کے آر پار ہو گئی تھی۔ جائے وقوعہ سے کارتوس کے خول کے علاوہ ایک بالٹی بھی ملی جو لاش کے پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کوئی اور نشان نہیں پایا گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل نے بڑی ہوشیاری سے اپنا کام کیا ہے۔

☆☆☆

انسپکٹر نارمن اور اس کے معاون انسپکٹر نیل کو گیڈا کے قتل کی اطلاع پونے بارہ کے قریب ملی۔ اس وقت وہ دونوں پولیس ہیڈ کوارٹرز میں موجود تھے۔ نیل نے کافی کے دو کپ بنائے اور ان میں سے ایک نارمن کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے گولی کا خول معائنے کے لیے بھجوا دیا ہے۔ اب ہمیں پولسن اور اس لڑکی سے پوچھ گچھ کرنا ہوگی۔"

"ٹھیک ہے تم بٹلر کو بلاؤ۔ میں گولڈی کو فون کرتا ہوں۔"

وہ اپنے بالوں میں جیل لگا رہی تھی کہ اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف سے انسپکٹر نارمن نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔ "ہمارے پاس تمہارے لیے ایک اطلاع ہے اس کے لیے میں تم سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر آسکتی ہو؟"

"اس کا دارومدار میرے موڈ پر ہے۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے جیکٹ پہنی اور ہیڈ کوارٹر جانے کے ارادے سے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ اس نے دیکھا کہ تین لڑکے اس کی موٹر سائیکل کے گرد کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے اس کا ہینڈل پکڑا ہوا تھا۔ گولڈی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج تو قیامت ڈھا رہی ہو۔"

گولڈی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی لیکن مصنوعی غصے سے بولی۔ "میری موٹر سائیکل سے اترو۔"

وہ لڑکا زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کا ساتھی آگے بڑھا اور گولڈی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "کہاں کی تیاری ہے؟"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کی کنپٹی پر مکا رسید کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ساتھی کوئی ردعمل ظاہر کرتا۔ گولڈی نے لات گھمائی اور اس کے پیٹ میں مار دی۔ تیسرے لڑکے نے موٹر سائیکل چھوڑ دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ گولڈی نے اپنی جیکٹ کی زپ بند کی اور موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی۔ جب وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی تو انسپکٹر نارمن نے اسے اپنے دفتر میں بلا لیا۔

انسپکٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

گولڈی نے فوری طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور چاندی کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اسے سلگانے لگی۔ یہ سگریٹ کیس اسے گیڈا نے تحفے میں دیا تھا۔

انسپکٹر نارمن کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اوف گیڈا آج صبح اپنے باغ میں مردہ حالت میں پایا گیا۔"

"کیا؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "پاپا گیڈا مر گئے؟"

نارمن اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "انہیں کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

گولڈی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟"

"میں نے اسی سلسلے میں تمہیں بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جس کے پاس اسے قتل کرنے کی کوئی وجہ ہو؟"

اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت مہربان اور شریف انسان تھے، وہ میرے لیے باپ جیسے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" وہ اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "کیا میں تمہارے بارے میں کچھ تفصیلات جان سکتا ہوں۔"

گولڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

جیکر ایک مشہور رسالے کا پبلشر اور تحقیقاتی رپورٹر تھا۔ وہ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹنے ہی والا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر انسپکٹر نارمن کا نام دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ کہتا

اس نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں بعد میں فون کروں گا۔ اس وقت ایک ضروری آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔"

"ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔" انسپکٹر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "گولڈی ہمارے ساتھ بالکل تعاون نہیں کر رہی اور اس نے وکیل سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میں نے تمہیں اسی لیے فون کیا ہے کہ شاید وہ تم سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"بہت خوب لیکن تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟"

"ہم نے اسے گیڈا کے قتل کے الزام میں روکا ہے۔"

"تم مذاق تو نہیں کر رہے۔" جیکر نے نظریں اٹھا کر اپنی ایڈیٹر انیکا کی جانب دیکھا جو بستر کے دوسری جانب کروٹ بدل کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے فون پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "یہ تو مجھے کچھ اور ہی کہانی لگتی ہے۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں، البتہ ہمیں جائے واردات سے کچھوؤں کی بالٹی ملی ہے جس پر گولڈی کی انگلیوں کے نشان ہیں۔"

"بالٹی؟" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ گولڈی نے کبھی اتنے کچھوے نہیں پکڑے ہوں گے جن سے ایک ڈبا ہی بھر جائے۔ وہ کبھی کسی ذی روح کو نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ اسے ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔"

"تم غلطی پر ہو۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اس نے کل ہی تین لڑکوں کی اچھی خاصی مرمت کی ہے۔"

"یقیناً ان لڑکوں نے اسے ایسا کرنے پر اکسایا ہوگا۔" جیکر نے کہا۔

"ممکن ہے۔ خیر چھوڑو اور یہاں آکر اسے سمجھاؤ۔ وہ ہم سے تعاون نہ کرکے اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔"

انسپکٹر کی بات سن کر وہ الجھن میں پڑ گیا۔ کسی زمانے میں اس کے گولڈی سے اچھے تعلقات تھے لیکن بعد میں یہ تعلق ختم ہو گیا اور اس کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے انسپکٹر کو ٹالنے کی کوشش کی۔

انسپکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی اسے سمجھا سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل صبح آجاؤں گا۔"

☆☆☆

جیکر ٹھیک دس بجے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ وہ سیدھا انسپکٹر نارمن کے کمرے میں گیا جہاں اس کا تعارف انسپکٹر نیل سے ہوا۔ کافی پینے کے دوران ہی انسپکٹر نے بریفنگ دینا شروع کر دی۔ "پہلا ثبوت تو وہ بالٹی ہے جس پر گولڈی کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ دوسرا ثبوت گیڈا کو لگنے والی گولی ہے۔ اس کے زاویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل پانچ فٹ آٹھ انچ یا اس سے بھی کچھ لمبا تھا۔ تیسری بات یہ کہ کسی قسم کے جدوجہد کے آثار نہیں پائے گئے اور نہ ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گیڈا کے لیے قاتل کی آمد حیران کن تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل کوئی ایسا شخص ہے جسے گیڈا پہلے سے جانتا تھا اور قاتل کو بھی معلوم تھا کہ اس وقت گیڈا کے آس پاس کوئی نہیں ہوگا۔ یہ تینوں باتیں اس لڑکی کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔"

"حالانکہ یہ کسی اور کی جانب بھی اشارہ کر سکتی ہیں۔" جیکر نے کہا۔

"اگر بالٹی پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ ہوتے تو کسی اور پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔" نیل نے کہا۔

"اس کے علاوہ کوئی اور مشکوک شخص ہماری نظر میں نہیں ہے۔" جیکر نے پوچھا۔

"نہیں۔" نیل نے جواب دیا۔

"ممکن ہے کہ بعد میں ایسے کسی شخص کا نام سامنے آجائے۔" انسپکٹر نارمن بولا۔ "اس کے لیے ہمیں گیڈا کے وکیل الفرڈ اوڈی سے بات کرنی چاہیے۔"

"رہنے دو یار!" انسپکٹر نیل نے مداخلت کی۔ "وہ بے وقوف سی لڑکی ہے اور اس سے کسی ہوشیاری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

جیکر نے حیرت سے نیل کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے تصحیح کرنے دو۔ گولڈی نے اس زمانے میں میرے ساتھ کام کیا جب میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ مانتا ہوں کہ بعض اوقات وہ ایک ایسی دستی بم کی طرح نظر آتی تھی جس کی پن نکال دی گئی ہو لیکن اسے بے وقوف سمجھنا غلط ہوگا۔ وہ حساب کتاب اور کمپیوٹر پر کام کرنے میں بہت تیز ہے اور اس کی یادداشت بھی غضب کی ہے لہٰذا انسپکٹر نیل! اس جھانسے میں مت آجانا کہ وہ کوئی احمق لڑکی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہی ملزم ہے۔" انسپکٹر نیل نے کہا۔

"ممکن ہے اور نہیں بھی۔" نارمن بولا۔ "کیا تم اس کے بچپن کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" اس نے جیکر سے پوچھا۔

"نہیں۔" جیکر نے جواب دیا۔ "اس نے اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔"

☆☆☆

گولڈی چھوٹی سی کوٹھری میں بیٹھی ہوئی تھی جب انسپکٹر نارمن نے کوٹھری کا تالا کھولتے ہوئے اسے بتایا کہ اس سے ملنے کوئی آیا ہے۔ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "مجھ سے ملنے کون آسکتا ہے؟"

نارمن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا رپورٹر دوست۔“
”اسے بتا دو کہ میں اس سے نہیں ملنا چاہتی۔“
نارمن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”برائے مہربانی اس سے بات کرلو۔ تمہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس مصیبت سے نکال سکے۔ یہ تمہارے لیے آخری مگر بہترین موقع ہے۔“
گولڈی کو اس کے رویے پر خاصی حیرانی ہوئی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے اس کی اتنی فکر کیوں ہے پھر اس نے آہستہ سے انسپکٹر کا ہاتھ ہٹایا اور اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے لیکن پانچ منٹ سے زیادہ بات نہیں کروں گی۔“

☆☆☆

انسپکٹر نارمن نے گیڈا کے وکیل اینڈرڈ اوٹی سے ملاقات کی اور تمام تفصیلات اپنے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرلیں۔ جیسے ہی وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا تو جیکر اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جیکر نے اس کے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اوٹی سے کیا معلومات حاصل ہوئیں؟“
”یہی کہ تمہاری دوست کو ورثے میں بیس ارب کرونے ملیں گے۔ دو ایسے افراد اور بھی ہیں جنہیں گیڈا کی موت سے فائدہ پہنچا ہے۔“
جیکر نے اپنی نوٹ بک کھولی اور بولا۔ ”ان کے نام بتاؤ۔“
”سچ پوچھو تو اصل وارث ایک ہی ہے۔“ نیل بولا۔
نارمن نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ”وہ اکیلی وارث نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پولسن کو بھی پانچ ارب ملیں گے۔“
”کیا واقعی؟“ جیکر حیران ہوتے ہوئے بولا۔
انسپکٹر نارمن نے اس کی حیرانی کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ”میں نے اپنی فہرست میں جان ہیکسن کا نام بھی شامل کرلیا ہے۔ وہ گیڈا کا چھوٹا پارٹنر تھا۔ معاہدے کے مطابق گیڈا کا سارا کاروبار اس کی موت کے بعد ہیکسن کے پاس چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ اس نے گیڈا کے وکیل سے شکایت کی ہے کہ پچیس فیصد کا حصے دار ہونے کے باوجود اسے جائداد میں سے کچھ نہیں ملا۔“
جیکر نے یہ تینوں نام اپنی نوٹ بک میں لکھنے کے بعد ان میں ایک کا اضافہ اور کردیا اور اب یہ ترتیب اس طرح ہوگئی۔ گولڈی، پولسن، ہیکسن اور اوٹی۔ جیکر نے نارمن کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر میں ان مشتبہ افراد کے ساتھ ساتھ اوٹی سے بھی تھوڑی سی گفتگو کرلوں؟“
”بالکل، تم ایسا کرسکتے ہو۔“ نارمن نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نیل نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“

☆☆☆

دوسرے روز صبح گیارہ بجے جیکر، وکیل اوٹی کے دفتر پہنچ گیا۔ دراز قامت وکیل نے اس کا استقبال کیا۔
”شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ میں نے متعلقہ حکام کو تمام معلومات فراہم کردی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے وہی کافی ہوں گی۔“
جیکر نے رسماً سر ہلایا اور بولا۔ ”میں انہی معلومات کے حوالے سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے۔ بتاؤ ہم کہاں سے شروع کریں؟“
”میرا خیال ہے کہ تم نے ہی گیڈا کی وصیت لکھی ہوگی۔“ جیکر نے بات شروع کی۔
”ہاں۔“
”مجھے بتایا گیا ہے کہ اس وصیت کے مطابق گولڈی کو بیس ارب اور پولسن کو پانچ ارب کرونے ملیں گے۔“
اوٹی نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”لڑکی کو اس کے علاوہ اسکنڈے نیوین لنگرز کلب کی تاحیات رکنیت بھی مل جائے گی جبکہ غریب پولسن کے حصے میں وہی چھوٹا سا کاٹیج آئے گا جس میں وہ گزشتہ بیس سال سے رہ رہا ہے۔“
اوٹی مسکرا دیا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی وصیت کو لکھنے اور اس کے مندرجات کے بارے میں اپنے موکل سے گفتگو کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس وصیت میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ہم دونوں کے درمیان اتفاق نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اعتراض گولڈی کو دیے جانے والے حصے پر تھا۔ آخر اس لڑکی میں ایسی کیا بات ہے کہ گیڈا اسے بیس ارب کرونے اور کلب کی تاحیات رکنیت دینے پر تیار ہوگیا۔ مجھے تو یہ سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔ پولسن کو کاٹیج دینے کی تجویز میری ہی تھی۔“
”لگتا ہے کہ تم نے ایک ہوشیار وکیل کی طرح اپنا فرض ادا کیا۔“
یہ سن کر اوٹی کے چہرے پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیکر نے پوچھا کہ گیڈا کے باقی ماندہ اثاثوں کا کیا ہوگا؟“
”وہ سب فلاحی اداروں کو دے دیے جائیں گے۔ ان کی مالیت بھی بیس ارب کے قریب ہے۔“
”وہ یقیناً فیاض شخص تھا۔“ جیکر نے کہا۔ ”اب ہم دوبارہ گولڈی اور پولسن کی طرف آتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ قتل ان میں سے کسی نے کیا ہوگا؟“

”یقیناً نہیں۔“ اوٹی نے کہا۔ ”پولسن اپنے مالک سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے کبھی بھی پیسوں کی طلب نہیں رہی۔“
”گولڈی سے اس کے کیسے تعلقات تھے؟“
”صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“
”کیا گیڈا، اس لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا؟“
”نہیں، البتہ مچھلی کے شکار میں ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔“
”کیا پولسن کو اس لڑکی سے حسد یا رقابت تو محسوس نہیں ہوتی تھی؟“
”مجھے اس پر یقین نہیں ہے۔“
”گویا تمہارے خیال میں گولڈی نے ہی یہ قتل کیا ہوگا؟“
”میں اس سلسلے میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“
”تمہیں یقین ہے کہ وہاں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا؟“ جیکر نے پوچھا۔ ”گیڈا کے بزنس پارٹنر کے بارے میں کیا کہو گے؟“
”مجھے لگتا ہے کہ تم گولڈی کو بچانے کے لیے تنکے کا سہارا لے رہے ہو۔ ہیکسن بذاتِ خود بہت امیر ہے اور دوسری بات یہ کہ جب گیڈا کا قتل ہوا تو اس کا پارٹنر اس وقت فن لینڈ میں تھا۔ میں نے ہی اسے یہ افسوس ناک خبر سنائی تھی۔“
”ایک سوال اور.....“ جیکر نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے پاس گن ہے؟“
اوٹی اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”ہاں، میرے پاس ایک پستول تھا جو دو سال قبل چوری ہوگیا۔ میں نے اس کی رپورٹ درج کروا دی تھی۔“
”اس کے بدلے تم نے دوسرا ہتھیار حاصل نہیں کیا؟“
”مجھے تشدد سے نفرت ہے۔ میں نے کبھی مچھلی کا شکار نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ میں بہت زیادہ ڈسپلن ہے۔“ اس کے بعد جیکر نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا اور اوٹی کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

☆☆☆

جیکر کی اگلی منزل وہ کاٹیج تھی جہاں پولسن رہتا تھا۔ اس نے کاٹیج کے سامنے اپنی گاڑی کھڑی کی۔ پولسن راہداری میں کھڑا شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کاٹیج کے چھوٹے سے لیونگ روم میں آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے پولسن نے دو پیالیوں میں کافی بنائی اور ایک کپ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔
”تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ میرے لیے بہت ہی ناخوشگوار اور مشکل گفتگو ہوگی۔“
”ہاں، مجھے اندازہ ہے۔“ جیکر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے اس صبح کے بارے میں بتا سکتے ہو جب تم نے گیڈا کی لاش دیکھی؟“
”میں وقت کا بہت پابند ہوں اور اتوار کے علاوہ روزانہ صبح آٹھ بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتا ہوں کیونکہ اس وقت مجھے گیڈا کو ناشتا دینا ہوتا تھا۔ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں ہوئی۔ گیڈا کہا کرتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اپنی گھڑی ملاتا ہے۔ اس روز جب میں وہاں پہنچا تو مجھے لگا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ گیڈا مجھے کہیں نظر نہیں آیا، میں نے اسے کئی آوازیں دیں اور پورے گھر میں تلاش کرنے کے بعد باہر باغ میں آیا۔ تب میں نے اسے گلابوں کے تختے کے پاس دیکھا۔ اسے گلابوں سے بڑی محبت تھی۔“
یہ کہتے ہوئے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی ناک صاف کی اور بولا۔ ”وہ خون میں لت پت منہ کے بل اوندھا پڑا ہوا تھا۔“
”میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ سب بیان کرنا بہت مشکل ہوگا لیکن اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے یہ پوچھ گچھ ضروری ہے۔ کیا وہ عام طور پر تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی جاگ جاتا تھا؟“
”ہاں، اسے صبح سویرے اٹھنے کی عادت تھی۔ اگر وہ مچھلیاں پکڑنے نہیں جاتا تو وہ کتابیں پڑھتا اور کافی پیتا رہتا تھا یا پھر باغ میں کام کرتا رہتا۔“
”تمہارے علاوہ اور کون اس کے معمولات سے واقف تھا؟“
”وہ سب لوگ جو اس سے قریب تھے۔“ پولسن نے کہا۔ ”ان میں گولڈی، ہیکسن اور اوٹی شامل ہیں۔ تم چاہو تو اس فہرست میں مجھے بھی شمار کرسکتے ہو۔“ پولسن کے انداز میں فخر جھلک رہا تھا۔
”اس کے علاوہ بھی تو کوئی ہوگا؟“
”میرا خیال ہے کہ نہیں۔ گیڈا صرف قریبی لوگوں سے ہی گھل مل جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے خاندان کی طرح تھے۔“
جیکر چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”جب تم نے گیڈا کی لاش دیکھی تو تمہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہوئی۔ کیا تمہیں وہاں کسی جدوجہد کے آثار نظر آئے؟“
پولسن نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی البتہ یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی.....“
جیکر نے اس کی بات کاٹ دی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا اشارہ اس بالٹی کی طرف ہے جو لاش کے پاس رکھی ہوئی

تھی۔ اس میں تمہیں ایسی کیا خاص بات نظر آئی؟"
پولسن نے کندھے اچکائے اور خلا میں دیکھنے لگا۔
"کیا گیڈا کو کیڑے پکڑنے کا بھی شوق تھا؟"
"شاید میں اس سوال کا جواب نہ دے سکوں۔"
"لیکن تم اس بارے میں جانتے تو ہو گے؟"
"وہ گیڈا کی نہیں بلکہ گولڈی کی بالتی تھی۔" پولسن بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"
"کیا وہ بھی تمہاری طرح باقاعدگی سے آتی تھی؟"
"ہاں لیکن وہ شاید ہی کبھی دس بجے سے پہلے آئی ہو۔"
"کیا تم نے اس روز گولی چلنے کی آواز سنی تھی؟"
"میرا کاٹیج اس کے گھر سے ایک ہزار میٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں نے جو آواز سنی وہ بیک فائر بھی ہو سکتا ہے۔"
"بیک فائر۔"
"ہاں، گولڈی کبھی کبھی موٹر سائیکل کے بجائے اپنی پرانی واکس ویگن میں آیا کرتی ہے۔ جس کے انجن سے ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اس لیے میں یہی سمجھا کہ گولڈی کسی وجہ سے جلدی آگئی ہے۔"
"ہونہہ۔" جیگر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "جب تم نے گیڈا کی لاش دیکھی تو وہ وہاں آچکی تھی؟"
"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"
"اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ تم گولی کی آواز اور پٹاخے میں فرق محسوس نہیں کر سکتے۔"
"شاید نہیں۔" پولسن ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اس ملک میں صرف امیر لوگ ہی شکار کر سکتے ہیں۔"
"میں سمجھتا ہوں۔" جیگر نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ گیڈا اور گولڈی کے درمیان کیسے تعلقات تھے؟"
"وہ اس کے مالی معاملات دیکھتی اور کمپیوٹر کا سارا کام کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ دونوں بہت سا وقت ایک ساتھ مچھلیاں پکڑنے میں گزارتے تھے۔"
"میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ان دونوں کے درمیان کوئی رومانی تعلق تھا؟"
پولسن اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا پھر بولا۔ "یہ سوال تمہیں گولڈی سے کرنا چاہیے۔ میں گیڈا کا بٹلر تھا، کوئی نجومی نہیں جو اس کے دل کا حال جان سکوں۔"
"ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ۔" جیگر نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "صرف دو سوال اور کروں گا۔ کیا تم جانتے تھے کہ گیڈا نے اپنی وصیت میں تمہارا حصہ رکھا ہے؟"
پولسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"کیا گیڈا نے یہ بات تمہیں خود بتائی تھی؟"
"نہیں بلکہ مجھے وکیل سے معلوم ہوا تھا۔" اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ "اس نے بتایا تھا کہ گولڈی کو بھی وصیت میں حصہ دیا گیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"
جیگر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"بیس ارب۔"
جیگر نے ایک بار پھر سر ہلا دیا اور بولا۔ "یہ بات تمہیں اوٹی نے کب بتائی؟ گیڈا کے قتل سے پہلے یا بعد میں؟"
پولسن نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا اور آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "یہ گزشتہ موسم بہار کی بات ہے۔"
"کیا کچھ اندازہ ہے کہ اس نے تمہیں یہ بات کیوں بتائی؟"
"میرا خیال ہے کہ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ گیڈا نے اس کے مشورے پر عمل نہیں کیا اور وہ گولڈی کو دی جانے والی رقم پر بھی خوش نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ بات بھی پریشان کر رہی تھی کہ وصیت کے مطابق گولڈی کو کلب کی رکنیت مل جائے گی۔"
"گولڈی کو دیے جانے والے حصے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"
"تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے۔ میری بائیس سال کی خدمات کے مقابلے میں اس کی ملازمت صرف تین سال کی ہے اور اسے میرے مقابلے میں چار گنا حصہ دیا گیا ہے۔ کیا یہ زیادتی نہیں ہے؟"
"اس سے کئی سوال جنم لیتے ہیں جن کا جواب تلاش کرنا ضروری ہے۔" جیگر نے کہا اور اسے خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔
جب وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا تو پولسن نے اسے آواز دے کر روک لیا اور بولا۔ "میں نے ٹیلی وژن پر انسپکٹر وینڈر کا انٹرویو دیکھا تھا اور قتل کا محرک میری سمجھ میں آگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیس ارب کی رقم کسی بھی شخص کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہے۔"
جیگر اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ پانچ ارب کرونے بھی سات سو پچاس ملین امریکی ڈالر کے برابر ہوتے ہیں اور وہ دس مرتبہ جنم لے کر بھی اتنے پیسے نہیں کما سکتا لیکن وہ خاموش رہا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا لیکن اس نے پولسن کو دل ہی دل میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم جیسے دوستوں کے ہوتے ہوئے گولڈی کے پاس کوئی موقع نہیں تھا۔"

☆☆☆

گیڈا کے پارٹنر جان ہیکسن سے اس کی ملاقات اپنے میگزین کے دفتر میں صبح ساڑھے آٹھ بجے طے تھی۔ اس لیے وہ اور اینکا آٹھ بجے ہی دفتر پہنچ گئے تاکہ اس کے آنے سے پہلے

کافی کی ایک پیالی لے سکیں۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ایک ایتھلیٹ نما شخص دروازے پر نمودار ہوا۔
"میرا نام ہیکسن ہے، کیا تم ہی جیگر ہو؟"
اسے دیکھ کر اینکا اپنا اسکرٹ درست کرتے ہوئے اٹھی اور اپنا تعارف ایڈیٹر کے طور پر کروایا۔ ہیکسن نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "تمہارے جیسی جوان عمر عورت کے لیے یہ ایک بڑا کام ہے۔"
اینکا کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہیکسن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے لیے کافی بنانے لگی۔
"میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر کام کی بات شروع کر دینی چاہیے۔" جیگر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تمہیں گیڈا کی موت کی خبر کس طرح ملی؟"
"مجھے اوٹی نے فون کر کے بتایا تھا۔"
"جب اس کا فون آیا تو تم اس وقت کہاں تھے؟"
"میں فریڈ نے مجھے دوپہر میں فون کیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے ہیلسنکی آیا ہوا تھا۔ میں اسی روز سہ پہر کو اسٹاک ہوم واپس آگیا۔" اس نے کافی کی پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "وہاں اس روز یہی کچھ ہوا تھا۔"
"تم کتنا عرصہ ہیلسنکی میں رہے؟"
"صرف ایک رات، مجھے کاروباری سلسلے میں وہاں جانا پڑا تھا۔"
"وہاں تمہارا قیام کہاں تھا؟"
ہیکسن جھنجلاتے ہوئے بولا۔ "وہیں جہاں ہمیشہ ٹھہرتا ہوں۔ ہوٹل کیمپ، تمہیں بھی وہاں جانا چاہیے۔ بڑی عمدہ جگہ ہے لیکن شاید ایک صحافی کے لیے مہنگی ہو۔"
جیگر کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولا۔ "بظاہر تم اسپورٹس مین نظر آتے ہو، کیا تمہیں بھی مچھلی کے شکار کا شوق ہے؟"
"اوٹی نے کئی مرتبہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن شاید مجھ میں اتنا صبر نہیں۔ میں چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہوں، ان کے نزدیک آنے کا انتظار نہیں کرتا۔"
"گویا تم شکاری ہو؟"
"ہاں، یہ میرا شوق ہے۔" ہیکسن نے کہا۔ "لیکن میں جنگلی جانوروں کا شکار کرتا ہوں۔"
"تمہارے پاس بندوق بھی ہو گی؟"
"بالکل۔"
"کون کون سے ہتھیار ہیں۔ پستول، رائفل یا شاٹ گن؟"
ہیکسن نے اسے بیزاری سے دیکھا اور بولا۔ "اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں کسی بھی طرح گیڈا کے قتل میں ملوث ہوں تو تم محض اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، اس کے لیے انگریزی میں غلط درخت پر بھونکنے کی مثال دی جاتی ہے۔"
"وہ صحیح درخت بھی ہو سکتا ہے۔" جیگر نے اطمینان سے کہا۔ "تم بھی ان لوگوں کی صف میں شامل ہو جنہیں گیڈا کی موت سے فائدہ ہو سکتا ہے۔"
ہیکسن اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گیا اور بولا۔ "وہ میرا تیس سال سے کاروباری پارٹنر تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان بہت اچھی دوستی تھی۔ معاہدے کے تحت اس کے مرنے کے بعد یہ سارا کاروبار مجھے مل جاتا پھر مجھے یہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟"
"لالچ۔"
"شیکسپیئر کی زبان سے یہ لفظ بہت اچھا لگتا لیکن بدقسمتی سے تم وہ نہیں ہو۔ میرے نزدیک یہ ایک بے ہودہ الزام ہے۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں ہم نے کافی دیر یہ گیم کھیل لیا۔ میرا مشورہ ہے کہ زیادہ وقت اپنی خوب صورت ایڈیٹر کے ساتھ گزارو اور پولیس کا کام ان پر چھوڑ دو۔"
"میں اینکا کے ساتھ کیا کرتا ہوں، اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"
وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔ اینکا بھی اسے رخصت کرنے کے لیے اس کے پیچھے گئی۔ واپس آ کر اس نے جیگر سے پوچھا۔ "کئی خاص بات معلوم ہوئی؟"
جیگر سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے بولا۔ "گولڈی، پولسن اور تمہارا دوست ہیکسن، ان سب کو ہی گیڈا کی موت سے بہت فائدہ ہوا ہے اگر ایک طرف گولڈی اور پولسن کو بھاری نقد رقم ملے گی تو دوسری جانب ہیکسن سارے کاروبار کا مالک بن جائے گا کیونکہ گیڈا نے اسے اپنا کاروباری وارث مقرر کیا تھا لیکن اس نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ظاہر کر دی ہے۔ جس روز گیڈا کا قتل ہوا، ہیلسنکی میں تھا۔ پولسن کے پاس جائے واردات سے غیر موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں اور گولڈی کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس بھی اس حوالے سے ایک اچھی کہانی ہو گی ورنہ اس کے لیے مزید مشکل پیدا ہو جائے گی۔"
اینکا قریب آئی اور اس کی کرسی کے دستے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نے اس ہوٹل کا نام پوچھا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔"
جیگر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہوٹل کیمپ۔"
اینکا نے اپنا فون اٹھایا اور ہوٹل کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولی۔ "میں اسٹاک ہوم سے ہیکسن کی سیکریٹری بول رہی ہوں۔

مجھے دراصل ماہانہ اخراجات کی رپورٹ بنانی ہے لیکن شاید میں ہوٹل کی رسیدیں کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں اور میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ انہیں تلاش کروں۔ کیا مجھے ہوٹل کے اخراجات کے بارے میں تفصیل مل سکتی ہے؟"

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا تو اس نے جیکر کی طرف دیکھا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ "جمعرات تین جولائی۔"

اس نے فون پر یہ اطلاع آگے بڑھا دی۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا پھر انیکا چونکنے کے انداز میں بولی۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟"

دوسری طرف سے جواب میں جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے جیکر سے کہا۔ "ہیکسن جھوٹ بول رہا ہے۔ ہوٹل کے ریکارڈ کے مطابق اس مہینے میں وہ ایک دن کے لیے بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔"

"ہونہہ۔" جیکر نے ہنکارا بھرا اور بولا۔ "اس طرح تو گیڈا کے قتل کے سلسلے میں ہیکسن سب سے زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔"

☆☆☆

گولڈی نے مضطرب انداز میں اپنی مٹھیاں بھینچیں اور جنگلے کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے جیکر سے بولی۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

"کیا تم میرے کچھ سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گی؟"

"اس کا انحصار سوالات کی نوعیت پر ہے۔"

"تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو؟"

"تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ ایک دفعہ یہ کوشش کر چکی ہوں۔ دیکھ لو۔ میرا کیا حال ہو گیا۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔" جیکر نے اسے یقین دلانے کی کوشش اور نوٹ بک کھولتے ہوئے بولا۔ "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ جب گیڈا کا قتل ہوا، اس وقت تم کہاں تھیں؟"

"میں اس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ مجھے انسپکٹر نارمن نے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی۔"

"کیا اس وقت تمہارے ساتھ اپارٹمنٹ میں کوئی اور بھی تھا؟"

"نہیں۔"

"کیا کوئی شخص یہ گواہی دے سکتا ہے کہ اس وقت تم اپنے اپارٹمنٹ میں ہی تھیں؟"

"نہیں، سوائے ان لڑکوں کے جنھوں نے اپارٹمنٹ کے باہر مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ کتنے بجے کی بات ہے؟"

"یہ تم نارمن سے بھی پوچھ سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت پونے دس بج رہے تھے۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق گیڈا کا قتل صبح چھ اور سات بجے کے درمیان ہوا۔ اس طرح تمہیں اپنے اپارٹمنٹ جانے اور واپس آنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔"

گولڈی نے حیران ہوتے ہوئے جیکر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا تم بھی اس طرح سوچ رہے ہو؟"

"میری بات چھوڑو۔" جیکر بولا۔ "زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ پولیس کیا سوچ رہی ہے جیکر، پولسن اور ووٹی کا بھی یہی خیال ہے کہ تم نے ہی گیڈا کو قتل کیا ہے۔"

"گویا جب تک بے گناہ ثابت نہ ہو جاؤں، مجھے مجرم ہی سمجھا جائے گا۔"

"شاید ہاں یا شاید نہیں۔" جیکر اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے بولا۔ "اس بالٹی کے بارے میں کیا کہو گی جس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں؟"

"وہ کیڑے میں نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جمع کیے تھے۔ انہیں کانٹے میں پھنسا کر شکار کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔"

"کیا تمہیں گیڈا کی وصیت کے بارے میں معلوم تھا؟"

"ہاں، اس نے خود مجھے بتایا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"تقریباً ایک سال ہو گیا۔"

"کیا اس نے تمہارے حصے کے بارے میں بھی بتایا تھا؟"

"نہیں، صرف یہ کہا تھا کہ میرے لیے وہ رقم ضرورت سے زیادہ کافی ہوگی۔ بعد میں اوٹی نے بتایا کہ میرا حصہ تقریباً بیس ارب کرونے ہے۔"

"اس گفتگو کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم یہ ثابت نہیں کر سکتیں کہ جس وقت گیڈا قتل ہوا، تم اپنے اپارٹمنٹ میں تھیں اور دوسری بات یہ کہ تمہیں وصیت کے بارے میں بھی علم ہو گیا تھا جس کے مطابق گیڈا کی موت کے بعد تمہیں ایک بڑی رقم ملنے والی تھی، یہ دونوں باتیں تمہارے خلاف جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لاش کے پاس بالٹی کی موجودگی بھی تمہارے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہے اور اس سے تمہاری بے گناہی مشکوک ہو رہی ہے۔"

"میں بے ایمان ہوں اور اپنے بارے میں کیا کہوں گی۔ تم نے انیکا کے بارے میں مجھ سے جھوٹ بولا اور میں سمجھی کہ تم

نے اس سے تعلق ختم کر لیا ہے لیکن تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ میرا کوئی گھر نہیں تھا۔ پاپا گیڈا نے مجھے پناہ دی لیکن اب ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔"

"ان آنسوؤں کو بعد کے لیے بچا کر رکھو۔" جیکر طنز آمیز انداز میں بولا۔ "اس وقت ہمیں اس سے زیادہ اہم مسئلے پر سوچنا ہے جب تک اہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے، تم پر یہ الزام رہے گا لہٰذا سوچو کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

"ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص جسے وصیت میں حصہ نہ ملا ہو۔"

"شاید۔" جیکر نے اپنا سر گھماتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ البتہ میں نے ہیکسن کا ایک جھوٹ پکڑا ہے جو بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ممکن ہے۔" گولڈی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "شاید اس کا خیال ہو کہ میرے گیڈا سے ناجائز تعلقات ہوں اور جب میں نے اسے منہ نہیں لگایا تو وہ مجھ سے حسد کرنے لگا ہو اور جوش میں آکر اس سے یہ جرم سرزد ہو گیا ہو۔ اس طرح اس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہو۔"

"ممکن ہے۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔" گولڈی بولی۔ "کیا تم اب بھی انیکا سے ملتے ہو؟"

جیکر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

بالآخر گولڈی پر گیڈا کے قتل کے الزام میں باقاعدہ فرد جرم عائد کر دی گئی اور انسپکٹر نارمن کو حکم دیا گیا کہ ہفتے کے روز اسے جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ نارمن خوش تھا کہ اس ذمے داری سے اس کی جان چھوٹ جائے گی لیکن اس کیس کے حوالے سے کوئی بات اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا کافی کا دوسرا کپ پی رہا تھا جب انسپکٹر نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ نارمن نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ جانے کے لیے تیار ہے تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے ابھی ابھی ایک خبر سنی ہے۔"

نارمن سمجھ گیا کہ وہ کوئی فضول بات شروع کرنے والا ہے۔ اس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تمہاری خبر بعد میں سناؤں گا، پہلے اس لڑکی کو لے جانے کا انتظام کرو۔"

☆☆☆

گولڈی نے کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو فوراً ہی چوکنا ہو گئی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

انسپکٹر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں دوسری جیل میں بھیجا جا رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پیٹی سے بندھی ہتھکڑیاں کھول لیں۔

گولڈی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور جیسے ہی وہ اس کے نزدیک آیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب لپکی اور اس کی گردن پر چاقو رکھ دیا جو وہ اپنی آستین میں چھپائے ہوئے تھی پھر اس نے بڑی پھرتی سے اس کے ہولسٹر سے پستول نکالا اور بولی۔ "تم بہت چہکا کرتے تھے۔ امید ہے کہ اب تمہاری آواز بند ہو جائے گی۔"

نیل کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ حیرانی سے گولڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب تم اپنے کپڑے اتارو گے۔"

"کیا؟" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"یونیفارم، جوتے، موزے، سب کچھ، جلدی کرو۔"

گولڈی نے اس پر پستول تان لیا۔

نیل کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی وردی اتار کر فرش پر رکھ دی۔ اب اس کے جسم پر بنیان اور انڈرویئر کے سوا کچھ نہ تھا۔

"اب تم دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس نے جیل کے کپڑے اتارے اور نیل کا یونیفارم پہن کر بولی۔ "اب یہ لباس تم پہنو گے۔ میں بھی دیکھوں کہ جیل کے کپڑوں میں تم کیسے لگتے ہو۔"

جب وہ لباس تبدیل کر چکا تو گولڈی نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور بولی۔ "اگر تم نے مزید پانچ منٹ اپنا منہ بند رکھا تو میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ دوسری صورت میں جو کچھ ہوگا۔ اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

وہ کوٹھری سے باہر آگئی اور اس نے دروازے میں تالا ڈال دیا پھر وہ جان بوجھ کر نارمن کے دفتر کے سامنے سے گزری جو کسی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "لڑکی کو لے آئے؟"

گولڈی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور اس کی طرف پستول کی نال کا رخ کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں وہ مجھ پر حملہ نہ کر دے۔"

"کیا؟" نارمن کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے نارمن کو غیر مسلح کیا۔ اس کا موبائل فون، ڈیجیٹل ریڈیو، چھڑی، چابیاں اور دیگر تمام اشیا اپنے قبضے میں لے کر اسے بھی ہتھکڑی پہنا دی اور اسے بھی لے جا کر نیل کے ساتھ کوٹھری میں بند کر دیا اور ان سے بولی۔

"میری بات غور سے سنو۔ تم نے مجھ پر غلط الزام لگایا

ہے اور اب میں اسے غلط ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گی۔" یہ کہہ کر اس نے کوٹھری کے دروازے میں تالا لگایا اور لوہے کے اس مضبوط دروازے کی جانب بڑھی جسے باہر سے چٹخنی لگا دینے کے بعد نارمن اور نیل کا رابطہ باہر کی دنیا سے منقطع ہو جاتا۔

"میں شام کو یہ جاننے کے لیے فون کروں گی کہ کسی نے تمہیں رات کے کھانے کے لیے باہر نکالا یا نہیں۔" وہ دروازے پر پہنچ کر مڑی اور بولی۔ "میرا سامان کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"میری میز کی برابر والی الماری میں۔" نیل نے کہا۔

"تمہارا شکریہ انسپکٹر، اپنا خیال رکھنا۔" اس نے بھاری دروازے کو باہر سے چٹخنی لگائی اور آگے بڑھ گئی۔ نارمن کے دفتر میں پہنچ کر اس نے نیل کی میز کی دراز سے چابیاں نکالیں۔ الماری میں اس کا شولڈر بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سامان چیک کرنے کے لیے بیگ کھولا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔

اس نے چابیاں واپس اسی جگہ رکھ دیں اور اس کی کار کی چابیاں اٹھا لیں پھر اس نے اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھایا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ پارکنگ تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ وہ نیل کی کار کی جانب بڑھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی ہیڈ کوارٹر کے احاطے سے باہر آ گئی۔ اب وہ سیاٹل کی طرف جانے والی سڑک پر سفر کر رہی تھی۔

اس سے آگے ایک سیڈان اسپورٹس کار تھی جس کی بریک لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ گولڈی نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور کار کی چھت پر لگی ہوئی سرخ بتی جلا دی۔ اس کے ساتھ ہی سائرن بھی بجنے لگا۔ آگے والی گاڑی کچھ دور جا کر رک گئی۔ گولڈی کار سے باہر آئی اور اپنا ہیٹ آگے کی طرف جھکاتے ہوئے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ ڈرائیور نے پوچھ لیا کہ کیا مسئلہ ہے؟ گولڈی نے اسے بتایا کہ اس کی گاڑی کی بریک لائٹ کام نہیں کر رہی۔ اس نے ڈرائیور سے لائسنس اور گاڑی کے کاغذات مانگے چلانے والی کا نام مس مارگریٹ، عمر بائیس سال، قد پانچ فٹ گیارہ انچ، یہ سب کوائف اس سے ملتے جلتے تھے۔ اس نے کاغذات عورت کو واپس کیے اور بولی۔ "میں تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں، ضرور۔" وہ عورت خندہ پیشانی سے بولی اور پسنجر سیٹ سے اپنی چیزیں اٹھا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیں تاکہ گولڈی وہاں بیٹھ سکے۔ گولڈی نے بیٹھتے ہی ہاتھ بڑھا کر اگنیشن سے چابی نکال لی اور بولی۔ "تمہارے لیے میرے پاس اچھی اور بری دونوں طرح کی خبریں ہیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔" وہ عورت ہکلاتے ہوئے بولی۔

"اچھی خبر یہ کہ تمہاری گاڑی کی بریک لائٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ اس کے باوجود تمہارا چالان نہیں ہوگا اور بری خبر یہ کہ میں جیل سے فرار ہو کر آئی ہوں۔ یہ وردی اور پولیس کار دونوں چوری کی ہیں۔"

اس عورت نے مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل پکڑ لیا اور اس کے بیچ پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

"تم انسپکٹر نیل نہیں ہو؟"

"نہیں لیکن میں مسلح ہونے کے باوجود تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی اس لیے پُرسکون ہو جاؤ۔" اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو پیپر میں سے ایک اس کی طرف بڑھایا اور بولی۔ "اگر تم مجھ سے تعاون کرو گی تو تمہیں کبھی اس پر افسوس نہیں ہوگا۔ مجھ پر گیڈا کو قتل کرنے کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا ہے جبکہ میں نے اسے قتل نہیں کیا وہ میرے لیے باپ جیسا تھا لیکن کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔"

وہ عورت ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں کس طرح یقین کروں کہ تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"تمہیں یہ شک کیسے ہوا کہ میں جھوٹ بول سکتی ہوں۔"

"میرے والد ہمیشہ کہتے ہیں کہ الفاظ سے زیادہ انسان کا عمل بولتا ہے۔"

"خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا عقل مند باپ ملا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اپنے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔

اس عورت نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے اور چلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے گولی مت مارنا، پلیز۔"

"خاموشی سے بیٹھی رہو۔" گولڈی نے کہا پھر اس نے پستول خالی کیا اور گولیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

"اب تو یقین آ جانا چاہیے کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔"

اس عورت نے حیرت سے اپنی ہتھیلی پر رکھی ہوئی گولیوں کو دیکھا پھر انہیں جلدی سے اپنے پرس میں ڈال لیا جیسے ان کے پھٹ جانے کا خطرہ ہو۔

گولڈی ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا نام گولڈی ہے۔ سب سے پہلے میں اس کار اور وردی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں پھر مجھے ایک وگ اور کپڑوں کی بھی ضرورت ہوگی اور تم میرے لیے ایک کرائے کی گاڑی کا بندوبست بھی کرو گی۔"

اس عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اگر ہم نے ہوشیاری سے کام لیا تو کسی کو بھی شک نہیں ہوگا۔ میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

وہ عورت چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "میرے والد کا ایک پرانا گودام ہے جسے کئی سالوں سے استعمال نہیں کیا گیا۔ مجھے

معلوم ہے کہ اس کی چابی کہاں رکھی ہے۔ ہم یہ کار وہاں چھپا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے یہی کام کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ انہوں نے پولیس کار اور وردی پرانے گودام میں چھپا دی اور گولڈی نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے سر پر ایک وگ سجالی۔ آنکھوں پر مصنوعی پلکیں لگائیں۔ ناک اور گلے میں پہنا ہوا مصنوعی زیور اتار دیا۔ اب وہ خاصی حد تک بدلی ہوئی عورت نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح دس بجے وہ دونوں خریداری کی غرض سے مارکیٹ گئیں تو ان کی نظر اسٹال پر رکھے اخبار پر گئی جس میں نمایاں سرخی کے ساتھ گولڈی کے فرار کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس نے اخبار کے علاوہ ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، سگریٹ کا کارٹن، انڈے، دودھ، کافی، بریڈ اور چکن سینڈوچ خریدے جن کی ادائیگی اس عورت نے کی۔ کپڑوں کی دکان سے گولڈن نے اپنے لیے جینز کی پتلونیں، جیکٹ، موزے، جوتے اور ٹی شرٹ خریدے۔ ان کی قیمت بھی اس عورت نے ہی ادا کی پھر وہ رینٹ اے کار پر گئیں۔ جہاں سے اس عورت نے اپنا شناختی کارڈ دکھا کر ایک کار کرائے پر حاصل کی۔ گولڈی نے اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اس کے پیسے واپس کر دے گی۔

گھر آنے کے بعد اس نے اخبار دیکھا جس میں تفصیل سے اس کے فرار کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس خبر میں اس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لوگوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ اس عورت سے ہوشیار رہیں کیونکہ وہ مسلح ہے اور کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ پولیس سرگرمی کے ساتھ اسے پورے ملک میں تلاش کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گزشتہ ریکارڈ کا بھی حوالہ دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق اسے بہت چھوٹی عمر میں یتیم خانے میں داخل کروا دیا گیا تھا لیکن تیرہ سال کی تھی کہ وہاں سے فرار ہو گئی۔ پھر وہ کچھ عرصہ ایک بینک میں کام کرتی رہی۔ بینک کے ترجمان کے مطابق وہ حساب کتاب اور کمپیوٹر پر کام کرنے میں بہت ہوشیار تھی اور اس کی یادداشت بھی غضب کی ہے۔ ترجمان کے مطابق گولڈی نے دوران ملازمت کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا اور نہ ہی کوئی پُرتشدد کارروائی کی حالانکہ وہ مارشل آرٹ جانتی تھی۔ 2006ء میں اس نے کچھ عرصہ ایک میگزین میں فری لانس کے طور پر کام کیا پھر گیڈا کے یہاں ملازمت اختیار کر لی جسے چار جنوری کی صبح اس کے گھر میں گولی مار دی گئی۔ پولیس کی تحقیقات کے بعد گولڈی کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گیڈا کے وکیل اور قریبی ساتھی اوٹی نے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ اگر وہ اس حلیے سے ملتی جلتی کوئی عورت دیکھیں تو فوراً پولیس کو مطلع کیا جائے۔

"تم یتیم ہو؟" اس عورت نے جس کا نام سوزن تھا، کہا۔

"ہاں۔" گولڈن بولی۔ "ماں باپ کے بعد میں اپنے بھائی سے بھی بچھڑ گئی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟"

☆☆☆

جیکر نے جب ٹی وی پر گولڈی کے کارنامے کی تفصیل سنی تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور وہ بے اختیار بول اٹھا۔ "گولڈی پلیز! کہہ دو کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔" لیکن جب ٹی وی پر گولڈی کی تصویر دکھائی تو اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ ہیکسن سے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر وہ بالآخر اسے قاتل ثابت کر سکتا تھا لیکن اب اس کا یقین متزلزل ہو گیا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ گولڈی کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، کیا وہی سچ ہے ورنہ وہ جیل سے فرار کیوں ہوتی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ گولڈی سے محبت کرتا تھا لیکن انیکا کے درمیان میں آ جانے سے ان کے بیچ تعلق ٹوٹ گیا۔ اب جبکہ وہ ایک بار پھر اسے اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا تو گولڈی نے جیل سے فرار ہو کر اپنی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔

☆☆☆

انسپکٹر نے جب اخبار میں گولڈی کے بارے میں پڑھا تو اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ اور اس کی بہن 1985ء میں اس یتیم خانے میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت وہ چار سال اور اس کی بہن دو سال کی تھی۔ چند روز بعد ہی نارمن کو ایک خاندان نے گود لے لیا اور پھر اس نے اپنی بہن کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر لی۔ کہیں گولڈی ہی اس کی بہن تو نہیں۔

اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ تعاقب کے دوران اگر اس نے پولیس سے محاذ آرائی کی کوشش کی تو جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھ سکتی ہے۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اس کی بہن ہے تو اس کے لیے بھی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ انسپکٹر نے ہی اپنی بہن کو فرار ہونے میں مدد دی اور پھر اس کے خلاف محکمانہ کارروائی ہونا دور کی بات نہیں لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

جب گولڈی کو یقین ہو گیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے بیس ہزار کرونے اور ایک خط کچن کی میز پر رکھ دیا جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اس کی بقیہ رقم بہت جلد لوٹا دے گی پھر اس نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس کا رخ بندرگاہ کی جانب تھا۔ وہاں سے وہ شمال مغرب کی طرف مڑ گئی اور دریا کا پل پار کر کے روٹ 84 کے سنگم

پر رک گئی۔ وہ کار سے باہر آئی اور کچھ دیر پل پر کھڑے ہو کر دریا کی موجوں کا نظارہ کرنے لگی۔ اس نے ایک سگریٹ جلایا اور کچھ سوچنے کے بعد دوبارہ کار میں سوار ہو گئی۔ اب اس کی منزل وہ کاٹیج تھا جہاں اس نے پاپا گیڈا کے ساتھ مچھلی کے شکار کے سلسلے میں کئی مرتبہ قیام کیا تھا۔ کبھی کبھی اوٹی بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اس کاٹیج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور جب تک وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دیتی، یہ کاٹیج اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

جیکر نے کافی کا پہلا کپ حلق میں اتارا اور اپنے پرانے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ای میل چیک کی اور گولڈی کا پیغام پڑھ کر حیران رہ گیا جو اس سے ہیکسن کا ای میل ایڈریس مانگ رہی تھی۔ اس نے ایڈریس سے اس کا پتا نوٹ کیا اور ای میل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک تو ہو۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس کا جواب آ گیا۔ ”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“

”اس کا مطلب تھا کہ اس نے قتل نہیں کیا اور اسے بھی ہیکسن پر ہی شبہ ہے۔“ جیکر بلند آواز میں بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ وہ گھاس میں سے سانپ تلاش کرے گی۔ خدا کرے وہ کامیاب ہو جائے۔“

☆☆☆

گولڈی نے لیپ ٹاپ اپنے گھٹنوں پر رکھا اور ایک فرضی شناخت کے سہارے ہیکسن کے ای میل باکس میں گھس گئی۔ اسے اس کام میں مہارت تھی اس نے یکم جولائی کے بعد سے اس کی ڈاک کھنگالنا شروع کر دی۔ 3 جولائی کا ایک پیغام پڑھ کر وہ چونک گئی جو کسی ویلینا نامی عورت کے نام تھا۔ ”شیرٹن، کمرا نمبر چار سو گیارہ وہی سیاہ لباس پہن کر آنا جس میں تم پہلی بار ملی تھیں۔“

چار جولائی کو اس نے ویلینا کو ایک اور پیغام بھیجا۔ ”سہ پہر کو ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اوٹی نے ابھی فون کر کے مجھے بتایا ہے کہ آج صبح گیڈا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں نے اس سے جھوٹ بول دیا کہ ہیلسنکی میں ہوں اور فوراً ہی واپس آ رہا ہوں مجھے اس خبر پر یقین نہیں آیا۔ گیڈا صرف بزنس پارٹنر ہی نہیں بلکہ وفادار دوست بھی تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے بغیر کیا کروں گا، میں بہت اداس ہوں۔ براہ کرم اس کے لیے دعا کرنا۔“

گیارہ جولائی کا پیغام انگلانیکا کے نام تھا۔ ”میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا، کیا ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”بالکل، آج شام میں فارغ ہوں۔ سات بجے کیفے ہیڈن میں ملو۔“

گولڈی نے شیرٹن فون کر کے تصدیق کر لی کہ ہیکسن نے تین جولائی کو وہاں رات گزاری تھی پھر ای میل کے ذریعے جیکر کو بتا دیا کہ وہ وقوعہ والے روز ہیلسنکی میں نہیں بلکہ ہوٹل شیرٹن میں کسی سیاہ لباس والی عورت کے ساتھ تھا اور اس کے ای میل ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔

”پھر تو پوسن ہی باقی بچتا ہے۔“ جیکر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کچھ؟“ جیکر نے اپنے پیغام میں پوچھا۔

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انیکا، ہیکسن کے ساتھ بھی رات گزار چکی ہے۔ تمہیں دکھ تو ہو گا لیکن بتانا بھی ضروری ہے۔“

کمپیوٹر بند کرنے کے بعد گولڈی کا دل چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ کئی ہفتوں بعد اسے یہ اطمینان نصیب ہوا تھا۔

☆☆☆

گولڈی کے خیال میں پوسن پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ بے ضرر انسان تھا اور شاید اس نے زندگی میں کسی ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جب وہ سوچتے سوچتے تھک گئی تو اس نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان اٹھایا اور دریا کے کنارے چل دی۔ اس کا ارادہ ٹراؤٹ مچھلی پکڑنے کا تھا۔ وہ کافی دیر تک کوشش کرتی رہی لیکن کوئی بڑی ٹراؤٹ اس کے کانٹے میں نہیں پھنسی۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ ڈوری لپیٹنا شروع کی۔ مچھلی بہت وزنی معلوم ہو رہی تھی لیکن جب وہ اوپر آئی تو معلوم ہوا کہ وہ مچھلی نہیں بلکہ وہ ایک پستول تھا۔ اس نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور کاٹیج کی طرف دوڑ لگا دی۔

جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے احتیاط سے وہ پستول ایک تولیا پر رکھا اور کمپیوٹر پر بیٹھ گئی۔ اس نے پستول کا ماڈل اور سیریل نمبر فیڈ کیا لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ پھر اس نے گمشدہ ہتھیاروں کی سائٹ کھولی تو معلوم ہوا کہ اس پستول کی چوری کی رپورٹ بائیس جون دو ہزار سات کو درج کرائی گئی اور رپورٹ کرنے والے کا نام الفرڈ اوٹی تھا۔

اب اس نے اوٹی کے کمپیوٹر سسٹم کی ہیکنگ شروع کر دی۔ ایک ایک کر کے وہ سارے فولڈر دیکھتی گئی پھر اس کی نظر گیڈا کی وصیت پر گئی۔ جس کے مطابق اسے اور پوسن کو اس کے ترکہ میں سے حصے ملنا تھا اس کے علاوہ کئی فلاحی اداروں کو بھی اس وصیت میں حصہ دار بنایا گیا تھا۔ اس نے ان اداروں کے نام پڑھے جن میں دو کے علاوہ سب غیر معروف تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کا نام منتخب کیا جسے ایک ملین کرونے دیے گئے تھے

پھر گوگل پر اسے تلاش کیا۔ وہاں اس نام کا کوئی ادارہ نہیں تھا پھر اس نے ایک اور ادارہ کو سرچ کیا۔ اسے بھی ایک ملین کرونے دیے گئے تھے لیکن اس کا نام بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ ان کا بینک اکاؤنٹ ایک ہی تھا۔ بارکلے بینک۔ اکاؤنٹ نمبر۔۔۔

وہ یہ ساری تفصیل دیکھ کر حیران رہ گئی اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ گیڈا نے اس وصیت پر دستخط کیسے کر دیے۔ یقیناً یہ اوٹی کی کارستانی تھی۔

☆☆☆

جیکر اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ دوسری جانب سے انسپکٹر نارمن بول رہا تھا۔

”لڑکی کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“

”مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں۔ خیر جانے دو۔ اس وقت میں نے کچھ اور جاننے کے لیے فون کیا ہے۔“

”کیا؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کسی زمانے میں تمہارے گولڈی کے ساتھ تعلقات رہے ہیں؟“

”تمہیں ذاتیات میں دخل دینے کا حق نہیں۔“

”غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دو کہ کیا تم نے اس کی پشت پر کوئی پیدائشی نشان دیکھا تھا؟“

جیکر گڑبڑا گیا لیکن سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”ہاں لیکن اس نے اسے ٹیٹو سے چھپا رکھا تھا۔“ جیکر نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسرے فون پر پیغام موصول ہوا۔ ”میں مطلوبہ شخص تک پہنچ گئی ہوں۔“

اس نے نارمن سے کہا کہ وہ اسے بعد میں فون کرے گا اور گولڈی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کون ہے وہ؟“

”الفرڈ اوٹی۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

”ننانوے فیصد۔“

”کیا تمہیں آلۂ قتل مل گیا؟“

گولڈی نے اپنے آئی فون کے ذریعے پستول کی تصویر کھینچ دی تھی۔ وہ بولی۔ ”اپنی ای میل چیک کرو۔“

اس نے فون ہولڈ کیا اور ای میل دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تم پاپا گیڈا کے کاٹیج پر آ جاؤ۔ میں تمہیں سب سمجھا دیتی ہوں لیکن ابھی پولیس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

☆☆☆

کاٹیج کی طرف جاتے ہوئے اس نے انسپکٹر نارمن کو فون کر کے پوچھا کہ وہ گولڈی کے پیدائشی نشان کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔ جب اس نے بتایا کہ وہ اس کی بہن ہے تو اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گاڑی بری طرح لہرائی۔ اس نے جلدی سے اسٹیئرنگ قابو میں کیا اور نارمن کی کہانی سننے کے بعد اسے اطمینان دلایا کہ وہ پُرسکون ہو جائے۔ اسے یقین ہے کہ گولڈی بے گناہ ہے اور وہ دونوں بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔

جب وہ کاٹیج پہنچا تو گولڈی لنچ کر رہی تھی۔ اس نے اسے ہیلو بھی نہیں کہا اور اس کی جانب ایک بیگ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اس کے ذریعے تم مطلوبہ شخص تک پہنچ جاؤ گے۔“

”بتاؤ تو سہی یہ سب کیا ہے؟“

گولڈی نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ پستول، مچھلیاں پکڑنے کے دوران دریا کی تہ سے برآمد ہوا تھا بلکہ اس کے بجائے یہ کہا کہ اسے یہ پستول تالاب کے کنارے ایک گڑھے میں پڑا ہوا ملا تھا۔

”اس کے علاوہ کچھ اور؟“

گولڈی نے اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جو کمپیوٹر ہیکنگ کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں اور اوٹی کی جعل سازی کے بارے میں بتایا اور بولی۔ ”اگر یہی آلۂ قتل ہے تو سمجھو یہ کیس بند ہو گیا۔“

”اور کچھ؟“ جیکر نے اسے پُراشتیاق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ گولڈی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”میرے اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ کیس بھی بند ہو گیا؟“

گولڈی نے ایک سگریٹ جلایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔ ”یہ پستول لیبارٹری میں لے جاؤ۔ اس دوران میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں۔“

☆☆☆

جیکر پولیس کے آنے سے پہلے ہی گیڈا کے گھر پہنچ گیا جہاں اوٹی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”مجھ سے ملاقات کے لیے رضامندی ظاہر کرنے کا شکریہ۔“ جیکر نے کہا۔ ”کیا ہم تھوڑی سی چہل قدمی کر سکتے ہیں۔“

وہ دونوں باغ میں آ گئے۔ گلاب کے پودوں کے پاس پہنچ کر اوٹی نے پوچھا۔ ”کیا پولیس نے اس لڑکی کو تلاش کر لیا؟“

”نہیں، لیکن انہیں آلۂ قتل مل گیا ہے۔“

اوٹی سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”اس بات پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔“

"اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ وہ پستول تمہارا ہے۔"

اوٹی پُرسکون انداز میں بولا۔ "مجھے معلوم تھا کہ گولڈی نے ہی وہ پستول چرایا ہوگا۔"

"ان جعلی اداروں کے بارے میں کیا کہو گے جنہیں گیڈا کی وصیت میں حصہ دیا گیا ہے اور وہ ساری رقومات جس اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ وہ تمہارا اکاؤنٹ ہے۔" جیکر نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

اوٹی نے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو جیکر بولا۔ "بھاگنے کی کوشش بے سود ہے۔ پولیس پہنچنے ہی والی ہو گی۔ تم نے یہ سب کیوں کیا۔"

اوٹی نے گہری سانس لی اور بولا۔ "گیڈا نے مجھے لنگرز کلب کی رکنیت دینے سے انکار کردیا تھا جبکہ میں چند برس پہلے ایک چھ پونڈ وزنی مچھلی پکڑ چکا تھا۔ اس کے برعکس اس نے گولڈی کو تاحیات رکنیت دے دی۔ پھر اس نے وصیت کے بارے میں بھی میری ایک نہیں سنی اور گولڈی کو بیس ارب کردینے دے دیے جبکہ پانچ ارب پولسن کے حصے میں آئے۔ اس نے مجھے بالکل نظرانداز کردیا۔"

"لہٰذا تم نے اس لڑکی کو پھنسانے کے لیے جائے واردات پر وہ بالی رکھ دی۔"

اوٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "تاکہ سب یہی سمجھیں کہ جب وہ مچھلیاں پکڑنے جارہے تھے تو اس نے اسے قتل کردیا۔"

جیکر نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اور اسے مکان کی طرف لے جانے لگا جب وہ اس جگہ سے گزرے جہاں سے گیڈا کی لاش ملی تھی تو اوٹی بری طرح رونے لگا اور بولا۔ "گیڈا! مجھے معاف کرو۔ پلیز مجھے معاف کردو۔"

وہ دونوں ٹیرس پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اوٹی نے اپنے آنسو پونچھے اور بولا۔ "میں تمہیں ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں، میں اکیلا ہی نہیں بلکہ پولسن بھی اس میں شامل تھا۔"

"وہ کس طرح؟"

"ایک رات وہ اس کے کمرے میں گیا اور اس سے نظرثانی شدہ وصیت پر دستخط کرنے کے لیے کہا۔ اس کے خیال میں اس وصیت میں کچھ اداروں کے نام شامل کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ وہی جعلی ادارے ہیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔"

"اس مدد کے بدلے تم نے اس کے لیے یہ جعل سازی کی؟"

اس سے پہلے کہ اوٹی کچھ کہتا۔ جیکر نے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بندوک پولسن، گیڈا کی قیمتی دونال بندوق اس کی طرف کیے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ اوٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"تم بہت زیادہ بکواس کررہے ہو۔ اس لیے اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں یہ کام اتنی ہوشیاری سے کروں گا کہ یہی معلوم ہوگا تم نے جیکر کو مارا ہے اور میں نے ہتھیار چھیننے کی کوشش میں اپنے دفاع میں تمہیں قتل کردیا۔"

یہ کہہ کر وہ ان دونوں کے درمیان آگیا اور اس نے بندوق کا رخ جیکر کی طرف کردیا جیسے ہی اس نے سیفٹی کیچ ہٹایا ایک آواز فضا میں گونجی پھر کسی نے اچھل کر پولسن کی کمر میں لات جمائی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن گولڈی نے اس کے پیٹ میں زوردار لات مار کر اسے دوبارہ ڈھیر کردیا۔

اس دوران اوٹی کو موقع مل گیا اور اس نے شارٹ گن پکڑنے کی کوشش کی لیکن گولڈی نے اس پر بھی حملہ کردیا۔ وہ اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کررہی تھی پھر بولی۔ "پاپا گیڈا کی موت کا بدلہ لینے کا وقت آگیا۔"

"شاباش۔" عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ وہ انسپکٹر نارمن تھا۔ انہوں نے اوٹی اور پولسن کو ہتھکڑی لگائی پھر وہ آگے بڑھا اور گولڈی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک تو ہو گی؟"

گولڈی نے اسے چونک کر دیکھا اور سوچنے لگی کہ اسے یہ نام کیسے معلوم ہوا۔ گلی اس کا نک نیم تھا اور یتیم خانے میں سب اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔

انسپکٹر نے اس کی حیرانی دور کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لیے انسپکٹر نارمن نہیں بلکہ صرف نارمن ہوں، تمہارا بھائی۔"

گولڈی آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی اور بولی۔ "تم نے مجھے تلاش کرنے میں اتنی دیر کیوں لگادی؟"

جب انسپکٹر نارمن اور نیل، اپنی گاڑی کی طرف جانے لگے تو وہ بولی۔ "ایک منٹ، میں بھول گئی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے پولیس کار کی چابی نکال کر انسپکٹر نیل کے ہاتھ پر رکھی اور اسے بتادیا کہ وہ کار کہاں کھڑی ہے اور یہ کہ اس کا پستول بھی فرنٹ سیٹ پر رکھا ہوا ہے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد جیکر آگے بڑھا اور بولا۔ "کانی پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

گولڈی نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپایا اور آنسوؤں بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "کیوں نہیں جیکر لیکن یاد رکھنا تمہارے لیے یہ آخری موقع ہے۔"

رٹز ہوٹل کے ہال روم میں بڑی رونق تھی۔ ہر جانب زرق برق قیمتی ملبوسات پہنے خوب صورت خواتین اور وجیہہ مرد نظر آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشروبات کے گلاس تھے اور وہ سب آپس میں خوش گپیاں کررہے تھے۔ ان کی نظریں بار بار ہال کے مرکزی دروازے کی جانب اٹھ جاتیں جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔ میں نے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے ہی اپنے پرانے ساتھی اشین کوئنگی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ

خونی ہار

سیریینا راض

ہر قیمتی شے کی قیمت بھی دگنی ادا کرنا پڑتی ہے... ایک خوب صورت ہار کے گرد گھومتی سنسنی خیز کہانی... ہر شخص اس ہار کی حفاظت کرنے کا دعوے دار تھا... سخت پہرے کے باوجود وہ حسینہ کی گردن سے اس طرح غائب ہوا کہ... پھر ہر شخص اس واردات کی لپیٹ میں آتا چلا گیا...

سابق پولیس آفیسر تھا اور ان دنوں نوب ہل میں واقع اس ہوٹل میں سراغ رساں کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کا کام ہوٹل میں آنے والے گاہکوں پر نظر رکھنا اور ان کی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کرنا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مسٹر اینڈ مسز جیمسن پہلے ہی پہنچ چکے ہیں اور اپنے کمروں میں گئے ہیں۔

"ویسے تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک نیکلس پر نظر رکھنی ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "آج کل میں ایک انشورنس کمپنی کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"یقیناً وہ وائٹ ٹائیگر نیکلس ہوگا۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی کمروں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟"

"ان کی ازدواجی زندگی میں کشیدگی آگئی ہے اور وہ الگ الگ کمروں میں سو رہے ہیں۔ ابھی کسی کو اس کا علم نہیں ہے لیکن مجھے اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے سب معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ ہال روم میں ایک ساتھ آئیں گے، بالکل ایک جوڑے کی طرح لیکن اس کے بعد....." وہ کہتے کہتے رک گیا اور اپنی ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے بولا۔ "کچھ بھی ہو سکتا ہے، تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم ہال روم میں جاؤ۔ جب وہ نیچے آئیں گے تو میں تمہیں مطلع کر دوں گا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہال روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بار مین کو ایک گلاس مشروب کا آرڈر دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس طرح بیٹھ گیا کہ پورے ہال بالخصوص دروازے پر نظر رکھ سکوں۔ ویسے تو میری ذمے داری صرف اس نیکلس تک محدود تھی جو مسز جیمسن پہن کر اس ہال میں آتی۔ جیڈ جیمسن نے اس نیکلس کا بیمہ گولڈن گیٹ انشورنس کمپنی سے کروایا تھا اور کمپنی کو ڈر تھا کہ پارٹی کے دوران میں وہ نیکلس چوری نہ ہو جائے۔ اس لیے مجھے اس کی حفاظت کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ انہیں مجھ سے زیادہ سستا بندہ نہیں مل سکتا تھا۔

میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے وہاں پہلے سے موجود مہمانوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ان میں کوئی جانا پہچانا چور موجود نہیں تھا۔ ان میں سے چند لوگوں کو جانتا تھا جو شراب کے کاروبار سے منسلک تھے جبکہ دو کا تعلق سان فرانسسکو کے ہوٹل سے تھا۔ البتہ جوئے ڈیمس کو دیکھ کر چوکنا ہو گیا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میرے لیے کسی پریشانی کا سبب بن سکے گا۔ میری اس سے کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس سے ملنے چلا گیا اور بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تم ابھی تک وہی گھٹیا سگریٹ پی رہے ہو، جانتے ہوئے بھی کہ یہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ سگریٹ پینا اتنا ہی ضروری ہے تو کوئی امریکن برانڈ استعمال کرو۔"

"تم سے یہاں ملنے کی توقع نہیں تھی۔" یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "پیو گے؟"

"نہیں شکریہ۔ میں کچھ عرصہ مزید زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟"

اس نے مخصوص انداز میں کندھے اچکائے اور بولا۔ "بس گزارہ ہو رہا ہے۔ یہاں بھی اسی لیے آیا تھا کہ کچھ نئے گاہک بنا سکوں۔"

جب گزشتہ موسم بہار میں اس سے ملاقات ہوئی تو وہ سستی شراب پر جعلی لیبل لگا کر خوب منافع کما رہا تھا۔ اسے جعلسازی میں کمال حاصل تھا۔ وہ شائستہ انداز میں گفتگو کرتا جس کی وجہ سے لوگ اس کی باتوں میں آجاتے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں بھی کسی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ یوں سمجھو کہ ڈیوٹی پر ہوں۔"

"اوہ۔" وہ ہنسا۔

میں نے جل کر کہا۔ "بے فکر رہو۔ میں یہاں کسی کی حفاظت کرنے نہیں آیا۔"

"جانتے ہو تمہاری سنہری بالوں والی دوست بھی یہاں آئی ہوئی ہے۔ کیا نام ہے اس کا..... ہاں یاد آیا، ویلما۔"

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اسے نیری کے واقعے کے بعد نہیں دیکھا تھا جب وہ میری ملازمت چھوڑ کر رشین ریور ویلی چلی گئی تھی جہاں اسے نیری کی جانب سے ورثے میں ملے ہوئے انگوروں کے باغ کا انتظام سنبھالنا تھا۔ اس کا نام سنتے ہی میری آنکھیں اس کی تلاش میں لگیں۔ ویلما واقعی ایک شگفتہ کلی کی طرح تھی۔ دراز قد، اسمارٹ اور خوب صورت۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ دوڑتی رہتی تھی۔ بالآخر میری نظریں اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئیں۔ وہ گلاس ہاتھ میں تھامے کسی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا مختصر اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس لباس میں قیامت ڈھا رہی تھی۔

دیکھ کر میرا دل بے قابو ہو گیا۔ میں نے جوئے کو ٹالنے کے لیے کہا۔ "اچھا پھر بات کریں گے۔" اور ویلما کی طرف بڑھ گیا۔

"ویلما..... میری جان! میں تمہیں شدت سے یاد کر رہا تھا۔ کیسی ہو؟"

اس نے ایک ساتھ دو گھونٹ لیے اور بولی۔ "اوہ مائی گاڈ فرینک! یہ تم ہو۔ جی چاہتا ہے کہ یہ ڈرنک تمہارے چہرے پر پھینک دوں لیکن یہ کافی نہیں ہوگا۔ تمہیں تو اس سے نہلانا چاہیے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے..... پہلے تو ایسی کڑوی نہ تھیں؟"

"اب بھی نہیں ہوں۔ اگر ضرورت ہوتی تو تمہارے بارے میں ضرور سوچتی لیکن میں اپنے انگوروں کے باغ میں مصروف تھی۔ اب میری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔" وہ قدرے پُرسکون ہوتے ہوئے بولی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو فرینک؟"

"میں ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ تم جیمسن کو جانتی ہو؟"

"تم جیڈ اور جین جیمسن کی بات کر رہے ہو؟ میں انہیں نہیں جانتی۔ وہ بڑے لوگ ہیں جبکہ میرے پاس صرف چار ایکڑ زمین ہے۔"

"ہاں لیکن سب جانتے ہیں کہ تمہاری یہ زمین علاقے میں بہترین ہے جس پر انگوروں کا باغ ہے۔"

"ممکن ہے لیکن جیمسن کا کاروبار بے حد وسیع ہے جبکہ میں ایک چھوٹی سی کاشت کار ہوں۔ اسی لیے ہمارا حلقۂ احباب مختلف ہے۔"

اسی لمحے مجھے موبائل پر کوئنگ کا پیغام موصول ہوا۔ وہ دونوں میاں بیوی ہال روم میں آرہے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔

"یہ جیڈ جیمسن ہے۔" ویلما نے ایک دراز قد شخص کی طرف اشارہ کیا جس کے سر کے بال اور مونچھوں میں سفیدی نمایاں تھی لیکن درمیانی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ خاصا صحت مند اور اسمارٹ نظر آرہا تھا۔ جین اس کے کندھے سے کندھا ملائے چل رہی تھی۔ اس کا حسن لوگوں کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور جیڈ کا بازو پکڑ کر اس سے سرگوشی کرنے لگی۔ جیڈ نے تائید میں سر ہلا دیا اور وہ بار کی طرف کو چل دی۔

"وہ بار کی طرف جا رہی ہے فرینک! تم میرے لیے بھی ایک اور گلاس کا بندوبست کرو۔" یہ کہہ کر وہ خالی گلاس میرے سامنے لہرانے لگی۔

میں خود بھی جین کو قریب سے دیکھنا چاہ رہا تھا اس لیے ویلما کی فرمائش سنتے ہی بار کی طرف بڑھ گیا۔ جین مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ میں بھی اس کے برابر میں جا کر کھڑا ہو گیا اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ خوب صورت چہرے اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ اس کے گاؤن کا رنگ ویلما کے اسکرٹ کے مقابلے میں گہرا سرخ تھا اور پوری لمبائی میں تھا جبکہ ویلما نے شاید اپنی ٹانگوں کی نمائش کے لیے مختصر اسکرٹ کا انتخاب کیا تھا۔ جین کے گاؤن کا گلا بہت کشادہ تھا اور سینے پر سے چست ہونے کی وجہ سے اس کے خوب صورت جسم کی رعنائیوں کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ البتہ کمر کے نیچے سے وہ گاؤن کافی ڈھیلا تھا لیکن مجھے اس کے لباس کی خوب صورتی پر توجہ دینے کا ہوش نہیں تھا کیونکہ میری نظریں اس بھاری بھرکم نیکلس پر جمی ہوئی تھیں جس نے اس کے کھلے ہوئے گلے کے دو تہائی حصے کو گھیر رکھا تھا۔ اس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے اور درمیان میں ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا موتی لٹک رہا تھا۔

وہ میری محویت پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہارا نیکلس بہت خوب صورت ہے۔ اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "اور میرے پاس اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ میرا نام فرینک ہے اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ مجھے گولڈن گیٹ انشورنس کمپنی نے بھیجا ہے تاکہ آج کی شام تمہارے اس قیمتی نیکلس کی حفاظت کر سکوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔ میں اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوں۔ وہ بھی میری نگرانی کرنے کا عادی ہے اور شکی مزاج بھی ہے۔ تم سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور ہال روم کی طرف بڑھ گئی۔ چہرے اور جسم کے علاوہ اس کی چال بھی دلکش تھی۔ میں دم سادھے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

جب میں ویلما کے لیے مشروب لے کر واپس آیا تو دیکھا کہ جیڈ جیمسن صرف اپنی بیوی پر ہی نظر نہیں رکھتا بلکہ اس کی نظریں ویلما پر بھی جمی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی عمر پچاس سال سے کم نہیں لیکن وہ ویلما کو متاثر کرنے کے لیے نوجوانوں جیسی حرکتیں کر رہا تھا

اور وہ بھی اس کی توجہ پا کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کیے بغیر مجھ سے گلاس لے لیا اور جیمسن کی باتیں سننے لگی جو غالباً اس کے انگوروں کے حجم کی تعریف کر رہا تھا۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ میری نظریں جین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

جوئے ڈیمس پورے ہال میں ادھر سے اُدھر پھدکتا پھر رہا تھا اور وہاں موجود مہمانوں میں گھس کر اپنی شراب کی تعریفیں کر رہا تھا لیکن وہاں کسی کو اس کی بات سننے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی اور وہ سب اسے بُری طرح نظرانداز کر رہے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہونے لگا۔ وہ بدمعاش اور بے ایمان سہی لیکن کبھی اس سے میرا تعلق رہ چکا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا جیڈ اور ویلما کی طرف چلا گیا۔ جیڈ نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کے کندھے کے گرد اپنا بازو رکھ دیا۔ جوئے نے اس کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ مسکرایا اور ویلما کا بازو پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ جین وہاں کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی لیکن جوئے کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وہ جین کے سامنے احتراماً جھکا اور کسی دوسرے شکار کی تلاش میں چل دیا۔

میرا اندازہ تھا کہ جین اپنے شوہر کی بے اعتنائی پر برانگیختہ ہو رہی ہوگی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے بارے میں کچھ جان پاتا، وہ میرے پاس آ کر بولی۔ ”تمہارا مشروب کیسا تھا؟“

”بہت عمدہ، تم اپنے مشروب کے بارے میں کیا کہو گی؟“

”اچھا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ بارٹینڈر نے میرے گلاس میں کم مقدار ڈالی۔ کیا تم میرے لیے ایک اور گلاس لے سکتے ہو؟“

”یقیناً۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں بار کی جانب چل دیے۔ میں نے مزید دو گلاسوں کا آرڈر دیا۔ اس نے اپنا گلاس پکڑ کر سر کو پیچھے کیا اور ایک ہی دفعہ میں پورا گلاس خالی کر دیا جبکہ میرا خیال تھا کہ اسے آدھی شراب کسی گملے یا قریبی آتش دان میں انڈیلنا ہوگی۔ اس نے خالی گلاس کاؤنٹر پر رکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میں اب بھی پیاسی ہوں۔“

”میں تمہارے لیے ایک اور لے لیتا ہوں لیکن اب آہستہ آہستہ پینا۔“

اس کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ شاید اسے میری بات بُری لگی ہے اور اب وہ مجھ سے بحث شروع کر دے گی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر نرمی آ گئی اور وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے بھی کبھی اپنے شوہر پر بہت غصہ آتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی کے ساتھ فلرٹ کر کے اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔ لگتا تو یہی ہے کہ اسے اپنی اس حرکت پر کوئی ندامت نہیں ہے۔“

ہم دونوں کی نظریں ایک ساتھ اس جانب اٹھ گئیں۔ ویلما اور جیڈ ایک چھوٹے سے صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جیڈ نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا کر ہنس پڑی۔ جیڈ نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا جو نصف سے زیادہ بھرا ہوا تھا اور ویلما سے مزید قریب ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا، اس کا تصور کرنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا اور جین کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ویسے بھی مجھے جیڈ پر نہیں بلکہ جین پر نظر رکھنا تھی جو اس وقت میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے اپنی ڈیوٹی نبھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ نیکلس پر نظر رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ اس سے قریب رہوں۔ جیڈ اور ویلما نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا تو لہٰذا میں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اور جین کے لیے مزید ڈرنک کا آرڈر دیا اور اس سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔

”تمہاری شکل رابرٹ ٹیلر سے بہت ملتی ہے۔“ جین مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کیا کبھی کسی نے تمہیں یہ نہیں بتایا؟“

”نہیں، یہ میرے لیے ایک نئی خبر ہے۔ ویسے بھی وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے اور اس کی طرح میری ٹھوڑی پر گڑھا نہیں پڑتا۔“

”جیڈ بہت زیادہ پُراعتماد شخص ہے۔“ وہ یک دم اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور اس کا خیال ہے کہ وہ جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔“

”اس کی کامیابیوں کو دیکھ کر تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہاں، ہمارے پاس کافی ..... زرخیز زمینیں ہیں جو میں اپنے ساتھ لے کر آئی ہوں۔ میرے والد موسیقار تھے لیکن جیڈ کاروباری شخص ہے۔ میری اس سے ملاقات لاس اینجلس میں ہوئی پھر ہم نے شادی کر لی۔ جب میرے ڈیڈی کا انتقال ہوا تو ساری زمینیں مجھے مل گئیں۔ جیڈ نے ان زمینوں پر انگور کی کاشت کر کے شراب بنانا شروع کر دی اور

تمہارے یہاں برادری سے باہر شادی کا رواج ہو تو میں حاضر ہوں

قدیم مواصلاتی رابطہ

کاروبار بند کر دیا۔ اب ہم گزشتہ چھ برسوں سے انہی کی کمائی کھا رہے ہیں۔“

وہ باتیں کرتی رہی جبکہ جیڈ اور ویلما اپنی دنیا میں مگن تھے۔ آرکسٹرا نے نئی دھن چھیڑی تو جین نے پوچھا کہ کیا میں اس کے ساتھ رقص کرنا چاہوں گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ڈانس فلور پر لے گئی۔ میں نے اپنا دایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیا تو وہ خودسپردگی کے عالم میں مجھ سے چمٹنے سے لگ گئی۔ اب صرف نیکلس ہی نہیں بلکہ اس کے گہرے گلے سے جھانکتی رعنائیاں بھی میری نظروں کے سامنے تھیں۔

ہم نے چند دھنوں پر رقص کیا اور اس دوران میں اس کی قربت سے پوری طرح محظوظ ہوتا رہا۔ وہ بہترین ہم رقص ثابت ہوئی تھی اور اسے قدم سے قدم ملا کر ڈانس فلور پر تھرکنے کا ہنر آتا تھا۔ بالآخر ساز تھم گئے، ہم دونوں واپس اپنی میز پر بیٹھ گئے۔ جین نے اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں اور بولی۔ ”وہ چلے گئے۔“

”کون؟“ میں ابھی تک اس کی قربت کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا اس لیے فوری طور پر اس کا اشارہ نہیں سمجھ سکا۔

”میرا شوہر اور تمہاری دوست۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے پورے ہال میں نظریں دوڑائیں۔ اگر ویلما وہاں موجود ہوتی تو اپنے سرخ لباس کی وجہ سے اس بھیڑ میں بھی مجھے بہ آسانی نظر آ جاتی لیکن پورے ہال کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ دونوں ہی وہاں موجود نہیں تھے۔

”ممکن ہے کہ ویلما اپنا میک اَپ درست کرنے گئی ہو۔“ میں نے دل کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔

”ممکن ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا پارسا شوہر کسی لڑکی کے ہاتھ چھونے گیا ہو لیکن مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔ حالانکہ میں نے یہاں آنے سے پہلے ہی اسے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے آج کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو......“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں وہیں بیٹھے اور ان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ جب کافی دیر گزر گئی اور وہ نہیں آئے تو جین اپنے چہرے پر جھنجھلاہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”ہم کب تک یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے رہیں گے؟ میں تفریح کی غرض سے آئی تھی اور اسی لیے الگ کمرا بھی لیا تھا۔ کیوں نہ وہیں چل کر باتیں کریں۔“

میں کچھ ہچکچایا۔ جین جیسی عورت کے ساتھ اس کے کمرے میں جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔

”دیکھو، میں آج کی رات اپنے گھر واپس نہیں جا رہی۔ جیڈ اور میں نے اس ہوٹل میں علیحدہ علیحدہ کمرے بک کرائے ہیں۔ تمہیں اس نیکلس کی نگرانی اور حفاظت کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ جب تک میں یہاں ہوں، تم مجھ سے قریب رہو۔“

”چلو۔“ میں لاجواب ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے لابی میں کوگی کو دیکھا جو کچھ لوگوں کے ساتھ اگلے دن کے پروگراموں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے جیڈ کے بارے میں پوچھا تو اس نے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کر دیا۔ جین نے کاؤنٹر سے کمرے کی چابی لی اور ہم دونوں کسی کی نظروں میں آئے بغیر لفٹ میں داخل ہوئے۔ لفٹ بارہویں منزل پر پہنچ چکی تھی۔ دروازہ کھلا اور اس سے پہلے کہ باہر سے آنے والے ہمارے حلیے اور کیفیت کو دیکھتے، میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ جین نے بھی میری تقلید کی۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر لائٹ جلائی اور مستی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ میں کچھ دیر حواس باختہ کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔ جین ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ”دروازہ اندر سے لاک کر دو اور روم سروس کو ڈرنک کا آرڈر دے دو۔“

”لیکن یہ سب کیا ہے؟“ میں بوکھلاتے ہوئے بولا۔ ”تم تو پارٹی میں آئی تھیں اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میری ڈیوٹی پارٹی کے دوران تمہارے نیکلس کی حفاظت کرنا ہے۔“

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ میں پارٹی میں شرکت کرتی ہوں یا اپنے کمرے میں آرام۔ تمہیں اس نیکلس کی حفاظت کرنے کے لیے ہر حال میں میرے قریب رہنا ہوگا۔ چاہے میں کہیں بھی جاؤں۔ ویسے بھی ہال میں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرا شوہر کسی دوسری لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے تو میں وہاں رک کر کیا کروں گی۔“

میں لاجواب ہو کر خاموش ہوگیا۔ ویسے بھی مجھے اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو بس اپنی ڈیوٹی نبھانے کی خاطر اس کے ساتھ کمرے تک چلا آیا تھا اور اب میری کوشش تھی کہ اسے واپس ہال میں چلنے پر آمادہ کرسکوں۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے روم سروس کو ڈرنک اور سگریٹ کا آرڈر دیا۔ چند منٹ بعد ہی ویٹر دونوں چیزیں لے کر آگیا۔ اس کے جانے کے بعد سگریٹ اور شراب کا دور شروع ہوگیا۔ جین سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے بولی۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ جیڈ سے چھٹکارا حاصل کر کے نئی زندگی کا آغاز کروں۔“

میں نے ڈرنک کا لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم ایسا کرسکو گی؟“

”کیوں نہیں۔ خوش قسمتی سے ڈیڈی کی چھوڑی ہوئی زمین ابھی تک میرے نام پر ہی ہے۔ البتہ علیحدگی کی صورت میں فیکٹری، کاریں اور بینک اکاؤنٹ جیڈ کے حصے میں چلا جائے گا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔

”مجھے طلاق چاہیے اور جیڈ خوشی سے اس کے لیے تیار نہیں ہوگا کیونکہ اس کی نظریں میری زمین پر ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور سگریٹ پیتا رہا۔

”اس وقت وہ کمرا نمبر گیارہ سو دو میں تمہاری دوست کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے اور اس کی یہ حرکت طلاق کے لیے ایک مضبوط بنیاد بن سکتی ہے..... بشرطیکہ میرے ہاتھ کوئی ثبوت آجائے۔“

”کیسا ثبوت؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”ڈیلما اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں ہے۔ ہماری شادی کو دس سال ہوگئے ہیں اور وہ موقع ملنے پر اس طرح کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے ہمیشہ بے وقوف بنایا۔ وہ اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ کھیلتا رہا ہے۔“

میں نے اس بار بھی اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسے اپنی طرف گھسیٹ کر اس کی قربت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ میرے لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم ایک پرائیویٹ جاسوس ہو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ اسی وقت اس کے کمرے میں جاؤ اور ان دونوں کی کچھ تصویریں بنا کر لے آؤ۔ اس طرح میرے ہاتھ ایک ثبوت آجائے گا۔ میں نے استقبالیہ سے اس کے کمرے کی ایکسٹرا چابی لے لی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے جین۔“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”میں طلاق کے کیس نہیں لیتا۔“

”پلیز فرینک۔“ وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔ ”میں اس طرح مزید نہیں رہ سکتی۔“

”نہیں، یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں اس طرح کا گھٹیا کام نہیں کرسکتا۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن غیر اخلاقی حرکت نہیں کرتا۔ ویسے بھی تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے کیونکہ آج کی رات تم بھی اس کمرے میں وہی کچھ کر رہی ہو جو تمہارا شوہر ڈیلما کے ساتھ کر رہا ہے۔ تم بھی اس کی طرح مجرم ہو۔“

”تم جانتے ہو کہ ہر عمل کا ایک ردعمل ضرور ہوتا ہے۔ میں نے بہت برداشت کرلیا لیکن اب میں بھی وہی کروں گی جو وہ کر رہا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بڑے لگاوٹ بھرے انداز میں بولی۔ ”فرینک۔“

”ہاں!“ میرے لہجے کی تلخی اچانک ہی غائب ہوگئی۔

”کمرا نمبر گیارہ سو دو میں جاؤ اور ان کی ایک تصویر کھینچ لو۔“

”میرے پاس کیمرا نہیں ہے۔“

”تمہارے لیے کیمرے کا انتظام کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہوٹل سے ہی مل جائے گا۔“

”اس وقت مجھے کون کیمرا دے گا؟ آدھی رات گزر چکی ہے۔“

”کیا تم اس سے انکار کرو گے کہ تمہارا ایک دوست اس ہوٹل میں بھی ڈیوٹی پر ہے۔ فرینک! تم سمجھتے کیوں نہیں؟ مجھے جیڈ سے طلاق چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ وہ مجھے مارتا بھی ہے۔“

”وہ تمہیں مارتا ہے؟“ میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

”ہاں، ہم گھر میں بھی الگ الگ کمروں میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنا سارا غصہ مجھ پر نکالتا ہے اور اسی وقت میرے کمرے میں آتا ہے جب اسے اپنی بھوک مٹانا ہوتی ہے۔“

”میں تمہاری پریشانی سمجھ رہا ہوں لیکن میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا تو اب کیسے کرسکتا ہوں؟“

”اگر تمہیں اس وقت میرے جسم پر کوئی چوٹ کا نشان نظر نہیں آرہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چاہتا تھا، میں آج کی رات پارٹی میں یہ سرخ لباس پہنوں۔ اسی لیے اس نے گزشتہ کئی ہفتوں سے مجھے نہیں مارا۔ یہ دیکھو۔“

اس نے اپنا لباس ذرا سا سرکایا۔ کمر کے نچلے حصے پر بڑے بڑے نیل پڑے ہوئے تھے۔ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”ایک بوڑھا شخص جوان عورت کے ساتھ کیسے چل سکتا ہے۔ اسی لیے وہ جھلا کر اپنی چمڑے کی پیٹی کا آزادانہ استعمال کرتا ہے۔ شاید وہ تمہاری دوست کو بھی مار رہا ہو۔ وہ بہت ظالم ہے۔ میں تو اس سلوک کی عادی ہو چکی ہوں لیکن وہ شاید یہ تشدد برداشت نہ کر پائے۔“

یہ سنتے ہی میں نے بستر سے چھلانگ لگا دی۔ مجھے تو یہ بات بھی بہت بری لگی تھی کہ ڈیلما اس شخص کے ساتھ کمرے تک چلی گئی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار لڑکی تھی اور میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ کوئی اذیت پسند شخص اسے مارے۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے شوہر کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ پہلے نیچے جا کر اپنے دوست کو ڈھونڈتا ہوں، اگر اس سے کیمرا مل گیا تو ان دونوں کی چند تصویریں اتار لوں گا۔ تم مجھے اس کے کمرے کی چابی دے دو۔“

”شکریہ فرینک! تم کتنے اچھے ہو۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

چند منٹ بعد میں گیارہویں منزل کی راہداری میں دبے پاؤں چل رہا تھا۔ کوہکی کا دیا ہوا کیمرا میری گردن میں اور کمرے کی چابی میری مٹھی میں تھی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ غلط ہوگیا ہے۔ میں اسے محسوس کر سکتا تھا۔ آپ نے جو کام کبھی نہ کیا ہو اور اسے کرنے نکل پڑیں تو بہت جلد غلطی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مجھے وہ سواری استعمال نہیں کرنا چاہیے جو مجھے چلانا نہیں آتی۔ کچھ ایسے ہی محسوسات میرے بھی تھے۔ جانتا تھا کہ غلطی کر رہا ہوں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

میں نے دروازے کے تالے میں چابی گھمائی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا لیکن باتھ روم سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر کیمرا اوپر کیا اور تصویر کھینچ لی۔ لمحہ بھر کے لیے فلیش لائٹ کی روشنی کمرے میں چمکی۔ ڈیلما زور سے چلائی تو میں نے ایک بار پھر کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ یقینی طور پر جیڈ کی آنکھیں چندھیا گئی ہوں گی۔ لیکن اس نے بستر سے چھلانگ لگا دی۔ اس کا پاؤں فرش پر پڑے ہوئے بلب پر پڑا جو میں نے پہلی تصویر کھینچنے کے بعد پھینکا تھا۔ وہ درد سے چلایا اور اس نے اپنا پاؤں اٹھا کر بستر پر رکھ لیا۔

”ڈیلما۔“ میں نے آواز لگائی۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

”اوہ، میرے خدا! یہ تم ہو فرینک۔“ وہ میری آواز پہچانتے ہوئے بولی۔

جیڈ ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور ایک ہاتھ سے اسے دھکا دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کمرے میں رکھے ہوئے نائٹ اسٹینڈ سے ٹکرا گیا۔

”کیا اس نے تمہیں مارا ہے ڈیلما؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے چلے جاؤ فرینک! کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟“

”صرف اتنا بتا دو کہ تم ٹھیک ہو؟“

”یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ زور سے چلائی جس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ میں تیزی سے مڑا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بارہویں منزل پر پہنچ گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ کتنی بڑی غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ میرا کام نیکلس کی نگرانی کرنا تھا اور اس وقت میں اپنا کام نہیں کر رہا تھا۔ کمرا نمبر 1224 کا دروازہ لاک تھا۔ میں نے زور سے ٹھوکر ماری۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر نیچے گرا اور دروازہ کھل گیا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ جین بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے ایک چادر سے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ میری نظر بے اختیار اس کی گردن پر گئی۔ وہاں نیکلس موجود نہیں تھا۔ اس نے میرے بائیں کندھے کے پیچھے کسی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"فریک! نیکلس اس کے پاس ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں مڑ کر دیکھتا، میرے بائیں کان کے قریب ایک سرسراتی ہوئی آواز ابھری اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو اسی کمرے میں پایا۔ میں قالین پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور کمرے میں ایک عجیب سی ناگوار بو بسی ہوئی تھی۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ بارہ بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔ لیکن جب میں جین کو چھوڑ کر گیا تو وہ جمعے کی شب تھی۔ گویا یہ ہفتے کی صبح تھی۔ مجھے ہوش آ گیا تھا لیکن سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ میرا کیمرا کھل گیا تھا اور اس کی فلم بھی ساتھ ہی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ جین مجھے وہاں بیٹھی ہوئی نظر نہیں آئی۔ میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا بستر کی جانب بڑھا تو میری چیخ نکل گئی۔ جین مر چکی تھی۔ اس کا خوب صورت گلا کٹا ہوا تھا اور بستر کی چادر خون میں تر تھی۔

کمرے کے فون کا تار بھی کٹا ہوا تھا لہٰذا میں نے باہر رکھے ہوئے فون سے ریسیپشن کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ اتفاق سے فون کوکی نے ہی اٹھایا۔ میں نے اسے کمرا نمبر 1224 میں اکیلے ہی آنے کے لیے کہا پھر میں واپس کمرے میں گیا اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا لیکن کمرے کی فضا ابھی تک دھندلائی ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے اور خود گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کے بعد کھڑکی بند کر دی لیکن کمرے میں ابھی تک تمبا کو کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ مخصوص سگریٹ جوئے ڈیمس استعمال کرتا ہے۔ گویا گزشتہ شب وہ اس کمرے میں موجود تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور راہداری میں کوکی سے ٹکرا گیا۔

"فریک!" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اب کیا ہوا؟ تم کہاں بھاگے جا رہے تھے؟"

"بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے اسٹین! نیکلس چوری ہو گیا اور مسز جیمسن کو مار دیا گیا۔"

"اوہ میرے خدا۔" وہ اپنے سینے پر کراس بناتے ہوئے بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ کام کس کا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم جوئے ڈیمس کو جانتے ہو؟"

"تم اس چھوٹے قد والے فرانسیسی کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں وہی جعلساز۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس طرح کا کام کر سکتا ہے۔" کوکی میری رائے سے اختلاف کرتے ہوئے بولا۔

"میں خود بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن مجھے اس کو چیک کرنا ہو گا۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ ہوٹل میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم پولیس کو فون کرو۔ ویسے بھی یہ جیمسن کا کمرا ہے۔ اگر نیکلس کی حفاظت کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید میں اس کمرے کا رخ بھی نہ کرتا۔"

"مسز جیمسن کہاں ہیں؟ انہیں بھی اس قتل کے بارے میں اطلاع دینا ہو گی۔"

"ان کے کمرے میں دیکھو۔ میں جوئے کے پیچھے جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ملے گا۔ میں پولیس والوں کا کام ختم ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ اس سلسلے میں تمہیں میرے ساتھ کچھ رعایت برتنا ہو گی۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کیا کر رہے ہو لیکن اگر میری نوکری پر کوئی بات آئی تو میں تمہارا نام لے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کا ارادہ نہ بدل جائے۔

میں نے زیرِ زمین پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی اور میرینا ڈسٹرکٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ گو کہ مجھے جوئے کے گھر کا نمبر معلوم نہیں تھا لیکن جس سڑک پر وہ واقع تھا، وہ بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ اس عمارت کو بہ آسانی پہچان لوں گا۔ میں نے کیلی فورنیا اسٹریٹ پر جاتے ہوئے گاڑی ایک اسٹور کے سامنے روکی اور ایک کپ کافی پی کر اپنے آپ کو تازہ دم کیا۔ اس کے بعد دوبارہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ سڑک پر ٹریفک کا زیادہ رش نہیں تھا اور مجھے گاڑی چلانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے لومبارڈ سے گاڑی بائیں جانب موڑی اور چند منٹ بعد اپنی گاڑی میگنولیا اسٹریٹ پر پارک کر رہا تھا۔

میری نگاہ ایک زرد رنگ کی عمارت پر گئی جو سڑک پر واقع دوسری عمارتوں سے بڑی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر انٹرکام پینل لگا ہوا تھا اور ہر بٹن کے ساتھ اپارٹمنٹ کے مکین کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے جوئے ڈیمس کے نام کا بٹن دبایا لیکن جواب نہیں آیا لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عمارت میں جانے کا دروازہ کھل گیا۔ غالباً جوئے اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچا۔ جیسے ہی میں مختصر سے ہال میں داخل ہوا، ایک کمرے

...کھلا اور جوئے نے اپنا سر باہر نکال کر جھانکا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دروازہ بند کرنے لگا لیکن میں نے اس سے پھرتی دکھائی اور اپنا ایک پاؤں ڈیوڑھی میں رکھ دیا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، اندر آ جاؤ۔" پھر اس نے اپنی بیلٹ سے ایک پستول نکال کر میرے سامنے لہرایا اور بولا۔ "دروازہ بند کر دو اور مجھے بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں اس نیکلس کے سلسلے میں آیا ہوں جو جین نے پہن رکھا تھا۔"

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "اس نیکلس سے میرا کیا تعلق؟"

"میرا خیال ہے کہ کچھ نہ کچھ تعلق ضرور بنتا ہے کیونکہ وہ نیکلس غائب ہو چکا ہے۔"

"اس کے باوجود میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ میں ہیرے جواہرات اور زیورات کی چوری نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔ دائیں ہاتھ میں اس نے ریوالور پکڑ رکھا تھا جس کی نال کا رخ میری جانب تھا۔ پھر اس نے پیکٹ جیب میں رکھ کر بائیں ہاتھ سے لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا لیا۔

"لگتا ہے آج کل تم نے گلے کاٹنے کا کام شروع کر دیا ہے۔" میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اچانک ہی حملہ کر دیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا لہٰذا سٹپٹاتے ہوئے بولا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کام نازی کیا کرتے تھے۔ ان سے میرا کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔"

"ممکن ہے کہ تم کسی کے لیے کام کر رہے ہو۔ اسی لیے تم نے مجھے بے ہوش کیا پھر جین کا گلا کاٹ ڈالا۔"

وہ تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا اور بولا۔ "تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نے کسی کا گلا نہیں کاٹا۔"

"لیکن تم وہاں آئے تھے اور تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ تمہارے مخصوص تمباکو کی بو ابھی تک کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

"ممکن ہے کہ تم کسی خاص مقصد کے تحت وہاں آئے ہو۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی تمہارے پاس ہر وقت ایک چاقو رہتا ہے۔"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہاں ہر شخص اس طرح کا چاقو اپنے پاس رکھتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی پتلون کی دونوں جیبوں کو ٹٹولا لیکن چاقو برآمد نہیں ہوا۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے جیڈ نے یہ چاقو اس وقت اٹھا لیا ہو، جب وہ ہال روم میں مجھے کمرے کی چابی دے رہا تھا۔"

"کیسی چابی؟ جوئے! صاف صاف بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ تمہارے اور جیڈ کے درمیان کیا طے ہوا تھا؟"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا جیسے اپنے منتشر خیالات کو ترتیب دے رہا ہو پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ "جو کچھ مجھے معلوم ہے، وہ سب تمہیں بتا دوں گا لیکن تمہیں بھی میری مدد کرنا ہو گی کیونکہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"لیکن تم وہاں موجود تھے۔ تم نے نیکلس چرانے کے علاوہ مجھ پر حملہ بھی کیا۔"

"ہاں، مجھے جیڈ نے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ اچھے گاہکوں کی ضرورت ہے۔ وہ اس شرط پر مجھے نارتھ

کیرولینا میں اپنی کمپنی کی ایجنسی دینے پر تیار ہو گیا کہ اگر میں وہ ہار چرا کر اسے دے دوں۔ اس ہار کے چوری ہونے میں کسی کا کوئی نقصان نہ ہوتا کیونکہ انشورنس کمپنی یہ نقصان پورا کر دیتی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم انشورنس کمپنی کی طرف سے اس ہار کی حفاظت پر مامور ہو تو میں کبھی اس کام میں ہاتھ نہ ڈالتا۔"

"میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے دل میں سوچا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہا ہے یا واقعی عزت دے رہا ہے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جیڈ نے اپنی بیوی کے کمرے کی چابی اس وقت میری جیکٹ کی جیب میں ڈال دی جب ہم ہال روم میں تھے۔ میں بارھویں منزل پر ایک ستون کی آڑ میں کھڑا تمہارے نکلنے کا انتظار کرتا رہا اور جیسے ہی تم وہاں سے روانہ ہوئے، میں چابی کی مدد سے تالا کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے گلے سے ہار اتارا اور وہاں سے بھاگنے ہی والا تھا کہ تمہارے قدموں کی آہٹ سن کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا اور جیسے ہی تم اندر داخل ہوئے، میں نے پیچھے سے وار کیا اور بھاگ گیا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تو وہ زندہ تھی اور بستر پر صحیح سلامت بیٹھی ہوئی تھی۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "بولتے رہو۔"

"میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ جیڈ نے مجھے اپنے کمرے کا نمبر بتا دیا تھا۔ میں وہاں گیا اور بند دروازے کے نیچے سے کمرا نمبر بارہ سو چوبیس کی چابی اندر کھسکا دی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ کام ہو گیا ہے اور مطلوبہ ہار میرے پاس ہے۔"

"تمہارے خیال میں جیڈ نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"اس نے کوشش کی ہو گی لیکن میں پہلے ہی ٹیلی فون کا تار کاٹ چکا تھا۔" یہ کہہ کر وہ اچانک خاموش ہو گیا جیسے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "وہ یہیں آ رہا ہے۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"جیڈ..... جب تم نے گھنٹی بجائی تو میں یہی سمجھا کہ وہ آیا ہو گا۔ وہ اپنا نیکلس لینے اور مجھے پیسوں کی ادائیگی کرنے کے لیے آ رہا ہے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے جو تم نے اسے اپنے گھر بلا لیا۔ تم بہت زیادہ بے پروا ہوتے جا رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں... محض ایک کاروباری شخص ہے۔"

"میری نظر میں وہ قاتل ہے۔" میں اپنے شبے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے کچن میں کسی کے قدموں کی آواز سنی اور چند لمحوں بعد ہی جیڈ جیمسن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "فرینک ٹھیک ہی کہہ رہا ہے جوئے! تم واقعی بے پروا ہوتے جا رہے ہو۔ تمہارے کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری طرح کوئی بھی بہ آسانی اندر آ سکتا ہے۔"

اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک انچ زخم کا نشان تھا لیکن اس کے باوجود وہ بالکل تر و تازہ نظر آ رہا تھا اور اس کی تیاری دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پارٹی میں شریک ہونے جا رہا ہو۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ویلما کی کلائی پکڑی ہوئی تھی۔

"فرینک!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس وقت میری پوزیشن کافی نازک تھی۔ جوئے مجھ پر اپنا پستول تانے کھڑا ہوا تھا اور اس کے دائیں کندھے کے پیچھے جیڈ کھڑا ہوا تھا۔ میں جوئے سے پانچ چھ فٹ اور جیڈ سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ جیڈ بڑی آسانی سے مجھے اور جوئے کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی اور کہا۔

"کیا ہم سکون سے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟"

جیڈ نے ویلما کو اشارہ کیا اور وہ دونوں قریب پڑے کاؤچ پر بیٹھ گئے۔ جیڈ بولا۔ "ٹھیک ہے، پہلے ہم نیکلس کی بات کر لیتے ہیں۔ میں وہی لینے آیا ہوں۔"

"یقیناً۔" جوئے بولا۔ "لیکن پہلے ایک ڈرنک نہ ہو جائے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ تم اپنا پستول رکھ دو اور ہم سب کے لیے ڈرنک بناؤ۔ تمہارے پاس اسکاچ تو ہو گی۔ ہم سب اسکاچ پئیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

جوئے نے اپنا پستول میز پر رکھا اور مشروب کی ٹرالی کی طرف بڑھ گیا جو کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اسکاچ کی بوتل کھول کر چار گلاس بھرے اور ہم سب نے اپنے گلاس ہاتھوں میں تھام کر اسکاچ کے گھونٹ لینے لگے۔

تبھی میری نظر گلاس پر پڑی۔ اس کی تہ میں جین کا نیکلس ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے گلاس تھام لیا تاکہ جیڈ کی نظر اس نیکلس پر نہ پڑ جائے۔

"میرا خیال ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" وہ اپنے ماتھے کے زخم پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "اب دوبارہ تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔ تم خاصے خطرناک ثابت ہو سکتے ہو۔"

"تم شاید مجھے بھی قتل کر دیتے جب میں ہوٹل کے کمرے میں بے ہوش پڑا ہوا تھا لیکن اس سے تمہارے لیے پیچیدگیاں بڑھ سکتی تھیں۔ تم نے جوئے کو بڑی ہوشیاری سے پھنسانا چاہا تاکہ اس پر ڈاکا زنی کے ساتھ قتل کا الزام بھی لگ جائے..... جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس کا چاقو پہلے ہی چرا چکے تھے جس سے تم نے اپنی بیوی کا گلا کاٹ دیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ "میں ساری رات ویلما کے ساتھ تھا۔"

"جین تم سے طلاق لینا چاہ رہی تھی لیکن تم اس کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ ایسی صورت میں اس کے بیش قیمت ہاروں سے محروم ہو جاتے۔ لہٰذا تم نے ڈاکے کا منصوبہ بنایا تاکہ اس کی آڑ میں اسے قتل کر سکو۔"

"بیوی کو قتل کر دیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو فرینک؟" ویلما بولی۔ "یہ تو میرے ساتھ تھا۔"

"یاد کرو ویلما! اس نے تمہیں چند منٹ کے لیے ضرور اکیلا چھوڑا ہو گا۔ شاید میرے آنے کے کچھ دیر بعد۔"

"تمہارے آنے سے سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔" جیڈ بولا۔ "لہٰذا میں نے ویلما سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گھومنے چلتے ہیں۔"

"میں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور شاور لینے باتھ روم میں چلی گئی۔" یہ کہہ کر ویلما خاموش ہو گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہی وہ وقت تھا جب جیڈ کچھ دیر کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔

جب جوئے تمہارے پاس کاروبار کی بات کرنے آیا تو تم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بے حد ضرورت مند ہے۔" میں جیڈ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا تم اس کو اپنی ایجنسی دینے کے لیے تیار ہو گئے کہ وہ تمہارے لیے نیکلس چوری کرے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تم نے جین کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا الزام بھی جوئے پر ہی آتا کیونکہ وہی نیکلس چرانے گیا تھا۔ درحقیقت تمہیں نیکلس کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ تمہارے منصوبے کا حصہ تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے جین کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا؟" ویلما بولی۔ "اسے کیا معلوم تھا کہ میں شاور لینے باتھ روم میں جاؤں گی اور اسے کمرے سے باہر نکل کر جین کو قتل کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اسے تو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ وہ میرے ساتھ رات گزارے گا۔ ہماری ملاقات اتفاقاً ہی ہو گئی تھی۔"

"ہر منصوبے میں تھوڑی بہت لچک رکھی جاتی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اس میں تبدیلی کی جا سکے۔ مانتا ہوں کہ جیڈ تمہیں پہلے سے نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ تمہارے ساتھ رات گزارے گا لیکن اگر تم نہ ہوتیں تو تمہاری جگہ کوئی اور آ جاتی۔ اس معاملے میں جیڈ کا ریکارڈ قابلِ رشک ہے۔ اس نے منصوبے میں یہ گنجائش رکھی ہو گی کہ اسے کسی دوسری عورت کے ساتھ رات گزارنی ہے تاکہ جائے واردات سے اس کی غیر حاضری ثابت ہو سکے۔"

"لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" وہ بولی۔ "ممکن ہے کہ یہ قتل جوئے نے کیا ہو۔ وہی نیکلس چرانے گیا تھا۔ جین نے مزاحمت کی ہو گی تو اس نے اسے قتل کر دیا ہو گا۔"

"بالکل سامنے کی بات ہے جانِ من۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "جب جیڈ نے جوئے کو اپنی بیوی کے کمرے کی چابی دی تو اس نے جوئے کا چاقو اٹھا لیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اگر اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا؟"

جیڈ نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا۔ اسے دیکھ کر جوئے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جیڈ نے وہ چاقو کھول کر میز پر رکھ دیا۔ اس کا بلیڈ چار انچ لمبا تھا اور اس کے کنارے پر خون جم گیا تھا جسے صاف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "جوئے نیکلس چرا کر نکل رہا تھا کہ میں واپس آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا اور مجھ پر پیچھے سے حملہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد جیڈ وہاں آیا۔ اس وقت میں بے ہوش تھا۔ اس نے جین کو قتل کیا اور چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی بھی اس پر شک نہیں کرے گا کیونکہ تم گواہی دو گی کہ وہ رات بھر تمہارے ساتھ تھا۔ اس طرح جوئے قربانی کا بکرا بن گیا۔ ایک تو اس نے نیکلس چرایا، دوسرے اسی کے چاقو سے یہ قتل ہوا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر میں شاور لینے نہ جاتی تو

جین کی زندگی بچ سکتی تھی کیونکہ ایسی صورت میں جیڈ کو کمرے سے باہر جانے کا موقع نہ ملتا؟"

"نہیں۔ اگر تم شاور لینے نہ جاتیں تب بھی وہ کسی نہ کسی بہانے کمرے سے باہر چلا جاتا۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" جیڈ بولا۔ "میں نے اس کے مشروب میں خواب آور دوا ملا دی تھی لیکن اس نے دو گھونٹ لینے کے بعد گلاس میز پر رکھ دیا۔ تمہارے آنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اسے اسکاچ پلانے کی کوشش کی لیکن تمہاری مداخلت نے سارا معاملہ خراب کر دیا۔" یہ کہہ کر اس نے ویلما کو ہلکا سا دھکا دے کر اپنے آپ سے علیحدہ کیا اور بولا۔ "میں یہاں جوئے کو ادائیگی کرنے، نیکلس لینے اور یہ چاقو چھوڑنے آیا تھا۔ اگر تم اتنے ہوشیار نہ ہوتے تو اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ میں نے یہ چاقو اٹھایا تھا۔ جوئے! تمہاری اسکاچ بہت اچھی ہے لیکن اب مجھے ہوٹل پہنچ کر ایک غم زدہ شوہر کی اداکاری کرنی ہے.... براہ کرم میری امانت مجھے لوٹا دو۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔" وہ فرش کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ مجھے اس کی بے خوفی پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے جو پستول تانے کھڑا ہے اور گزشتہ شب ایک قتل کر چکا تھا۔

"اگر یہاں نہیں تو وہ نیکلس کہاں گیا؟" جیڈ غراتے ہوئے بولا۔

ویلما سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے بولی۔ "تم نے واقعی اپنی بیوی کو قتل کر دیا؟"

"تم اس بارے میں بہت کچھ سن چکی ہو لیکن یہ لوگ میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ تم میرے حق میں گواہی دو گی کہ ساری رات میرے ساتھ تھیں۔"

"بالکل نہیں، میں وہی کہوں گی جو سچ ہے۔" ویلما بولی۔

جیڈ نے اپنا پستول اس کی پسلی میں گڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم میرے حق میں گواہی نہیں دے سکتیں تو مجھے بھی تمہاری ضرورت نہیں۔"

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔ "وہ نیکلس میرے پاس ہے اور میں یہاں اسی لیے آیا تھا کہ اسے حاصل کر سکوں۔ تم جانتے ہو کہ میں انشورنس کمپنی کی طرف سے اس کی حفاظت پر مامور ہوں۔"

"وفادار لوگوں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اپنی خدمت کا معاوضہ پیشگی وصول کر لیا ہوگا۔ وہ نیکلس کہاں ہے؟"

"اس گلاس میں۔" میں نے اسے اشتعال دلانے کی خاطر وہ گلاس اس کے سامنے لہرایا۔ اس نے پستول سے مجھ پر فائر کیا لیکن مجھے فرش پر چھلانگ لگانے کا موقع مل گیا اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور اس میں سے نیکلس نکل کر فرش پر جا گرا۔ جیڈ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانا چاہا لیکن اسی اثنا میں جوئے اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس نے میز پر سے چاقو اٹھایا اور جیڈ کے سینے میں بھونک دیا۔ اس سے پہلے جیڈ فائر کر چکا تھا۔ جوئے بھی لڑکھڑاتا ہوا ایک جانب گر پڑا۔

میں نے جوئے کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی اور بولا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

وہ کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اس کی قمیص کے بٹن کھولے۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ گولی اس کے پھیپھڑوں میں لگی ہے۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

"ویلما! ایمبولینس کے لیے فون کرو۔"

وہ فون کر کے واپس آئی اور جوئے کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "ہمت سے کام لو۔ ایمبولینس آنے ہی والی ہے۔"

"فرینک!" جوئے کراہتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔"

"کیا تم میرے لیے ایک سگریٹ جلا سکتے ہو؟"

میں نے اس کی جیب سے پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ جلا کر اس کے ہونٹوں کے درمیان رکھ دیا۔ اس نے ایک کش لیا اور مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں اور ویلما اپارٹمنٹ سے باہر آ کر پولیس کا انتظار کرنے لگے۔ میرے ہاتھ میں وہی منحوس نیکلس تھا جس کی وجہ سے تین جیتے جاگتے انسان اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ میں چاہتا تو وہ قیمتی نیکلس ویلما کو تحفے میں دے سکتا تھا لیکن مجھے اس کی زندگی عزیز تھی۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس نیکلس کو جین اور جیڈ کے وکیل کے حوالے کر دوں گا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ انہوں نے اپنے ترکے کے بارے میں کیا وصیت کی ہوگی البتہ اس حادثے کے نتیجے میں ویلما دوبارہ میرے پاس آ گئی۔ اس واقعے سے اسے اچھا سبق مل گیا تھا اور وہ آئندہ کسی امیر شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

＊ ＊

قرنطینہ

محی الدین نواب

دولت کی خواہش... عادت اور ہوس میں بدل جائے تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے... مال و متاع کی ہوس میں ہر بٹی اختیار کرنے والوں کا عبرت ناک و عبرت اثر ماجرا... وہ دولت جو مل جائے تو زندگی کو عیش کدہ بنا دیتی ہے۔ ایسی ہی لاحاصل دولت کا حصول جس کی خاطر ہر شخص کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی... لمحہ بہ لمحہ زندگی کی سانسیں کم ہو رہی تھیں... اور عیش و عشرت کا سامان کر دینے والی دولت ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔

ان کم نصیبوں کا المیہ جو منزل پر پہنچ کے بھی طمع بے کنار ٹھہرے

سب اسے موسیٰ بھائی کہتے تھے لیکن احتراماً نہیں۔ ممبئی میں ہر بڑے بدمعاش کو خوش آمدانہ انداز میں بھائی بولتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ایسے بھائی سب کی بولتی بند کر دیتے ہیں۔

جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کی ارتھی اٹھاتے سے کہا جاتا ہے۔ "رام نام ست ہے" لیکن جب تک وہ زندہ رہتا ہے، کہتا ہے۔ "موسیٰ بھائی ست ہے۔ قانون، عدالت پست ہے۔"

اس کا جسم باڈی بلڈر کی طرح سخت تھا۔ قد بھی اچھا خاصا تھا۔ وہ اپنا سینہ ٹھونک کر کہتا تھا۔ "یہ باڈی چاند ماری ہے۔ پولیس کی گولیاں لگتی رہتی ہیں۔ بے چارے شرمندہ ہیں کہ پھر بھی چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے لگاتا اور پولیس والے سبکی محسوس کرتے۔ بڑی بڑی ڈکیتی اور قتل کی وارداتیں اس سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن ثبوت اور گواہوں کی عدم موجودگی اسے جیل سے باہر لے آتی تھی۔

اس نے شادی نہیں کی تھی، کہتا تھا۔ "جب شادی روز کی جا سکتی ہے۔ روز توڑی جا سکتی ہے تو زنجیر کیوں بنایا جائے؟"

ایک پولیس افسر نے اسے سمجھایا۔ "شادی کر لے زندگی سنور جائے گی۔ بیوی اور اولاد کی محبت میں تیری زندگی گزارے گا۔"

اس نے کہا۔ "اے آفیسر! کوئی شریف ہوگی تو زندگی شریفانہ ہوگی۔ تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ جن بچوں کو تمہارا نام دے رہی ہے، وہ تمہارے ہی ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "کیا بکواس کرتے ہو؟ کیا دنیا کی ساری عورتیں بھروسے کے قابل نہیں ہوتیں؟"

"ہوتی ہیں لیکن ان کے درمیان ایسی بھی ہوتی ہیں جو قطعی ناقابلِ اعتبار اور بھروسے کے قابل نہیں ہوتیں۔"

افسر نے ناگواری سے کہا۔ "تمہارے جیسے جاہل کو سمجھانے والا کوئی گدھا ہی ہوگا۔ میں تو کان پکڑتا ہوں۔"

اس نے شادی نہیں کی تھی لیکن ورشا کماری سے کسی حد تک متاثر ہوا تھا۔ وہ بھی ہیرا پھیری سے مال کماتی تھی۔ کبھی کسی واردات میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ بات کچھ ایسی تھی کہ اس سے کترائی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے نہیں آتی تھی یوں اس کے حواس پر چھائی رہتی تھی۔

ورشا کی مختصری ہسٹری یہ ہے کہ اس نے ایک آشرم میں پرورش پائی تھی۔ چودہ برس کی عمر تک مندر کی داسی بن کر رہی۔ روز صبح و شام مندر کے فرش کی دھلائی کرتی۔ ایک رات پنڈت اور پجاری نے اس پر ہاتھ صاف کر دیا۔ اسے دھمکی دی کہ وہ اگر مندر کمیٹی کے عہدیداروں سے شکایت کرے گی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اگرچہ وہ کم سن تھی لیکن فطرتاً ضدی تھی۔ گرم مزاج کی حامل تھی۔ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ دوسری رات پھر

مجبور ہونے سے پہلے وہاں سے فرار ہو گئی۔
وہ شہر کا بہت بڑا مندر تھا۔ امیر کبیر گھرانوں کی فیملیز وہاں پوجا کے لیے آتی تھیں۔ پارکنگ ایریا میں بڑی مہنگی کاریں کھڑی رہتی تھیں۔ ورشا کو ایک داسی کی حیثیت سے سب ہی جانتے تھے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے چھپتی ہوئی ایک کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔
گاڑیاں ہمیشہ لاک رہتی ہیں۔ اس کے نصیب سے کار کا مالک گاڑی کے تمام دروازوں کو لاک کرنا بھول گیا تھا۔ وہ اگلی پچھلی سیٹوں کے درمیان اوندھے منہ لیٹ کر رام نام جپنے لگی۔
تھوڑی دیر بعد کروڑ پتی اوجھال اپنی پتنی کے ساتھ اگلی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اسے پارکنگ ایریا سے نکال کر مندر کے وسیع و عریض احاطے سے باہر آ کر اپنی پتنی سے بولا۔ ”پنڈت جی نے پورے یقین سے کہا ہے۔ روز یہاں آ کر پوجا کا پرساد کھاتی رہو گی تو ہماری منوکامنا ضرور پوری ہو گی۔ تم ضرور ماں بنو گی اور میری برسوں سے باپ بننے کی اِچھا پوری ہو جائے گی۔“
ورشا نے ایک ذرا سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور سوچا۔ ’مجھے رونا چاہیے اور انہیں اپنا دکھڑا سنانا چاہیے۔ آنسو نہیں بہاؤں گی۔ ناٹک نہیں کروں گی تو ان کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکوں گی۔‘
وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ سیٹھ نے چونک کر اپنی پتنی سے پوچھا۔ ”تم کوئی آواز سن رہی ہو؟“
وہ ایکدم سے پیچھے گھوم کر بولی۔ ”پیچھے سے آ رہی ہے۔“
ورشا سایہ سایہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ سیٹھانی نے خوف سے چیخ کر کہا۔ ”اِدھر کوئی ہے۔“
سیٹھ اوجھال نے اچانک گاڑی کو بریک لگائے۔ بڑی پھرتی سے اندر کی لائٹ آن کرتے ہوئے اپنے لباس سے پستول نکالتے ہوئے للکارا۔ ”کون ہے؟“
وہ سیٹوں کے درمیان سے ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اوجھال نے کہا۔ ”یہ تو ورشا ہے۔“
سیٹھانی نے کہا۔ ”تم مندر کی داسی ہو۔ ہماری گاڑی میں کیسے آ گئیں؟“
وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں مندر میں نہیں رہوں گی۔ وہ لوگ پاپی ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ پاپ کیا ہے۔“
سیٹھانی نے پوچھا۔ ”پاپ اور مندر میں؟ کس نے کیا ہے؟“
”پنڈت جی اور پجاری نے...“
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنی پتا نہیں سنانے لگی۔ وہ دونوں تعجب سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سیٹھانی نے کہا۔ ”واپس چلیں۔ آپ مندر کمیٹی کے بڑے ممبر ہیں۔ ابھی ان کی گردنیں دبوچ کر انہیں وہاں سے باہر نکالیں۔“
ورشا نے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ انہوں نے کہا تھا۔ کسی سے بولوں گی تو میری ہتیا کر دیں گے۔“
سیٹھانی نے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مندر کے پنڈت اور پجاری نے ایسا کام کیا ہے؟ تھو ہے ان پر۔ آپ ابھی کمیٹی کے چیئرمین کو بلائیں۔ مندر واپس چلیں۔“
اوجھال نے پتنی سے کہا۔ ”رکمنی! جلدی نہ کرو۔ جوش میں نہ آؤ۔ پنڈت اور پجاری کے پاپ کو ظاہر کرنے سے ہمارا مندر اور دھرم بدنام ہو گا۔“
وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”گھر چلو۔ میں چیئرمین سے فون پر بات کروں گا۔ اس معاملے کو اندر ہی اندر نمٹایا جائے گا۔ پنڈت اور پجاری کو رازداری سے سزا دے کر مندر سے نکال دیا جائے گا۔“
سیٹھانی رکمنی نے ورشا کا ہاتھ تھام کر اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”جب تک وہ شیطان وہاں ہیں، تم ہمارے گھر میں رہو گی۔ ڈرو نہیں۔ کوئی تمہاری ہتیا نہیں کرے گا۔“
وہ ڈرنے والی نہیں تھی۔ محض ہمدردی حاصل کرنے کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔ ورشا اندر ہی اندر مردوں کے خلاف نفرت سے سوچ رہی تھی کہ پنڈت اور پجاری ایسے ہیں تو باقی مرد ان سے زیادہ پاپی اور قابلِ نفرت ہوں گے۔
وہ اوجھال کی شاندار کوٹھی میں آ گئی۔ وہاں یہ معلوم ہوتا رہا کہ ان گناہ گاروں کے خلاف کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ ایک ہفتے کے بعد اوجھال کے سالے جگدیو نے اس سے کہا۔ ”کوئی کارروائی نہیں ہو رہی ہے۔ وہ دونوں پاپی پہلے کی طرح مندر میں عزت اور احترام سے ہیں۔“
وہ بولی۔ ”مجھ سے جھوٹ کیوں بولا جا رہا ہے۔ میں یہاں کب تک رہوں گی؟“
”کیا تم جیجاجی (اوجھال) کی مہربانیوں کو نہیں سمجھ رہی ہو؟ انہوں نے اپنے لیے تمہیں رکھا ہے۔“
وہ پریشان ہو گئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”پوجا مندر کے بعد اب یہاں سے بھی بھاگو گی؟“

ورشا کے سینے میں دل نہیں، پتھر تھا۔ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”اب میں آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ پوچھوں گی کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟“
”میرا دل خوش کرو گی تو اپنی دیدی (رکمنی) کے لاکھوں روپے کے زیور تمہیں دوں گا۔ یہاں سے جا کر ان کے ذریعے کہیں آرام سے زندگی گزار سکو گی۔“
ورشا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اسے اپنی مرضی سے کہیں جا کر زندگی گزارنے کا راستہ مل رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”زیورات سے مجھے کتنے روپے ملیں گے؟“
”چالیس پچاس لاکھ ضرور مل جائیں گے۔“
”میں اکیلی لڑکی کہیں زیورات بیچنے جاؤں گی تو پکڑی جاؤں گی۔ تم انہیں بیچ کر نقد دو گے تو پھر جو بولو گے وہ کروں گی۔“
جگدیو نے دو دن کے بعد کہا۔ ”وہ زیورات میں نے دیدی کے کمرے سے چرائے ہیں۔ ان کے پاس اتنا سونا ہے کہ انہیں کچھ دنوں تک چوری کی خبر نہیں ہو گی۔“
ورشا نے کہا۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں ایک معمولی لڑکی ہوں۔ میرے ساتھ پاپی بننے کے لیے تم ماں جیسی بہن کو نقصان پہنچا رہے ہو؟“
وہ بولا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ میری سگی بہن نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم معمولی لڑکی نہیں ہو۔ اتنی سندر ہو کہ ممبئی جاؤ گی تو ڈائریکٹر پروڈیوسر تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ میں بھی یہاں سے بھاگ کر تمہارے ذریعے فلموں میں چانس لینا چاہتا ہوں۔“
وہ سمجھ گئی کہ جگدیو ایک تیر سے تین شکار کھیل رہا ہے۔ اس کا پہلا کھیل یہ ہے کہ اس نے لاکھوں روپے کے زیورات اپنے فائدے کے لیے چوری کیے ہیں۔
دوسرا کھیل یہ ہے کہ مجھ سے ہوس پوری کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا کھیل یہ ہے کہ مجھے انڈسٹری میں بکاؤ مال بنا کر وہاں اپنا چانس لینا چاہتا ہے۔
اس نے کہا۔ ”تم بھی میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو پچاس لاکھ کے زیورات سے کام نہیں چلے گا اور لمبا ہاتھ مارنا ہو گا۔“
اس نے ایک ہفتے کے اندر ایک اور لمبا ہاتھ مارا۔ ... کے زیورات چرائے۔ چور بازار سے ان کے ... ہو گئے۔ ایک نئی جنت جیسی زندگی گزارنے کے لیے یہ ... رقم تھی۔ وہ اسی رات ممبئی جانے کے لیے ایک ٹرین میں سوار ہو گئے۔
وہ پہلی بار جھوٹ فریب اور چوری کی واردات میں شریک ہوئی تھی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ ایک تنہا لڑکی فریبی دنیا میں بدمعاش بن کر ہی زندگی گزار سکتی ہے۔ وہ دونوں رات کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں چند مسافر تھے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ جلدی سو گئے۔ جگدیو بھی نیند کا متوالا تھا۔ وہ رات کسی پہر گہری نیند میں ڈوب گیا۔
کمپارٹمنٹ میں بھیک مانگنے والے آتے جاتے رہتے تھے۔ ایسے وقت ایک بوڑھے میاں بیوی وہاں آئے۔ بوڑھی نے ورشا سے کہا۔ ”بیٹی! ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھگوان کے لیے ایک روٹی کھلا دو۔“
ورشا نے انہیں بچا ہوا کھانا دے دیا۔ وہ واقعی بھوکے تھے وہیں بیٹھ کر کھانے لگے۔ اپنا دکھڑا سنانے لگے کہ بیٹے اور بہو نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ابھی کھانے کو مل گیا ہے۔ پتا نہیں کل کیا ہو گا۔
ورشا ان کی باتیں سن رہی تھی اور دور تک سوچ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا میرے ساتھ رہو گے؟“
وہ فوراً ہی احسان مندی سے اس کے پاؤں چھو کر اسے دعائیں دینے لگے۔ وہ ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر بولی۔ ”پھر کبھی میرے پاؤں کو ہاتھ نہ لگانا۔ تم دونوں میرے ماں باپ بن کر رہو گے۔ میں جہاں جاؤں گی وہاں میرے بزرگ اور سرپرست کہلاؤ گے۔“
وہ انہیں سمجھانے لگی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اور انہیں آئندہ کس طرح ان کے ساتھ رہنا ہے۔ ٹرین ایک اسٹیشن پر رک گئی۔ جگدیو اوپر کی برتھ پر سو رہا تھا۔ اس کے پیچھے نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ رکھا تھا۔ ورشا نے بوڑھے کو اپنا بیگ دے کر کہا۔ ”ٹرین سے اترو۔ میں آ رہی ہوں۔“
وہ دونوں اتر گئے۔ اس نے جگدیو کے پاس آ کر اس کے پیچھے سے بڑی آہستگی سے بیگ کو اٹھا کر دل میں کہا۔ ’میں ایک ہی بار دو مردوں سے ڈسی گئی ہوں۔ دوسری بار یہ غلطی نہیں کروں گی۔ اب تم لوگوں کو ڈستی رہوں گی۔‘
وہ بیگ اٹھا کر ٹرین سے اتر گئی۔ کوئی اسے تنہا لڑکی سمجھ کر اس کے لیے مصیبت نہیں بن سکتا تھا۔ کوئی پولیس والا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اکیلی کہیں سے بھاگ کر آئی ہے۔ وہ ان بوڑھوں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ پھر لانگ روٹ کے بس اڈے پر آ کر ایک بس میں سوار ہو کر مدھیہ پردیش کے شہر ناگپور پہنچ گئی۔
یوں اس نے اپنی زندگی میں پہلے شخص کو نقصان

پہنچایا۔ اسے الو بنا کر چالیس لاکھ روپے ہتھیا لیے۔ وہ فرضی ماں باپ بننے والے مسلمان تھے۔ اس نے بھی ایک اسلامی نام جمیلہ رکھ لیا اور عبا پہن کر نقاب میں رہنے لگی۔ یہ بہروپ اسے پسند آ گیا۔ وہ نقاب میں رہ کر کسی حد تک ہوس پرستوں سے محفوظ رہ سکتی تھی اور واردات کرنے کے بعد آسانی سے گم ہو سکتی تھی۔

اس شہر میں اس نے تین برس گزارے۔ سترہ برس کی بھرپور دوشیزہ بن گئی۔ وہاں کے جرائم پیشہ لوگوں کے متعلق معلومات حاصل کرتی رہی۔ کبھی عبا سے باہر آ کر ان کی چھوٹی بڑی وارداتوں میں شریک ہوتی رہی۔ اس دوران میں اس نے ریوالور اور رائفل سے اچھی نشانہ بازی سیکھ لی۔ چار برس بعد جب وہ ممبئی آئی تو اس کا پہلا ٹکراؤ موسیٰ بھائی سے ہوا۔

دوسرے ممالک سے اسمگل ہو کر آنے والی ہیروئن، چرس اور افیون ممبئی آتی ہے پھر ممبئی کے بلیک سی پورٹ سے افریقہ کے چند ممالک میں پہنچائی جاتی ہے۔ یہ دھندا انڈر ورلڈ ڈرگ مافیا کے ہاتھوں میں ہے۔ جرائم کے ان بڑے پہاڑوں کے سامنے موسیٰ بھائی ایک معمولی وارداتیا تھا۔ اس کے باوجود وہ پولیس کے علاوہ بڑے خطرناک مجرموں کے لیے بھی دردِ سر بنا رہتا تھا۔ ایسا اچکا تھا کہ بڑے بڑے مجرموں کا مال چرا کر لے جایا کرتا تھا۔

کولابا کے ایک اڈے سے وائٹ پاؤڈر کے پیکٹس بلیک سی پورٹ کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ موسیٰ نے معلوم کیا تھا کہ وہ مال کولابا سے نکالا جائے گا اور فلورا فاؤنٹین کے راستے پورٹ کی طرف لے جایا جائے گا۔

پولیس کی پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لیے دو بوڑھی عورتوں کو اور دس بارہ برس کے دو بچوں کو استعمال کیا گیا تھا۔ ایک بچے نے اسکول کے بیگ میں وہ پیکٹس رکھے تھے۔ دوسرے بچے کے شاپر میں ہرے پتوں والی سبزیاں تھیں ان کے درمیان مال چھپایا ہوا تھا۔

دونوں بوڑھی عورتوں نے آٹے اور چاول کی دو گٹھڑیاں بنا کر سر پر رکھ لی تھیں۔ وہ چاروں ایک دوسرے سے دور رہ کر ایک ہی جگہ مال پہنچانے جا رہے تھے۔ موسیٰ ایک بوڑھی کا تعاقب کرتا ہوا ایک بس اسٹاپ پر آیا۔ وہاں مسافروں کی بھیڑ تھی۔ وہ سر پر گٹھڑی اٹھائے بس پر سوار نہ ہو سکی۔ دھکے کھاتی ہوئی پیچھے رہ گئی۔ بڑھاپے اور کمزوری کے باعث ہانپنے لگی۔

موسیٰ نے اس کی گٹھڑی چھیننے کے انداز میں لے کر کہا۔ ”اماں! تم بس پر چڑھو۔ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میری گٹھڑی دو۔ میں [illegible] خود ہی چڑھ جاؤں گی۔“

وہ اسے آگے کی طرف دھکا دیتے ہوئے [illegible] ”گٹھڑی کے لیے نہ مرو۔ بس جانے والی ہے۔ مجھ [illegible] ہے چلو اوپر چڑھو۔“

وہ دھکے کھاتی ہوئی بس میں چڑھ گئی۔ [illegible] ہوئے اس نے باہر دیکھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

بس چل پڑی۔ اسے موسیٰ کی جھلک دکھائی دی۔ [illegible] فٹ پاتھ پر تھا۔ ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کر اشارے سے اسے الوداع کہہ رہا تھا۔ بس رفتار پکڑ چکی تھی۔ وہ بیچاری فوراً ہی [illegible] نہ سکی۔

وہیں بھیڑ میں ورشا کھڑی ہوئی تھی۔ اسے [illegible] جانتا نہیں تھا۔ وہ بھی کسی کا مال اچکنے کی تاک میں تھی۔ وہاں کسی شکار کو تاڑ رہی تھی پھر اسے موسیٰ کو تاڑنے میں دیر نہیں لگی۔

وہ گٹھڑی کو ایک بغل میں داب کر وہاں سے جا رہا تھا۔ وہ بڑھیا واپس آ سکتی تھی۔ اس لیے فوراً ہی وہ جگہ چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ورشا اس کے پیچھے ہو گئی۔ اس وقت وہ پردہ نشین نہیں تھی۔ اس نے اپنی عبا اور نقاب کو تہ کر کے بیگ میں رکھ [illegible] تھا۔ اکثر [illegible] لمبا ہاتھ مارنے کے بعد عبا پہن کر چھپ جاتی تھی۔ ڈھونڈنے والے اسے ڈھونڈتے ہی رہ جاتے تھے۔

موسیٰ سڑک پار کر کے دوسری سڑک پر آ گیا۔ پھر ایک گلی سے گزرتے ہوئے تیسری سڑک پر پہنچ گیا۔ وہ انسپکٹر عبداللہ کا علاقہ تھا۔ اسے بھونے ہوئے چنے اچھے لگتے تھے۔ [illegible] علاقے کا راؤنڈ لگاتے وقت چنے چباتا رہتا تھا۔ [illegible] وقت [illegible] سپاہیوں کے ساتھ چنے چباتا ہوا وہ ایک فٹ پاتھ سے گزر [illegible] تھا۔

[illegible] چانک دوسری فٹ پاتھ کی طرف دیکھ کر [illegible] ایک سپاہی سے بولا۔ ”ابے باشو! ادھر دیکھ۔ [illegible] موسیٰ دکھائی دیا تھا۔ اب اس کی پیٹھ دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے نیلی شرٹ پہنی ہے۔“

سپاہی باشو ادھر توجہ سے دیکھنے لگا۔ عبداللہ نے [illegible] ”ابے جلدی بول وہی ہے نا؟“

وہ بولا۔ ”میرا منہ دکھائی نہیں دے رہا ہے مگر وہ [illegible] شرٹ والا موسیٰ ہی لگ رہا ہے۔“

”وہی بدمعاش ہو گا۔ بغل میں مال دبا [illegible] ہے۔ چل ادھر۔ اسے آواز دے۔“

وہ سڑک پار کرنے کے لیے فٹ پاتھ [illegible] گاڑیاں اتنی تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں کہ وہ [illegible]

فٹ پاتھ پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اُدھر موسیٰ نے پولیس کی وردیاں دیکھ لی تھیں۔ اپنا منہ دوسری طرف گھما کر اپنی رفتار بڑھا رہا تھا۔

ورشا نے سوچا۔ ”اس نے رفتار کیوں بڑھا دی ہے؟ کیا شبہ ہو گیا ہے کہ میں پیچھا کر رہی ہوں؟ مگر نہیں۔ یہ پیچھے پلٹ کر مجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔ دوسری جانب فٹ پاتھ کی طرف دیکھ رہا ہے۔“

ورشا نے چلتے چلتے سر گھما کر ادھر دیکھا تو پولیس والے دکھائی دیے۔ وہ اس طرف آنے کے لیے سڑک پار کر رہے تھے۔ تب سمجھ میں آیا کہ موسیٰ بھاگنے کے انداز میں کیوں چل رہا تھا۔

ان دنوں وہ موسیٰ کو جانتی پہچانتی نہیں تھی۔ پولیس کو دیکھ کر سمجھ گئی کہ ممبئی کے وردی والے اسے پہچانتے ہیں۔ یقیناً ایک نمبر سے دس نمبر تک اس کا کوئی نمبر ہو گا اور وہ اس وقت کسی نمبری بدمعاش کا پیچھا کر رہی ہے۔

آگے ایک بہت بڑا کریانہ اسٹور تھا۔ دکان کا مالک کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”آؤ موسیٰ بھائی! معلوم ہوتا ہے لمبا ہاتھ مار کر آئے ہو؟“

موسیٰ نے اس کے آگے گٹھڑی رکھ کر کہا۔ ”چاچا! اسے جلدی چھپا دو اور کوئی دوسری گٹھڑی یا بھرا ہوا شاپر مجھے دے دو۔“

ورشا اس دکان کے شوکیس کے پاس رک کر دیکھ رہی تھی۔ یہ معلوم ہوا کہ اس کا نام موسیٰ ہے اور دکان دار اسے موسیٰ بھائی کہتا ہے۔ چاچا وہ گٹھڑی پھرتی سے دکان کے اندر ایک چھوٹے سے گودام میں لے گیا۔ پھر باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک بھرا ہوا شاپر تھا۔ اس نے موسیٰ سے کہا۔ ”اس میں ایک درجن صابن، ٹوتھ پیسٹ اور شیونگ کا سامان ہے۔ یہ بتاؤ مال کیا ہے؟“

موسیٰ نے کہا۔ ”وائٹ پاؤڈر ہے۔ تمہیں اچھا کمیشن ملے گا۔ پولیس میرے پیچھے ہے اگر وہ مجھے لے گئے تو میرا کوئی آدمی آئے گا۔ وہ کوڈ ورڈز بولے گا۔“

پھر وہ سوچ کر بولا۔ ”غور سے سنو اور یاد رکھو۔ جو مال لینے آئے گا۔ وہ بولے گا۔ ’پیچھے والے پیچھے رہ جاتے ہیں تم [illegible] جاتے ہیں۔‘ یہ سن کر اسے گٹھڑی دے دینا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی انسپکٹر عبداللہ دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ہم پولیس والوں کی بھی کیا قسمت ہے۔ کتوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور ہانپتے رہتے ہیں۔ کیوں رے موسیٰ! بغل میں کیا دبا کر لے جا رہا تھا؟“

وہ بولا۔ ”کچھ نہیں یہ آپ کے سامنے ہے۔ اسے یہاں لایا ہوں۔“

”کیا ہے اس میں؟“

”صابن، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان۔ میں نے سارے غلط دھندے چھوڑ دیے ہیں۔ آج کل چلتی پھرتی دکان داری کر رہا ہوں۔ دکان دکان جا کر مال بیچتا ہوں۔“

”ابے کیوں ہماری پیٹ پر لات مارتا ہے۔ چوری بدمعاشی چھوڑ دے گا تو ہمارا تھانہ کیسے چلے گا؟“

وہ شاپر کے اندر جھانک کر دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”ہاں لگتا تو ہے کہ آدمی بن گیا ہے مگر یہ کہاوت تو بدل نہیں سکتی ہے نا کہ کتے کو گنگا نہلا کر لے آؤ پھر بھی دُم ٹیڑھی ہی رہے گی۔“

پھر وہ دکان دار سے بولا۔ ”تم سچ بولو۔ کیا یہ چلتی پھرتی دکان داری کر رہا ہے؟ تم اس کا سامان خریدتے ہو؟“

دکان دار نے کہا۔ ”ہاں مال کی ورائٹی اچھی ہے۔ میں ان سب کے چھ سو روپے دے رہا ہوں۔“

اس نے گدی پر آ کر چھ سو روپے نکالے پھر انہیں لا کر موسیٰ کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ موسیٰ روپے اٹھا کر جیب میں رکھنے لگا۔ انسپکٹر ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ جیب میں رکھنے کی چیز نہیں ہے۔ چل تیرے انسان بننے کی خوشی میں جشن منایا جائے۔ وہ سامنے ریسٹورنٹ ہے۔“

وہ چپ چاپ ان کے ساتھ دکان سے باہر چلا گیا۔ ورشا دوسری دکان کی طرف چلی گئی تھی تاکہ ان کی نظروں میں نہ آئے۔ اس نے انسپکٹر کی یہ بات نہیں سنی تھی کہ وہ موسیٰ کو قریبی ریسٹورنٹ میں لے جا رہا ہے۔

جب وہ دوسری طرف جانے کے لیے سڑک پار کرنے لگے تو وہ دکان کے اندر آ گئی۔ دکان دار نے شاپر کاؤنٹر کے پیچھے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”بولو بیٹی! کیا لینا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”موسیٰ ابھی گٹھڑی دے گیا ہے۔“

اس نے چونک کر ورشا کو دیکھا پھر کہا۔ ”اتنی جلدی...؟ اُدھر وہ گیا ہے اِدھر تم آ گئیں۔“

”ہاں اس نے اپنے پیچھے رہنے کو کہا تھا اور سمجھایا تھا کہ مال جہاں بھی چھوڑ کر جائے گا۔ وہاں سے میں لے کے فوراً گھر پہنچا دوں۔“

اس نے کہا۔ ”پہلے تو کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں دیکھی۔“

وہ بولی۔ ”پہلے اس نے میری جیسی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اب دیکھتے ہی پاگل ہوگیا ہے۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”اچھا اچھا۔ اسے تم سے پریم ہوگیا ہے؟“

”ہاں تم سب اسے موئی بھائی کہتے ہو۔ میں بھائی نہیں کہتی۔ سمجھو کہ کیوں نہیں کہتی۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”سمجھ گیا... سمجھ گیا۔ اگر تم اس کی وہ ہو تو کوڈ ورڈز بولو۔“

اس نے کہا۔ ”پیچھے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہم تو آگے کی جانتے ہیں۔“

وہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔“

”تو پھر لاؤ گٹھڑی۔ کہیں پولیس پھر نہ آجائے۔“

”ارے وہ حرام کھانے گئے ہیں۔ ادھر نہیں آئیں گے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔“

وہ پلٹ کر جانے لگا پھر رک گیا۔ ورشا نے پوچھا ”کیا ہوا؟“

وہ بولا۔ ”بہن جی! کچھ خیال نہ کرنا۔ میں پوری طرح سنتوش ہونا چاہتا ہوں۔ بس آخری بات پوچھ رہا ہوں۔ یہ بتائیں گٹھڑی میں کیا ہے؟“

ورشا نے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ وہ آیا تو اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں بولی۔ ”وائٹ پاؤڈر....“

وہ بتیسی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”بس بس۔ اب کوئی چنتا نہیں رہے گی۔ ہے سنتوشی ماں! تیری جے ہو۔“

وہ اندر اسٹور میں جا کر گٹھڑی لے آیا۔ پھر اس کے سامنے رکھ کر بولا۔ ”اسے جلدی سے چھپاؤ۔“

ورشا نے اپنا بیگ کھول کر گٹھڑی کو اس میں ٹھونس لیا۔ پھر دکان سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا کمیشن میں ہی دے کر دوں گی۔ سنتوشی ماں کو پکارتے رہو۔“

اس نے باہر آکر ایک سمت چلتے ہوئے سوچا۔ فوراً عبا میں چھپنا ہوگا۔ دکاندار صورت دیکھ چکا ہے۔ یہ صورت کہیں موئی کو نظر نہ آئے اور پولیس والوں میں بھی اتنی شرافت ہے کہ وہ برقع والیوں کو روکتے ٹوکتے نہیں ہیں۔

وہ سڑک پار کر کے ریسٹورنٹ میں آگئی۔ وہاں کے باتھ روم میں جا کر عبا پہن سکتی تھی۔ وہ فیملی ریسٹورنٹ تھا۔ دور تک میزوں پر مردوں کے ساتھ عورتیں زیادہ دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں دو چار خواتین عبا پہنے ہوئے تھیں۔

ورشا اندر آتے ہی موئی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ ایک میز پر انسپکٹر اور سپاہیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی انسپکٹر سے باتیں کرتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی اس کے ہاتھ میں بیگ کو دیکھا تو ورشا کو یوں لگا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے ٹوائلٹ کی طرف چلی گئی۔

انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھئی تیری نئی ایماندار کمائی کے پیسے ابھی کھائے ہیں۔ پر دل نہیں مانتا ہے کہ تو بدل گیا ہے۔ چلو ہم اسی شہر میں ہیں۔ دیکھیں گے اگلی بار کون سی کمائی کھلائے گا۔“

وہ سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ موئی سمجھ رہا تھا کہ انسپکٹر اب تک اس پر شبہ کر رہا ہے۔ ابھی دو چار گھنٹوں تک کریانہ اسٹور کی طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ لاکھوں کا مال وہاں چھوڑ کر آیا تھا۔ دل میں بے چینی تھی۔ اس نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ”چاچا! میں موئی بول رہا ہوں۔“

وہ چہک کر بولا۔ ”ہاں تو مال تمہارے پاس پہنچ گیا؟“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ کون سا مال میرے پاس پہنچا ہے؟“

”وہی گٹھڑی جو تم نے رکھوائی تھی۔ وہ ابھی لے کر گئی ہے۔“

وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ ”کون لے کر گئی ہے؟“

اس کے چیخ پڑنے پر ہوٹل کے تمام لوگ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر باہر آتے ہوئے بولا۔ ”چاچا! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نے سچ مچ وہ مال کسی کو دے دیا ہے؟ یا مذاق کر رہے ہو؟“

”کیا لاکھوں کے مال کے لین دین میں مذاق کروں گا؟ تم نے کہا تھا۔ تمہارا کوئی آدمی آئے گا وہ کوڈ ورڈز بولے گا۔ اس لڑکی نے بالکل وہی کوڈ ورڈز بولے۔ صرف اتنا ہی نہیں اس نے یہ بھی بتایا کہ گٹھڑی میں وائٹ پاؤڈر ہے۔ پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد میں نے مال اسے دیا ہے۔“

”ارے چاچا! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی لڑکی کو میرا کوڈ ورڈ کیسے معلوم ہوگیا؟ وہ کون تھی؟ کیسی تھی؟ کدھر گئی ہے؟“

”کیا بتاؤں کون تھی؟ کیسی تھی؟ جیسی جوان لڑکیاں ہوتی ہیں ویسی ہی تھی۔“

”ارے کوئی پہچان بتاؤ؟“

”اس کے پاس ایک بیگ تھا۔ اس نے اسی بیگ میں وہ گٹھڑی رکھی تھی۔“

”بیگ کیسا تھا؟“

”معمولی سا سنترے کے کلر کا تھا۔“

موئی کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ ریسٹورنٹ کے دروازے پر تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے اندر ایک لڑکی کو اس طرف جاتے دیکھا تھا جہاں ٹوائلٹ تھا۔ اس کے ہاتھ میں سنترے کے کلر والا بیگ تھا۔

بڑی حد تک سراغ مل گیا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ کے اندر آتے ہوئے بولا۔ ”چاچا! مجھے لگتا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو یہاں ریسٹورنٹ میں دیکھا ہے۔ تم اسے اچھی طرح پہچان سکو گے فوراً یہاں آؤ۔“

”ملازم آج نہیں آیا ہے۔ دکان کیسے چھوڑ کر آؤں؟“

”چاچا! لاکھوں جانے والے ہیں۔ شٹر گرا کے آؤ۔ جلدی آؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی آتا ہوں۔“

موئی اپنی میز پر آگیا۔ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹوائلٹ سے ادھر ہی ڈائننگ ہال میں آنے والی تھی۔ کہیں جانے کے لیے دوسرا راستہ نہیں تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہی لڑکی ہوئی تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟

کوئی برا سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ غیر قانونی مال تھا۔ لڑکی کو سرِ عام پکڑ کر اس سے غیر انسانی سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دانش مندی یہی ہوتی کہ اس سے دوستانہ رویہ اختیار کر کے اسے کہیں تنہائی میں لے جا کر اس کا کام تمام کیا جاتا۔

موئی نے مٹھیاں بھینچ کر دل میں کہا۔ ”اسے تو کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ سالی جانتی نہیں ہے، میں کون ہوں۔“

دکاندار چاچا آگیا۔ اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ؟ کہاں دیکھا ہے تم نے؟“

”وہ ٹوائلٹ کی طرف گئی ہے۔ خاصی دیر ہوچکی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔“

اس نے بے چینی سے اُدھر جانے والے کوریڈور کو دیکھا۔ اُدھر زنانہ اور مردانہ دونوں ٹوائلٹ تھے۔ مرد بھی آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے چاچا سے کہا۔ ”جب وہ تمہارے پاس آئی تھی تو تم مجھے ایک مس کال دے دیتے پھر میں آندھی طوفان کی طرح آکر سالی کو دبوچ لیتا۔“

”تم تو فون کی سم بدلتے رہتے ہو۔ ابھی جس نمبر سے تم نے فون کیا تھا اور یہاں آنے کو کہا تھا۔ یہ نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ پھر میرے دماغ میں یہ بات تھی کہ تھانیدار کے ساتھ گئے ہو ایسے وقت تم کو فون کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔“

موئی نے کوریڈور کی طرف دیکھتے ہوئے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کہاں مر گئی سالی! باہر نکل۔ تیرا باپ یہاں بیٹھا ہے۔“

وہ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”آتو سہی۔ پہلے تجھے لے جا کر مال وصول کروں گا۔ پھر مزے اڑاؤں گا۔“

چاچا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”آہستہ بولو موئی بھائی! آس پاس دنیا بیٹھی ہے۔“

موئی بے تابی سے اس کے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا... مگر وہ تھی کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کافی دیر بعد جب وہ باہر آئی تو عبا اور نقاب میں چھپی ہوئی تھی اور وہ آٹھ یا نو مہینے کی حاملہ ہوگئی تھی۔ عبا کے اندر اس کا پیٹ نکل آیا تھا۔

وہ حاملہ عورتوں کی طرح ذرا تکلیف سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر آئی۔ قریب ہی ٹوائلٹ میں مرد جا رہے تھے اور باہر آرہے تھے۔ اس نے ایک عمر رسیدہ داڑھی والے شخص کو دیکھا پھر اس کے پیچھے چل پڑی۔

کوریڈور کے سرے پر پہنچتے ہی موئی اور چاچا دکھائی دیے۔ اس نے دل میں کہا۔ ”ہے بھگوان! یہ سمجھ گئے ہیں کہ میں یہاں ہوں۔ تب ہی موئی نے مجھے پہچاننے کے لیے دکاندار کو بلا کر بٹھایا ہے۔“

انہوں نے ایک داڑھی والے کے پیچھے حاملہ عورت کو اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ موئی نے کہا۔ ”اس داڑھی والے کو دیکھو۔ بڑھاپے میں باپ بننے کا اشتہار لگائے پھر رہا ہے۔“

چاچا نے کہا۔ ”یہ دیکھ کر تجھے شرم آنی چاہیے۔ ابھی تک نہ شادی کی ہے۔ نہ بچہ پیدا کیا ہے۔“

وہ جھنجلا کر شادی اور بچے کو گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ ”وہ سالی باہر کیوں نہیں آرہی ہے؟“

وہ داڑھی والے کے پیچھے باہر جا چکی تھی۔ چاچا اسے صبر کی تلقین کرتے ہوئے سمجھانے لگا کہ خواتین کو کیسے کیسے مسائل پیش آتے ہیں۔ وہ باہر آئے گی تو اس کا مسئلہ بھی پوچھ لیں گے۔

اس کے آدھے گھنٹے بعد صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اس نے کوریڈور میں ایک جمعدار اور جمعدارنی کو دیکھا۔ سیدھا اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ دس کا ایک نوٹ نکال کر انہیں دیتے ہوئے بولا۔ ”ادھر لیڈیز ٹوائلٹ میں ایک لڑکی بڑی دیر سے گئی ہوئی ہے۔ باہر نہیں آرہی ہے۔ جا کر دیکھو اور بتاؤ۔ وہ ادھر کیا کر

رہی ہے؟"
جمعدارنی نے کہا۔ "اس لڑکی کی کوئی پہچان بتاؤ۔"
"اس کے پاس ایک سنترے کے رنگ کا بیگ ہے۔ وہ بڑی دیر سے اندر گئی ہے۔ ذرا جلدی جا کر دیکھو۔"
"ابھی جا کر دیکھتی ہوں۔"
وہ لیڈیز ٹوائلٹ کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں وہی سنترے کے رنگ والا خالی بیگ تھا۔ وہ اسے موسیٰ کے سامنے پھینکتی ہوئی بولی۔ "بیگ خالی ہے۔ ادھر پڑا ہوا تھا۔ اندر ابھی تین عمر والی عورتیں ہیں۔ کوئی لڑکی نہیں ہے۔"
چاچا بھی وہاں آ کر یہ باتیں سن رہا تھا۔ موسیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "باہر دیکھو۔ وہ ہم کو الو بنا کر نکل گئی ہے۔"
وہ تیزی سے موسیٰ کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "بیگ کو تو پھینک کر گئی ہے مگر میں اس کو صورت... اور لباس سے پہچانتا ہوں۔ وہ سامنے سے جاتی تو میں دیکھتے ہی پہچان لیتا۔"
وہ ہوٹل کے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ موسیٰ نے حیرانی سے کہا۔ "وہ ہمارے آگے سے کیسے چھپ کر گئی ہوگی۔ پھر اس نے بڑی سی گٹھڑی کہاں چھپائی ہوگی؟"
چاچا نے کہا۔ "عورت تو پوری دنیا کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے پیدا کرتی ہے، تب ہم آباد ہوتے ہیں۔"
موسیٰ نے چونک کر کہا۔ "یعنی کہ اولاد کو پہلے پیٹ میں چھپاتی ہے۔ ارے چاچا! وہ پیٹ والی ہمارے سامنے سے گئی ہے اور... اور وہ دیکھو داڑھی والا بڈھا..."
انہیں وہ داڑھی والا نظر آیا جو عبا والی کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس وقت فٹ پاتھ پر کھڑا ایک پھل والے سے امرود خرید رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اس کے آس پاس کوئی برقع والی نہیں تھی۔
چاچا نے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ فیملی ہے؟"
اس نے ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔ "نہیں۔"
موسیٰ نے کہا۔ "ابھی ہوٹل میں آپ کے ساتھ ایک پردہ نشین تھی۔"
"نہیں تو۔ میرے ساتھ نہیں تھی۔"
"آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔"
وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میاں صاحبزادے! اس عمر میں پیچھا کرنے والیاں کہاں ملتی ہیں۔ ہائے وہ دن ہوا ہوئے، جب پسینہ گلاب تھا۔"
چاچا نے موسیٰ کو کھینچ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "وہی تھی۔ خالی بیگ پھینک کر گئی ہے۔ گٹھڑی کو پیٹ بنا کر ہمیں الو بنا کر گئی ہے۔"
موسیٰ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ دیدے پھاڑ کر چاچا کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ "واہ چاچا! سالی نے کیا مکاری دکھائی ہے۔ اس پر تو پیار آ رہا ہے۔ میں ایسی مکاری سے پیار کروں گا کہ زندگی بھر ہائے ہائے کرتی رہے گی۔ ویسے ہے بڑے کام کی چیز۔"
"وہ تو کہہ رہی تھی کہ تیری بیوی ہے۔ وہ تیرے ساتھ یعنی کہ تو اس کے ساتھ یعنی کہ میں کیا بولوں۔ وہ تیری کچھ نہ ہو کر تیری کھوپڑی پر ناچ کر چلی گئی۔"
"اب ہاتھ آ جائے تو ایسا نچاؤں گا کہ پاؤں کی جوتی بن کر رہ جائے گی۔ جائے گی کہاں؟ یہ ممبئی شہر میرا گھر ہے۔ اس کا کونہ کونہ جانتا ہوں۔ آج ہی اسے کہیں پکڑ لوں گا۔"
"کیسے پہچانے گا۔ اس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ نام نہیں جانتا ہے۔"
"جس پر شبہ ہوگا۔ اسے پکڑ کر تمہارے پاس لاؤں گا۔ تم اسے پہچانو گے۔"
وہ اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ جانتی ہوگی کہ وائٹ پاؤڈر کے خریدار کہاں ہوتے ہیں تو ابھی وہیں گئی ہوگی۔ میں چلتا ہوں چاچا! اسے وہیں پکڑوں گا۔"
وہ ایک طرف جاتے ہوئے فون کے ذریعے ان تمام دو نمبری کہلانے والوں سے رابطہ کرنے لگا۔ جو چھوٹی بڑی وارداتوں میں اس کے کام آتے تھے اور کرمنل ممبئی کی تازہ ترین معلومات فراہم کرتے تھے۔ موسیٰ ان سے کہہ رہا تھا۔
"ہمارے شہر میں بے شمار عورتیں مجرمانہ زندگی گزار رہی ہیں۔ تقریباً سب ہی ہماری نظروں میں آتی رہتی ہیں اور ہمارے لیے کام بھی کرتی ہیں۔ کیا یہاں ایسی کوئی جوان لڑکی ہے جس نے ہم سے ناتا نہیں جوڑا ہو اور تنہا چوری اور ہیرا پھیری کر رہی ہو؟"
دو نمبری بدمعاشوں سے جواب ملا کہ وہ کسی لڑکی کو نہیں جانتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک یہ تھا جو ورشا کو جوہی کے نام سے جانتا تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی واردات کر چکا تھا۔ اس نے فون پر ورشا کو مخاطب کیا۔ "ہیلو۔ جوہی میں ٹنڈن بول رہا ہوں۔"
ورشا نے کہا۔ "ہاں بولو۔"
وہ بولا۔ "میں نے تم کو یہ بات سمجھائی تھی [illegible] خطرناک ہے۔ اکیلی کام نہ کرو۔ میرے پاس [illegible]

تمہیں یہاں کے بڑے مگرمچھوں سے بچاؤں گا مگر تم نے مجھ سے کام لیا اور غائب ہو گئیں۔"
ورشا نے کہا۔ "میں نے ایک چھوٹا سا کام لیا اور تمہیں تین ہزار روپے۔ تم مجھے ڈان اور گاڈ فادر کہلانے والوں سے نہ ڈراؤ۔ اپنی بات کرو، کیوں فون کیا ہے؟"
"تمہیں یہ بتانے کے لیے ممبئی کا موسیٰ بھائی تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"
"میں جانتی ہوں۔ آگے بولو۔"
"تم نہیں جانتیں۔ وہ انسان کے بھیس میں درندہ ہے۔ وہ اب تک چھ معصوم بچوں اور دو عورتوں کی ہتیا کر چکا ہے۔ وہ لاشوں پر کھانے کی پلیٹ رکھ کر کھاتا ہے۔ سوچو جسے معصوم بچوں... اور مجبور عورتوں پر ترس نہ آتا ہو اور جو لاشوں کو کھانے کی میز بنا لیتا ہو وہ کیسا بے حس درندہ ہوگا؟"
"میں اس سے ہوشیار رہوں گی۔ آگے بولو۔"
"آگے کیا بولوں؟ تم بولو کہ وہ تمہیں کیوں ڈھونڈتا پھر رہا ہے؟ تم نہیں جانتیں آج کا دن اور آج کی رات تم پر بھاری ہے۔ تم اپنی ماں کی کوکھ میں بھی جا کر چھپو گی تو تمہیں وہاں سے نکال لائے گا۔"
"کیا تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے؟"
"ہے تب ہی تو کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس آ جاؤ۔"
"میرا بھروسا جیت لوگے تو آ جاؤں گی۔"
"میں تمہیں کیسے جیت سکتا ہوں بتاؤ؟"
"موسیٰ کا پتا ٹھکانا اور اس کی پچھلی ہسٹری بتاؤ۔"
"لمبی ہسٹری ہے۔ فون کا بیلنس ختم ہو جائے گا۔"
"میں پانچ سو کا بیلنس بھیج رہی ہوں۔ آ جائے تو مجھ سے بات کرنا۔"
"اس کے کئی پتے ٹھکانے ہیں۔ ادھر جاؤ گی تو پنجرے سے نکل نہیں پاؤ گی۔"
"تم پانچ سو کا بیلنس اور میرا بھروسا چاہتے ہو یا نہیں؟"
"ہاں ہاں تمہیں پانے کے لیے میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہوں گا۔"
"کھڑے رہو۔ ابھی بیلنس بھیج رہی ہوں۔"
اس نے پندرہ منٹ کے بعد بیلنس حاصل کر کے کہا۔ "میں کیا بتاؤں کہ موسیٰ بھائی کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ ماں باپ کا کوئی پتا نہیں ہے۔ ہم شاید اسی لیے غنڈے بن جاتے ہیں کہ ہماری پیدائش نامعلوم ہوتی ہے۔ ہم شاید اسی لیے ساری دنیا میں بدمعاشی پھیلاتے رہتے ہیں کہ ہمیں گالی بنا کر کیوں لایا گیا ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ وہ پیدائشی قاتل ہے۔ اس نے پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی ماں کو قتل کیا ہے۔"
ورشا نے کہا۔ "بکواس کرتا ہے۔ ایک بچہ اپنی ماں کی ہتیا کیسے کر سکتا ہے؟"
"موسیٰ کا بیان ہے، وہ کہتا ہے کہ جب وہ پیٹ میں تھا تو اس کی ماں روتی تھی اور کہتی تھی، میرے پیٹ میں انسان نہیں، بچھو ہے۔ اندر ہی اندر میرا کلیجا نوچ رہا ہے۔ میرا خون چوس رہا ہے۔ وہ بیچاری نو مہینوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ موسیٰ کو پیدا کرنے کے ایک منٹ بعد ہی مر گئی۔"
وہ اپنے متعلق سوچ رہی تھی اور موسیٰ کے متعلق فون پر سن رہی تھی کہ وہ اس شہر میں کہاں رہتا ہے اور اس نے اب تک کہاں کہاں واردات کی؟ اس نے ٹنڈن سے موسیٰ کا فون نمبر معلوم کیا پھر اس سے رابطہ ختم کر دیا۔
وہ کولابا میں تھی۔ مچھلیاں پکڑنے والوں کو مچھیرے کہتے ہیں۔ وہاں کی زبان میں وہ کولی کہلاتے ہیں۔ کولی کی مناسبت سے ممبئی کا وہ معروف علاقہ کولابا کہلاتا ہے۔ اب وہ بہت ہی ماڈرن ہو گیا ہے تاہم اس کے ایک حصے میں اب بھی مچھیروں کی آبادی ہے۔ ورشا نے اسی آبادی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ وہاں فرضی ماں باپ کے ساتھ گزارا کر رہی تھی۔ آئندہ لمبے ہاتھ مارتے ہوئے اپر کلاس سوسائٹی میں رہنے کا ارادہ تھا۔
اس نے گٹھڑی سے وائٹ پاؤڈر کی چھوٹی چھوٹی سی تھیلیاں نکال کر ایک بیگ میں رکھ کر بیڈ کے نیچے چھپا دی تھیں۔ پہلی بار ڈرگ کا دھندا اس کے ہاتھ آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جتنا مال ہاتھ لگا ہے، اس کی قیمت کیا ہے اور اسے مارکیٹ میں کس طرح بیچنا چاہیے۔
اس نے پھر ٹنڈن کو فون کیا اور پوچھا۔ "وائٹ پاؤڈر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا یہ چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں آتا ہے؟"
وہ بولا۔ "ہاں میں نے ایک آدھ بار چھوٹی تھیلیوں میں دیکھا ہے۔"
"معلوم کرو۔ ایسی ایک تھیلی کی قیمت کیا مل جاتی ہے؟"
وہ حیرانی سے بولا۔ "جوہی! کیا یہ مال کہیں سے ہاتھ لگا ہے؟ ارے تیرے پاس ہے تو بول کتنا مال ہے۔ بیٹھے بیٹھے لکھ پتی بن جائے گی۔"
"زیادہ نہ بول۔ جتنا کہتی ہوں اتنا کر۔ ایک تھیلی کی

قیمت معلوم کرا اور ڈیلر سے میری بات کرا۔ تجھے تگڑا کمیشن دوں گی۔"

وہ بولا۔ "ایک ڈیلر ہے کشوری لال۔ میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں فون کروں گا۔"

ٹنڈن نے جھوٹ کہا تھا۔ کشوری لال ڈرگ کے دھندے میں نہیں تھا۔ وہ بہت ہی ایجوکیٹڈ کمپیوٹر سے کھیلنے والا مجرم تھا۔ ان دنوں اپنے دو ذہین ساتھیوں کے ساتھ ایک بینک لوٹنے کی پلاننگ کر چکا تھا اور اس پلاننگ پر جلد ہی عمل کرنے والا تھا۔

ٹنڈن نے اس کے پاس آ کر کہا۔ "کشوری مہاراج! آپ نے درست کہا تھا، جو لڑکی ممبئی جیسے شہر میں اکیلی کام کر رہی ہے، وہ یا تو جلد ہی پکڑی جائے گی یا بہت ہی لمبا ہاتھ مار کر اپنی ایک فورس بنا لے گی۔"

کشوری لال نے پوچھا۔ "اب کیا ہوا ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے، ہیروئن کی بڑی کھیپ اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں ایک چھوٹی تھیلی کی قیمت معلوم کروں اور کسی ڈیلر سے بات کراؤں۔ میں نے آپ کا نام بتایا ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈیلر بن کر دیکھیں اور اسے شیشے میں اتاریں۔"

کشوری لال نے کہا۔ "ہاں یہ لڑکی حیران کر رہی ہے۔ میں دیکھوں گا کہ کتنا وزن ہے اس کا؟ اگر میرا کام کرے گی تو میری چھایا میں محفوظ رہے گی۔ اسے میرا نمبر دو۔"

ٹنڈن نے ورشا کو کشوری لال کا فون نمبر دے کر کہا۔ "یہ کشوری لال بے ایمانی کے دھندے میں ایماندار ہے۔ تمہیں مال کا اچھا ریٹ دے گا۔ اس سے بات کرو اور میرا کمیشن نہ بھولنا۔"

ورشا نے فون پر رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟"

ورشا کو اس کی بھاری بھرکم آواز اچھی لگی۔ پہلے ہی اس کی آواز نے اسے لاشعوری طور پر متاثر کر دیا۔ وہ بولی۔ "میں جوہی بول رہی ہوں۔ ٹنڈن نے وائٹ پاؤڈر کی بات کی ہوگی؟"

"ہاں۔ ہم کسی نئے اور اناڑی سے مال خریدتے وقت بہت محتاط رہتے ہیں۔ اناڑیوں کو پتا نہیں چلتا کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں اس شہر میں نئی تو ہوں، اناڑی نہیں ہوں۔ پولیس والے وردی میں نہ ہوں۔ تب بھی دور سے ان کی بو سونگھ لیتی ہوں۔"

"ہوں۔ اپنے آپ پر بڑا بھروسا ہے۔ مضبوط ارادے والی ہو۔ میں تم سے مال خریدوں گا۔ کتنی تھیلیاں ہیں؟"

"اسّی تھیلیاں، ایک لکھا ہوا کاغذ اور ایک کنٹوپ ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "وائٹ پاؤڈر سے کاغذ اور کنٹوپ کا کیا تعلق ہے؟"

وہ بولی۔ "کنٹوپ سردیوں میں پہنتے ہیں۔ چہرہ سر سے گردن تک چھپ جاتا ہے۔ صرف ناک کا اور آنکھوں کا حصہ کھلا رہتا ہے۔ لیکن مال کے ساتھ جو کنٹوپ ملا ہے۔ اس میں ایک آنکھ کے برابر سوراخ ہے۔ اس آنکھ جیسے سوراخ میں ایک لینس لگا ہے۔ اسے پہن کر بس ایک آنکھ سے کاغذ پڑھا جائے تو کاغذ میں جو لکھا ہے، وہ صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کے بغیر وہ لکھی ہوئی بات دھندلی دکھائی دیتی ہے۔ پڑھی نہیں جاتی۔"

"تم نے وہ کنٹوپ پہنا ہوگا۔ وہ کاغذ پڑھا ہوگا۔ وہاں کیا لکھا ہے؟"

"انگریزی میں لکھا ہے۔ میں صرف ہندی پڑھنا جانتی ہوں۔"

"تعجب ہے مال کے ساتھ وہ کاغذ کیوں ہے؟ تم انگریزی نہیں پڑھ سکتیں۔ ایسا کرو پہلے وہ کاغذ مجھے پڑھنے دو۔"

"پہلے ریٹ بتاؤ۔"

"ایک تھیلی کے ایک ہزار روپے دوں گا۔ تمہیں اسّی تھیلیوں کے اسّی ہزار روپے مل جائیں گے۔"

"میں مونگ پھلی نہیں بیچ رہی ہوں۔ ایک تھیلی کے تین ہزار دو گے تو سودا ہوگا۔ ایک اور ڈیلر سے بھی میری بات ہونے والی ہے۔ سوچ لو۔"

وہ سوچ رہا تھا اس لڑکی کو کسی بھی طرح ہاتھ میں لینا ہے۔ اسے کسی طرح جھانسا دے کر اپنے پاس بلانا ہے۔ ورنہ موسیٰ تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ورشا نے پوچھا۔ "تمہیں سودا منظور نہیں ہے۔ میں فون بند کر دوں؟"

"ایک منٹ۔ سودے جلد بازی میں نہیں ہوتے۔ مجھ سے رابطہ رکھو۔ صحیح سلامت رہو گی۔ تم اس بات سے بے خبر ہو کہ موسیٰ موت بن کر تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ طوفانی ہوتا ہے۔ ممبئی میں ایک ایک سانس لینے والوں کی ناک تک پہنچ جاتا ہے۔"

"تم ٹنڈن کی طرح ڈرا رہے ہو۔ جبکہ ۔۔ مردوں کی طرح میں بھی مرنے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔"

"مجھے تمہاری دلیری تمہارا مضبوط ارادہ چھو گیا ہے۔ مجھ سے دوستی کرو۔ دوستی کے بعد جس ریٹ پر چاہو گی۔ مال خرید لوں گا۔"

اس نے دوستی کی بات کی تو ورشا کو یوں لگا جیسے وہ بھی اسے قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔ بہت دیر سے اس کی آواز دل میں بج رہی تھی۔ وہ بولی۔ "میں کسی پر بھروسا نہیں کرتی۔ ایک بار تم سے دوستی کرنے کی غلطی کروں گی۔ بولو کب ملنا ہے؟ کہاں ملنا ہے؟"

"تم جہاں کہو گی میں گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ چھ بجے فلورا فاؤنٹین کے پہلے فوارے کے پاس رہوں گی۔ اپنی پہچان بتاؤ۔"

"اس فوارے کے سامنے گیٹ پر ایک مرسڈیز آئے گی۔ اس کا نمبر بی ایم وی ٹو زیرو فور ہے۔"

"میں عبا اور نقاب میں رہوں گی۔ گاڑی میں آ کر بیٹھ جاؤں گی۔ مال لے کر نہیں آؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ پہلے دوستی ضروری ہے۔ ہم چھ بجے مل رہے ہیں اوکے۔ بائے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فون بند کر کے سوچنے لگی۔ یہ کیا ہوا ہے مجھے؟ میں اپنے سائے پر بھروسا نہیں کرتی ہوں اور اس پر کر رہی ہوں۔ کیا اسی کو نادانی کہتے ہیں کہ اندیشوں کے باوجود کسی کے ساتھ نادانی کرنے کو جی چاہتا ہے؟

اس نے اپنے فون کو دیکھا پھر اس کی سم بدل کر موسیٰ کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون ہے؟"

اس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ ورشا نے مسکرا کر کہا۔ "میں ہوں۔"

اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "میں کون؟ نام بتاؤ۔"

"میرا نام ہے چیٹ والی۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ادھر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ فون کو منہ کے قریب لا کر چیخنے لگا۔ "تم وہی ہو؟ ہاں تم وہی ہو۔ ہیلو۔ ہیلو۔ ہیلو۔۔۔"

رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے کال کرنے والی کے نمبر دیکھے پھر سے گالیاں دیتے ہوئے نمبر پنچ کر کے اسے کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں جانتی تھی تم پھر چڑ جاؤ گے اور کال بیک کرو گے۔"

"تم کون ہو؟ پہلی بار ایک لڑکی نے موسیٰ کو صرف پریشان نہیں کیا ہے۔ حیران بھی کیا ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا میرے پاس چوری کا مال ہے؟ جو کوڈ ورڈز میں نے چاچا کو بتائے وہ تمہیں کیسے معلوم ہوئے؟ کیا تم ہمارے کہیں قریب تھیں؟ کیا تم ممبئی میں نئی ہو؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ موسیٰ تمہیں پاتال سے بھی کھود کر نکال لے گا۔ میں نہیں کہوں گا کہ میرے پاس آ جاؤ۔ بس آج یا کل، تمہاری گردن خود ہی میرے ہاتھ میں آ جائے گی۔ سن رہی ہو نا؟"

تب اسے معلوم ہوا کہ فون پھر بند ہو گیا ہے۔ اس نے غصے سے فون کو مٹھی میں جکڑ لیا اور کیا کرتا۔ پتا نہیں کب اس کی گردن ہاتھ میں آنے والی تھی۔ فی الحال وہ ڈرگ کا دھندا کرنے والے چھوٹے بڑے ڈیلروں کو ٹٹول رہا تھا۔ وہ چوری کیا ہوا مال وہیں کہیں بیچنے والا تھا۔ مال بیچنے والا نظروں میں آتا تو وہ بھی پکڑی جاتی۔

وہ شام کو چھ بجے فوارے کے پاس آئی تو کشوری لال کی گاڑی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ ورشا اگلی سیٹ کی طرف آئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا بیگ تھا۔ وہ بیگ اٹھائے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اس نے پوچھا۔ "بیگ میں کیا ہے؟"

"وائٹ پاؤڈر۔"

"تم نے کہا تھا مال لے کر نہیں آؤ گی۔ پہلے دوستی ہوگی۔"

"فون پر تمہاری آواز اور لہجے نے سمجھا دیا کہ دوستی کر لینی چاہیے۔ ایک لڑکی کو اوّل یا آخر کسی ایک مرد پر بھروسا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تھینک یو۔ تم نے ملاقات سے پہلے ہی مجھ پر بھروسا کیا ہے۔ میں تمہارے بھروسے کی لاج رکھوں گا۔"

ورشا نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ وہ اس سے عمر میں دگنا ہوگا لیکن بوڑھا نہیں تھا۔ اس کے چہرے اور جسم سے جوانی اور صحت مندی نمایاں تھی۔ اس نے عینک پہنی تھی اس عینک کے باعث اس کی شخصیت بھاری بھرکم لگ رہی تھی۔

وہ بولا۔ "ایک بات کہوں۔۔۔ تم بہت خوبصورت ہو۔"

وہ مسکرا کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ "اچھا ہوا میرے پاس آ گئیں۔ تم چھٹے ہوئے بدمعاشوں کی دنیا میں آئی ہو۔ یہاں تمہاری چٹنی بن جاتی۔ اب کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تم میری مسز کہلاؤ گی۔"

"مسز بننے کے بعد بھی پردے میں رہوں گی۔ کسی بھی غیر ضروری شخص کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ اگر کسی واردات میں تمہیں میری ضرورت ہو تو میں عبا پہن کر یا بھیس بدل کر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں ایسی پردہ داری سے آج تک

بہت فائدہ اٹھاتی آئی ہوں۔"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے ایک مکان کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہارا طریقۂ کار بہت خوب ہے۔ ہمارے پیشے میں خود کو جس قدر چھپا کر رکھو اتنی ہی سلامتی ملتی ہے۔"

وہ دونوں کار سے اتر کے مکان کے اندر آئے۔ ایک بڑے سے کمرے میں دو کمپیوٹر اور بڑے سائز کے مونیٹر اور آڈیو وڈیو کے مختلف سامان ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ کشوری لال نے کہا۔ "یہ ہمارا پروجیکشن روم ہے۔ میرے دو گہرے اور قابل اعتماد دوست ہیں۔ ایک کا نام آنند تیواری اور دوسرے کا نام وجے بھاسکر ہے۔ ہم تینوں بینک ڈکیتی کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ میں کمپیوٹر کا کھلاڑی ہوں۔ زبردست ہیکر ہوں۔ بینک کے ایک اکاؤنٹ سے کروڑوں روپے اپنے.... اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے والا ہوں۔ میں تمہیں اس پروجیکٹ کی پوری تفصیل اطمینان سے سمجھاؤں گا۔"

وہ اپنا بیگ ایک میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "پہلے اسے دیکھو جو میں لائی ہوں۔"

"مجھے ڈرگ کے دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تمہارا یہ مال میں کسی دوسرے سے فروخت کرا دوں گا۔ اس کی تمام رقم تمہاری ہوگی۔ کیونکہ آج سے جو چیز میری ہے، وہ تمہاری ہے۔"

وہ آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ کر بولی۔ "میرا بھی فرض ہے کہ تمہیں پیش آنے والے خطرات سے بچاتی رہوں۔ اگر میں دھوکا دینے کے لیے آتی تو ابھی تم بہت نقصان اٹھاتے۔"

اس نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

ورشا نے بیگ سے وہ کنٹوپ اور کاغذ نکالا۔ کشوری لال نے انہیں دیکھ کر کہا۔ "اوہو۔ میں بھول گیا تھا کہ یہ عجیب سا کنٹوپ اور کاغذ وائٹ پاؤڈر کے ساتھ ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کاغذ میں کیا لکھا ہے؟"

"میں نے معلوم کیا ہے۔"

"تم نے تو کہا تھا انگریزی نہیں جانتیں۔"

"میرا منہ بولا باپ جانتا ہے۔ اس نے پڑھا تھا۔ اس کاغذ میں لکھا ہے "ہمارا مال چرانے والا ہم سے چھپ نہیں سکتا۔ تم نے کنٹوپ پہن کر ایک آنکھ سے پڑھا ہے۔ آئندہ وہ آنکھ تمہاری شناخت بن جائے گی۔ تم لاکھوں کی بھیڑ میں پہچانے جاؤ گے۔ اگر مال خود لا کر دو گے تو تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔"

کشوری لال نے پوچھا۔ "تمہارے باپ کی وہ آنکھ کیسے قابلِ شناخت بن گئی ہے جس سے یہ کاغذ پڑھا ہے؟"

"اس کی آنکھ کے گرد سرخ حلقہ پڑ گیا ہے۔ کنٹوپ کی آنکھ میں جو لینس لگا ہے۔ اس میں کوئی ایسا کیمیکل ہے جو آنکھ کو متاثر کرتا ہے۔ میرے باپ کو تکلیف تو نہیں ہے لیکن رہ رہ کر پانی بہتا ہے اور صابن سے اچھی طرح دھونے کے باوجود وہ سرخ حلقہ نہیں مٹ رہا ہے۔"

"سمجھ گیا۔ وہ سرخ حلقہ ہمیشہ رہے گا۔ وہ آنکھ تمہارے پتاجی کی پہچان بن گئی ہے۔ دشمن انہیں دور سے پہچان لیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ اس بوڑھے نے ان کا مال چرایا ہے۔"

ورشا نے کہا۔ "ہاں اب تم سوچو۔ اگر میں دوست بن کر نہ آتی اور دشمنوں کو یہ جتانا چاہتی کہ مال میں نے نہیں، تم نے چرایا ہے تو یہاں آتے ہی تمہیں کنٹوپ پہنا کر یہ کاغذ پڑھنے دیتی۔"

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ "واقعی میں پھنس جاتا۔ مجھے تم سے خریدا ہوا مال انہیں واپس کرنا پڑتا۔ ورنہ ان کے ہاتھوں مارا جاتا۔ آئی لو یو۔"

پھر اس نے سوچ کر کہا۔ "تم اپنے باپ کے ساتھ اب محفوظ نہیں رہو گی۔ دشمن اس کے ذریعے تم تک پہنچ جائیں گے۔"

"وہ میرے سگے نہیں ہیں۔ میں نے ان ماں باپ کو اچھی خاصی رقم دی ہے اور کہا ہے آج ہی یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلے جائیں اور کسی کے سامنے کبھی میرا ذکر نہ کریں۔"

"بہتر ہے تم وہ مکان چھوڑ کر یہاں آ جاؤ۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میں ہمیشہ کے لیے آ گئی ہوں۔"

دونوں جرائم کی دنیا میں جینے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ آئندہ کبھی شامت نہ آتی تو بڑی شان سے جینے والے تھے۔

موتی ان سے کم نہ تھا۔ فی الحال مجبوری تھی اس کا زور نہیں چل رہا ہے۔ ورشا کشوری لال کی چھایا میں گم ہو گئی تھی۔ کسی اہم ضرورت کے بغیر باہر نکلنے والی نہیں تھی۔ انہوں نے وائٹ پاؤڈر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ ابھی سودا نہیں کر رہے تھے اس لیے موتی کو ان کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس کنٹوپ نے اس کے فرضی باپ کو قابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ جب تک وہ ممبئی سے دور کہیں چلا نہ جاتا تب تک اندیشوں میں گھری رہتی۔

کشوری نے کہا۔ "میں تمہارے باپ کو پہچانتا نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔ ابھی وہ دشمنوں کی نظروں میں نہیں آیا ہوگا۔ ہم اسے ممبئی شہر سے کہیں باہر پہنچا کر کسی لانگ روٹ والی بس میں بٹھا دیں گے۔"

وہ عبا اور نقاب میں چھپ کر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ایسے ہی وقت فون نے اسے مخاطب کیا۔ ورشا نے کہا۔ "کوئی انجان نمبر ہے۔"

کشوری نے کہا۔ "اٹینڈ کرو۔ دیکھو کون ہے؟"

اس نے بٹن دبا کر فون سنا.......... اسے باپ کی آواز سنائی دی۔ "بیٹی! ہم اسٹیشن جانے والے تھے۔ اچانک تمہاری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔"

ورشا نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ تو اچھی بھلی تھیں اچانک یہ کیسے ہوا؟"

"میں کیا بولوں، تم خود یہاں آ کر دیکھو۔"

"یہ کس کے فون سے بول رہے ہو؟"

"ایک پڑوسی کا فون ہے۔"

"میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے فون بند کر کے کشوری لال کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "کچھ گڑبڑ ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

اس نے ایک نمبر پر رابطہ کیا پھر کہا۔ "انسپکٹر ایک کام ہے۔ کولابا مچھیروں کی پرانی بستی میں ایک بوڑھی عورت اچانک مر گئی ہے۔ وہ مرڈر بھی ہو سکتا ہے۔ پلیز سپاہیوں کے ساتھ جاؤ اور مجھے سچ بتاؤ۔ شام تک تمہاری پیمنٹ ہو جائے گی۔"

ممبئی کی پولیس ہمیشہ الرٹ رہتی ہے۔ غیر سرکاری تنخواہ پانے کے لیے فوراً غیر سرکاری فرائض ادا کرتی ہے۔ انسپکٹر وہاں پہنچا تو دو گن مین پچھلے دروازے سے فرار ہو گئے۔ مکان کے اندر بوڑھی کی لاش پڑی تھی۔ بوڑھے نے صدمے سے کہا۔ "وہ لوگ ہماری بیٹی کا پوچھ رہے تھے۔ میری بیوی نے اس کے بارے میں کچھ بولنے سے انکار کیا تو اس کے حلق پر چھری پھیر دی۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے انہیں اپنی بیٹی کا فون نمبر بتایا۔ انہوں نے مجھے بات کرنے کو کہا۔ اسے یہاں بلانے کو کہا۔ اس کی جگہ آپ آ گئے تو وہ بھاگ گئے۔"

انسپکٹر نے یہ رپورٹ کشوری لال کو دی۔ ورشا نے سن کر کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔ اس بوڑھی کا کفن دفن ہوگا۔ بوڑھا بابا کل سے پہلے ممبئی چھوڑ نہیں سکے گا اور اب اس کا یہاں سے جانا نہ جانا برابر ہے۔ وہ دشمنوں کی نظروں میں آ چکا ہے۔"

کشوری لال نے کہا۔ "اور وہ اسے ہلاک نہیں کریں گے۔ تمہارے پاس پہنچنے کے لیے اسے زندہ رکھیں گے۔"

ورشا نے..... سفاکی سے کہا۔ "اور اب اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔"

"اس کی زندگی تمہاری نیندیں اڑا دے گی۔"

اس بوڑھے کی موت ضروری ہو گئی تھی۔ کشوری لال نے اپنی دوسری گاڑی گیراج سے نکالی۔ اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کی پھر ورشا کے ساتھ قبرستان کی طرف گیا۔ بوڑھی کی تدفین کے بعد وہ بوڑھا چند لوگوں کی ساتھ قبرستان سے باہر آ رہا تھا۔ ورشا نے نشانہ لیا۔ کشوری نے قریب پہنچ کر رفتار ذرا دھیمی کی تاکہ نشانہ نہ چوکے اور یہی ہوا۔ اس نے منہ بولے باپ کا صحیح نشانہ لیا پھر گاڑی کی رفتار بڑھ گئی، وہ آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکل آئے۔

جرائم کی دنیا میں کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ مجرموں کے نہ ماں باپ ہوتے ہیں نہ بہن بھائی۔ ورشا نے بچپن میں ایک باپ کو بجلی کے تار سے مارا تھا۔ دوسرے کو گولی سے اڑا دیا۔

آئندہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے یار کو بھی گولی مار دیتی یا کشوری اس سے نجات حاصل کر لیتا۔ فی الحال تو دونوں میں بہت محبت تھی۔ صرف محبت ہی نہیں ایک دوسرے پر اعتماد بھی تھا۔

ایک دن ورشا نے کہا۔ "کسی طرح موتی سے نجات حاصل کرنا ہے۔"

"ہاں۔ اب وہی ایک ایسا ہے جو تمہاری تاک میں ہے اور وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ کبھی اچانک ہی شب خون مارے گا۔"

"اس سے پہلے میں اسے مار گراؤں گی۔"

"کوئی آئیڈیا ہے تمہارے دماغ میں؟"

"ہے۔ بڑی دیر سے یہ آئیڈیا پک رہا ہے۔ یہ کنٹوپ اور کاغذ کسی طرح موتی تک پہنچانا ہے۔ وہ کاغذ پڑھنے کے لیے ضرور اسے پہنے گا پھر ایک آنکھ سے جائے گا۔ دشمن سمجھیں گے کہ اس نے مال چرایا ہے۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

کشوری لال نے کہا۔ "زبردست آئیڈیا ہے۔ ہم اسے نہیں ماریں گے۔ دور سے تماشا دیکھیں گے۔ تمہاری طرف آنے والی موت اس کے نام ہو جائے گی۔"

ورشا نے سم بدل کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ "کیا مجھے نمبر سے پہچان رہے ہو؟"

"ہاں۔ شاید یہ سم تم نے میرے لیے رکھی ہے۔ شاید اب تمہیں میری ضرورت پڑ گئی ہے؟"

"ہاں۔ میں نہیں جانتی، وائٹ پاؤڈر کی ڈیلنگ کن لوگوں سے کی جاتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے؟"

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"ڈیلنگ تم کرو اور مجھے کچھ رقم دے دو۔"

"کتنی رقم کی توقع کر رہی ہو؟"

"ایک لاکھ سے کم نہیں۔ اس سے زیادہ ہو جائے تو ہماری دوستی پکی ہو گی۔"

چوری کا مال تھا۔ ایک لاکھ اسے کوئی نہ دیتا۔ وہ بھی مسکرا کر رہ گیا۔ اسے پھانسنے کے لیے بولا۔ "زیادہ مانگ رہی ہو پھر بھی تمہیں دوست بنانے کے لیے مال بیچ کر پیسے دوں گا۔"

"نہیں۔ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔"

"میں خاندانی رئیس نہیں ہوں۔ روز کنواں کھودتا ہوں روز پانی پیتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں زبان کا دھنی ہوں۔"

"اس حد تک بھروسا کر سکتی ہوں کہ پہلے پچاس ہزار تو ضرور ادا کرو۔ باقی مال بیچنے کے بعد دو۔"

"اچھا مجھے سوچنے دو۔ کہیں سے رقم کا انتظام کروں گا تب ہی تمہیں کال کروں گا۔"

"میں انتظار کروں گی۔"

"کیا لین دین کے وقت کوئی تمہارے ساتھ ہوگا؟"

"میں اکیلی ہوں۔ کسی پر بھروسا نہیں کرتی۔ ایک بات بتا دوں۔ مال کے ساتھ اس گٹھڑی میں ایک کنٹوپ اور ایک کاغذ ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔"

"کاغذ میں کیا لکھا ہے؟"

"اس کی لکھائی دھندلی ہے۔ کنٹوپ میں ایک آنکھ کے جیسا سوراخ ہے۔ وہاں ایک لینس لگا ہوا ہے۔ میں نے اسے پہن کر ایک آنکھ سے دیکھا تو وہ دھندلی لکھائی صاف نظر آنے لگی۔"

"وہاں کیا لکھا تھا؟"

"پتا نہیں، انگریزی میں لکھا تھا۔ میں انگریزی نہیں جانتی۔"

"کسی سے پڑھوا لو۔"

"پتا نہیں مال کے بارے میں کیا راز کی بات لکھی ہے۔ کسی سے پڑھوانے کا مطلب ہوگا اسے اپنا رازدار بنانا۔ اسے تو وہی پڑھے گا جو مجھ سے مال خریدے گا۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ آخر اس میں کیا لکھا ہوگا؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

"میں الجھی ہوئی ہوں۔ عقل سمجھاتی ہے اسے پڑھے بغیر لین دین نہیں کرنا چاہیے۔ کیا تم انگریزی جانتے ہو۔ اسے پڑھ سکو گے؟"

"ہاں جانتا ہوں۔ اب تو صاف کہہ دیتا ہوں کہ جب تک وہ کاغذ نہیں پڑھوں گا۔ تمہیں پچاس ہزار نہیں دوں گا۔ صحیح بات جانے بغیر ایک بڑی رقم ڈبونے کی حماقت نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ ایسا کرو۔ پہلے یہ کاغذ پڑھ لو۔"

"میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ کہیں ملو۔ میں اسے پڑھ کر خود سمجھوں گا اور تمہیں سمجھاؤں گا۔"

"جس دن پیمنٹ لینے آؤں گی۔ اسی دن ملوں گی۔ مجھ سے ملاقات کیے بغیر یہ چیزیں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔"

"کیسے پہنچاؤ گی؟"

"ابھی تم کہیں آ سکتے ہو؟"

"ہاں۔ آ سکتا ہوں۔"

"میں آدھے گھنٹے بعد فون کروں گی اور بتاؤں گی کہ یہ چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ تم آ کر وہاں سے لے جاؤ۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم بہت چالاک ہو۔ محتاط رہنا جانتی ہو۔ میں بھی محتاط رہنے کا عادی ہوں۔ کسی ویران جگہ وہ سامان لینے نہیں جاؤں گا۔"

"وہ سامان شہر میں ہی ملے گا۔ انتظار کرو۔"

ورشا نے فون بند کر دیا۔ کشوری لال نے کہا۔ "یہ پتا ہوا۔ اس سے وائٹ پاؤڈر کے لین دین کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے بغیر ہی اس کی شامت آ جائے گی۔ کنٹوپ اور کاغذ اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

وہ تنہا جا کر کاغذ اور کنٹوپ کو رکھ کر آ گیا۔ ورشا کو بتایا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ اس نے فون پر موسیٰ سے کہا۔ "جے ونتی ہنومان مندر کے سامنے ایک جنرل اسٹور ہے۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہو۔ "ہنومان مہاراج دے دے میرا سامان۔" وہ تمہیں ایک پیکٹ دے گا۔ اس پیکٹ میں کاغذ اور کنٹوپ ہے۔"

موسیٰ نے وہاں جا کر وہ پیکٹ حاصل کیا پھر اسے اپنی رہائش گاہ میں لے آیا۔ اسے کھول کر دیکھا تو ورشا کے بیان کے مطابق ایک لفافہ میں تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر دھندلی تھی۔ یہ درست کہا گیا تھا کہ وہ کنٹوپ کی آنکھ کے بغیر اسے پڑھ نہیں سکے گا۔

پہلے اس نے ایک عینک لگا کر دیکھا۔ وہ تحریر دھندلی رہی پھر اس نے ایک محدب شیشے سے دیکھا۔ وہ پھر بھی پڑھی نہیں گئی۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ کنٹوپ کے آئی لینس میں کوئی ایسا کیمیکل ہے اور وہ تحریر بھی ایسے کیمیکل سے لکھی گئی ہے کہ دونوں کے اشتراک سے ہی وہ تحریر واضح ہوتی ہے۔

وہ کنٹوپ کو اٹھا کر اس آنکھ کے لینس کو محدب شیشے سے دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ سمجھنا ضروری تھا کہ اس تحریر کو پیچیدہ کیوں بنایا گیا ہے؟ کوئی راز کی بات کسی تک پہنچانے کے لیے اس آنکھ کے استعمال کو لازمی کیوں بنا دیا گیا ہے؟

کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کا ذہن چیخ کر کہہ رہا تھا۔

کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ کسی کا بھیجا ہوا کھانا یا کوئی چیز فوراً ہی استعمال نہیں کرتا تھا۔ پہلے اسے دوسروں پر آزماتا تھا تب مطمئن ہوتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ جو لڑکی اس کے مال کی گٹھڑی مکاری سے لے جا سکتی ہے۔ اس کے کوڈ ورڈز معلوم کر سکتی ہے اور حاملہ عورت بن کر آنکھوں میں دھول جھونک سکتی ہے۔ وہ کسی بدمعاشی سے اسے اندھا یا کانا بھی بنا سکتی ہے۔

اس نے ایک بیروزگار نوجوان کو فون کیا۔ "میں تمہیں نوکری دوں گا۔ یہاں آؤ۔ انٹرویو دو۔ کام کے آدمی ہوئے تو تمہیں کام مل جائے گا۔"

نوجوان روزگار حاصل کرنے آ گیا۔ موسیٰ نے کہا۔ "یہ کنٹوپ پہنو اور یہ کاغذ پڑھ کر سناؤ۔"

اس بیچارے نے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے پہنا پھر اس کی ایک آنکھ سے کاغذ کو دیکھ کر پڑھا۔ وہاں لکھا تھا۔

"ہمارا مال چرانے والا ہم سے چھپ نہیں سکتا۔ تم نے کنٹوپ پہن کر ایک آنکھ سے پڑھا ہے۔ آئندہ وہ آنکھ تمہاری شناخت بن جائے گی۔ تم لاکھوں کی بھیڑ میں پہچانے جاؤ گے۔ ہمارا مال خود واپس کر دو گے تو تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔"

موسیٰ نے نوجوان سے کہا۔ "اسے اتارو۔"

جب اس نے کنٹوپ کو اتارا تو وہ آنکھ ذرا سوجی ہوئی دکھائی دی پھر اس کی آنکھ سے پانی بہنے لگا۔ وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ کراہتے ہوئے بولا۔ "غریبوں کو کوئی نہ کوئی بیماری لگی ہی رہتی ہے یہ آنکھ ٹھیک ہو جائے گی۔ ہمارے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ بیمار باپ چارپائی پر پڑا رہتا ہے۔ ماں ادھر ادھر کام کر کے ایک وقت روٹی کھلاتی ہے۔ ہم دو وقت بھوکے رہتے ہیں۔ تین جوان بہنیں شادی

کے لیے بیٹھی ہیں۔ بے غیرت باپ کہتا ہے ان سے دھندا کراؤ۔ ہمیں تینوں وقت کی روٹیاں ملیں گی۔ مگر ایسا ہوا تو میں شرم سے مر جاؤں گا۔"

موسیٰ اس کا دکھڑا نہیں سن رہا تھا۔ دنیا کی آدھی سے زیادہ غریب آبادی روتی رہتی ہے۔ کون سنتا ہے؟ کسے اتنی فرصت ہے؟ وہ ایک کان سے سن رہا تھا دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔ دکھڑا رونے والے کی آنکھ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں آنکھ کے گرد سرخ حلقہ پڑ گیا تھا۔ اور اس حلقے کی سرخی مٹنے والی نہیں تھی۔ دشمن اسے دور سے پہچان لیتے کہ اس نے ان کا وائٹ پاؤڈر چرایا ہے۔

اس نے نوجوان سے کہا۔ "واش روم جاؤ اور اس آنکھ کو اچھی طرح صابن سے دھو کر آؤ۔"

وہ واش روم میں چلا گیا۔ اس نے ورشا کو فون پر کراہتے ہوئے مخاطب کیا۔ "آہ! یہ تم نے کیسا کنٹوپ پہننے کو دیا ہے۔ اسے پڑھتے ہی میری آنکھ میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ آنکھ سے پانی بہہ رہا ہے۔ ہلکی ہلکی سی جلن ہے اور چاروں طرف سے سرخ ہو گئی ہے۔"

ورشا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "یعنی کہ تم اسے پہن کر اس کے لینس کے ذریعے کاغذ پڑھ چکے ہو۔"

"ہاں۔ اس میں لکھا ہے کہ میں نے ان کا وائٹ پاؤڈر واپس نہ کیا تو وہ مجھے اس ایک آنکھ کے ذریعے لاکھوں کی بھیڑ میں پہچان لیں گے۔ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "بس میرا کام ہو گیا۔ مجھے تم سے نجات مل جائے گی۔ نہ تمہارے پاس وائٹ پاؤڈر ہے نہ انہیں دے سکو گے۔ باہر نکلو، کہیں بھی جاؤ.. مارے جاؤ گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "قبر کے کیڑے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ کیڑے مردے کو کیسے کھاتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "یہ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ مجھ سے پہلے تم قبر میں جاؤ گی۔"

قہقہہ سنائی دیا۔ "میں تو چتا میں جلائی جاؤں گی۔ مسلمانوں کو کھانے والے کیڑے ہمارے بے ترستے ہیں۔"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔ موسیٰ نے مسکراتے ہوئے اپنے فون کو دیکھا پھر کہا۔ "ماننا پڑتا ہے۔ سالی آفت کی پرکالہ ہے۔ میرے بڑے کام آئے گی۔ بس ایک بار ہاتھ آ جائے۔ جوتی بنا کر پیروں میں پہنتا رہوں گا۔"

وہ نوجوان واش روم سے آیا۔ صابن سے دھونے کے

باوجود آنکھ کے حلقے میں سرخی موجود تھی۔ موت کے بعد بھی مٹنے والی نہیں تھی۔ موسیٰ نے اسے دو ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے بندرگاہ کی طرف جاؤ۔ وہاں شام تک ٹہلتے رہو۔ واپس آؤ گے تو اور دو ہزار دوں گا۔“

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ موسیٰ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نوجوان کے نصیب میں واپسی ہے یا نہیں؟ وہ ایک بس میں بیٹھ کر گیا۔ موسیٰ ایک موٹر سائیکل میں اس کے پیچھے ہو گیا۔ دور ہی دور سے اس کی نگرانی کرنے لگا۔

بندرگاہ کے علاقے میں کئی اسمگلر مختلف روپ بہروپ میں رہتے ہیں۔ سیدھے سادے بیوپاری بن کر یا عام ڈیلرز بن کر رہتے ہیں۔ اس جگہ دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ تقریباً تین گھنٹے بعد وہ نوجوان دشمنوں کی نظروں میں آ گیا۔

وہ چائے پینے ہوٹل میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ اسی وقت دو آدمی اس کے دائیں بائیں میز کے اطراف آ کر بیٹھ گئے۔ ایک نے پوچھا۔ ”مال لائے ہو؟“

نوجوان نے تعجب سے پوچھا۔ ”مال...؟ کیسا مال؟“

”بھولے نہ بنو۔ جس مال کو چرانے کی یہ سزا ملی ہے۔“

اس نے نوجوان کی آنکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آنکھ کا نقشہ بدل گیا ہے۔ اسی طرح تمہاری زندگی موت میں بدل جائے گی۔“

دوسرے نے کہا۔ ”بولو مال کہاں رکھا ہے؟“

وہ تینوں ہوٹل کے باہر ایک میز کے اطراف بیٹھے تھے۔ موسیٰ نے ان میں سے ایک کو دیکھا۔ وہ میز کے نیچے ریوالور نکال کر اسے نوجوان کی پسلی سے لگا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

موسیٰ نے سوچا۔ ”وہ نوجوان میرا نام نہیں جانتا ہے۔ لیکن میرا حلیہ انہیں بتائے گا تو یہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

وہ اس وقت ہیلمٹ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دور سے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہ دونوں اس نوجوان کو ریوالور کے نشانے پر وہاں سے لے جانے لگے۔ ان میں سے ایک کے لباس میں ریوالور چھپا ہوا تھا۔ نوجوان سہما ہوا سا تھا اور موسیٰ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے شکار کو کہیں لے جا کر اس کا حلیہ اور اس کے گھر کا پتا معلوم کریں۔

اس نے ریوالور نکال کر تڑاتڑ دو فائر کیے۔ پہلی گولی اس ریوالور والے کو ماری۔ دوسری اس معصوم بے قصور نوجوان کے وجود میں اتاری پھر دیکھتے ہی دیکھتے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتا ہوا وہاں سے فرار ہو گیا۔

واردات کرنے والے جانتے ہیں کہ سڑکوں اور بازاروں میں گشت کرنے والے سپاہیوں کے پاس بندوقیں نہیں صرف ڈنڈے ہوتے ہیں۔ جب گولیاں چلتی ہیں تو یہ سپاہی بھاگتے ہیں پھر لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے چھپتے پھرتے ہیں۔

وہ اپنا کام کر کے وہاں سے چلا آیا۔ یہ اطمینان ہو کہ کوئی اس نوجوان کو وسیلہ بنا کر اس کے پیچھے نہیں آئے گا۔ بلا سے ایک نوجوان کی جان گئی۔ بلا سے اس کے گھر میں فاقے ہوتے رہیں اور جوان بہنیں دھندے پر چڑھا دی جائیں۔ ایسے غریب غربا حرام موت مرتے ہی رہتے ہیں اور شرمناک دھندوں کی دلدل میں دھنستے... رہتے ہیں۔

ورشا اور موسیٰ کا ایک ہی دھندا تھا۔ ایک ہی مزاج اور ایک ہی مقصد تھا کہ صرف اپنے لیے جیو۔ اپنی سلامتی کے لیے دوسروں کو مسل ڈالو۔ ورشا نے اپنے سگے باپ کی اور منہ بولے باپ کی زندگیاں چھین لی تھیں۔ موسیٰ نے صرف ایک نوجوان کو ہی نہیں مارا تھا، اس کی تین بہنوں کو بازاری بنا دیا تھا۔ اس سے بھی پہلے چھ معصوم بچوں کو قتل کر چکا تھا۔

ایسے لوگ زندہ رہتے ہیں۔ انہیں دنیا کا کوئی قانون اپنی گرفت میں نہیں لیتا مگر ان کی پکڑ ہوتی ہے اوپر سے۔ وہ اوپر والا ہی اچانک کسی دن ایسا جھٹکا دیتا ہے کہ تمام مجرمانہ ہتھکنڈے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں پھر انہیں فرار اور سلامتی کا راستہ نہیں ملتا۔

موسیٰ نے گھر آ کر ورشا کے نمبر پنچ کیے۔ وہ سم بدل چکی تھی۔ رابطہ نہیں ہوا۔ اس نے غصے سے اسے گالیاں دیں۔ مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ”تو نے مجھے قربانی کا بکرا بنانے کے لیے یہ لپ ٹاپ اور کاغذ بھیجا تھا۔ اگر میں اسے پڑھتا اور متاثرہ لے کر باہر نکلتا تو مارا جاتا۔ سالی! تیری جیسی بدذات کمینی پہلے نہیں دیکھی۔ تجھے تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اور چتا میں جلنے نہیں دوں گا۔ تجھے کیڑے کھائیں گے۔ میں تجھے قبر میں ڈالوں گا۔ آج ڈالوں گا پھر دوسرے دن قبر کھود کر دیکھوں گا کہ کیڑے تجھے کس طرح کھا رہے ہیں۔“

وہ کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔ ”پورا ممبئی جانتا ہے۔ موسیٰ کی زبان نہیں خنجر ہے۔ جب بولتا ہے تو کاٹ کے بھی رکھ دیتا ہے اور اب موسیٰ بول دیا، اس سالی کو کیڑے کھاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔“

☆☆☆

چھ ماہ گزر گئے۔ موسیٰ اسے ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ وہ نہ تو نظر آئی نہ فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ یہ توقع تھی کہ وہ

کوئی واردات کرے گی تو اس کا چرچا ہوگا۔ اتنا تو معلوم ہوگا کہ وہ ممبئی میں ہے۔

اب اس کی خاموشی اور گمشدگی سمجھا رہی تھی کہ وہ مر گئی ہے یا ممبئی چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ یا کسی کی داشتہ بن کر اس کی چار دیواری میں خاموشی سے زندگی گزار رہی ہے۔

یہ آخری بات کسی حد تک درست تھی۔ ورشا اور کشوری لال نے شادی نہیں کی تھی۔ بس یونہی زندگی گزار رہے تھے۔ کہتے تھے جب ایک دوسرے کو قبول کر لیا ہے تو لگن منڈپ میں بیٹھ کر اگنی کے سات پھیرے لینے میں وقت اور رقم کیوں ضائع کریں۔

انہوں نے قسم کھائی تھی کہ آخری سانسوں تک ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہیں گے۔ یہ قسم کھانا ہی دراصل نکاح قبول کرنا ہے اور وہ فی الحال یہ قسم نباہ رہے تھے۔

وہ کوئی اس لیے واردات نہیں کر رہی تھی کہ کشوری لال اپنے دو ساتھی آنند تیواری اور وجے بھاسکر کے ساتھ دن رات کمپیوٹر میں مصروف رہتا تھا۔ وہ ایک بینک اکاؤنٹ سے دو کروڑ دس لاکھ روپے ہیک کر کے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے والے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جدید ٹیکنالوجی کے مطابق بینک ڈکیتی میں کامیاب رہیں گے۔

کامیابی سے پہلے یہ اندیشہ تھا کہ ہیکنگ کے بعد دو کروڑ دس لاکھ جس کے اکاؤنٹ میں پہنچیں گے، وہ تفتیش کے دوران میں جلد یا بدیر پکڑا جائے گا۔ اتنی بڑی رقم اچانک کسی کے اکاؤنٹ میں آ کر چھپ نہیں سکے گی۔

ابھی جو رقم ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اسے چھپا کر رکھنے کا مسئلہ تھا۔ اس کے لیے ایک جعلی اکاؤنٹ کھولنا لازمی تھا۔ تاکہ جس دن رقم اس اکاؤنٹ میں پہنچتی اسی دن اسے نکالا جاتا اور کہیں حفاظت سے چھپا دیا جاتا۔ پھر اس جعلی اکاؤنٹ کے پیچھے قانون کے محافظ دوڑتے رہ جاتے۔

وہ تینوں کشوری لال آنند تیواری اور وجے بھاسکر جو تدابیر سوچ رہے تھے ان پر گھر بیٹھے کمپیوٹر کے ذریعے عمل کرتے رہتے تھے۔ ورشا ان کے لیے کھانا پکاتی تھی۔ انہیں اچھی اچھی ڈشیں کھلاتی رہتی اور ان کی فرمائش پر گرم یا ٹھنڈا مشروب پیش کرتی رہتی تھی۔

انہوں نے ایک چھوٹی سی جعلی کمپنی کھولی ہوئی تھی۔ وہ کمپنی صرف کاغذ پر تھی۔ پانچ لاکھ روپے سے بینک اکاؤنٹ کھولا گیا تھا۔ اکاؤنٹ کھولنے کے لیے آنند تیواری کو اس کمپنی کے مالک کی حیثیت سے بینک منیجر کے سامنے آنا پڑا تھا۔

باقی دو ساتھی کشوری اور وجے نے اسے یقین دلایا تھا کہ جعلی اکاؤنٹ سے ڈکیتی کی رقم نکال کر اس کا حصہ اسے دیا جائے گا۔ اسی دن انڈیا چھوڑنے کے لیے پہلے سے ایک فلائٹ میں اس کی سیٹ اوکے ہوگی۔ قانون کے جاگنے سے پہلے ہی وہ ان کی پہنچ سے دور نکل جائے گا۔

تمام ضروری اور پیچیدہ مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر انہیں کامیابی حاصل ہوگئی۔ ایک انتہائی دولت مند کے اکاؤنٹ سے دو کروڑ دس لاکھ روپے نکال لیے گئے۔ تیواری انٹرپرائز کے مالک آنند تیواری کے اکاؤنٹ میں پہنچ گئے۔ وہ بینک میں موجود تھا۔ فون پر اطلاع ملتے ہی اس نے وہ رقم نکلوا لی۔ بینک کے باہر اس کے دونوں پارٹنرز گاڑی میں موجود تھے۔ وہ اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اسے سیدھا ائرپورٹ جانا تھا۔

وجے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کشوری لال پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک جدید بریف کیس تھا جس میں وہ بیگ سے تمام نوٹ نکال کر اس میں رکھ رہا تھا۔ پھر اس نے نمبروں کی ترتیب اور ایک چھوٹی سی چابی سے اسے لاکڈ کر دیا۔

اس اہم کام سے فارغ ہو کر اس نے آنند تیواری کی گردن سے پستول لگا کر کہا۔ اس میں سائلنسر لگا ہے۔ یہ آواز نہیں کرے گا تم بھی شور نہ مچاؤ۔ چپ چاپ جاؤ۔“

وہ دہشت زدہ ہو کر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی گولی اس کے دماغ میں گھس گئی۔ وجے بھاسکر نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن انکھیوں سے مردہ ساتھی کو دیکھا پھر کہا۔ ”تھینکس گاڈ! یہ بینک والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ یہ اپنے ساتھ ہمیں بھی پھنسا دیتا۔“

کشوری نے کہا۔ ”ہمارا اچھا دوست تھا۔ اس نے آخر وقت تک ساتھ دیا اور آخر میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ دوستی مہنگی تو نہیں پڑے گی؟“

وجے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی ہمارے دیس میں بڑی مہنگائی ہے۔ ہم سستے چھوٹ گئے۔“

گاڑی ایسے راستے پر آ گئی جہاں سے اِکّا دُکّا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ آگے کشوری لال کی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ یہ سب پلاننگ کے مطابق تھا۔ آنند تیواری کو اس کی ہی گاڑی میں مردہ چھوڑ کر وہاں سے کشوری لال کی گاڑی میں جانا تھا۔

وجے نے اس کار کے قریب آ کر گاڑی روک دی۔ کشوری نے کہا۔ ”وجے! ہمارے سیاست والوں نے بھارت دیس کا بٹوارا کر دیا۔ ایک انڈیا کے تین ٹکڑے کر

دے۔ میں تین تو کیا' دو ٹکڑے بھی نہیں کروں گا۔"

اس نے ٹریگر دبایا۔ وجے کی ایک کراہ کے ساتھ بٹوارا ختم ہو گیا۔ دو کروڑ دس لاکھ روپے معمولی رقم نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے کبھی کبھی مقدر سے ہاتھ آتی ہے۔ یہ پھر بھی نصیب سے ملے نہ ملے۔ اس کا بٹوارا کر کے اسے کم سے کم کرنا سراسر نادانی تھی۔

وہ بریف کیس اٹھا کر اپنی گاڑی میں آیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے دو لاشوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ یاری، دوستی اور رشتے داری کیا ہوتی ہے؟ کچھ نہیں' انہیں مٹی میں ملا دیا جائے تو نئے دوست اور نئے رشتے بن جاتے ہیں۔

فی الحال ورشا سے کشوری لال کا رشتہ بہت مستحکم تھا۔ وہ دو ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر اس کی ریشمی بانہوں میں آ گیا۔ بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں اس پر سے نچھاور کر کے پھر انہیں بریف کیس میں رکھتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے ہم پکڑے جائیں۔ بعض اوقات جو ہم نہیں سوچتے' وہ ہو جاتا ہے۔ اگر رقم ہمارے پاس سے برآمد نہیں ہو گی تو گرفتاری کے بعد جلد ہی رہا کر دیے جائیں گے۔"

ورشا نے کہا۔ "کیا اسے دوسری جگہ چھپاؤ گے؟"

"ہاں۔ ابھی اس دولت کو خود سے دور رکھنا ضروری ہے۔"

"جہاں رکھو گے وہاں سے کوئی دوسرا لے جائے گا۔"

"میں نے بہت پہلے سے ایسی جگہ سوچ رکھی ہے جہاں کئی مہینوں تک کوئی نہیں جائے گا۔"

"ایسی کون سی جگہ ہے جہاں کئی مہینوں تک کوئی نہیں جائے گا۔"

"ممبئی شہر سے تین میل دور شانتا بائی کورانٹائن (Quarantine) ہے۔"

ورشا نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"ایک چھوٹا سا ایسا اسپتال ہے۔ جہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہوتا دوائیں بھی نہیں ہوتیں، صرف موت سے لڑنے والے مریض .... ہوتے ہیں۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "میں نے ایسا اسپتال نہ کہیں دیکھا ہے نہ سنا ہے۔"

"بھگوان نہ کرے، تمہیں کبھی ایسی جگہ جانا پڑے۔ وہاں چیچک اور طاعون کے مریضوں کو شہری آبادی سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی بیماری دوسروں کو نہ لگے۔ اس جگہ کو اچھوت یا پھر قرنطینہ کہتے ہیں۔"

وہ جیسے یاد کرتے ہوئے بولی۔ "او... ہاں... میں نے سنا ہے۔ ایسے مریضوں کو شہر سے باہر رکھا جاتا ہے۔ کیا بیماری لگنے والی جگہ پر اتنی بڑی رقم لے جا کر رکھو گے؟"

"ابھی نہ تو چیچک پھیلی ہے نہ طاعون۔ پچھلے دو برس پہلے چیچک کے کئی مریض وہاں مر گئے تھے۔ ان کی لاشیں اٹھانے کے لیے ڈھیڑ چمار اور بھنگی بھی نہیں گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لاشوں کو وہیں کیڑے کھا گئے۔ چونکہ بھنگی نہیں جاتے تھے۔ اس لیے مریضوں کی غلاظتیں بھی دلدل کی طرح جمع ہو گئیں۔ کیڑے مکوڑے' جراثیم کے علاوہ چوہے اور چھپکلیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔"

ورشا نے منہ بنا کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر کہا۔ "ہے بھگوان! وہ کیسی جگہ ہو گی۔ سوچنے سے ہی ایسا لگتا ہے جیسے کیڑے ہمیں کھا رہے ہوں۔"

"وہاں بدبو بھی ایسی ہے کہ میں یہ دولت چھپانے کے لیے گیس ماسک پہن کر جاؤں گا۔ کیڑوں اور خونخوار چوہوں کو بھگانے کے لیے حشرات کش دوائیں سپرے کرتا جاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "ایسی جگہ تو کوئی جاتا بھی نہیں ہو گا۔"

"اسی لیے ہماری دولت وہاں محفوظ رہے گی۔ کئی مہینوں اور برسوں تک کسی طرح کی وبا پھیلنے کا امکان نہیں ہے۔ نہ مریض ہوں گے نہ قرنطینہ کا دروازہ کھولا جائے گا۔"

"کیا وہ لاکڈ رہتا ہے؟"

"ہاں اور کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند ہیں۔ ایک بڑے دروازے کو شٹر ڈاؤن کر کے لاک کیا گیا ہے اور تین بڑے تالے ڈالے گئے ہیں۔ میں ان تالوں کو توڑ کر اپنے تین بڑے تالے ڈالوں گا۔ اس طرح ہم کسی وقت بھی وہاں جا کر اپنی رقم لا سکیں گے۔"

"کروڑوں کا معاملہ ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"ابھی نہیں۔ پہلے یہ رقم چھپانے تنہا جاؤں گا۔ وہاں کے اچھے برے حالات کو سمجھوں گا۔ جب خطرہ ٹل جائے گا۔ ہم پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جائے گا۔ تب تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"تب تک مجھے یوں لگے گا کہ تم نے مجھے کروڑوں روپے سے محروم کر دیا ہے۔"

کشوری لال نے اسے کھینچ کر پیار کیا پھر بریف کیس کی ننھی سی چابی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ صرف ایک چابی نہیں ہے۔ دو کروڑ دس لاکھ روپے ہیں۔ جب تک تمہارے پاس ہیں۔ کوئی ان روپوں کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ لوہے کے بریف کیس کو توڑ نہیں سکے گا۔"

پھر اس نے مخصوص نمبروں کی ترتیب بتائی۔ چابی گھمانے کے بعد بھی وہ بریف کیس مخصوص نمبروں کے بغیر نہیں کھل سکتا تھا۔ ورشا نے اس کی دھڑکنوں سے لگ کر کہا۔ "آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ مجھے مال و دولت سے زیادہ چاہتے ہو۔"

وہ بولا۔ "اب تم یہ جگہ چھوڑ دو۔ ہمارے چھوٹے سے بنگلے میں جا کر رہو۔ جب تک ڈکیتی اور قتل کا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑے گا، میں کہیں چھپ کر رہوں گا۔ قرنطینہ کی تین تالوں کی چابیاں بھی کسی طرح تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔ مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ کسی وجہ سے میں ناکام رہا تو تم کبھی نہ کبھی وہاں جا کر تمام رقم لے آؤ گی۔"

یہ تمام معاملات طے ہونے کے بعد وہ اس بنگلے میں چلی گئی جہاں اب تک اس کے ساتھ چھپ کر رہتی آئی تھی اور موی جیسا شاطر بھی اسے ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔

یہ خبر جلد ہی ٹی وی اور اشتہارات کے ذریعے پھیل گئی کہ سیٹھ دولت رام ناریل والا کے بینک اکاؤنٹ پر ڈاکا پڑا ہے۔ اس کے اکاؤنٹ سے دو کروڑ دس لاکھ روپے ہیک کیے گئے ہیں۔

پھر اسی دن مالا بار ہل کے قریب ایک کار میں دو لاشیں پائی گئیں۔ ان کی آئی ڈی سے معلوم ہوا کہ ایک مقتول کا نام وجے بھاسکر ہے اور دوسرا مقتول آنند تیواری ہے۔ مزید تفتیش سے معلوم ہوا کہ آنند تیواری جنتا بینک سے دو کروڑ دس لاکھ روپے نکال کر لے گیا تھا۔ بینک منیجر نے لاش دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا۔

تین دنوں کی تگ و دو سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ تین ساتھی تھے۔ دو مارے گئے ایک لاپتا ہے اور وہ کمپیوٹر کا خطرناک کھلاڑی ہے۔ وہی ہیکر ہو گا اسی نے سیٹھ ناریل والا کے اکاؤنٹ پر ڈاکا ڈالا ہے۔

چوتھے دن کشوری لال کی تصویر اخباروں میں شائع ہوئی اور ٹی وی کے ذریعے بھی نشر ہوتی رہی۔ دونوں مقتولین کے رشتے داروں اور شناساؤں نے بیان دیا ہے کہ وہ تینوں ہی کمپیوٹر کے زبردست کھلاڑی تھے۔ یقیناً ہیکر بھی ہوں گے۔ یوں اس طرح ثابت ہوتا تھا کہ سیٹھ ناریل والا کے اکاؤنٹ کی رقم تیواری کے اکاؤنٹ میں پہنچ گئی تھی۔

چوری ڈکیتی کرنے والوں کے لیے یہ خبر دھماکا خیز تھی کہ کشوری لال دو کروڑ دس لاکھ کا آدمی بن گیا ہے۔ جس کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اسے کروڑ پتی بنا کر نرک میں جائے گا۔

یوں پولیس اور سراغرسانوں کے علاوہ چور ڈاکو بھی اسے تلاش کرنے لگے۔ سب سے زیادہ موی بے چین ہو گیا تھا۔ وہ کشوری لال کے رشتے داروں اور اس کے شناساؤں کو ٹٹولتا پھر رہا تھا۔ ایسی تمام جگہ جا رہا تھا جہاں مجرموں کے خفیہ اڈے ہو سکتے تھے۔

تقریباً ایک ماہ تک اس کی بو سونگھتے رہنے کے بعد وہ ایک ایسے مکان تک پہنچا جہاں پانچ برس پہلے کشوری لال اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ تمام دن رہا کرتا تھا۔ وہ تینوں اپنی کمپیوٹر کی دنیا میں مصروف رہا کرتے تھے پھر رات ہونے سے پہلے مکان کو لاک کر کے چلے جاتے تھے۔

مالک مکان نے موی کو بتایا۔ "اب ایک شخص نے اسے کرائے پر لیا ہے۔ شاید کچھ بیمار ہے۔ تمام دن گھر میں پڑا رہتا ہے۔"

"کیا یہ موجودہ کرائے دار ان تینوں میں سے ایک ہے جو پانچ برس پہلے یہاں رہتے تھے؟"

وہ بولا۔ "پانچ برس پہلے میرے پتا جی کرائے داروں سے لین دین رکھتے تھے۔ میں کالج میں پڑھتا تھا ادھر کبھی نہیں آتا تھا۔"

موی نے رات آٹھ بجے مالک مکان سے بات کی۔ اس وقت گلی میں اندھیرا تھا۔ اس مکان کی کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند تھے اور دروازے کے پیچھے واقعی کشوری لال چھپا ہوا تھا۔

وہ ایک کرسی پر چڑھ کر روشن دان سے دیکھ رہا تھا۔ باہر گلی میں مالک مکان کسی شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے نیم تاریکی کے باعث موی کو نہیں پہچانا۔ اس کے اپنے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ پہنچا ہے۔

تھوڑی دیر بعد موی مالک مکان کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ اس نے کرسی سے اتر کر ورشا کو فون کیا۔ "میری جان! میں یہاں بھی خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یہ جگہ بھی چھوڑنی ہو گی۔"

"میں تو کب سے سمجھا رہی ہوں۔ دو چار مہینوں کے لیے ممبئی سے چلے جاؤ۔ یہاں سے دور کوئی تمہیں ڈھونڈنے نہیں آئے گا تو میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گی۔"

"میں کیا کروں، کروڑوں روپے چھوڑ کر یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"تم نے وہ رقم قرنطینہ میں چھپا دی ہے۔ جب تک چیچک اور طاعون جیسی بیماریاں نہیں پھیلیں گی۔ تب تک ادھر

کوئی نہیں جوئے گا۔ میرا ابھی دل نہیں مانتا کہ اتنی بڑی رقم چھوڑ کر جاؤں۔ یہ اندیشہ رہے گا کہ جانے کون کسی وقت وہاں کسی ضرورت سے چلا جائے۔"

"ورشا! تمہیں اسی شہر میں رہنا ہوگا۔ بریف کیس کی چابی اور مخصوص نمبروں کی ترتیب تمہیں معلوم ہے۔ بیرونی دروازے کی تین چابیاں میرے پاس ہیں۔ ان چابیوں کو بھی تمہارے پاس رہنا چاہیے۔ میں انہیں جیب میں لیے پھرتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں چھپتا رہتا ہوں۔ یہ چابیاں کہیں گر سکتی ہیں، گم ہو سکتی ہیں۔"

"چابیاں کسی بھی طرح سنبھال کر رکھو اور آج رات ہی یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ فون بند کر کے سوچنے لگا۔ اس شہر سے بھاگنا ہی ہوگا۔ مشکل یہ تھی کہ ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے اس کی تصویر دور تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں جاتا وہاں ایک بچہ بھی اسے پہچان سکتا تھا۔ اس کی عینک تو دور سے ہی پہچانی جاتی تھی۔

آدھی رات ہوئی تو اس نے عینک اتار دی۔ اپنا سفری بیگ اٹھایا۔ پھر ایک کھڑکی کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ گلی میں تاریکی اور سناٹا تھا۔ وہ دروازے پر آ گیا۔ وہاں اس نے کان لگا کر سنا۔ باہر کوئی آواز کوئی آہٹ بھی نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ... کھول دیا۔

ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ جو نہ سوچو وہ ہو جاتا ہے۔ اچانک ہی جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ موئی نے اچھل کر اس کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ گرتے گرتے سنبھل گیا لیکن پھرتی سے اپنا ریوالور نہ نکال سکا۔ موئی نے چاقو والا ہاتھ لہرایا تو ٹھوڑی کے نیچے لہو کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ زیرو پاور کی مدھم سی روشنی میں وہ فرش پر پھڑپھڑاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

موئی فوراً ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اپنے رومال سے اس کے نرخرے کو دبا کر خون کا بہاؤ روکتے ہوئے بولا۔ "جلدی بول۔ رقم کہاں ہے؟ کیا اس بیگ میں ہے؟"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے موئی کو دیکھ رہا تھا۔ جان تو جا ہی رہی تھی۔ اگر سلامتی بھی ملتی تو وہ رقم... اور ورشا کے بارے میں ایک حرف نہ کہتا۔ اس نے جھنجوڑ کر کہا۔ "بول۔ میں ابھی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"

یہ بچکانا سی بات تھی۔ قاتل ایک مقتول ہونے والے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ کشوری لال کے جسم نے یکبارگی جھٹکا سا کھایا پھر اس کا دم نکل گیا۔

موئی نے اسے چھوڑ کر بیگ کی تلاشی لی۔ اس میں پہننے کا ایک جوڑا تھا۔ شیونگ کا سامان اور بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں اور ایک چھوٹی سی ڈائری رکھی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر خالی بیگ کو لاش کے منہ پر مارا۔ صرف دو گڈیاں تھیں۔ دو کروڑ نہیں تھے۔

وہ اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اوپری جیب میں موبائل فون تھا۔ کمر کی بیلٹ میں ایک پستول پھنسا ہوا تھا۔ اس نے پتلون پر ہاتھ مارا تو پتا چلا۔ اندر ایک چور جیب ہے۔ اس نے بیلٹ کھول کر اندر ہاتھ ڈال کر جیب کو ٹٹولا۔ تین چابیاں تھیں۔ وہ انہیں نکال کر دیکھنے لگا۔

چور کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ چابیاں بہت اہم ہیں۔ اسی لیے وہ چور جیب میں چھپا کر رکھی گئی ہیں۔ وہ انہیں مٹھی میں جکڑ کر سوچنے لگا' ان چابیوں کے تالے کہاں لگائے گئے ہوں گے؟ ایسی کون سی محفوظ جگہ ہے جہاں کشوری لال دو کروڑ دس لاکھ چھپا کر مطمئن ہو گیا تھا؟

اس نے موبائل فون کے کالنگ نمبرز دیکھے۔ اور یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہاں ایک ہی فون نمبر تھا۔ باقی جو ہوں گے انہیں ڈیلیٹ کر دیا گیا تھا۔

وہ ایک نمبر کو پنچ کر کے معلوم کر سکتا تھا کہ دوسری طرف کون ہے اور اس کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ فون کے اندر وہی ایک ہستی رہ گئی تھی۔

اس نے چابیوں کو اپنی چور جیب میں رکھ لیا۔ فون اور ڈائری اٹھا کر ٹارچ کی روشنی میں کمرے کو دیکھنے لگا۔ وہاں صرف ایک بیڈ ایک میز اور دو کرسیاں تھیں۔ وہ فرش پر جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھنے لگا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ کشوری لال تنہا چھپنے آیا تھا۔ اس کے پاس زیادہ سامان نہیں ہو سکتا تھا اور چھپانے کی چیز وہ پہلے ہی کہیں محفوظ کر چکا تھا۔

وہ میز کے پاس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ڈائری کو کھول کر اوراق الٹنے لگا۔ آدھی ڈائری لکھی ہوئی تھی۔ کمپیوٹر سے تعلق رکھنے والی باتیں درج تھیں۔ دو صفحات ایسے تھے جن میں چابیوں کا ذکر آیا۔ اس نے پریشان ہو کر لکھا تھا۔ "کیا کروں۔ یہ چابیاں اس کے پاس کیسے پہنچاؤں؟"

پھر ایک جگہ لکھا تھا۔ "اکثر گرمی کے موسم میں چیچک کی بیماری پھیلتی ہے۔ گرمی شروع ہونے والی ہے ابھی چند مہینے باقی ہیں۔ امید تو نہیں ہے کہ بیماری پھیلے گی لیکن کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جلد ہی رقم وہاں سے نکالنی ہوگی۔"

موئی نے حیرانی سے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ "وہ کون سی جگہ ہے جہاں چیچک کی بیماری پھیلتی ہے اور اس کے پھیلنے سے پہلے ہی وہ رقم نکالنا ضروری ہے۔"

اس نے میز پر گھونسا مار کر زیر لب کہا۔ "وہ کون سی جگہ ہے جہاں وہ تین تالے ہوں گے اور یہ تین چابیاں انہیں کھولیں گی؟

"مجھے اچھی طرح دماغ سے سوچنا ہوگا کہ دو کروڑ دس لاکھ کا چیچک کی بیماری سے کیا تعلق ہے۔ وہ کون سی جگہ ہے جہاں ایسے مریض ہوتے ہیں؟"

یہ بڑبڑاتے ہی وہ ایکدم سے اچھل پڑا۔ دماغ میں سیدھی سی بات آ گئی قرنطینہ...

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ وبائی مرض پھیلتا ہے تو ایسے مریضوں کو تمام شہریوں سے دور ایک (Pest house) قرنطینہ میں رکھا جاتا ہے۔

موئی نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اسے اپنے سامنے ممبئی شہر سے دور شانتا بائی کوارنٹائن کی وسیع و عریض چار دیواری دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے رشتے داروں سے دور پھینکے ہوئے مریض وہاں آخری سانسیں لیتے رہتے تھے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے تھے جو واپس جاتے تھے۔ ورنہ وہیں قرنطینہ کے پیچھے ان کی چتائیں جلا دی جاتی تھیں۔

دو برس پہلے اس چار دیواری میں کئی لاشیں گل سڑ گئی تھیں۔ جتنی بھی انہیں اٹھانے اور جلانے نہیں گئے تھے۔ جانے کیسے یہ بات پھیل گئی تھی کہ وہاں نادیدہ بلائیں رہنے لگی تھیں۔ وہاں جانے والے زندہ لوٹ کر نہیں آتے۔

دیکھا جائے تو کشوری لال لوٹی ہوئی رقم وہاں چھپا کر زندہ واپس آیا تھا اور وہاں سے زندہ آ کر یہاں مارا گیا تھا۔ الغرض قرنطینہ میں جانے والے کو موت بہر حال آ گئی تھی۔

کشوری لال کے فون کی ننھی سی اسکرین روشن ہوئی۔ اس نے کالنگ ٹون کو وائبریشن پر رکھا تھا۔ اس وقت کوئی اسے طلب کر رہا تھا۔ موئی نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے ایکدم سے چونکا دیا۔ وہ ورشا کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "تم وہیں ہو۔ وہاں سے نکل چکے ہو۔ ابھی گھڑی بھر کو آنکھ لگی تھی۔ میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔ وہاں سے ابھی نکل جاؤ۔"

وہ چپ رہا۔ یہ جانتا تھا کہ وہ بھی اس کی آواز پہچان جائے گی۔ اس نے پوچھا۔ "کشور! چپ کیوں ہو؟"

وہ بولا۔ "مقدر منہ بند کر دے تو ہمیشہ کے لیے چپ ہو جاتی ہے۔"

وہ موئی کی آواز سن کر گھبرا گئی۔ "تم... تم کشوری کے فون سے بول رہے ہو۔ وہ کہاں ہے۔ اسے فون دو۔"

"دو لڑنے والوں میں کوئی ایک مارا جاتا ہے۔ وہ زندہ ہوتا تو میں مارا جاتا۔ میں زندہ ہوں تو سمجھ لو۔ وہ کہاں ہوگا۔"

وہ چیخ پڑی۔ "نہیں۔ تم اسے نہیں مار سکتے۔ وہ زندہ ہے۔ اس سے بات کراؤ۔ ہم سے دوستی کرو۔ ہم تمہیں تیسرا پارٹنر بنا لیں گے۔ بھگوان کے لیے کشوری سے بات کراؤ۔"

"تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ کوئی بات نہیں' آج نہیں تو کل یقین آ جائے گا۔"

وہ رونے لگی۔ موئی نے کہا۔ "اب وہ دو کروڑ دس لاکھ میرے ہیں۔ تینوں چابیاں میرے پاس ہیں اور میں کسی دن بھی مناسب موقع دیکھ کر قرنطینہ سے وہ رقم نکال لاؤں گا۔"

وہ روتے روتے چونک کر حیرانی سے بولی۔ "تم کیسے جانتے ہو کہ وہ رقم قرنطینہ میں چھپائی گئی ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جن کاغذوں پر باپو (گاندھی جی) کا فوٹو چھپا ہوا ہے انہیں میں دور سے سونگھ لیتا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "تم ادھر جاؤ گے تو خالی ہاتھ آؤ گے۔ وہ دولت تمہیں نظر آئے گی لیکن تم اسے لا نہیں سکو گے۔"

اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "اچھا ایسا کیا جادو ہے کہ میں اسے دیکھ سکوں گا مگر لا نہیں سکوں گا۔"

"جادو نہیں' کشوری لال کی ذہانت ہے۔ اس نے میرے لیے حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ وہ رقم ایک مضبوط لوہے کے بریف کیس میں ہے۔ اس میں پہلے ایک چابی گھمائی جاتی ہے۔ وہ چابی میرے پاس ہے پھر اسے خاص نمبروں سے کھولا جاتا ہے۔ وہ خاص نمبر صرف میں جانتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں' میں وہ بریف کیس وہاں سے اٹھا لاؤں گا۔ اسے چھپا کر رکھوں گا اور آرام سے اس کے لاک توڑتا رہوں گا۔ ایک آدھ دن کی محنت سے وہ ٹوٹ جائے گا۔ خزانہ باہر آ جائے گا۔"

"اسے اٹھا کر نہیں لے جا سکو گے۔ قرنطینہ کے بڑے کمرے میں ایک مچان بنی ہوئی ہے۔ ایک لوہے کی سیڑھی سے مچان پر جاتے ہیں۔ سیڑھی کے ساتھ لوہے کی ریلنگ ہے۔ وہ بریف کیس سامنے ہی مچان کے سرے پر رکھی ہے اور زنجیر کے ذریعے ریلنگ سے بندھا ہوا ہے۔ تمہارے اچھے بھی فولادی زنجیر توڑ کر بریف کیس وہاں سے اٹھا نہیں سکیں گے۔"

جاسوسی ڈائجسٹ 251 جنوری 2013ء

"ہوں۔ پھر تو مجھے وہاں جا کر دیکھنا ہوگا کہ کیسی کیسی رکاوٹیں ہیں۔ اگر رکاوٹیں دور نہ کر سکا تو تم میرے لیے ضروری ہو جاؤ گی۔"

"جاؤ مرو۔ تم نے میرے کشوری کو مارا ہے۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کروں گی کہ قرنطینہ کے کیڑے تمہیں کھا جائیں۔ تم ایسی موت مرو کہ لوگ تمہیں دیکھ کر اپنے کان پکڑنے لگیں۔"

موسیٰ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں تمہیں چتا میں جلنے کے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ پہلے سوچا تھا تمہیں کسی قبر میں پھینک دوں گا پھر دوسرے دن آ کر دیکھوں گا کہ کس طرح کیڑے تمہیں کھا رہے ہیں۔

"اب تو قرنطینہ میں پلے پلائے کیڑے ہیں۔ کیوں نا تمہیں وہاں لے چلوں۔ تمہیں وہاں سے آدھی رقم ملنے کا یقین ہوگا تو تم ضرور میرے ساتھ وہاں چلو گی۔"

اس نے کچن میں آ کر چولھا جلایا پھر اس ڈائری کو آگ لگا دی۔ نلکے کے پاس آ کر اپنے لباس سے لہو کے دھبوں کو دھویا۔ اس کے بعد کشوری لال کا فون اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

وہ دونوں آگ اور پانی تھے، یکجا نہیں ہو سکتے تھے۔ ورشا کو فکر تھی کہ موسیٰ کسی بھی دن وہ تمام رقم نکال کر لے جائے گا۔ اگرچہ لوہے کے بریف کیس کو توڑنا آسان نہیں تھا اور وہ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی وہ چھٹا ہوا بدمعاش کسی چالبازی سے تمام رقم لے جا سکتا تھا۔

موسیٰ بھی مشکلات کو سمجھ رہا تھا کہ بریف کیس کے ڈبل لاک کو توڑنے کے لیے کسی ایسے لوہار کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی۔ جو لاک بریکر بھی ہو اور کروڑوں کے معاملے میں کسی کو رازدار بنانے سے بہتر یہ ہوتا کہ ورشا کو اہمیت دی جاتی۔

ورشا ہر حال میں بہتر ہوتی۔ ایک بار بریف کیس کھل جاتا تو اسے کھولنے والی کو وہیں سے جہنم پہنچایا جا سکتا تھا۔ خواہ وہ کتنی ہی مکار ہو۔ قرنطینہ کی تنہائی میں ایک تر نوالہ ہوتی۔ وہ اسے چبائے بغیر نگل سکتا تھا۔

ورشا سوچ رہی تھی۔ "ایک بار اس کا وائٹ پاؤڈر چھین کر اسے لاکھوں روپے کا نقصان پہنچا چکی ہوں اور اب تک اس کے ہاتھ نہیں آئی ہوں۔ اب دوستی کروں گی تو وہ دوست بن کر انتقام ضرور لے گا۔

وہ مجھے چھوڑے گا نہیں اور میں کروڑوں روپے [illegible] چھوڑوں گی۔ کوئی ایسی تدبیر کرنی ہوگی کہ سانپ سے [illegible] بیٹھ کر وہ رقم لے آؤں اور وہ مجھے ڈسنے کی حسرت لیے [illegible] جائے۔"

مجرمانہ گیم ایسے ہی کھیلے جاتے ہیں کہ سانپ بھی [illegible] جائے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے۔ موسیٰ نے دوسرے دن فون پر پوچھا۔ "دوستی کرو گی؟"

وہ بولی۔ "تمہاری دوستی بہت مہنگی پڑے گی۔ [illegible] زندگی کو داؤ پر لگانا ہوگا۔"

"میں مسجد میں بیٹھ کر قسم کھاؤں گا کہ میری ذات سے تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"یہ قسم ایسی ہی ہوگی جیسے عدالت میں جھوٹ بولنے والے قرآن اور گیتا پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھاتے ہیں۔ ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔ دو کروڑ دس لاکھ کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

"تو پھر بولو کیا ہوگا؟"

"پہلے تم بولو۔ تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے اچھی طرح غور کیا ہے۔ سب سے آسان اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ تمہاری چابی اور نمبروں کی ترتیب سے بریف کیس کھولا جائے۔ ورنہ اسے توڑنے کے لیے کسی لوہار کو رازدار بنانا ہوگا۔ وہ رازدار چالاک اور مکار نکلا، اس نے مخبری کی تو رقم بھی جائے گی اور جیل کا دروازہ بھی کھل جائے گا۔"

"ایک صورت یہ ہے کہ وہ تینوں چابیاں مجھے دو۔ میں وہاں تنہا جاؤں گی پھر وہاں سے رقم لا کر تمہارا حصہ تمہیں دوں گی۔"

"یعنی میں تم پر اعتماد کروں؟"

"کرنا چاہیے یہی ایک راستہ ہے۔"

"دوسرا راستہ بھی ہے۔ تم مجھ پر اعتماد کرو۔ بریف کیس کی چابی مجھے دو اور وہ مخصوص نمبر بتا دو۔ میں آج رات وہاں جاؤں گا اور صبح سے پہلے تمہارا حصہ تمہیں پہنچا دوں گا۔"

وہ بولی۔ "ہم دونوں فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نہ تم مجھ پر بھروسا کرو گے نہ میں تم پر [illegible]"

"پھر تو میں تم پر لعنت بھیج کر وہاں تنہا جاؤں گا۔ [illegible] طرح بریف کیس کو توڑنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔ میرا نشانہ [illegible] اور یہ کہا جاتا ہے کہ قرنطینہ میں جانے [illegible] باہر آتے ہیں۔"

"کیا تم کبھی وہاں تنہا جا سکو گی؟ میں بھی تمہاری تاک میں رہوں گا۔ میرا بھی نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے پھر موسیٰ نے کہا۔ "ورشا! ہماری دشمنی ہم دونوں کو نقصان پہنچائے گی۔"

"یہی میں سوچ رہی ہوں۔ اگر اچانک بیماری پھیلنے [illegible] شنا باتی کوارنٹائن کی انتظامیہ وہاں صفائی ستھرائی کے [illegible] آئے گی تو بریف کیس ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔"

"ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر دوستی کرنی ہوگی۔ ورنہ ہم [illegible] میں خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔"

"میں سوچوں گی کہ کوئی آخری قابلِ عمل تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔"

"میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ دونوں شدید اضطراب میں مبتلا تھے۔ [illegible] کے اندر دو کروڑ دس لاکھ روپے شیطان کی طرح اچھل [illegible] تھے۔ یہ اندیشہ سکون برباد کر رہا تھا کہ کوئی تیسرا وہ رقم [illegible] اڑا لے گا۔

ورشا نے شام کو فون پر کہا۔ "میں عورت ہوں۔ کمزور [illegible] تم قرنطینہ میں کسی وقت بھی مجھے مسل ڈالو گے۔ لہٰذا سب سے پہلے اپنی سلامتی کی تدبیر یہ ہے کہ قرنطینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہم دونوں ایک ہتھکڑی میں بندھے ہوں گے اور اس ہتھکڑی کی چابی میرے پاس ہوگی۔"

"کیا میں پاگل ہوں کہ خود کو قیدی بنا کر تمہارے ساتھ [illegible] جاؤں گا؟"

"میں بھی تو قیدی بن کر رہوں گی۔ تمہیں دھوکا دے کر ہتھکڑی کھول کر وہاں سے بھاگ نہیں سکوں گی۔ کیونکہ ہتھکڑی پہننے کے بعد قرنطینہ کے باہر ہی اس کی چابی کہیں رکھ دی جائے [illegible]"

وہ اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں اسی [illegible] محفوظ رہوں گی کہ بریف کیس کھلنے کے بعد تم تمام رقم [illegible] فرار نہیں ہو سکو گے۔ میں ہتھکڑی میں تمہارے ساتھ [illegible] ...اور مجھے ہلاک نہیں کر سکو گے۔ کرو گے تو میری [illegible] گھسیٹنا ہوگا۔"

موسیٰ نے دل میں کہا۔ "واہ ری عورت اپنی سلامتی کی [illegible] شاطرانہ تدبیر سوچ کر آئی ہے۔"

وہ بولا۔ "کیا میں قرنطینہ سے باہر آ کر وہاں سے چابی [illegible] ہتھکڑی نہیں کھول سکوں گا؟"

وہ بڑے یقین سے بولی۔ "نہیں کھول سکو گے۔ جب [illegible] میں نہیں چاہوں گی، تم ہتھکڑی سے نجات حاصل نہیں کر سکو گے۔"

"تم باتیں بنا رہی ہو جس چابی سے ہتھکڑی لگائی جائے گی۔ اسی چابی سے میں کیوں نہیں کھول سکوں گا؟"

"یہ تم سوچو، اپنی عقل لڑاؤ۔ میں اپنی سلامتی کی تدبیر کر رہی ہوں اور تمہیں بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہاں جب مجھے لاش بنا دو گے تو گویا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارو گے۔"

"تم مجھے الجھا رہی ہو۔ قرنطینہ سے باہر آ کر ہتھکڑی کیوں نہیں کھول سکوں گا؟"

"جب مجھے مار ڈالو گے تب مسئلہ پیدا ہوگا۔ زندہ رہوں گی تو تمہارے ساتھ قرنطینہ سے باہر آ کر گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھوں گی۔ ممبئی رات کو جاگتا ہے۔ اور آج کل تو ہر طرف رونقیں لگی ہوئی ہیں..... نئے سال کی آمد اور کرسمس کی تیاریاں اپنے عروج پر ہیں۔ ہم کسی بارونق بازار میں آ کر گاڑی کے اندر ہتھکڑی کھولیں گے۔ رقم کا بٹوارا ہوگا۔ تم اپنا حصہ لے کر گاڑی سے اتر کر دور جاؤ گے۔ تب میں اپنی اس گاڑی میں وہاں سے چلی جاؤں گی۔

"میں نے ایک ایک بات مکمل کہہ دی ہے۔ یہ گیم اسی طرح کھیلا جائے گا۔ منظور ہو تو کال بیک کرو، میں انتظار کروں گی۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ اپنی پوری دماغی توانائی سے سوچنے لگا کہ ایک عورت کے دماغ میں ہتھکڑی والی تدبیر کیسے آئی ہے؟ بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ واقعی محفوظ رہے گی۔ میں اسے ہلاک نہیں کر سکوں گا۔

اور یہ بھی درست کہہ رہی ہے کہ میں دشمنی نہیں کروں گا۔ اسے زندہ سلامت رہنے دوں گا تو کسی بھرے پرے بازار میں پہنچ کر ہتھکڑی کھولی جائے گی۔ وہاں میں اسے ہلاک کرنے کی حماقت نہیں کروں گا۔

وہ ہتھکڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بندھ جانے کے بعد اسے کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے؟ بار بار یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بس اتنا ہے کہ اسے آدھی رقم کے ساتھ زندہ چھوڑنا ہوگا۔

مجبوری تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ "اسے حصہ دے دیا جائے بعد میں اس سے نمٹ لوں گا۔ فی الحال مجھے ایک کروڑ پانچ لاکھ ملیں گے۔ اتنی بڑی رقم جلد سے جلد حاصل کرنی چاہیے۔"

آخر اس نے فون پر کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی اسی وقت وہاں جانا چاہیے۔"

وہ بولی۔ ”ہم ابھی نہیں جائیں گے۔ وہاں جانے سے پہلے اچھی خاصی تیاری کرنی ہوگی۔“

”تیاری کیا کرنی ہے؟ اندھیری رات ہے۔ ہم جائیں گے۔ تین تالے کھولیں گے۔ فوراً ہی بریف کیس سے رقم نکال کر لے آئیں گے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ وہاں خونخوار چوہے، چھپکلیاں اور آہستہ آہستہ چبا جانے والے قبر کے کیڑے ہیں۔ کشوری لال جب وہ بریف کیس چھپانے گیا تھا۔ تب وہ کیڑے مار دوائیں اسپرے کرنے کا سامان لے گیا تھا۔

”اس نے بتایا تھا کہ وہ چوہے اور کیڑے مکوڑے بڑے سخت جان ہیں۔ دواؤں سے مرتے تو نہیں ہیں لیکن دور بھاگ جاتے ہیں۔ یوں کشوری لال کے جانے اور آنے کا راستہ بن گیا تھا۔“

”میں ابھی بازار جا کر دوائیں اسپرے کرنے کا سامان لے آؤں گا۔“

”جلدی نہ کرو۔ گیس ماسک اور آکسیجن سلنڈر لازمی ہیں کیونکہ زہریلی دوا اسپرے کرنے کے بعد ہمیں بھی وہاں سانسیں لینی ہیں۔“

”ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔ میں یہ سارا سامان لے آؤں گا۔“

”تم اپنا سامان خریدو۔ میرے پاس اپنے استعمال کا سامان موجود ہے۔ آج اس لیے نہیں جاؤں گی کہ کل ایک ایسی گاڑی کرائے پر حاصل کروں گی جو ہمارے استعمال میں رہے گی۔ کام ہونے کے بعد میں اسے کہیں دور چھوڑ دیں گے۔“

”جو کام ابھی ہو سکتا ہے، اسے کل رات کرنا چاہتی ہو۔ خواہ مخواہ دیر نہ کرو۔“

”اور تم خواہ مخواہ جلدی نہ کرو۔ میں ہر طرح سے محتاط رہنے کے بعد تمہارے ساتھ قرنطینہ میں جاؤں گی اور ایک بات ہے۔“

”اب اور کیا ہے؟“

”کل رات ہم دونوں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔ ہم ایک چھوٹا سا چاقو بھی نہیں رکھیں گے۔“

”احمقانہ باتیں نہ کرو۔ وہاں کسی دشمن سے یا پولیس والوں سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔“

”میری نظروں میں ہم دونوں کا ٹکراؤ اہم ہے۔ ہتھیار سے ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے۔ کل کوئی دشمن کوئی پولیس والا نہیں ہوگا۔ ہم ہی دشمن ہوں گے۔ ہم ہی دوست ہوں گے۔“

موئی نے ناگواری سے منہ بناتے ہوئے فون بند کیا۔ ورشا نے اپنی دو باتیں منوائی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہتھکڑی میں اس کے ساتھ بندھی رہے گی۔ دوسری بات یہ کہ نہ دونوں کے پاس ہتھیار ہوں گے نہ وہ ایک دوسرے سے خوفزدہ رہیں گے۔

☆☆☆

دسمبر کی تاریک رات تھی۔ چاند اپنی آخری تاریخ میں گم ہو گیا تھا۔ ورشا ایک چھوٹی سی کار ڈرائیو کرتی ہوئی قرنطینہ کے دروازے کے سامنے آگئی۔ موئی وہاں پہلے سے پہنچا ہوا تھا۔

وہ گاڑی سے باہر آئی۔ دونوں سائے کی طرح ایک دوسرے کو دکھائی دے رہے تھے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھ گئی تھیں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔

موئی نے کہا۔ ”ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔ تم نے شاید کبھی چھپ کر مجھے دیکھا ہوگا۔ میں آج بھی تمہیں دیکھ نہیں پا رہا ہوں۔ صورت نظر نہ آئے تو کشش اور بڑھ جاتی ہے۔“

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”مجھ سے زیادہ کشش دو کروڑ دس لاکھ میں ہے۔ دھیان ادھر ہی رکھو۔ مجھے تمہاری تلاشی لینی ہے۔ پھر تم میری تلاشی لے لینا۔“

وہ دونوں ہاتھ اور پاؤں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ ورشا نے اوپر سے نیچے تک اس کے لباس کی اچھی طرح تلاشی لی۔ پھر موئی نے بھی اس کے لباس کو اور بدن کو اچھی طرح ٹٹولا۔ دونوں مطمئن ہو گئے۔ کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔

شٹر کے نچلے حصے میں تین تالے تھے۔ موئی نے چابیاں نکال کر انہیں کھولا۔ پھر شٹر اٹھانے سے پہلے انہوں نے گیس ماسک منہ پر چڑھا لیا۔ گیس سلنڈر کو اپنی اپنی پشت پر رکھا پھر ورشا نے ہتھکڑی کی ایک کڑی اس کی کلائی میں پہنائی دوسری اپنی کلائی میں پہنی پھر چابی اسے دے کر کہا۔ ”اسے کار کی چھت پر اپنے ہاتھ سے رکھو۔ واپسی میں یہیں سے چابی اٹھا کر ہتھکڑیاں کھولی جائیں گی۔“

موئی نے اپنے ہاتھ سے چابی وہاں رکھ کر اطمینان حاصل کیا۔ اب وہ واپس آنے تک نہ ایک دوسرے سے دور بھاگ سکتے تھے نہ ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔

موئی کی دائیں کلائی اور ورشا کی بائیں کلائی ہتھکڑیوں میں تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دروازے کے سامنے آئے۔ پھر موئی نے شٹر [illegible] اٹھایا۔ بدبو کا ایک تیز بھبکا باہر آیا۔ انہوں نے فوراً ہی [illegible]

ناک پر چڑھا لیا۔

پھر ایک نے ٹارچ روشن کی تو سامنے ہی بڑے ہال میں ادھر ادھر انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے دکھائی دیے۔ بڑے بڑے چوہے اور چھپکلیاں روشنی ہوتے ہی ادھر ادھر بھاگ گئے۔ زمین پر رینگنے والے کیڑے آرام سے ٹہل رہے تھے۔

وہ ڈھانچے کہہ رہے تھے کہ ہمیں اچھی طرح چاٹنے کے بعد یہ ٹہل رہے ہیں۔ ایک مدت سے انہیں ایسی خوراک نہیں ملی ہے۔ اچھا ہے تم دونوں آگئے۔

روشنی میں دور دور تک چوہوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ جیسے انہیں دیکھ رہے تھے اور ان پر جھپٹنے کے لیے سوچ رہے تھے۔

دونوں نے کمر بیلٹ سے بندھے ہوئے حشرات کش دوا کے کین نکالے پھر انہیں اسپرے کیا۔ جہاں تک وہ دوا گئی وہاں تک آگے بڑھنے کا راستہ صاف ہو گیا۔ وہ زہریلے دشمن ادھر چلے گئے۔

وہ دونوں اس ہال سے گزر کر ایک کمرے میں آئے۔ یہاں بھی انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے اور زہریلے دشمن تھے۔ دوا اسپرے کرنے سے عارضی طور پر وہ دور ہٹتے تھے پھر رینگتے ہوئے قریب آنے لگتے تھے۔

اسی کمرے میں چھت کی طرف ایک مچان بنی ہوئی تھی۔ لوہے کا ایک زینہ وہاں تک گیا تھا۔ ہاتھ رکھ کر چڑھنے کے لیے لوہے کا ایک موٹا پائپ ریلنگ کے طور پر لگا ہوا تھا۔ موئی نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ زینے کے اوپری سرے پر وہی بریف کیس دکھائی دیا اور واقعی ایک موٹی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔

موئی نے خوش ہو کر ورشا کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرائی پھر وہ زینے کے پہلے پائدان پر آگئے۔ وہ اوپر نیچے دو پائدان پر تھے۔ موئی آگے اور وہ پیچھے تھی۔ دونوں کے ہتھکڑی والے ہاتھ لوہے کی ریلنگ پر تھے۔ وہ ایک ایک پائدان پر چڑھتے ہوئے بریف کیس کے قریب پہنچ گئے۔

ورشا نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور موئی کی طرف بڑھائی۔ اس نے چابی لے کر بریف کیس کے کی ہول میں ڈالی اور اسے گھمایا۔ ہلکی سی کھٹ کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک لاک کھل گیا۔

اس نے کہا۔ ”تھینک یو ورشا! اب نمبر بولو۔“

وہ بولی۔ ”سیون زیرو سیون سیون۔“

اس نے ان نمبروں کو اسی ترتیب سے اپنے سامنے کیا تو کھٹ کی آواز سنائی دی۔ دوسرا لاک کھل گیا۔

اس نے بڑی بے تابی سے بریف کیس کو کھولا۔ خوشی کے مارے اس کا منہ کھل گیا۔ وہاں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دو کروڑ دس لاکھ ہوں گے۔

وہ خوشی سے چیخ کر بولا۔ ”یہ پورے ہوں گے۔ پورے دو کروڑ دس لاکھ ہوں گے۔ میں ابھی گن کر دیکھتا ہوں۔ یہیں رقم بانٹ لی جائے گی۔“

گنتی کے لیے دو ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ اس نے ہتھکڑی والا ہاتھ بڑھایا تو وہ رُک گیا۔ آگے دوسرے ہاتھ کے برابر نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ ”ورشا ہاتھ بڑھاؤ۔ مجھے گننے دو۔“

ورشا سے جواب نہیں ملا۔ ہاتھ بھی آگے نہیں بڑھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ورشا اس کے پیچھے نہیں تھی۔ اس کی کلائی کی ہتھکڑی زینے کی ریلنگ نے پہن لی تھی۔

اب وہ ورشا سے نہیں لوہے کی ریلنگ سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر آزاد کھڑی ہوئی تھی۔ ایک چٹکی میں پکڑی ہوئی چابی دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”یہ ڈپلیکیٹ ہے۔ میں نے دو بنوائی تھیں۔ ایک چابی تم باہر کار کی چھت پر رکھ کر آئے ہو۔ یہ دوسری میرے بالوں کی کیچر میں چھپی ہوئی تھی۔ تم نے سر سے پاؤں تک میری تلاشی لی۔ بالوں کو نہیں چھیڑا۔۔۔ شکریہ۔“

وہ ریلنگ سے الگ ہو کر اس کی طرف نہیں آ سکتا تھا۔ ہتھکڑی والے ہاتھ کو غصے سے جھٹک رہا تھا۔ ورشا نے کہا۔ ”کیوں غصہ آ رہا ہے۔ دو کروڑ چاہتے تھے، وہ تمہارے سامنے ہیں اور تم زہریلے کیڑوں اور خونخوار چوہوں کے سامنے ہو۔“

موئی نے حشرات کش دواؤں کا کین اپنی کمر بیلٹ سے نکالا۔ وہ بولی۔ ”یہ دوا کب تک کام آئے گی؟ جلد ہی ختم ہو جائے گی پھر کیا ہوگا؟“

ورشا نے بولنے کے لیے منہ اور ناک پر سے گیس ماسک کو تھوڑی دیر کے لیے ہٹایا تھا۔ موئی نے اچانک ہی اس کی ناک کی طرف اسپرے کیا۔ زہریلی دوا کا ایک بھبکا اس کی سانسوں سے ٹکرایا۔ وہ ایکدم سے بوکھلا گئی۔ ذرا چکرا کر آگے کی طرف جھکی تو موئی نے اچھل کر دونوں ٹانگوں سے اس کی گردن جکڑ لی۔

یہ اس پر کامیاب حملہ تھا۔ وہ ہاتھوں سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر سے بندھا ہوا تھا۔ اپنے قد کی لمبائی کے مطابق اس

نے دونوں پیروں کی قینچی میں گردن کو پھنسا لیا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ موسیٰ کے پاؤں اسے ادھر سے ادھر جھٹکے دے رہے تھے پھر وہ نڈھال سی ہو کر جھکی تو اس کا سر زینے کے پائدان سے ٹکرا گیا۔ وہ لوہے کا زینہ تھا۔ سر ٹکراتے ہی پیشانی سے خون اُبل پڑا۔ چوہے اور چھپکلیاں تڑپ کر اس کی طرف آنے لگیں۔ انہیں برسوں سے انسانی لہو کا چسکا پڑا ہوا تھا لیکن وہ قریب نہ آسکیں۔ موسیٰ نے ابھی ابھی دوا اسپرے کی تھی۔

اس کمرے میں دور تک خونخوار آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان بھوکوں کا نصیب ان کے لیے دسترخوان بچھا رہا تھا۔

اگرچہ موسیٰ اسے جکڑے ہوئے تھا۔ اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ تاہم وہ بھی زخمی ہو رہا تھا۔ ورشا کی گردن کے ساتھ اس کے دونوں پاؤں لوہے کے پائدان سے اور ریلنگ سے ٹکرا رہے تھے۔ پیروں کی جلد پھٹ رہی تھی اور لہو بہنے لگا تھا۔

اور بہتا ہوا لہو بے زبان بھوکوں کی بھوک چمکا رہا تھا۔

ایسے لوگ جو اخلاق اور تہذیب کو نہیں مانتے اور قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ ان کی بھی پکڑ ہوتی ہے اوپر سے... وہ اوپر والا ہی اچانک کسی دن ایسا جھٹکا دیتا ہے کہ تمام مجرمانہ ہتھکنڈے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پھر انہیں فرار کا اور سلامتی کا راستہ نہیں ملتا۔

ورشا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اب وہ گردن چھڑانے کے لیے جدوجہد نہیں کر رہی تھی۔ موسیٰ نے ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھا پھر منہ پر سے ماسک ہٹا کر بولا۔ ”چابی دو۔ ورنہ گردن کبھی چھڑا نہیں پاؤ گی۔“

ورشا کی آنکھیں کمزوری کے باعث بند ہو رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ پھر اسے چٹکی میں پکڑی ہوئی چابی دکھائی۔ وہ ایک ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”ذرا اوپر آؤ۔ چابی دو۔ میں گردن چھوڑ دوں گا۔“

اس نے چابی کو اس کی طرف بڑھایا جیسے دے رہی ہو پھر اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ چابی کو دور زینے کے نیچے پھینک دیا۔ وہ غصے سے اسے گالیاں دینے لگا۔ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ چابی تاریکی میں کہیں جا کر گم ہو گئی تھی۔ وہ اپنا ایک ہاتھ کاٹنے کے بعد ہی اسے تلاش کرنے جا سکتا تھا۔

اور ہاتھ کاٹنے کے لیے چاقو ضروری تھا۔

اور ورشا نے پہلے ہی ہتھیار کو ممنوع بنا دیا تھا۔

غصے کی شدت سے اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ رہائی بے ناممکن ہو گئی تھی۔ اس نے ایک زور کی لات اسے ماری۔ وہ چیختی ہوئی درمیانی زینے پر اُلٹ کر سر کے بل نچلے پائدان پر آ کر گری۔ یہ آخری حملہ تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

لہو فرش پر پھیلنے لگا۔ چوہے دوڑتے ہوئے آئے اور لہو پینے لگے۔ اس کے بدن کو جگہ جگہ سے کترنے لگے۔ وہ تو مر چکی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

موسیٰ دیدے پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اسے چتا میں جلنے نہیں دے گا۔ اسے کیڑے کھائیں گے اور یہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

اور وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے وہ لہو میں بھیگ رہے تھے۔ چوہے اس پر بھی حملہ کرنے آئے۔ اس نے دوا اسپرے کی۔ وہ دور چلے گئے لیکن کب تک؟

وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد آتے تھے۔ دوا اسپرے ہو کر فضا میں پھیلتی تھی پھر جلد ہی اس کا اثر زائل ہو جاتا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ کین خالی ہو گیا۔

بریف کیس بھرا ہوا تھا۔ اور اب بٹوارا ہونے والا نہیں تھا۔ پورے دو کروڑ دس لاکھ اس کے ہو گئے تھے۔ ہائے وہ دولت اب وہاں سے کیسے لے جائے؟

یکبارگی اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ کتنے ہی چوہوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ ”بچ ؤ...!“

پہلی بار اس کی چیخ باہر تک آئی۔

باہر رات اندھیری تھی... گونگی تھی... بہری تھی۔

”بچاؤ...! کوئی ہے...؟“

کوئی ہوتا تو یہ عبرت ناک تماشا دیکھتا کہ قبر کے کیڑے زندہ انسان کو کس طرح کھاتے ہیں؟

اور کوئی ہوتا تو کیا کر لیتا؟ قرنطینہ تو ہے ہی زندہ درگور ہونے کے لیے۔ وہاں آنے والے بیمار ہوں یا بے ایمان ہو آ کر واپس نہیں جاتے۔

”کوئی ہے... کوئی ہے جو قرنطینہ سے عبرت حاصل کرے؟

اندر سے آخری ڈوبتی ہوئی آواز آئی۔ ”کوئی ہے...؟“

ایک سوال تاریک رات کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

”کوئی ہے...؟“

سوال سوال ہی رہا۔ گم ہو گیا۔ 31 دسمبر دو ہزار بارہ کی آخری ساعتیں گزر رہی تھیں اور نئے سال کے سورج کی تابانیاں طلوع ہونے کو بے قرار تھیں۔

☆

زرگزیدہ

مریم کے خان

فتنہ و فساد کی ایک سدا بہار مثلث ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے... ہر جرم اسی مثلث کے کسی کونے سے جنم لیتا ہے اور پھر بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے... تفتیش کار کسی سراغ کی تلاش میں اسی گوشۂ گمنام و بے نشان میں بھٹکتے رہتے ہیں لیکن کہاوت ہے کہ لگن سچی ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے... ڈھونڈنے کا ولولہ آخرکار مجرم کے گریبان تک پہنچا ہی دیتا ہے... پھر کوئی دلیل کام نہیں آتی... نان جویں کی جستجو میں شب و روز سرگرداں رہنے والوں پر جب ہُن برسنے لگتا ہے تو قدم لڑکھڑا جاتے ہیں، راست روی بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے... اور گدھ، بھوکے گدھ ایسے بھٹکے ہوؤں کی گھات میں مورچے لگائے بیٹھے ہوتے ہیں جو نشانے پر آجائے، اسی کو گھیر لیتے ہیں، یہ بھول کر کہ ان کے کرتوت انہیں کس طرح بے نام و نشان کر دیں گے... معاشی اور معاشرتی نیک و بد کے تانے بانے سے بُنی ..... چشم کشا کہانی جس میں تجسس اور تحیر کے ساتھ سبق بھی ہے... ان کے لیے جو سیکھنا چاہتے ہیں...

زن، زر اور زمین کی تکون سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان

حیات احمد طیارے سے اترا تو اسلام آباد کا موسم بھی سرد ہو رہا تھا لیکن لندن کی سردی کے مقابلے میں یہ ہلکا ہی تھا۔ وہاں قیامت کی سردی پڑ رہی تھی۔ طویل فلائٹ کے بعد وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترا تھا۔ حیات احمد تقریباً اٹھائیس تیس سال کا خوش شکل مرد تھا۔ ہلکی ترشی ہوئی مونچھیں بالوں کی طرح لائٹ براؤن کلر کی تھیں۔ آنکھوں کا رنگ کسی قدر گہرا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ کسی قدر ستا ہوا اور تھکن زدہ لگ رہا تھا۔ اس نے گرم پتلون پر لیدر اور جینز سے بنی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ امیگریشن سسٹم کے مراحل سے گزر کر وہ باہر آیا۔ فوراً ہی ٹیکسی اور پرائیویٹ کار والوں نے اس پر یلغار کر دی۔ وہ سب اسے لے جانے پر مصر تھے لیکن اس نے ایک نوجوان سے بات کر لی جس کے پاس ذاتی کار تھی۔

”مجھے مظفر آباد سے ذرا آگے ایک گاؤں شاہ پور تک جانا ہے۔“

”لے جائے گا صاحب۔“ نوجوان نے متانت سے کہا۔

دونوں کے درمیان کرائے پر بات ہوئی... اب وہ اپنے گاؤں کی جانب گامزن تھا۔

☆☆☆

شاہ پور وہ قصبہ تھا جہاں حیات احمد نے آنکھ کھولی تھی۔ یہ قصبہ ان میرپور کے مہاجروں نے آباد کیا تھا جو منگلا ڈیم کی تعمیر کے بعد اپنی زمینوں سے بے دخل ہو گئے تھے۔ ان میں جمیلہ اور سجاد احمد بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سجاد کی پرانے میرپور میں چھ کنال آبائی زمین تھی۔ اس کے بدلے اسے شاہ پور میں چھ کنال زمین اور کچھ رقم بھی ملی تھی جس سے اس نے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا۔ یہاں زمین اچھی حالت میں نہیں تھی اور نہ ہی سجاد کے پاس اتنا پیسا اور وقت تھا کہ وہ زمین کو دوبارہ سے آباد کرتا اس لیے اس نے ملازمت کر لی۔ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ڈرائیور لگ گیا۔ وہ ٹرک چلاتا تھا اور جب وہ باہر جاتا تو جمیلہ اکیلی رہ جاتی۔ اسے اکیلے رہنے سے ڈر لگتا تھا مگر مجبوری تھی۔ بہرحال وہ اچھا دور تھا، اکیلی عورت بھی عزت اور سکون سے گھر میں رہ جاتی تھی پھر شاہ پور آنے کے بعد ان کے ہاں حیات احمد پیدا ہوا۔

حیات ان کی پہلی اولاد تھا اور شادی کے تین سال بعد پیدا ہوا تھا دونوں میاں بیوی خوشی سے نہال تھے۔ پہلی اولاد اور پھر بیٹا ہونے کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ جس ماحول کے باسی تھے، وہاں بیٹے کی خواہش زیادہ کی جاتی تھی۔ اب جمیلہ کو اکیلے نہیں رہنا پڑتا تھا۔ بیٹا اس کے لیے رفاقت اور مصروفیت لایا تھا۔ اب سجاد طویل سفر پر کئی دن کے لیے جاتا تو اسے تنہائی اور خوف کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ بڑا ہونے لگا۔ اپنے پیروں پر چلنے اور کھیلنے لگا۔ تین سال کا ہوا تو وہ باہر جانے لگا لیکن جمیلہ اسے گھر سے زیادہ دور جانے نہیں دیتی تھی۔ البتہ

پانچ سال کا ہوا تو اسے اسکول میں داخل کرانا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ صبح سے دوپہر تک کئی گھنٹوں کے لیے ماں اور گھر سے دور رہتا تھا۔ شروع میں اسے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ وہ اسکول میں بے آواز روتا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گیا۔ جب وہ دوسری کلاس میں پہنچا تو اسکول شوق سے جانے لگا کیونکہ اسے پڑھنا اچھا لگتا تھا۔

جمیلہ اور سجاد کے ہاں دوسری اولاد اس وقت ہوئی جب وہ تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ حیات دس سال کا تھا جب شہزاد پیدا ہوا۔ ماں باپ تو خوش تھے۔ حیات ان سے زیادہ خوش تھا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کا ایک بھائی دنیا میں آگیا ہے۔ پہلے اسے اسکول سے آنے کی جلدی نہیں ہوتی تھی لیکن اب وہ بے تابی سے چھٹی کے وقت کا انتظار کرتا تا کہ گھر جائے اور شہزاد کے ساتھ کھیل سکے۔ بھائیوں میں محبت فطری چیز ہوتی ہے لیکن حیات کو شہزاد سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ بے قرار ہو جاتا۔ اگر وہ بیمار ہوتا تو حیات کا سکون، چین اور کھانا پینا حرام ہو جاتا۔ اس کی حالت دیکھ کر جمیلہ اور سجاد ہنستے۔ جمیلہ کہتی۔ ''لگتا ہے شہزاد کی ماں اور باپ یہی ہے، ہم تو بس ایسے ہی ہیں۔''

جیسے جیسے شہزاد بڑا ہوتا گیا، وہ خود بہ خود بھائی سے قریب ہوتا گیا۔ اگر انسان کو اس کی حیثیت سے زیادہ محبت ملنے لگے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور اس محبت کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ ایسا ہی شہزاد کے معاملے میں ہوا۔ حیات کی محبت نے اسے مغرور کر دیا۔ وہ حیات پر اپنا حق سمجھنے لگا اور اس حق کو بے دریغ استعمال کرنے لگا۔ تین چار سال کی عمر میں وہ حیات کو اپنے اشاروں پر چلانے لگا۔ وہ اپنا کام اور تفریح چھوڑ کر شہزاد کی خواہشات پوری کرتا۔ روز شام کے وقت وہ شہزاد کو باہر لے جاتا۔ اسے گھماتا پھراتا اور کھلاتا۔ اس عمر میں جمیلہ اسے باہر نہیں جانے دیتی تھی اس لیے اسے کھیلنے کا موقع نہیں ملا اور جب اس کے خود سے باہر جا کر کھیلنے کی عمر آئی تو شہزاد دنیا میں آگیا۔ یوں اسے موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے لیے کچھ وقت نکال سکے۔

میٹرک کے بعد حیات نے شاہ پور سے ذرا دور شہر کے پاس ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں شہزاد نے اسکول جانا شروع کیا تھا اور ان ہی دنوں شکیلہ پیدا ہوئی۔ شہزاد کی محبت حیات کے دل میں خود پیدا ہوئی تھی لیکن شکیلہ ان بچوں میں سے تھی جو دوسروں کو اپنی جانب خود متوجہ کر لیتے ہیں۔ آنے والے پانچ برسوں تک حیات پر شکیلہ کا قبضہ رہا۔ اس دوران میں اس نے گریجویشن کر لیا تھا۔ قدرت کے [illegible] میں کتنی ٹائمنگ ہوتی ہے۔ کم سے کم جمیلہ اور سجاد کے [illegible] ہی ہوتا آیا تھا۔ میرپور سے دربدر ہونے کے بعد کئی سال تک ان کی اولاد نہیں ہوئی۔ جب وہ سیٹ ہو گئے تو قدرت نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔

اب تک قدرت کی ٹائمنگ ان کے فیور میں تھی لیکن اچانک اس میں بدلاؤ آ گیا۔ ادھر حیات نے تعلیم مکمل کی اور ادھر سجاد ایک حادثے میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ ٹرک لے کر شہر جا رہا تھا، اس پر گنجائش سے زیادہ [illegible] ہوا تھا۔ اوور لوڈنگ کی وجہ سے ٹرک بے قابو ہو کر ایک کھائی میں جا گرا اور سجاد موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ غربت تھی لیکن فاقے اور تنگ دستی نہیں تھی۔ وہ روکھی کھاتے لیکن تین وقت کھاتے تھے۔ مگر سجاد کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی فاقوں اور تنگ دستی کا عفریت منہ پھاڑے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جمیلہ سہم گئی کہ اب کیا ہوگا۔ آنے والی بھوک کے خوف سے شہزاد کے آنسو خشک ہو گئے۔ شکیلہ ابھی چھوٹی تھی اسے ماں سے خوراک مل جاتی تھی اس لیے اس کے حصے کی فکر بھی جمیلہ کو کرنا پڑ رہی تھی۔

مگر حیات نے ہمت کی۔ اس نے جمیلہ سے کہا۔

''امی! آپ فکر نہ کریں۔ ابو نہیں ہیں مگر میں تو ہوں... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں آپ لوگوں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

جمیلہ رونے لگی۔ حیات صرف بیس سال کا تھا۔ اس عمر کے لڑکے بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں گھر والوں کی تو کیا کمانے کی فکر بھی نہیں ہوتی اور حیات پورے گھر کا بوجھ سر پر لے رہا تھا۔ یہ قدرت کا انوکھا رواج ہے کہ بھرے پُرے گھر کو ایک باپ جتنی آسانی سے چلا لیتا ہے، اسی گھر کو کوئی دوسرا فرد بہت مشکل سے چلاتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مخلص اور محنتی کیوں نہ ہو۔ اب تک حیات کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے باپ کی آمدنی کیا تھی لیکن اس نے گھر اور گھر کے کسی فرد کی ضرورت کو رکتے نہیں دیکھا تھا۔

سجاد کے بعد حیات کو معلوم ہوا کہ ان کے پاس کوئی جمع پونجی نہیں تھی کیونکہ سجاد جو کماتا تھا، وہ اپنے گھر پر خرچ کر دیتا تھا۔ ان بیس سالوں میں اس نے زمین پر محنت کر کے سیب اور آڑو کا باغ لگا لیا تھا۔ مگر یہ بہت اچھی کوالٹی کا نہیں تھا اس لیے سال میں جب پھل اترتا تو انہیں بہت زیادہ نہیں ملتا تھا۔ زمین کے کچھ حصے پر ذاتی ضرورت کے لیے سبزی لگا رکھی تھی۔ اسی طرح دو بکریاں اور چند مرغیاں پال

رکھی تھیں جن سے گھر کے دودھ اور انڈوں کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ بکریاں جو بچے دیتی تھیں، انہیں وہ بڑی عید پر قربان کر دیا کرتے تھے۔ حیات کو اسی کمپنی میں ملازمت مل گئی جہاں سجاد ڈرائیور تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا اس لیے اسے حساب کتاب کا کام دے دیا گیا مگر تنخواہ اتنی نہیں تھی۔ حیات نے انکار نہیں کیا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہی تھا۔ اسے آگے پڑھنے اور ماسٹر کرنے کا شوق تھا مگر اب یہ شوق دل میں ہی رہ گیا۔

حیات کی نوکری سے گھر کی گاڑی چلنے لگی۔ تنخواہ کم تھی اور مہنگائی بڑھ رہی تھی اس لیے گزارہ مشکل ہو رہا تھا۔ شہزاد اور شکیلہ جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے، ان کے اخراجات بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے حیات خود پر جبر کرتا تھا۔ پرانے کپڑوں اور جوتوں میں گزارہ کرتا۔ اس نے کوئی ایسی علت نہیں پالی تھی جس پر اسے رقم خرچ کرنی پڑے۔

ابتدا میں شاہ پور غریبوں کا قصبہ تھا۔ بے دخل ہو کر آنے والے اپنی زندگی دوبارہ سے تعمیر کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ حکومت کے ساتھ دنیا والے بھی ان کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ خاص طور سے برطانیہ نے ان لوگوں کے لیے اپنے ملک کے دروازے کھول دیے تھے اور انہیں بہت آسانی سے برطانیہ کا ویزا اور نیشنلٹی مل رہی تھی۔ شاہ پور کے کچھ لوگ بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ چلے گئے۔ انہوں نے وہاں محنت کی اور کما کر گھر والوں کو بھیجا۔ ان کے حالات بدل گئے۔ انہوں نے اپنے کچے... مکانوں کی جگہ خوب صورت اور پکے مکانات بنوا لیے۔ اپنی بیٹیوں کو آباد کیا اور ان کے گھروں میں زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں آ گئیں۔

اس کایا پلٹ نے دوسروں کو بھی للچایا اور وہ بھی باہر جانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ یہ زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے باہر جانے والوں کا ایسا تانتا بندھا کہ شاہ پور کے نصف مرد باہر چلے گئے اور آنے والے دس سالوں میں شاہ پور کا حلیہ ہی بدل گیا۔ شاہ پور ایک غریبانہ بستی سے ایک خوش حال اور خوب صورت قصبے میں بدل گیا۔

اس تبدیلی کا اثر ان گھرانوں پر تو مثبت ہوا جو اس تبدیلی سے براہ راست مستفید ہوئے تھے لیکن وہ گھرانے جن کا کوئی فرد باہر نہیں تھا اور وہ یہیں رہ کر کما رہے تھے، ان کی غربت زیادہ نمایاں ہونے لگی۔ اپنے آس پاس ہونے والی تبدیلیوں کا انہوں نے اثر لیا۔ جب سب ایک جیسے تھے تو کسی کو احساس نہیں تھا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے لیکن جب ان میں سے کچھ پیسے والے ہو گئے تو باقیوں کو پتا چلا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی زندگی میں کیا کیا کمی ہے۔ اس تبدیلی کا آغاز حیات کے بچپن میں ہو گیا مگر جب وہ بڑا ہوا اور باپ کے مرنے کے بعد اس نے گھر کی ذمے داری سنبھالی، تب تک شاہ پور مکمل تبدیل ہو چکا تھا۔ حیات نے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ شہزاد کو بھی اسی اسکول میں داخل کرایا گیا مگر اسے یہ اسکول پسند نہیں تھا۔ وہ اس پرائیویٹ اسکول میں پڑھنا چاہتا تھا جہاں اب شاہ پور کے امراء کے بچے پڑھتے تھے مگر اس کی فیس برداشت کرنا ان کی اوقات سے باہر تھا۔ اس لیے شہزاد ضد کے باوجود سرکاری اسکول میں پڑھتا رہا۔

شہزاد حیات سے بالکل مختلف تھا۔ حیات میں جتنا صبر تھا، شہزاد میں اتنی ہی ضد تھی۔ وہ ہر اچھی چیز چاہتا تھا اور اسے کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کا تعلق ایک غریب گھر سے ہے جہاں انہیں کھانے پینے کے ساتھ مناسب سہولتیں مل رہی ہیں۔ مگر تعیشات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شہزاد چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی وہ سب ہو جو دوسرے بچوں کے پاس ہے۔ سرکاری اسکول میں بھی امیر گھرانے کے بچے آتے تھے۔ ان کے پاس کافی پیسے ہوتے تھے اور وہ کھل کر خرچ کرتے تھے جبکہ شہزاد کو ایک روپیا جیب خرچ ملتا تھا۔ کبھی کبھی حیات ماں سے چھپ کر اسے دو روپے دے دیتا تھا لیکن اس سے اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اس سے کہیں زیادہ چاہتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا، اس کی حسرتیں اور خواہشیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ جب وہ بھائی یا ماں سے کوئی خواہش کرتا اور وہ پوری نہیں ہوتی تو شہزاد جھنجلا جاتا۔

''دوسروں کے پاس بھی تو یہ سب ہے۔''

''ان کے پاس دولت ہے۔''

''تو ہمارے پاس کیوں نہیں ہے؟''

''کیونکہ ان کے گھروں میں باہر سے پیسا آتا ہے۔''

شہزاد سوچتا کہ اگر حیات باہر چلا جائے تو ان کے گھر میں بھی پیسا آئے گا اور پھر انہیں کسی چیز یا کسی خواہش کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا۔ مگر وہ ماں یا بھائی سے یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا، اس لیے اندر ہی اندر جلتا اور کڑھتا۔ شکیلہ بھی تقریباً اسی کی فطرت کی تھی۔ اسے بھی خواہش تھی کہ ان کے پاس ڈھیروں پیسے ہوں اور ان کے گھر میں تفریح اور سہولت کی ہر چیز ہو۔ اس کی سہیلیوں کے گھر سب کچھ تھا۔

حیات نے کوشش کر کے حساب کتاب کا کام سیکھ لیا۔

اب وہ کمپنی کا سارا حساب دیکھتا تھا مگر تنخواہ میں خاص فرق نہیں آیا جبکہ پانچ سالوں میں مہنگائی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اب شکیلہ سیکنڈری اسکول جانے لگی تھی اور اس کے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ اپنے گھر کے حالات اور پھر بہن بھائی کو دیکھتے ہوئے حیات کو خیال آنے لگا کہ اسے بھی باہر چلے جانا چاہیے۔ جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو کئی جاننے والوں اور دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ باہر چلا جائے۔ یہاں جتنی محنت کرتا ہے اگر باہر کرے گا تو چند سالوں میں زندگی بنالے گا۔ مگر اس وقت شہزاد بھی چھوٹا تھا اور شکیلہ بھی۔ جمیلہ کو باہر کا زیادہ پتا نہیں تھا، حیات انہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے شہزاد کا خیال تھا۔

حیات دیکھ رہا تھا کہ دولت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں کتنی تیزی سے بگاڑ بھی آرہا تھا۔ غربت میں جو گھرانے وضع دار اور مقامی رسم و رواج کے پابند تھے، دولت آنے پر ان میں ایسی تبدیلیاں آگئیں جو حیران کن تھیں۔ وہ اپنے رواج چھوڑ کر وہاں کے رواج اپنانے لگے جہاں سے یہ دولت آرہی تھی۔ لیکن مثبت انداز میں نہیں بلکہ منفی انداز میں۔ ان کی اولاد شتر بے مہار ہوگئی تھی۔

اسی لیے وہ باہر جاتے ہوئے ڈر رہا تھا اور اس نے اپنے دوستوں کو انکار کیا کہ ابھی وہ باہر نہیں جاسکتا۔ مگر اب شہزاد بڑا ہوگیا تھا۔ ضدی اور خواہشوں کے پیچھے بھاگنے کے باوجود وہ اچھا طالب علم تھا۔ اس نے میٹرک میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا اور اسے شہر کے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ یہاں کے اخراجات زیادہ تھے اور پھر حیات چاہتا تھا کہ شہزاد انٹر کے بعد کسی پروفیشنل ڈگری کورس میں داخلہ لے۔ اس کے لیے کافی رقم چاہیے تھی۔ اس لیے اس نے دل پر پتھر رکھ کر باہر جانے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔ اب وہ اپنے گھر والوں کو غربت کی چکی میں مزید پستے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”امی! میں باہر جانے کا سوچ چکا ہوں۔ اب آپ خود کو تیار کریں، گھر آپ کو دیکھنا ہے۔“

جمیلہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”ٹھیک ہے میرے بچے... اس زندگی پر تمہارا حق بھی ہے۔ تم کب تک ہماری خاطر یونہی محنت کی چکی میں پستے رہو گے؟“

”بس یہی سوچ کر باہر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہاں میں اتنا کماسکوں گا کہ گھر بنانے کے ساتھ شہزاد کی اعلیٰ تعلیم اور شکیلہ کی کسی اچھی جگہ شادی کا خرچ بھی اٹھاسکوں گا۔“

جمیلہ سمجھ رہی تھی کہ حیات یہاں ساری عمر بھی ملازمت کرتا رہے گا تو کچھ نہیں کرسکے گا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میرے بچے میں ہمت کرلوں گی مگر تم باہر جاؤ گے کیسے، اس کے لیے تو بہت رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”امی! میں ادھار لے لوں گا۔ جب کمانے لگوں گا تو ادا کردوں گا۔“

باہر جانا حیات کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اسے قرض آسانی سے مل جاتا۔ قرض دینے والے بھی تھے اور جاننے والے بھی تھے جو اسے سیٹل کراسکتے تھے۔ اس نے کوشش کی اور دو مہینے بعد ہی اس کا ویزہ لگ گیا۔ جب وہ لندن پہنچا تو اس کے لیے ملازمت بھی تیار تھی۔ کام محنت والا تھا لیکن اس میں آمدنی تھی اور حیات یہاں کمانے آیا تھا۔ اگر اسے زیادہ محنت کرنا پڑتی تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے گھر والوں کو پُرآسائش زندگی دینا چاہتا تھا۔ ایک مہینے بعد اس نے اتنی رقم کا ڈرافٹ بھیجا جو ملک میں اس کی چھ مہینے کی تنخواہ سے بھی زیادہ کا تھا۔ اس کے بعد وہ ہر مہینے اتنی ہی رقم گھر بھیجنے لگا۔ دو سال بعد وہ واپس آیا اور اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوکر اپنا مکان نئے سرے سے بنوانا شروع کیا۔ گھر والوں کی حالت پہلے ہی بدل چکی تھی۔ مگر گھر اسی حالت میں تھا۔ حیات بہت خوش تھا کہ اس نے بالآخر وہ سب کرلیا تھا جو وہ اپنے گھر والوں کے لیے چاہتا تھا۔

لیکن پہلا دھچکا اس وقت لگا جب اسے معلوم ہوا کہ شہزاد ایف ایس سی میں صرف بی گریڈ حاصل کرسکا تھا۔ اس گریڈ کے ساتھ اسے کسی پروفیشنل ڈگری میں داخلہ ملنا ناممکن تھا۔ حیات افسوس کرکے رہ گیا۔ بہرحال اس نے شہزاد سے کہا کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرے۔ تین مہینے بعد وہ واپس جا رہا تھا تو اس کے پرانے گھر کی جگہ چار بیڈ روم کی خوب صورت کوٹھی کا اسٹرکچر کھڑا ہوگیا تھا۔ فنشنگ کا کام بعد میں شہزاد نے تقریباً ایک سال میں مکمل کرایا اور اس پر اتنی لاگت آئی جتنی کہ پوری کوٹھی کھڑی کرنے پر آئی تھی۔ حیات حیران تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس کے بعد اسے دوبارہ گھر آنے کا موقع نہیں ملا۔ آنے والے چار برس وہ یہ سوچ کر کماتا رہا کہ اب ایک ہی بار طویل چھٹی پر واپس جائے گا۔ اپنی اور شہزاد کی شادی کے ساتھ اگر مناسب رشتہ ہوا تو شکیلہ کی شادی بھی کردے گا۔

ان کی زمین ویسے ہی پڑی تھی بلکہ پرانا باغ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو رہا تھا۔ حیات نے جانے سے پہلے ایک ماہر سے بات کی اور شہزاد سے کہا کہ ماہر کی مدد سے زمین پر بہترین درختوں کے باغ لگوائے۔ اپنی طبیعت کے برخلاف شہزاد نے یہ کام پوری دلچسپی سے کیا۔ اس نے زرعی ماہر کے ساتھ مل کر زمین پر سیب، آڑو، ناشپاتی اور انگور کی بہترین اقسام لگوائیں۔ جانے سے پہلے حیات نے زمین کے ساتھ ملی ہوئی کچھ زمین اور لی تھی۔ اب ان کا فارم پہاڑی سڑک تک آتا تھا اور انہیں دوسروں کی زمین سے گزرنا نہیں پڑتا تھا۔ جب پھل کا سیزن آتا تو فارم میں کئی ملازم کام کرتے اور جب سیزن گزر جاتا تو صرف ایک رکھوالا ہوتا۔

”جناب!“ ڈرائیور...... نے کہا تو وہ چونکا۔ ”آپ کہاں جانا ہے؟“

وہ مظفر آباد پہنچ گئے تھے۔ حیات اسے راستہ بتانے لگا۔ یہاں سے شاہ پور کا راستہ تقریباً پون گھنٹے کا تھا لیکن اب ہائی وے بہت اچھی حالت میں تھی۔ اسے نہ صرف کشادہ کیا گیا تھا بلکہ پہلے کے مقابلے میں یہ ہموار بھی تھی اس لیے وہ صرف آدھے گھنٹے بعد شاہ پور میں اپنے گھر کے سامنے تھا۔ سردی شدید تھی کیونکہ برف باری ہوچکی تھی۔ درخت ٹنڈ منڈ اور مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ کرایہ دے کر بیگ اٹھائے سست قدموں سے کوٹھی کی طرف بڑھا۔ کوٹھی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر بہت لوگ تھے کیونکہ باتیں کرنے کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا تو کسی نے اسے دیکھ لیا۔ فوراً ہی شور مچ گیا۔ ”حیات احمد آگیا ہے۔“

اندر سے روتی ہوئی جمیلہ نکلی اور اس سے لپٹی تو وہ بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ اس کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ ”شہزاد۔“

شہزاد اندر کفن میں لپٹا... بھائی کا منتظر تھا کہ وہ آئے اور اسے دفنائے۔

☆☆☆

”ڈی ایس پی ممتاز ڈار۔“ پولیس وردی میں ملبوس درمیانی العمر آدمی نے حیات سے تعارف کرایا۔ حیات نے ہاتھ ملایا۔

”حیات احمد... میں شہزاد کا بڑا بھائی ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ ڈی ایس پی نے رسمی تعزیت کے انداز میں کہا۔ ظاہر ہے وہ پولیس میں تھا اور آئے دن اس کا واسطہ لاشوں اور ان کے لواحقین سے پڑتا تھا۔ شہزاد احمد کا کیس اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ شہزاد کی تدفین کے اگلے دن شام کے وقت حیات سے ملنے آیا تھا۔ ابھی تک مدعی کی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی تھی کیونکہ جمیلہ کو اپنا ہوش نہیں تھا اور شکیلہ صرف سترہ سال کی تھی۔ ”میں ایف آئی آر کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

”آپ مجھے کیس کی ابتدائی تفتیش کے بارے میں بتائیں گے؟“

”جی بالکل۔“ ڈی ایس پی نے کیس کی فائل کھولی۔ ”آج چوبیس دسمبر ہے۔ اکیس دسمبر کی رات دو بج کر چالیس منٹ پر پولیس کو شاہ پور اور مظفر آباد کو ملانے والی شاہراہ پر سڑک سے ذرا ہٹ کر شہزاد احمد کی لاش ملی۔ لاش درخت کے کٹے تنے کے ساتھ پڑی تھی اور اس موسم میں اس نے صرف شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے سارے بٹن کھلے تھے اور جسم پر خراشوں اور چوٹوں کے نشانات تھے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ قاتل یا قاتلوں سے لڑتا رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے مطابق موت کی وجہ بائیں کنپٹی پر لگنے والی شدید ضرب تھی جس نے دماغ کو متاثر کیا۔ ضرب اس موٹی لکڑی سے لگائی گئی تھی جو لاش کے پاس پڑی پائی گئی۔ موت کا وقت اندازاً ایک بجے کے آس پاس تھا۔ یعنی جب پولیس پارٹی نے لاش دیکھی تو شہزاد اس سے پونے دو گھنٹے پہلے دم توڑ چکا تھا۔“

حیات کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ ”یعنی یہ طے ہے کہ شہزاد کی موت کسی حادثے سے نہیں بلکہ قتل کا نتیجہ ہے؟“

”بالکل یہ طے ہے۔ جائے وقوعہ سے پولیس کو شہزاد احمد کے جوتوں کے نشانات کے علاوہ دو قسم کے جوتوں کے نشانات اور ملے ہیں۔“

”کیا وہ قاتلوں کے نشانات ہیں؟“ حیات پُرجوش ہو گیا۔

”ممکن ہے اگر کوئی مشکوک فرد ہمارے ہاتھ لگے تو ہم موازنہ بھی کرسکتے ہیں۔“

”یہ بھی ممکن ہے وہ جائے وقوعہ پر جانے والی پولیس پارٹی کے جوتوں کے نشانات ہوں۔“

”نہیں، ان کے نشانات الگ تھے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔ ”ابتدائی کارروائی کے بعد پولیس نے جب تفتیش شروع کی تو شہزاد احمد کی جیپ اسی شاہراہ پر دو کلومیٹر دور شاہ پور کی سمت میں خالی کھڑی پائی گئی۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور اس میں ہمیں ایک سوٹ کیس ملا جس میں کسی عورت کے کپڑے اور دوسری چیزیں تھیں۔ یہ تمام خواتین کے استعمال کی چیزیں تھیں۔“

حیات چونک گیا۔ ”اس کا مطلب ہے جس وقت یہ

واقعہ پیش آیا، شہزاد کے ساتھ کوئی عورت بھی گاڑی میں تھی؟ اس کا کچھ پتا چلا کہ وہ کہاں گئی؟"

"نہیں، ہمیں آس پاس کسی عورت کا سراغ نہیں ملا۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "سوٹ کیس میں موجود چیزوں سے بھی کوئی سراغ دالی چیز نہیں ملی۔"

"شہزاد احمد کی شناخت کیسے ہوئی؟"

"اس کے پاس ملنے والے پرس سے۔ اس میں اس کا آئی ڈی کارڈ موجود تھا۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ گزشتہ چار سال سے ملک سے باہر تھے اور اس دوران میں یہاں نہیں آئے؟"

"یہ درست ہے۔" حیات نے گہری سانس لی۔ "آپ جانتے ہیں باہر جانے والے صرف ایک فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کما لیں اور اس کے لیے وہ گھر بھی نہیں آتے۔ یہی میں نے بھی کیا۔"

"اس کا مطلب ہے آپ یہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہوں گے۔" ڈی ایس پی ممتاز نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کو کچھ اندازہ تو ہوگا کہ شہزاد کی کن لوگوں سے دشمنی تھی؟"

"بدقسمتی سے میں بالکل بے خبر ہوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ وہ گریجویشن کر کے ایم بی اے میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ اس نے بڑی مشکل سے گریجویشن کیا تھا۔"

"مجھے بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ شہزاد غلط صحبت کا شکار تھا۔ وہ نہ صرف شراب کا عادی تھا بلکہ شاید مارفین کا نشہ بھی کرتا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں پر ایسے سیاہ نشان تھے جو انجکشن کے ہوتے ہیں۔"

حیات کے لیے یہ واقعی انکشاف تھا۔ اسے یہ اندازہ تو تھا کہ شہزاد نے امیروں والے شوق اپنا لیے تھے لیکن وہ شراب اور مارفین کے نشے کا عادی ہو گیا تھا... پھر عورت والا معاملہ بھی تھا۔ گویا وہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ بگڑ گیا تھا۔ حیات چاہتا تھا کہ جیسے ہی شہزاد گریجویشن مکمل کرے، وہ اسے باہر بلوا لے۔ مگر اوّل اس نے تین سال میں جا کر گریجویشن کے پیپرز کلیئر کیے۔ پھر اس نے برطانیہ آنے سے انکار کر دیا۔ حیات نے برطانیہ میں ہی اکاؤنٹس کے کچھ کورس کیے تھے اور اب ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کر رہا تھا۔ اس کا ابتدائی مشکل وقت گزر گیا تھا۔ وہ شہزاد کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ نہیں مانا اور پھر اچانک اس کی موت کی اطلاع آ گئی۔ اب ڈی ایس پی اسے بتا رہا تھا کہ شہزاد کن راہوں پر چل نکلا تھا۔ اس نے حیات سے کہا۔

"آپ کو کسی پر شک نہیں ہے کیونکہ آپ نہیں جانتے کہ شہزاد کا کن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا اور وہ کن چکروں میں تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ آدھی رات گئے اس کی گاڑی میں پائے جانے والے لیڈیز کپڑوں کے سوٹ کیس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ تھا۔ گاڑی کا رخ شاہ پور کی طرف تھا اس لیے ممکن یہی ہے کہ وہ عورت کو گھر سے لے جا رہا تھا مگر راستے میں ڈاکوؤں نے اسے روکا۔ اس نے مزاحمت کی اور ان سے بچنے کے لیے بھاگا مگر ڈاکوؤں نے بالآخر اسے پکڑ لیا اور مار ڈالا۔"

"وہ عورت کہاں گئی جو شہزاد کے ساتھ تھی؟"

"میرا ذاتی خیال ہے کہ اسی عورت کے گھر والے یا اس میں دلچسپی لینے والا کوئی دوسرا فرد پیچھے آیا تھا اور شہزاد کے قتل کے بعد وہی عورت کو واپس لے گئے۔"

"اگر وہ اس کے گھر والے نہیں تھے تو اب تک اس کی گمشدگی کی اطلاع پولیس تک پہنچ جانی چاہیے تھی۔"

ڈی ایس پی نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "آپ نے ٹھیک کہا۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ وہ عورت کے گھر والے تھے۔"

حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ "قاتل نامعلوم ہیں یعنی اب مجھے نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کرانی ہو گی۔"

"فی الحال تو یہی کیا جا سکتا ہے۔"

حیات کو پولیس سے زیادہ توقع بھی نہیں تھی۔ انگلینڈ میں رہ کر اسے وہاں کی پولیس اور مقامی پولیس کا فرق اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ ہماری پولیس کی کارکردگی اس مشین کی طرح تھی جو زنگ آلود پرزوں پر مشتمل تھی اور اس میں آئل کی بھی کمی تھی۔ اس لیے اس کی کارکردگی بھی فرسودہ تھی۔ مقامی پولیس نے ابتدائی تفتیش مکمل کر لی تھی۔ اب تک وہ جمیلہ اور شکیلہ سے بات نہیں کر سکا تھا۔ اس نے حیات سے کہا۔ "میں آپ کی موجودگی میں آپ کی والدہ اور سسٹر سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"والدہ کی طبیعت تو ٹھیک نہیں ہے۔" حیات نے معذرت کی۔ "وہ سو رہی ہیں۔ ہاں شکیلہ سے آپ بات کر سکتے ہیں۔"

شکیلہ سترہ سال کی دلکش اور نازک اندام لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور لیئر کٹنگ بالوں کی وجہ سے اور بھی دلکش لگ رہی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر غم انگیز تاثرات تھے۔ البتہ اس نے جدید فیشن کا تقریباً نیا سوٹ دکھ رکھا

تھی۔ اس نے ڈی ایس پی کے سوالوں کے جواب میں اسے بتایا کہ اس دن شہزاد شام سات بجے گھر سے چلا گیا تھا۔ اس نے ماں اور اسے بتایا تھا کہ وہ دوستوں کے پاس جا رہا ہے لیکن جب وہ رات دو بجے تک نہیں آیا تو شکیلہ نے جمیلہ کے کہنے پر اس کے تین قریبی دوستوں قدیر، شارق اور منصور کو کال کی تھی۔ لیکن ان تینوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شہزاد ان کے پاس نہیں آیا بلکہ گزشتہ دو دن سے انہوں نے شہزاد کو نہیں دیکھا تھا۔ پریشان ہو کر انہوں نے دوسرے واقف کاروں کے ہاں کال کی لیکن شہزاد کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اس روز جمیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جلدی سو گئی تھی اور پھر اسے شکیلہ نے بیدار کیا۔ پھر فکر کی وجہ سے جمیلہ کی نیند اڑ گئی اس لیے جب صبح چار بجے پولیس کی طرف سے کال آئی تو وہ جاگ رہی تھی اور پھر اس کی چیخیں سن کر شکیلہ بھی جاگ گئی تھی۔ جمیلہ بے ہوش ہو گئی اور شکیلہ نے فون سنا تو شہزاد کے بارے میں سن کر اس کے حواس بھی مختل ہو گئے۔

"کیا وہ پہلے بھی رات گئے گھر سے غائب رہتا تھا؟"

"نہیں، شہزاد بھائی رات بارہ بجے تک لازمی گھر آ جاتے تھے کیونکہ گھر میں بس میں اور امی ہوتے تھے۔"

"گھر میں اس کے دوست آتے تھے؟"

"نہیں، شہزاد بھائی ان سے باہر ہی ملتے تھے۔ شاید وہ تین چار بار ہی گھر آئے ہوں گے۔"

"کبھی کوئی عورت شہزاد کے ساتھ آئی؟"

شکیلہ نے چونک کر ڈی ایس پی کو دیکھا۔ "نہیں، ان کے ساتھ کبھی کوئی عورت گھر میں نہیں آئی۔"

"شہزاد کسی عورت یا لڑکی سے ملنے جاتا تھا؟"

شکیلہ نے بے بسی سے بھائی اور ڈی ایس پی کی طرف دیکھا۔ "اگر وہ کسی سے ملتے تھے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔"

"مسٹر حیات! میں شہزاد کا کمرا دیکھنا چاہوں گا۔"

ڈی ایس پی نے کہا تو حیات کھڑا ہو گیا۔

"آئیے میرے ساتھ۔"

ممتاز اور حیات شہزاد کے بیڈ روم میں آئے۔ اب تک حیات نے بھی یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اندر آیا تو اسے لگا کہ ابھی شہزاد کہیں سے نکل کر آئے گا۔ بستر پر اس کے اتارے ہوئے کپڑے بکھرے ہوئے تھے اور ڈریسنگ ٹیبل پر ایک پرفیوم کی شیشی کھلی پڑی تھی جیسے شہزاد عجلت میں اسپرے کر کے گیا ہو۔ حیات نے بے خیالی میں اسپرے کیا تو مسحور کن خوشبو فضا میں بکھر گئی۔ ممتاز نے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کی اجازت سے..."

حیات نے سر ہلایا تو ممتاز نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی۔ سب سے پہلے اس نے ڈریسنگ کی درازیں چیک کیں۔ ان میں کچھ نہیں تھا۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ اس کے لاکر سے نوٹوں کی چند گڈیاں جو ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی تھیں اور دو شراب کی بوتلیں برآمد ہوئیں۔ حیات شرمندہ ہو گیا۔ اس کا مطلب شہزاد اس حد تک بگڑ گیا تھا کہ گھر میں بھی پینے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ماں اور شکیلہ کو علم تھا کہ شہزاد پیتا ہے؟ ممتاز کو تلاشی میں کوئی خاص چیز نہیں ملی۔ اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود انہیں ضائع کر دیجیے گا۔"

حیات نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ شراب کی موجودگی کسی مشکل کا باعث نہ بن جائے۔ مگر ممتاز عام پولیس افسران سے مختلف تھا۔ اگر وہ رشوت لینے والا پولیس افسر ہوتا تو یہ اس کے لیے سنہری موقع ہوتا۔ اسے شہزاد کے کمرے سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جو اس کے قتل پر روشنی ڈال سکتی۔ وہ حیات کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ "یہ میرا موبائل نمبر ہے... ماں جی کی طبیعت جیسے ہی سنبھلے، مجھے کال کر دیجیے گا میں بیان لینے حاضر ہو جاؤں گا۔"

جب حیات کو شہزاد کے قتل کی اطلاع ملی تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور راستے بھر وہ ماضی کے بارے میں سوچتا رہا... جب شہزاد زندہ تھا۔ پھر یہاں آنے کے بعد وہ تدفین اور ماں بہن کو سنبھالنے میں لگ گیا اس لیے اسے اب تک غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ شہزاد کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مگر ممتاز سے ملاقات کے بعد اسے پہلی بار سوچنے کا موقع ملا۔ شہزاد کے بارے میں نئے انکشافات ہوئے تھے۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ اس کے جانے کے بعد شہزاد اس حد تک بگڑ جائے گا تو وہ شاید باہر نہ جاتا۔ اسے یاد تھا کہ وہ کتنا اچھا اور محنتی طالب علم تھا۔ اس نے میٹرک میں بہترین نمبرز لیے تھے اور اسی وجہ سے اسے اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا لیکن جیسے ہی اس کے ہاتھ میں پیسا آیا، اس کی توجہ تعلیم سے ہٹ گئی تھی۔ دولت نے اسے بگاڑ دیا تھا مگر یہ سب قسمت میں تھا اور اس سے مفر ممکن نہیں تھا۔

جمیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے نیند کی دوا دی گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ شکیلہ، حیات کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ کوٹھی میں کام کرنے کے لیے دو ملازمائیں آتی تھیں لیکن وہ صرف صبح سے شام تک

ہوتی تھیں۔ کوٹھی کا کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ صرف بچے زمین پر نگرانی کے لیے ایک لڑکا رضوان تھا جسے باغ میں چھوٹی سی کوٹھری بنا کر دے دی گئی تھی اور وہ وہیں رہتا تھا۔ دن میں کوٹھی کے گیٹ پر موجود رہتا اور رات کو کوٹھری میں چلا جاتا۔ اسے تینوں وقت کا کھانا کوٹھی سے مل جاتا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا تھا اور کسی چھوٹے سے گاؤں سے آیا تھا۔ یہاں ملازمت کے ساتھ پرائیویٹ میٹرک بھی کر رہا تھا۔ حیات نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس نے شکیلہ سے پوچھا۔

"یہ کیسا لڑکا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "شہزاد بھائی کہیں سے لائے تھے۔ یہاں سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تک اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔"

حیات نے شکیلہ کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

شکیلہ ہچکچائی۔ "جی پوچھیں؟"

"شہزاد کی ان دنوں کیا مصروفیات تھیں؟"

"تین مہینے پہلے تک پھل اتر رہا تھا اس لیے وہ صبح سے شام تک کام کی نگرانی کرتے تھے اور اگر کہیں باہر جاتے بھی تو تھوڑی دیر کے لیے جاتے مگر جب پھل اتر گیا تو شہزاد بھائی اکثر شام کے چار کے آس پاس گھر سے چلے جاتے تھے اور پھر رات بارہ کے قریب واپس آتے۔"

"تمہیں یا امی کو علم تھا کہ وہ کہاں جاتا تھا؟"

"ہم یہی سمجھتے تھے کہ وہ دوستوں کے پاس جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بتا دیتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں اور اکثر ایسے ہی چلے جاتے تھے۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ وہ رات بارہ بجے کے بعد گھر آیا ہو؟"

"بہت کم... اور اگر دیر ہوتی بھی تھی تو دس پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے اس رات جب وہ دو بجے تک نہیں آئے تو میں اور امی دونوں پریشان ہو گئے۔"

حیات، قدیر اور شارق کو جانتا تھا۔ وہ شاہ پور کے رہنے والے تھے لیکن وہ منصور سے ناواقف تھا۔ "یہ منصور کون ہے؟"

"یہاں سے کچھ آگے مظفر آباد جانے والی سڑک پر منصور کے خاندان کی زمین ہے، وہ وہیں رہتا ہے۔ ان کی بہت بڑی حویلی ہے۔ منصور کی بہن کی شادی ہوئی تھی تو ہم اور امی بھی گئے تھے۔"

"گھر میں شہزاد کیا کرتا تھا؟"

"گھر میں بھائی زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے تھے اور میوزک سنتے تھے یا کوئی مووی دیکھتے تھے۔"

"کیا تم لوگ کسی وقت بھی اس کے کمرے میں جا سکتے تھے؟"

اس سوال کے جواب پر شکیلہ ہچکچائی لیکن پھر اس نے کہا۔ "نہیں... وہ دس بجے کے بعد کمرا اندر سے بند کر لیا کرتے تھے۔ امی نے دو تین بار ان سے پوچھ کہ وہ کمرا کیوں بند کر لیتے ہیں مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے انداز سے لگتا تھا، انہیں یہ بات پوچھنا اچھا نہیں لگتا ہے۔"

بات واضح تھی۔ شہزاد دس بجے کے بعد کمرا بند کر کے شراب نوشی کرتا تھا اور اسی لیے وہ کمرا اندر سے بند کر لیتا تھا تاکہ کوئی اچانک آ کر اسے شراب پیتے نہ دیکھ لے۔ اسی وجہ سے اس کی نشے کی لت جمیلہ اور شکیلہ پر ظاہر نہیں ہو سکی تھی۔ اگلا سوال حیات نے ہچکچا کر کیا۔ "کبھی شہزاد نے تم سے کسی لڑکی کا ذکر کیا جسے وہ پسند کرتا ہو؟"

شکیلہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "نہیں... شہزاد بھائی نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"تمہیں یا امی کو کبھی محسوس ہوا کہ وہ کسی سے ملتا ہے یا کسی کو پسند کرتا ہے؟"

شکیلہ نے اس سوال کا بھی نفی میں جواب دیا۔ رات کو جمیلہ جاگ گئی تھی اور اس کی حالت بہتر تھی۔ حیات نے اس سے بھی بات کی لیکن جمیلہ بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزاد نے نہایت مہارت سے اپنا اصل روپ چھپا رکھا تھا۔ جمیلہ اور شکیلہ اسے ایک اچھا بیٹا اور اچھا بھائی سمجھتی تھیں۔ حیات نے محسوس کیا کہ اسے گھر سے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ اس نے رضوان کو بلا کر اس سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن اسے تو سرے سے کوٹھی کے معاملات کا کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ وہ بلا اجازت اندر نہیں آ سکتا تھا اور اسے تینوں وقت کا کھانا ملازمہ دیتی تھی۔ رضوان صورت سے معصوم اور سادہ سا لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ شہزاد کے مرنے کے بعد وہ فکرمند تھا کہ اب نہ جانے اسے ملازمت پر رکھا جاتا ہے یا نہیں۔ حیات نے اسے تسلی دی کہ ابھی وہ یہیں ہے اور جب تک وہ یہاں ہے اس کی ملازمت برقرار رہے گی۔

دوسرے دن ممتاز نے آ کر جمیلہ کا بیان لیا۔ حیات نے شہزاد کے کمرے کی بھرپور تلاشی لی تھی اور ایک ایک چیز چیک کی تھی۔ اسے دو ایسی چیزیں ملیں جو اس کے خیال میں کام کی ہو سکتی تھیں۔ اوّل ایک لڑکی کی تصویر، لڑکی بہت حسین اور دلکش تھی۔ گلابی مائل رنگت اور خوب صورت نقوش کے ساتھ بلی جیسی نیلی آنکھیں اسے مزید دلکش بنا رہی تھیں۔ اس نے خاص پوز دے کر تصویر بنوائی تھی اور اپنے شانے کے اوپر سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ گلابی رخسار پر چند لٹیں تھیں اور نظر آنے والے کان میں موتی کا ٹاپس تھا۔ ہلکے میک اپ اور لباس سے وہ ماڈرن لگ رہی تھی۔ دوسری چیز شہزاد کی ایک اور چیک بک تھی جس سے پچھلے چھ مہینے کے دوران میں تقریباً بیس لاکھ روپے مالیت کے پندرہ چیک کاٹے گئے تھے۔ کٹے ہوئے حصوں پر تفصیل تھی اس لیے حیات کو پتا چل گیا کہ شہزاد نے کتنی مالیت کے چیک دیے ہیں۔ یہ بہت بڑی رقم تھی اور حیات کو نہیں معلوم تھا کہ شہزاد کا کوئی اور بینک اکاؤنٹ بھی ہے کیونکہ اس کے علم میں صرف وہی بینک اکاؤنٹ تھا جس میں وہ باہر سے رقم بھیجتا تھا۔ جب ممتاز نے جمیلہ کا بیان لے لیا تو حیات اسے الگ سے نشست گاہ میں لایا اور دونوں چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ ممتاز نے لڑکی کی تصویر دلچسپی سے دیکھی۔ "آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں، میں نے پہلی بار اسے دیکھا ہے لیکن میں گزشتہ چھ سال سے باہر ہوں اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شاہ پور کی کوئی لڑکی ہے یا نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، اس کی عمر بیس بائیس سے زیادہ نہیں ہے اس لیے یہ اسی عرصے میں بڑی ہوئی ہوگی۔"

ممتاز نے سر ہلایا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے آپ کی والدہ یا سسٹر جانتی ہوں۔"

"تب بہتر ہوگا میں آپ کی طرف سے ان سے پوچھ لوں۔" حیات نے تجویز پیش کی۔ "میں نہیں چاہتا کہ انہیں شہزاد کے بارے میں پتا چلے۔"

"یہ مناسب ہوگا۔"

حیات تصویر لے کر اندر آیا۔ اس نے جمیلہ اور شکیلہ کو تصویر دکھائی تو جمیلہ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے صرف نفی میں سر ہلایا لیکن شکیلہ چونکی تھی، البتہ جب حیات نے اس سے پوچھا تو اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ یعنی وہ اس تصویر والی لڑکی کو نہیں جانتی تھیں۔ حیات نے انہیں یہی بتایا کہ ڈی ایس پی نے یہ تصویر دی ہے اور وہ بھی نہیں جانتا کہ شہزاد سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ممتاز نے حیات کی رپورٹ سنی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "میں یہ چیک بک لے جا رہا ہوں۔ بینک سے معلوم کروں گا کہ چیک کا کیا کیا گیا۔"

اگلے روز سوئم تھا۔ حیات اگرچہ ان رسومات کا قائل نہیں تھا لیکن یہ رسومات ان کے معاشرے کا ایک حصہ تھیں اور ان پر عمل کرنا ہی تھا۔ سوئم میں دور پاس کے سب لوگ شریک تھے۔ یہاں ان کے رشتے دار کم تھے لیکن سارا شاہ پور جانتے والا تھا اس لیے تقریباً ہر گھر سے کوئی نہ کوئی فرد آیا تھا۔ آنے والوں میں قدیر، شارق اور منصور بھی شامل تھے۔ حیات، منصور سے پہلی بار ملا تھا۔ وہ شہزاد کی تدفین میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی بہن کے پاس کراچی گیا ہوا تھا اور موسم کی خرابی کی وجہ سے دو دن سے کوئی فلائٹ نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہ مشکل کوچ کی مدد سے واپس آیا تھا۔ سوئم دوپہر میں تھا۔ اس نے ان تینوں سے کہا۔ "تم لوگ جانا مت، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سہ پہر تک تمام آنے والے جا چکے تھے۔ حیات اور دوسرے لوگ قبرستان سے بھی ہو آئے۔ شہزاد کے تینوں دوستوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے حیات نے واپسی پر اپنے ساتھ ان کے لیے بھی کھانا لگوایا۔ کھانے کے بعد وہ انہیں نشست گاہ میں لے آیا۔ ملازمہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ حیات نے ان سے کہا۔ "تم لوگ شاید حیران ہو رہے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں روکا ہے؟"

"نہیں۔" شارق نے جواب دیا۔ وہ شہزاد کا ہم عمر تھا۔ "میں جانتا ہوں، آپ ہم سے بات کرنا چاہیں گے۔ آج پولیس نے بھی ہم سے بات کی ہے۔"

حیات چونکا۔ "اچھا... وہ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"یہی کہ شہزاد کی کس سے دشمنی ہے اور ان دنوں اس کی مصروفیات کیا تھیں؟"

حیات نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم نے کیا جواب دیا؟"

"کم سے کم میں اس بارے میں نہیں جانتا۔ شہزاد کی بس ہم تینوں سے دوستی تھی اور وہ کسی سے نہیں ملتا تھا اور نہ اس کی کسی سے دشمنی تھی۔"

"کیا ان دنوں وہ کوئی بزنس کر رہا تھا جس میں بڑی رقم کی ضرورت ہو؟"

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

اس بار قدیر نے کہا۔
”کسی لڑکی کا چکر؟“
اس بار بھی تینوں نے نفی میں جواب دیا لیکن حیات نے محسوس کرلیا تھا کہ قدیر ہچکچایا تھا۔ شارق نے کہا۔ ”پولیس نے بھی اس حوالے سے سوال کیا تھا اور ایک لڑکی کی تصویر بھی دکھائی تھی جو ہمارے لیے اجنبی ہے۔“
”شہزاد اس رات یہ کہہ کر نکلا تھا کہ وہ دوستوں کے پاس جارہا ہے۔ لیکن وہ تمہارے پاس نہیں پہنچا۔“
”یہ درست ہے۔“ قدیر نے کہا۔ ”بلکہ اس رات ہمارا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا۔“
”میں تو گھر پر بھی نہیں، کراچی میں تھا۔“ منصور بولا۔
”اگر وہ تم لوگوں کے پاس نہیں گیا تو کس کے پاس گیا ہوگا... اس کا کچھ آئیڈیا ہے؟“
اکثر سوالوں کی طرح ان کے پاس اس کا جواب بھی نفی میں تھا۔ کچھ دیر بعد حیات نے محسوس کیا کہ وہ تینوں ہی اس سے کچھ نہ کچھ چھپا رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ وہ انہیں وارننگ دے کہ اگر انہوں نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو وہ جلد پکڑا جائے گا لیکن اس نے انہیں پہلے سے ہوشیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے پولیس کی کارروائی میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ ان تینوں کو علم نہیں تھا کہ اس نے لاعلمی میں اپنے موبائل میں یہ ساری گفتگو ریکارڈ کرلی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اس گفتگو کو سنا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان سے الگ الگ بات کرتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اس طرح ان کی باتوں میں تضاد آنے کا امکان تھا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ وہ اس کے دوست تھے اور اس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ وہ یقیناً بہت کچھ جانتے تھے لیکن انجان بن رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد حیات نے ڈی ایس پی ممتاز کو کال کی۔
”مجھے اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے؟“
”بالکل... بلکہ میں نے آپ کے لیے کاپی کرالی ہے۔ کل صبح دفتر جاتے ہوئے آپ کو دیتا جاؤں گا۔“
حیات نے اسے شہزاد کے دوستوں سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا۔ ”مجھے شک ہے، وہ بہت کچھ جانتے ہیں لیکن چھپا رہے ہیں۔“
”اتفاق سے یہی شک مجھے بھی ہوا ہے لیکن تینوں ہی بڑے گھرانوں کے لڑکے ہیں اور میں قانون کے دائرے سے ہٹ کر ان سے بات نہیں کرسکتا۔“
”شہزاد کی چیزیں اور گاڑی پولیس کی تحویل میں ہے، یہ کب تک ملیں گی؟“
”گاڑی ہم نے چیک کرلی ہے۔ آپ کورٹ سے آرڈر لے لیں، ہم ریلیز کردیں گے اور سامان بھی آپ کے ہینڈ اوور کردیا جائے گا۔“
”اس میں تو وقت لگے گا۔“ حیات نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں پہلے ان چیزوں کو دیکھ سکوں؟“
”بالکل ہوسکتا ہے۔ آپ پولیس اسٹیشن آجائیں، سامان سارا میری تحویل میں ہے۔“
”ٹھیک ہے پھر آپ زحمت نہ کریں، میں کل صبح حاضر ہوجاتا ہوں۔“
اس رات حیات، شہزاد کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا بھائی شراب و شباب کے چکر میں اتنا آگے نکل جائے گا۔ وہ ممتاز سے چیک بک کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا لیکن وہ کل صبح اس سے معلوم کرسکتا تھا۔ ابھی اسے شہزاد کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ نکلوانا تھا اور اس کے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں بات کرنی تھی۔ حیات کا اندازہ تھا کہ اس نے گزشتہ چار سالوں میں ساٹھ لاکھ روپے سے زیادہ رقم بھیجی تھی اور اس کا کم سے کم نصف محفوظ ہونا چاہیے تھا۔ اسے معلوم کرنا تھا کہ شہزاد کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم تھی۔ وہ صبح سویرے ناشتا کرکے گھر سے نکلا اور پہلے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ممتاز آچکا تھا۔ اپنے کچھ کام نمٹا کر وہ حیات کو مال خانے میں لایا اور وہ سوٹ کیس اس کے سامنے رکھ دیا جو شہزاد کی گاڑی سے نکلا تھا۔ اس میں درجن بھر قیمتی لیڈیز سوٹ تھے۔ چند ایک عام جوڑے اور رات کے لباس تھے۔ سوٹ کیس کی ایک پاکٹ میں انڈر گارمنٹس بھی تھے۔ مگر نہ تو کوئی جیولری تھی اور نہ ہی کوئی کاغذ یا شناخت کی چیز تھی۔ حیات نے ایک سوٹ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے ممتاز سے کہا۔
”یہ کسی دبلی پتلی اور نازک اندام عورت یا لڑکی کا سوٹ ہے۔“
اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔“
”تصویر میں جو لڑکی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”میرا خیال ہے وہ کسی قدر بھاری جسامت کی مالک ہے۔ آپ نے دیکھا اس کے شانے چوڑے اور قد دراز ہے۔ یہ سوٹ اس کے ناپ کے نہیں ہیں۔ دوسرے اس نے بہت سوبر رنگ پہنے تھے جبکہ یہ سارے شوخ اور بھڑکتے رنگوں

والے کپڑے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سوٹ کیس سے تصویر والی لڑکی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”آپ نے تصویر کی کاپیاں بنوالی ہیں؟“
”ہاں، میں نے بڑی کاپی بنائی ہے۔“ ممتاز نے کہا اور اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس نے آٹھ بائی چھ کی تصویر اس کی طرف بڑھائی۔ اصل تصویر چار بائی چھ کی تھی۔ حیات نے سر ہلایا۔
”ہاں، یہ بہتر ہوگئی ہے۔ آپ نے چیکس کے بارے میں معلوم کیا؟“
”نہیں، میں نے بینک منیجر کو کال کردی تھی۔ آج میں اس سے ملوں گا، دیکھتا ہوں اس نے کیا کیا ہے؟“
”کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟“
”ہاں۔“ ممتاز نے سوچ کر کہا۔ ”لیکن ابھی مجھے کچھ کام ہے۔“
”کوئی بات نہیں، میں انتظار کرلوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے میں نے شہزاد کے تینوں دوستوں سے کی گئی گفتگو ریکارڈ کرلی ہے۔ اگر آپ سننا چاہیں تو میں سنا سکتا ہوں۔“
”یہ راستے میں سن لیں گے۔“ ممتاز نے تجویز پیش کی۔
”جیسی آپ کی مرضی۔“
ممتاز نے اس کے لیے چائے منگوائی اور خود فائلیں دیکھنے اور دوسرے کام نمٹانے میں لگ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ فارغ ہوا اور حیات کے ساتھ بینک کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اس نے قدیر، شارق اور منصور کی حیات سے ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ سنی لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ بینک مظفر آباد میں تھا۔ اس کے منیجر نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ممتاز نے چیکس کا پوچھا۔ منیجر نے شہزاد کے اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ نکلوالی تھی۔ اس نے اس کی کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔ ”یہ پچھلے ایک سال کی مکمل اسٹیٹمنٹ ہے۔ اس میں مسٹر شہزاد احمد کے اکاؤنٹ سے کی جانے والی ہر ٹرانزیکشن موجود ہے۔“
کاپی کئی صفحات پر مشتمل تھی۔ حیرت انگیز طور پر پچھلے ایک سال میں شہزاد کے اس اکاؤنٹ میں بہت بڑی رقومات جمع ہوئی تھیں اور نکالی گئی تھیں۔ ممتاز اسٹیٹمنٹ دیکھ رہا تھا اور حیات کا اکاؤنٹنٹ ذہن خودکار انداز میں حساب کررہا تھا۔ ایک سال میں شہزاد نے تیس بار چیکس اور اے ٹی ایم ٹرانسفر کی مدد سے کوئی اڑتیس لاکھ کی رقم دی تھی جبکہ اس دوران میں چیکس کی مدد سے کوئی بیالیس لاکھ روپے کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں آئی تھی۔ سب سے زیادہ جس فرد کو رقم دی گئی یا اس کے توسط سے آئی، وہ کوئی ارشاد حسین تھا۔ اتفاق سے وہ بھی اسی بینک کا ایک اکاؤنٹ ہولڈر تھا۔ شہزاد نے تقریباً سارا لین دین اسی سے کیا تھا۔ ممتاز نے اس کا پتا اور فون نمبر مانگا۔ منیجر نے معذرت کی۔ ”جناب! یہ بینک کی پالیسی کے خلاف ہے۔ آپ کو عدالت سے آرڈر لانا ہوگا۔“
”اس کے علاوہ کوئی راستہ؟“ ممتاز نے کہا۔ ”یہ ایک قتل کا کیس ہے اور تاخیر سے ممکن ہے قاتل فرار ہوجائے یا کوئی ثبوت مٹا دے۔“
منیجر سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
”دیکھیے میرا نام نہ آئے... ارشاد حسین جیولر ہے اور یہاں سے کچھ دور اسی سڑک پر اس کی دکان حسین جیولرز کے نام سے ہے۔ آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا پتا اسٹیٹمنٹ کی مدد سے لگایا ہے۔“
”یہ ہمارا دردِ سر ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کا نام نہیں آئے گا۔ کیا میں یہ اسٹیٹمنٹ لے جاسکتا ہوں؟“
”بالکل... ریسیونگ پر سائن کردیں۔“ منیجر نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ حیات اب تک خاموش تھا۔ جب ممتاز نے سائن کردیے تو اس نے منیجر سے پوچھا۔
”اس بینک میں شہزاد کا کوئی اور اکاؤنٹ یا کوئی اور چیز ہے؟“
”آپ کون ہیں؟“ منیجر نے کسی قدر کھردرے لہجے میں کہا۔
”میں مرحوم شہزاد احمد کا بڑا بھائی حیات احمد ہوں۔“
حیات نے تعارف کرایا تو اس کا رویّہ بدل گیا۔
”سوری! مجھے معلوم نہیں تھا۔ سب سے پہلے میری طرف سے تعزیت قبول کریں۔“ منیجر نے کہا۔ ”جی ہاں، اسی بینک میں شہزاد احمد صاحب نے ایک سیف لاکر بھی لے رکھا ہے۔“
لاکر کا سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ ”آپ کا شکریہ... آپ نے تعاون کرکے ہمارے لیے آسانی کردی ہے۔“
”مجھے امید ہے، شہزاد صاحب کے قاتل پکڑے جائیں گے۔“ منیجر نے خلوص سے کہا۔ ”شہزاد صاحب کا اکاؤنٹ وارثوں کو ٹرانسفر کرنے میں میں آپ کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔“
”اگر ہم اس کارروائی سے پہلے لاکر دیکھنا چاہیں تو؟“

"اس کے لیے کورٹ آرڈر لازمی ہے۔" منیجر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "یہاں صرف میرے تعاون سے کام نہیں چلے گا۔"

باہر آ کر ممتاز نے کہا۔ "یہ تو مجھے کوئی قانونی لین دین لگ رہا ہے؟"

"وہ کیسے؟"

"غیر قانونی لین دین ہمیشہ نقد ہوتے ہیں، ان میں بینک کو ملوث نہیں کیا جاتا ہے۔"

ممتاز کا اندازہ درست نکلا۔ جب وہ ارشاد حسین سے ملے اور اس نے اقرار کیا کہ شہزاد احمد سے اس کا لین دین ہوتا تھا۔ حسین جیولرز بڑی اور خوب صورت دکان تھی۔ ارشاد کا دفتر پیچھے کی طرف تھا اور فرنٹ پر چار سیلز مین کام کر رہے تھے۔ وہ صرف نگرانی کرتا تھا۔ ممتاز نے پوچھا۔ "کس سلسلے میں لین دین ہوتا تھا؟"

"شہزاد احمد گولڈ میں سرمایہ کاری کرتا تھا۔" ارشاد حسین نے محتاط انداز میں کہا۔

"کیا یہ گولڈ بانڈز ٹائپ کی کوئی چیز ہوتی تھی؟" حیات نے سوال کیا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"سارا کام نقد اور ہاتھ کے ہاتھ ہوتا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شہزاد احمد مجھے بینک کا تصدیق شدہ چیک دیتا تھا اور میں اسے گولڈ بار دیتا تھا۔ جب اسے فروخت کرنا ہوتا تھا تو میں اسے تصدیق شدہ چیک دیتا تھا اور وہ گولڈ بار مجھے دے دیتا تھا۔"

ممتاز کی سمجھ میں یہ بزنس نہیں آیا لیکن حیات کا تعلق ایک بزنس فرم سے تھا اور اسے اس بارے میں معلومات بھی تھیں اس لیے وہ سمجھ گیا۔ شہزاد، ارشاد سے اس وقت سونا خرید لیتا تھا جب اس کے خیال میں اس کی قیمت بڑھنے والی ہوتی تھی اور اس وقت فروخت کر دیتا تھا جب اندازاً سونے کی قیمت گرنے والی ہوتی تھی۔ کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے میں سونے کی مارکیٹ میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ آ رہا تھا۔ حیات کو حیرت ہوئی کہ شہزاد کو اس کام کی سمجھ بوجھ کہاں سے ہوئی تھی۔ یہ خاصا دشوار اور رسکی بزنس تھا۔ صرف گولڈ مارکیٹ کو اچھی طرح جاننے والے ہی اس میں کامیاب رہ سکتے تھے۔ حیات کو خیال آیا اور اس نے ممتاز سے لے کر بینک اسٹیٹمنٹ کا معائنہ کیا اور ارشاد حسین سے پوچھا۔ "شہزاد کب سے آپ کے ساتھ یہ بزنس کر رہا تھا؟"

"تقریباً ایک سال سے۔"

"میرا خیال ہے، وہ آپ سے سونا خریدتا اور بیچتا تھا۔"

"یہ درست ہے۔ میں نے اسے کبھی خریدنے یا فروخت کرنے کا مشورہ نہیں دیا۔ صرف شہزاد احمد نہیں، بہت سارے لوگ مجھ سے گولڈ بار لیتے ہیں اور میرے پاس ایک انٹرنیشنل گولڈ فرم کا لائسنس ہے۔ میں اس کا تصدیق شدہ سونا خریدتا اور فروخت کرتا ہوں۔"

ارشاد حسین سے بات کر کے وہ باہر آئے تو حیات نے کہا۔ "شہزاد کے اکاؤنٹ میں اب بھی بائیس لاکھ روپے موجود ہیں۔ مجھے اس اکاؤنٹ کا علم نہیں تھا۔"

"اس کا کوئی دوسرا اکاؤنٹ بھی ہے؟" ممتاز چونکا۔

"ہاں، ایک دوسرے بینک میں ہے۔ میں باہر سے جو رقم بھیجتا تھا، وہ اسی اکاؤنٹ میں بھیجتا تھا۔"

ممتاز نے بینک کا پوچھا۔ حیات نے بتایا تو وہ بولا۔ "یہ پاس ہی ہے، اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"میں حیران ہوں۔ شہزاد میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ سونے میں سرمایہ کاری جیسا مشکل کام کرتا۔"

"اس کا مطلب ہے اسے کوئی اور گائیڈ کر رہا تھا۔" ممتاز نے کہا۔

شہزاد کا دوسرا اکاؤنٹ جس بینک میں تھا، وہ اسی سڑک پر تھا۔ یہ مظفر آباد کا کمرشل علاقہ تھا اور زیادہ تر بینک اسی علاقے میں تھے۔ اس کا منیجر حیات سے واقف تھا کیونکہ چار سال پہلے حیات آیا تھا تو اس سے ملا تھا۔ اس نے پہلے شہزاد کی موت پر تعزیت کی۔ "مجھے سن کر افسوس ہوا تھا۔"

"قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔" حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ ڈی ایس پی ممتاز ڈار ہیں، شہزاد کیس کے انویسٹی گیشن آفیسر... یہ آپ سے کچھ پوچھنے آئے ہیں۔"

"ضرور... میں قانون کے ساتھ ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔" وہ خوش خلقی سے بولا۔

"مجھے شہزاد احمد کی ایک سال کی اسٹیٹمنٹ درکار ہے۔"

"اگر آپ آفیشلی درخواست کر رہے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"بالکل، یہ آفیشلی ہے۔" ممتاز نے جواب دیا۔

منیجر نے دس منٹ میں انہیں شہزاد احمد کے اکاؤنٹ کی ایک سال کی اسٹیٹمنٹ منگوا دی۔ ممتاز نے اسے دیکھا اور پھر حیات کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دیکھا اور ایک بار پھر

حیران ہوا۔ اکاؤنٹ میں ساڑھے سینتیس لاکھ روپے تھے۔ یہ رقم اس کے اندازے سے زیادہ تھی۔ جبکہ شہزاد کے اکاؤنٹ میں بھی بائیس لاکھ کی رقم موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس کہیں اور سے بھی رقم آ رہی تھی۔ گولڈ کا بزنس تو حیات کے سامنے تھا مگر شہزاد اور بھی کچھ کر رہا تھا تب ہی اس کے دونوں اکاؤنٹس میں بھاری رقم موجود تھی۔ ابھی بینک لاکر دیکھنا باقی تھا کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ حیات نے ممتاز سے کہا۔ "اگر میں عدالت میں وارث کی حیثیت سے... درخواست دوں تو مجھے لاکر کھولنے کی اجازت دیر سے ملے گی لیکن آپ جلدی یہ اجازت حاصل کر سکتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ہے کہ لاکر میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جو اس کیس کو حل کرنے میں مدد دے سکتی ہے؟"

"میرا یہی خیال ہے۔" حیات نے کہا۔ "درحقیقت میں حیران ہو رہا ہوں۔ پہلے شہزاد کا امیج جیسے میرے سامنے آیا کہ وہ شراب پیتا تھا اور دوسرے نشے بھی کرتا تھا پھر کسی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ ایسے لوگ تو اپنے پاس موجود دولت لٹا دیتے ہیں مگر اب پتا چل رہا ہے کہ وہ کما رہا تھا۔ ایک بزنس تو آپ نے دیکھ لیا مگر اس کے بینک اکاؤنٹس میں موجود رقم دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کوئی کام اور بھی کر رہا تھا۔ پھر اس نے زمین کو بہت اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا۔ اب اس پر بہترین پھل دینے والے درخت لگے ہیں۔ میں شاید وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں اپنی بات کی۔"

"مسٹر حیات! آپ کا مطلب ہے اس کے دونوں کردار آپس میں میچ نہیں کر رہے ہیں۔"

"بالکل۔" حیات نے جوش سے کہا۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ لاکر کھول کر دیکھا جائے کہ اس میں کیا ہے۔"

"میں کل اجازت لینے کی کوشش کرتا ہوں لیکن آپ کو میرے ساتھ کورٹ میں پیش ہونا پڑے گا شہزاد کے وارث کی حیثیت سے۔"

"میں آ جاؤں گا۔" حیات نے جواب دیا۔ ممتاز اسے واپس پولیس اسٹیشن لے آیا جہاں اس کی کار موجود تھی۔

"آپ کب تک ہیں یہاں؟"

"کم سے کم دو مہینے تک تو ہوں۔ اتنی چھٹی ہے میرے پاس۔" اس نے جواب دیا اور شاہ پور کے لیے روانہ ہو گیا مگر گھر جانے کے بجائے وہ قدیر کے گھر پہنچ گیا۔ قدیر اتفاق سے گھر پر تھا۔ حیات اندر نہیں گیا بلکہ اسے باہر بلا لیا۔

"جی حیات بھائی؟"

"میرے ساتھ آؤ... تمہارا کچھ وقت لوں گا۔"

وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا اور حیات نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ قدیر کا گھر شاہ پور میں ہائی وے کی مغربی طرف واقع پہاڑی پر تھا۔ حیات کا گھر مشرقی سمت میں تھا۔ وہ کار نیچے لے آیا۔ یہاں چند اچھے ریستوران اور ہوٹل تھے۔ اس نے کار ایک ریستوران کے سامنے روکی۔ ایک کونے کی میز منتخب کر کے حیات نے چائے کا آرڈر دیا اور قدیر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نروس لگ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے تم نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔"

"میں نے آپ کو سب بتا دیا تھا۔" قدیر نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ حیات نے جیکٹ سے لڑکی کی تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔

"سب نہیں بتایا تھا، تم نے اس کے بارے میں چھپایا ہے۔"

"میں سچ کہہ..."

"دیکھو بیٹے۔" حیات نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔ "دوست کا راز رکھنا اچھی بات ہے لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔ شہزاد اب زندہ نہیں ہے۔ کسی نے اسے بیدردی سے قتل کر دیا ہے اور اس کا قاتل آزاد گھوم رہا ہے۔ اس کی گاڑی جائے واردات سے دو کلومیٹر دور کھڑی پائی گئی اور اس میں ایک سوٹ کیس تھا جس میں کسی لڑکی یا عورت کے کپڑے بھرے ہوئے ہیں۔ تم اس کے دوست ہو اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تم اس بارے میں کچھ نہ جانتے ہو۔"

"میں سچ کہہ..."

"وہ شراب پیتا تھا... شاید کوئی اور نشہ بھی کرتا تھا۔" حیات نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔ قدیر ہراساں نظر آنے لگا۔ "تم جانتے ہو؟"

اس بار اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں جانتا ہوں لیکن اس نے کبھی ہمارے سامنے نہیں پی۔"

"تمہارا مطلب ہے تم چاروں میں صرف شہزاد پیتا تھا؟"

"نہیں لیکن میں اور شارق نہیں پیتے۔"

"گویا منصور پیتا ہے؟" حیات نے نتیجہ اخذ کیا۔ "یہ الگ بات ہے۔ مجھے یہ جاننا ہے کہ شہزاد کس لڑکی کے چکر میں تھا؟"

"میں خدا کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس بارے میں نہیں معلوم اور نہ میں نے اس لڑکی کو پہلے دیکھا ہے۔"

"تم کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔" حیات دباؤ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ لڑکا کم عمر تھا وہ ٹوٹ سکتا تھا، اس کا اندازہ

درست ثابت ہوا۔ بالآخر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"میں نے صرف ایک بات سنی ہے۔ مگر صرف سنی ہے، یقین سے نہیں کہہ سکتا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟"

"شہزاد شاید جینا ہاؤس جاتا تھا۔"

"جینا ہاؤس...؟ یہ کہاں ہے؟"

"مظفر آباد والی سڑک پر ہے۔ شہر سے کچھ پہلے دائیں طرف ٹیلے پر سرخ چھت والی بڑی سی کوٹھی ہے۔ اس کا مالک برطانیہ گیا تھا۔ اس نے وہاں جینا نامی گوری سے شادی کی۔ بعد میں وہ مر گیا تو جینا یہاں آگئی اور اس نے کوٹھی میں لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ہاسٹل کھول لیا لیکن وہاں پر..." یہ کہتے ہوئے قدیر کی نظریں جھک گئی تھیں۔ حیات سمجھ گیا۔

"ہاسٹل یا قحبہ خانہ؟"

"وہی۔" قدیر نے سر ہلایا۔ "جینا اسے چلاتی ہے اور وہاں صرف بہت دولت مند اور بڑے لوگ جا سکتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ شہزاد وہاں جاتا تھا؟"

"ایک دن شہزاد ہمارے ساتھ تھا کہ اسے کسی کی کال آئی اور اس کے موبائل کا اسپیکر کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔ شہزاد نے فوراً اسپیکر بند کر دیا لیکن اس سے پہلے میں نے کسی لڑکی کو کہتے سنا کہ تم جینا ہاؤس کب آؤ گے؟ اس وقت شہزاد کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ اس نے چور نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں نے کچھ سنا تو نہیں ہے۔ میں بھی انجان بن گیا۔"

"تمہاری اس موضوع پر شہزاد سے بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں... ویسے بھی ان دنوں وہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے ڈیوٹی نبھانے آیا ہو۔"

"اس کا تم تینوں میں سے کسی سے جھگڑا یا تلخ کلامی ہوئی؟"

"بہت زیادہ تو نہیں لیکن منصور سے وہ کھچا کھچا سا تھا۔ البتہ میں نے اسے کسی سے جھگڑتے یا تلخ کلامی کرتے نہیں دیکھا۔"

"کچھ اندازہ ہے کہ منصور اور اس کے درمیان کیا چکر چل رہا تھا؟"

قدیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، شاید دو مہینے پہلے کی بات ہے پھر ہمارا ملنا جلنا کم ہو گیا۔ شہزاد اس واقعے سے پہلے آخری بار کوئی دو ہفتے پہلے ہم سے ملا تھا۔ یعنی ہم چاروں ایک ساتھ جمع ہوئے تھے۔ اس کے بعد کم سے کم میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر کسی اور سے ملا ہو تو مجھے اس کا پتا نہیں ہے۔"

حیات کو یقین تھا کہ اب قدیر سچ کہہ رہا۔ اب اسے ایک سرا مل گیا تھا۔ شہزاد کی جیب میں لڑکی کا سوٹ کیس موجود تھا اور اب اس کا تعلق ایک بدنام جگہ سے بھی نکل آیا تھا۔ قدیر کے پاس سے وہ دوبارہ شہر کی طرف روانہ ہوا اور اس بار وہ جینا ہاؤس دیکھنا چاہتا تھا۔ جینا ہاؤس بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی کوٹھی تھی۔ اس کی چھت کا طرز تعمیر چینی تھا اور سرخ کھپریل کی چھت تہ در تہ اوپر سے نیچے آرہی تھی۔ حیات کچھ دیر اس کے سامنے رک کر اس کا جائزہ لیتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد اسے ایک ہوٹل دکھائی دیا۔ لنچ کا وقت ہو رہا تھا، اس نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔ اندر آ کر اس نے ایک کونے کی میز منتخب کی۔ ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ایک نوجوان ویٹر اس کے پاس آیا اور مینیو اس کے سامنے رکھ دیا۔ حیات نے کہا۔

"سوپ لے آؤ۔"

کچھ دیر میں ویٹر سوپ لے آیا تو حیات نے اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ "اور کوئی خدمت جناب؟"

"نہیں، ابھی میں سوپ لوں گا، لنچ کچھ دیر بعد کروں گا۔" حیات نے جواب دیا۔ "تم یہاں پرانے آدمی ہو؟"

"جی سر! میں تین سال سے کام کر رہا ہوں۔" ویٹر نے جواب دیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اسے کسی مقصد کے تحت ہی یہ پیشگی ٹپ دی گئی ہے۔ حیات سوپ پینے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میں بہت عرصے بعد یہاں آیا ہوں۔"

"آپ کہیں باہر ہوتے ہیں سر؟"

"انگلینڈ... میں کسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

"کس کی تلاش میں سر!"

"وہ یہیں کہیں رہتی ہے، شاید تم نے اسے دیکھا ہو؟"

ویٹر چونکا۔ "وہ کوئی خاتون ہے؟"

"ہاں..." حیات نے کہا اور تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ ساتھ ہی وہ غور سے ویٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ویٹر کوئی ردعمل ظاہر کرتا، اس نے پرس نکال لیا اور اس سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا۔ اس کا خاطر خواہ ردعمل ہوا۔ ویٹر نے سر ہلایا۔

"جی سر! میں نے ان خاتون کو دیکھا ہے۔"

حیات کا دل دھڑک اٹھا۔ "کہاں... کس کے ساتھ؟"

"ایک لڑکا جیسا تھا۔ یہ دو تین بار اس کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے ہی سرو کیا تھا اس لیے مجھے یاد رہ گیا۔"

"نوجوان کا حلیہ یاد ہے؟"

جواب میں ویٹر خاموش کھڑا رہا تو حیات نے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا مگر چھوڑا نہیں۔ ویٹر بولا۔ "عمر بائیس سال تھی۔ تیکھے سے نقوش تھے، سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں..." وہ شہزاد کا حلیہ بتا رہا تھا۔ اتفاق سے حیات کے پرس میں اس کی اور شہزاد کی ایک مشترکہ تصویر موجود تھی۔ اس نے وہ تصویر نکال کر ویٹر کے سامنے کی، اپنے چہرے پر انگوٹھا رکھ لیا۔

"یہی ہے؟"

"بالکل یہی ہے۔" ویٹر نے بے ساختہ کہا تو حیات نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم اس سے ڈبل کما سکتے ہو اگر مجھے بتا دو کہ یہ لڑکی کہاں ملے گی۔"

"سر! میں غریب آدمی ہوں۔" ویٹر نے آہستہ سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ غریب آدمی کہیں پھنس جائے تو اس کی جان نہیں بچتی۔"

"فکر مت کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا اور نہ کہیں تمہارا نام لیا جائے گا۔" حیات نے کہا اور ہزار کا نوٹ بھی نکال لیا۔

"میں یہ بھی دوں گا اور تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

ویٹر ابھی تک ہچکچا رہا تھا۔ "سر! خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں... اور میں کہہ چکا ہوں کہ تمہارا نام نہیں آئے گا۔ بس مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ کہاں رہتی ہے۔"

"یہ جینا ہاؤس کی لڑکی ہے۔" ویٹر نے سرگوشی میں کہا۔

"جینا ہاؤس کہاں ہے... یہاں کون رہتا ہے؟" حیات نے انجان بن کر کہا۔ ویسے اسے خود بھی یہی خیال آ رہا تھا کہ تصویر والی لڑکی کا تعلق جینا ہاؤس سے ہے۔

"جی میں کیا بتاؤں، سمجھ لیں بہت بری جگہ ہے۔ وہاں رہنے والی عورتیں اچھا کام نہیں کرتیں۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ جسم فروش ہیں؟" حیات نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"جی سر!" ویٹر نے کہا۔ "لیکن وہ خطرناک لوگ ہیں۔ سب ان سے ڈرتے ہیں کیونکہ بڑے سرکاری افسران ان کے ساتھ ہیں۔ کوئی رپورٹ کراتا ہے تو خود اندر ہو جاتا ہے۔ جینا نے بدمعاش پالے ہوئے ہیں جو اس کے ایک اشارے پر کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ پاؤں توڑ سکتے ہیں یا اسے مار بھی سکتے ہیں۔"

"مار بھی سکتے ہیں۔" حیات نے زیر لب کہا۔ ویٹر چلا گیا۔ سوپ کے کچھ دیر بعد اس نے لنچ منگوایا۔ کھانے کے دوران میں وہ سوچتا رہا کہ اب اس معاملے میں کیا کرے۔ کیا وہ ممتاز کو سب بتائے؟ لیکن اس سے کیا ثابت ہوگا؟ اگر تصویر والی لڑکی نے شہزاد کے ساتھ دو تین بار یہاں کھانا کھا لیا۔ پھر ویٹر کے بیان کے مطابق جینا ہاؤس والے بہت طاقتور اور بارسوخ تھے۔ ایک ڈی ایس پی اگر چاہتا بھی تو ان کے خلاف کیا کر سکتا تھا؟ حیات اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں پولیس، انتظامیہ کی غلام ہے اور انتظامیہ پیسے کی غلام ہے۔ ان سے یہ توقع محال تھی کہ وہ جینا ہاؤس تک تفتیش کا دائرہ لے جاتے مگر کیا وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو ایسے ہی چھوڑ دے گا؟ یہ خیال اس کے لیے سخت اذیت ناک تھا۔

☆☆☆

رات بارہ بجے سردی شدت کی تھی۔ درجۂ حرارت یقیناً منفی سے کہیں نیچے گر گیا تھا۔ حیات ایک اونچی چٹان پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر دوربین لگی تھی جو تقریباً تین سو گز دور جینا ہاؤس پر مرکوز تھی۔ یہاں سے عمارت بہت اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ کوٹھی کے پورچ میں اور اندرونی چار دیواری کے ساتھ کم سے کم درجن بھر لگژری گاڑیاں موجود تھیں۔ اس سردی کے عالم میں بھی اچھے خاصے لوگ آئے ہوئے تھے۔ حیات گزشتہ دو گھنٹے سے اس چٹان پر موجود تھا جو کوٹھی والے ٹیلے کے مخالف سمت میں تھی۔ یہ جگہ کوٹھی سے کم سے کم دو سو فٹ بلند تھی اس لیے یہاں سے کوٹھی کا منظر بہت واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس چٹان تک پہنچنا بڑا مشکل ثابت ہوا تھا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے اس نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ٹوپی اور ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ ٹھٹھر رہا تھا۔ یخ بستہ چٹان پر لیٹنا بھی کم مشکل نہیں تھا۔

ان دو گھنٹوں کے دوران میں چھ سات گاڑیاں کوٹھی کے اندر گئی تھیں اور ان سے اوپری طبقے کے لوگ اتر کر کوٹھی کے اندر گئے تھے۔ ان کا جس طرح سے استقبال ہوا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں کے پرانے گاہک ہیں۔ کوٹھی کے احاطے میں کئی مسلح افراد ٹہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ گارڈز تھے۔ گاڑیوں کے ساتھ آنے والے ڈرائیور گاڑیوں میں رکے ہوئے تھے۔ یعنی ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے وہ گاڑیوں میں گھسے ہوئے تھے۔ حیات وقفے وقفے سے کوٹھی کا معائنہ کر رہا تھا جو تیز روشنیوں کی وجہ سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس کی چار دیواری پر تیز روشنی والی لائٹس لگی تھیں اور اندر کا ایک ایک گوشہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ کھڑکیاں ساری ہی بند اور تاریک تھیں مگر یہ تاریکی یقیناً بھاری پردوں کی وجہ سے تھی۔ اس موسم میں اور اندر جاری سرگرمیوں کے ہوتے ہوئے کھڑکیاں کھلی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حیات سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے چلنا چاہیے کیونکہ سردی شدید تھی۔ اس نے اٹھنے سے پہلے ایک بار پھر پوری کوٹھی کا معائنہ کیا۔ وہ دوربین سے کھڑکیاں کھنگال رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر ایک کھڑکی کھلی اور اس سے کسی عورت نے باہر جھانکا۔ یہ اوپری منزل کی کھڑکی تھی اور عورت آگے جھکی ہوئی تھی، اس لیے حیات اس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس موسم میں عورت کو کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ عورت نے سویٹر پہن رکھا تھا لیکن اس کے بال کھلے ہوئے تھے پھر اس نے چہرہ اوپر کیا تو حیات چونک گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی تصویر اس کے پاس تھی اور جو شہزاد کے ساتھ ہوٹل میں جاتی رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دوربین فوکس کی اور اب عورت یا لڑکی کا چہرہ بالکل اس کے سامنے تھا۔ یہ وہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات تھے۔ شاید مسلسل رونے سے آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

حیات کا خیال تھا کہ شاید اس نے گھٹن کی وجہ سے کھڑکی کھولی ہے لیکن جب اس نے ایک بیگ اٹھا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور پھر خود بھی چوکھٹ پر آگئی تو حیات چونکا۔ کیا وہ یہاں سے بھاگ رہی تھی؟ اس خطرناک ترچھی چھت پر اترنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا تھا اور وہ بھی رات کے اس پہر۔ لڑکی نے بیگ اٹھا کر پشت پر اسکول بیگ کی طرح لٹکا لیا اور احتیاط سے بیٹھ کر چھت کے کنارے کی طرف سرکنے لگی۔ حیات بہت توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیاہ سویٹر کے ساتھ سیاہ ہی رنگ کی چست پتلون اور ہم رنگ جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت دلکش جسم کی مالک تھی۔ نیچے سرکنے سے پہلے اس نے اپنے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھ لیے تھے۔ وہ سرکتی ہوئی کنارے تک آئی اور دوسری چھت پر اتری۔ وہ اب بھی زمین سے کوئی بیس فٹ کی بلندی پر تھی اور ایک چھت اور تھی۔ وہ اس پر اتر کر ہی زمین تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ بہت سنبھل کر اور آہستگی سے حرکت کر رہی تھی۔

بالآخر اس نے تیسری چھت بھی عبور کر لی اور اب کنارے پر بیٹھی تھی۔ اس نے نیچے دیکھا کہ وہاں کوئی پہرے دار تو نہیں لیکن اس سمت کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ حیات نے چند لمحے کے لیے دوربین اس سے ہٹا کر اس طرف کا جائزہ لیا اور دوبارہ دوربین لڑکی پر مرکوز کر دی۔ وہ جس طرح سے یہاں تک آئی تھی، لگ رہا تھا کہ وہ جرأت مند ہے ورنہ اس خطرناک چھت پر مرد بھی قدم رکھتے ہوئے ڈرتے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس طرف کوئی نہیں ہے تو اس نے پاؤں نیچے لٹکائے اور چھت کا کنارہ تھام کر آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگی۔ کچھ دیر میں وہ ہاتھوں کے بل لٹک رہی تھی اور زمین اس کے پیروں سے تین فٹ نیچے تھی۔ اس نے ہاتھ چھوڑا اور اسی لمحے اس سمت ایک پہرے دار نمودار ہوا لیکن اس کی نظریں کسی اور سمت تھیں اس لیے وہ لڑکی کا ہیولہ نہیں دیکھ سکا اور وہ گرتے ہی جلدی سے کیاری کے پودوں کے درمیان دبک گئی۔ پہرے دار ٹہلتا ہوا اس کے نزدیک سے گزرتا چلا گیا۔ اس نے غور نہیں کیا ورنہ وہاں اتنی روشنی تھی کہ لڑکی دکھائی دے جاتی۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔

یہ تو واضح تھا کہ لڑکی چوری چھپے جینا ہاؤس سے نکلنے کی تیاری کر رہی ہے۔ شاید وہ یہاں کے ماحول سے بدظن ہو گئی تھی۔ وہ شہزاد سے ملتی تھی اور شاید ان کے درمیان کوئی مفاہمت ہو گئی تھی اور شاید اس رات اس نے شہزاد کے ساتھ فرار کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ سوٹ کیس کس کا تھا؟ کیونکہ اس میں جو کپڑے تھے وہ اس کی جسامت کے نہیں تھے۔ اب حیات واضح دیکھ سکتا تھا کہ وہ بھرے بدن کی مالک ہے۔ جیسے ہی پہرے دار وہاں سے گزرا، وہ تیز قدموں سے چار دیواری کی طرف جانے لگی۔ پہرے داروں کی نظر سے بچنے کے لیے وہ لان میں لگے چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر دیوار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک حیات کو خیال آیا اور وہ کھڑا ہو گیا اور تیزی سے چٹان سے اترنے لگا۔ وہ اتنی عجلت میں تھا کہ کئی بار نیچے گرتے گرتے بچا۔ جیسے تیسے وہ نیچے اس جگہ پہنچا جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی۔ اسے اسٹارٹ کر کے وہ سڑک کی طرف لایا اور جینا ہاؤس سے آنے والے راستے سے کچھ دور کچے میں رک گیا۔ یہاں درختوں تلے اندھیرا تھا۔ اگر کوئی پاس آتا تب ہی گاڑی دیکھ سکتا تھا۔ کار کا رنگ بھی گہرا تھا جو اندھیرے میں مشکل سے دکھائی دیتا۔

حیات بروقت پہنچا تھا کیونکہ کچھ دیر بعد اوپر سے ایک سایہ نمودار ہوا اور پیدل ہی سڑک پر مظفرآباد کی طرف چل پڑا۔ حیات نے ساخت سے جان لیا کہ وہ لڑکی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے آیا۔ روشنی دیکھ کر وہ چونکی اور جلدی سے سڑک سے ہٹ گئی۔ حیات نے اس کے پاس کار روک دی۔ ”آپ مظفرآباد جارہی ہیں؟“

”ہاں لیکن میں چلی جاؤں گی۔“ وہ بولی۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”سردی ہے اور سڑک بھی ویران ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں لفٹ دے سکتا ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ حیات کا خیال تھا کہ وہ انکار کر دے گی لیکن خلافِ توقع وہ پلٹ آئی۔ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور لڑکی اندر آگئی۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے حیات نے دیکھا، اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس نے کار آگے بڑھادی۔ اندر ہیٹر آن تھا۔ چند لمحے میں لڑکی بہتر محسوس کرنے لگی۔ ”شکریہ! باہر بہت سردی ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ حیات نے کہا۔

”آپ کہیں پاس سے سڑک پر آئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔ حیات اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ کار کی روشنی اچانک ہی پیچھے سے آئی تھی۔ اگر حیات ہائی وے پر دور سے آتا تو وہ پہلے روشنی محسوس کر لیتی جبکہ ایسا نہیں تھا۔

”اگر میں کہوں کہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا؟“

”تو میں مان لوں گی۔“ لڑکی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور تب حیات نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سے پستول کی جھلک دیکھی۔ ”مجھے بھی یہی شبہ تھا۔ اب بتاؤ تم کیوں میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”میں بتا دوں گا... پستول رکھ لو، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ وہ بولی اور پستول حیات کے پہلو سے لگا دیا۔ ”یقین کرو، مجھے گولی چلانے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوگا۔“

”میں نے کہا نا، جلد بازی مت کرو۔ میں دشمن نہیں ہوں بلکہ شاید دوست ہوں۔“

”شاید۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”ہاں، ابھی ہم دونوں کے درمیان گفتگو ہوگی اور اس کے بعد صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔“

”کیسی صورتِ حال؟“

”یہ بتاؤ کہ تم جینا ہاؤس سے اس طرح کیوں نکلیں؟“

”تو میرا شبہ درست تھا۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے شہزاد کو قتل کیا تھا۔“ اس نے حیات کے پہلو پر دباؤ بڑھا دیا۔

”نہیں، میں خود شہزاد کے قاتل یا قاتلوں کی تلاش میں ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”تم ہو کون... پولیس یا خفیہ پولیس والے ہو؟“

”میں جو کوئی بھی ہوں لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ میرا تعلق کسی ایسے شخص سے ہے جو شہزاد کے قتل میں ملوث ہو۔ ویسے میں یہی شبہ تم پر کر سکتا ہوں۔“

وہ چونکی۔ ”کیا... تم شہزاد کے قتل کی بات کر رہے ہو؟“

”بالکل... پولیس کو شہزاد کی گاڑی سے ایک سوٹ کیس ملا ہے جس میں زنانہ ملبوسات تھے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ حیرت سے بولی۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں، وہ سوٹ کیس پولیس کی تحویل میں ہے لیکن اس سے کوئی ایسا نشان یا پتا نہیں ملا جس سے پتا چلے کہ وہ کس کا ہے؟“

”تم کون ہو اور تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا اور شہزاد کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ معاشرتی لحاظ سے تم دونوں کا کوئی تعلق نہیں بنتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تمہارا تعلق جینا ہاؤس سے ہے اور سب جانتے ہیں وہاں کیا ہوتا ہے۔ شہزاد ایک عام گھرانے کا فرد تھا اور اب وہ دنیا میں نہیں رہا ہے۔“

”میرا اس سے کیا تعلق تھا؟“ لڑکی کی آواز لرزنے لگی پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا پستول والا ہاتھ حیات کے پہلو سے ہٹ گیا اور وہ چاہتا تو آرام سے اس سے پستول چھین سکتا تھا لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ البتہ کار ایک طرف کر کے روک لی۔ لڑکی نے چونک کر دیکھا۔ ”یہاں کیوں رکے ہو؟“

حیات نے کہا۔ ”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“ اس نے پستول دوبارہ حیات پر تان لیا۔ حیات نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”تم شہزاد سے محبت کرتی تھیں؟“

”ہاں، میں اس سے محبت کرتی تھی اور اس سے شادی کرنے والی تھی۔“ وہ تند لہجے میں بولی۔ ”میں اس زندگی سے تنگ آگئی تھی جس میں مجھے نت نئے مردوں سے واسطہ پڑتا تھا۔“

”تم دونوں نے فرار کا پروگرام بنایا لیکن پکڑے گئے اور ان لوگوں نے شہزاد کو... مار دیا۔“

”میرے ساتھ فرار؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”نہیں... ابھی تو ہم سوچ رہے تھے۔ شہزاد ایک ہفتے سے میرے پاس نہیں آیا اور پھر اس کی...“ لڑکی کی آواز بھرا گئی۔

”تم اس سے باہر ملتی تھیں... کیا تمہیں باہر جانے کی اجازت تھی؟“

”ہاں، شہزاد اب جانا پہچانا ہو گیا تھا اس لیے مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ لیکن تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اسی لیے میں کہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”فکر مت کرو، میں تمہیں شہزاد کے گھر لے جاؤں گا۔“

”شہزاد کے گھر؟“ وہ دنگ رہ گئی۔ ”تم کون ہو؟“

”شہزاد کا بڑا بھائی حیات۔“

☆☆☆

وہ لباس بدل کر نشست گاہ میں آگئی۔ شکیلہ نے چائے تیار کر لی تھی۔ وہ متجسس تھی کہ بھائی اتنی رات گئے اس لڑکی کو کیوں لایا ہے لیکن حیات نے اسے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے چلی گئی۔ لڑکی کا نام سوہانہ تھا اور اس کا تعلق آزاد کشمیر سے ہی تھا۔ حیات نے اس سے کہا۔ ”اب تم بتا سکتی ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے؟“

”پہلے آپ بتائیے کہ آپ مجھ تک کیسے پہنچے؟“ سوہانہ اب اس سے احترام سے بات کر رہی تھی۔

”شہزاد کے پاس تمہاری ایک تصویر نکلی تھی۔ وہ تصویر پولیس کے پاس بھی ہے اور وہ بھی تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ میں نے اسی تصویر کی مدد سے تمہیں تلاش کیا۔“

”آپ اس وقت وہاں کیا کر رہے تھے؟“

”یہ بالکل اتفاق تھا... میں دوربین سے جینا ہاؤس کا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے تمہیں خاموشی سے نکلتے دیکھا اور پھر میں سڑک پر تمہارا انتظار کرنے لگا۔“

”اوہ۔“ سوہانہ نے گہری سانس لی۔

سوہانہ کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا۔ وہ بچپن سے بہت خوب صورت تھی۔ وہ غریب لوگ تھے۔ باپ نشہ کرتا تھا اور ماں محنت کر کے گھر چلاتی تھی۔ وہ سترہ برس کی ہوئی تو ایک دن اس کا باپ اسے گاؤں سے یہاں شہر لے آیا۔ وہ دھوکا دے کر لایا تھا کہ اسے شہر دکھائے گا۔ سوہانہ نے مڈل تک اسکول میں پڑھا تھا اور اسے گاؤں سے باہر کی دنیا کے بارے میں پتا تھا مگر باپ اسے جینا ہاؤس لے آیا۔ کوٹھی اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بے اختیار اس کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش وہ اس کوٹھی میں رہ سکے۔ اس کی خواہش یوں پوری ہوئی کہ اس رات وہ کوٹھی میں رہی اور اگلی صبح جاگی تو اسے پتا چلا کہ اس کا باپ اس کا سودا کر کے جا چکا ہے۔ سوہانہ تڑپ گئی۔ اس نے بہت رونا دھونا کیا اور جینا سے التجائیں کیں کہ اسے واپس جانے دیا جائے، اس کی ماں اس کے بغیر مر جائے گی مگر جینا نے اسے بتایا کہ اسے یہیں رہنا ہے اور یہ بھی بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ سوہانہ کو جوش آگیا۔

”میں آبرو نہیں بیچ سکتی... تم بے شک مجھے مار دو۔“

”میری بچی! میں تمہیں ماروں گی نہیں اور نہ زبردستی کروں گی۔“ جینا نے بہترین اردو میں کہا۔ ”جلد تم خود میری ہر بات مانو گی۔“

سوہانہ کا خیال تھا کہ اسے زبردستی پامال کر کے اس کام پر لگایا جائے گا لیکن اس وقت اس کی حیرت کی حد نہ رہی جب جینا نے اس کی مزید تعلیم اور تربیت کے لیے استاد مقرر کیے۔ وہ کتابوں، تصویروں اور ویڈیوز کی مدد سے پڑھاتے تھے۔ اس کا دیہاتی لہجہ درست کرتے تھے۔ اسے جدید لباس دیے گئے اور انہیں پہننے کا سلیقہ سکھایا۔ ساتھ ہی غیر محسوس انداز میں اس کے کچے ذہن کو بے راہ روی اور جنس کی طرف موڑا گیا۔ وہاں رہنے والی لڑکیاں اسے اپنے تجربات اس طرح سناتیں کہ وہ سنسنی محسوس کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ رہی سہی کسر فلموں کی مدد سے پوری کی گئی۔ جینا اپنی لڑکیوں کو بہت پالش کر کے رکھتی تھی۔ وہ ان کی ذہنی اور جسمانی صحت کا پورا خیال رکھتی تھی۔ اس کا اصول تھا کہ کسی لڑکی کو ہفتے میں تین دن سے زیادہ کام پر مجبور نہیں کرتی تھی، ہاں وہ خود کرنا چاہے تو اسے اجازت ہوتی تھی۔ ان کا باقاعدگی سے طبی معائنہ ہوتا تھا کہ انہیں کوئی مسئلہ یا بیماری تو لاحق نہیں ہو گئی ہے۔

ایک سال بعد سوہانہ بغیر جبر کے، دام جینا کی آلۂ کار بننے پر راضی ہو گئی۔ ایک سال کے دوران میں کسی نے اسے

ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اگرچہ وہاں آنے والے اسے دیکھ کر للچاتے تھے اور جینا کی خوشامدیں کرتے تھے لیکن جینا کا اصول تھا کہ وہ کسی لڑکی کو زبردستی کام پر مجبور نہیں کرتی تھی۔ ہاں کوئی لڑکی اس کے لیے کام کرنے کو تیار ہو جاتی تو جینا اس سے پانچ سال کا معاہدہ کرتی تھی اور اس سے پہلے لڑکی کو آزادی نہیں ملتی تھی۔ سوہانہ سے بھی جینا نے پانچ سال کا معاہدہ کیا اور اسے چار سال گزر چکے تھے۔ ان چار سالوں میں سوہانہ نے جینا کو اس سے سوگنا زیادہ کما کر دیا تھا جتنا اس نے اس پر خرچ کیا تھا۔ وہ جینا ہاؤس کی سب سے مہنگی لڑکی تھی۔

کوئی سوا سال پہلے اس کی ملاقات شہزاد سے جینا ہاؤس میں ہوئی۔ پہلی ملاقات میں شہزاد نے اسے بتایا کہ وہ صرف اس کی خاطر یہاں آیا ہے۔ اس نے سوہانہ کو کہیں باہر دیکھا تھا اور اسے پسند کر بیٹھا تھا۔ اس وقت اسے نہیں معلوم تھا کہ سوہانہ ایک کال گرل ہے پھر وہ تلاش کرتے ہوئے جینا ہاؤس تک آ گیا اور تب اسے سوہانہ کی اصلیت کا پتا چلا لیکن اس کی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس نے کوشش کرکے اس تک رسائی حاصل کرلی۔ سوہانہ نے اس کی بات کو استہزائیہ انداز میں لیا کیونکہ اس کے پاس آنے والے ہر دوسرے مرد کو اس سے محبت ہو جاتی تھی۔ اس نے شہزاد کا مذاق بھی اڑایا مگر وہ سنجیدہ رہا۔ اس نے ایک بار بھی سوہانہ کو ہاتھ نہیں لگایا اور جاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''جلد تمہیں میری محبت کا اندازہ ہو جائے گا۔''

اس کے بعد شہزاد نے آنے والے ایک ہفتے کے لیے اسے بک کرلیا مگر ان تینوں مواقعوں پر اس نے سوہانہ کو ہاتھ نہیں لگایا تو وہ اس کے دعوے کو سچ سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ ورنہ دوسرے محبت جتانے والے اپنا کام نکلنے تک دعوے کرتے تھے۔ سوہانہ عورت تھی اور اب تک کسی مرد نے اسے اس طرح سے احترام نہیں دیا تھا۔ وہ شہزاد سے محبت کرنے لگی۔ شہزاد تقریباً ہر ہفتے اس سے ملتا تھا لیکن اس نے کبھی اس کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سوہانہ سے کہتا کہ وہ اسے یہاں سے نکال کرلے جائے گا اور باقاعدہ شادی کرکے اسے اپنائے گا مگر سوہانہ اسے یہی جواب دیتی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ پانچ سال سے پہلے اسے جینا سے رہائی نہیں ملے گی۔ جلد اسے شہزاد کے بارے میں پتا چل گیا کہ اس کی اپنی کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس کا بھائی باہر سے کما کر بھیجتا ہے۔ سوہانہ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کی محنت کی کمائی اس پر یوں نہ لٹائے۔

مگر شہزاد کو اس سے ملے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ وہ خود بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اس لیے سوہانہ نے یہ کیا کہ اپنی جمع پونجی جو بیس لاکھ کے قریب بنتی تھی، شہزاد کے حوالے کردی۔ ساتھ ہی وہ اسے سونے کی مارکیٹ کے حوالے سے معلومات دینے لگی کیونکہ اس کے پاس آنے والوں میں ایک گولڈ ڈیلر بھی تھا اور وہ جانتا تھا کہ کب سونے کی قیمت میں اتار چڑھاؤ آئے گا۔ سوہانہ ہوشیاری سے اس سے سب معلوم کرکے شہزاد کو بتاتی۔ شہزاد اسی کی ٹپ کی مدد سے سونے میں سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ اس طرح وہ خود کمانے لگا۔ ان دونوں نے طے کیا کہ جب ان کے پاس ایک کروڑ روپے ہو جائیں گے تو سوہانہ شہزاد کے ساتھ جینا ہاؤس سے فرار ہو جائے گی اور وہ لاہور چلے جائیں گے۔ شہزاد اس سے نکاح کرکے اسے وہیں رکھے گا۔ اس دوران میں شہزاد بھائی کی مدد سے برطانیہ کا ویزا حاصل کرلے گا۔ اس کا ارادہ بعد میں سوہانہ کو وہاں بلا لینے کا تھا۔ اس طرح سوہانہ جینا کی پہنچ سے دور نکل جاتی۔

سوہانہ کو اس کے کام کا معاوضہ فوراً مل جاتا تھا۔ جینا کا اصول تھا کہ گاہک سے جتنا وصول کرتی تھی، اس میں سے چالیس فیصد لڑکی کو ملتا تھا۔ اگر گاہک لڑکی کو رقم یا تحفہ دیتا تھا تو یہ اس کی ملکیت ہوتا تھا۔ سوہانہ کو بھی بہت کچھ ملا تھا۔ اس کے پاس کلو بھر سونا تھا۔ اس نے وہ بھی شہزاد کے حوالے کر دیا۔ ایک سال میں اس نے دس لاکھ روپے مزید جمع کرلیے۔ وہ یہ رقم ساتھ لے کر نکلی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ زیورات اور دوسری قیمتی چیزیں بھی تھیں۔ ایک مہینے پہلے انہوں نے طے کیا کہ اب سوہانہ یہاں نہیں رہے گی۔ مگر انہوں نے چالاکی سے کام لیا اور شہزاد نے سوہانہ سے ملنا بند کر دیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا کہ اب وہ اس کے لیے کشش کھو چکی ہے۔ آخری بار وہ سوہانہ سے ایک ہفتہ پہلے ملا تھا اور اس نے اسے تیار رہنے کو کہا تھا۔ ستائیس اور اٹھائیس دسمبر کی رات سوہانہ وہاں سے نکل آتی اور شہزاد اسے لے کر براہ راست لاہور روانہ ہو جاتا جہاں وہ اس کے لیے ایک وومن ہاسٹل میں جگہ حاصل کر چکا تھا۔ سوہانہ کو کچھ دن یا ایک مہینہ یہاں رہنا تھا۔ اس کے بعد شہزاد راستہ صاف دیکھ کر آتا اور اس سے نکاح کرکے اسے کہیں گھر لے دیتا۔ ابھی وہ یہیں رہنا چاہتا تھا تاکہ اگر جینا اس پر شک کرے تو اسے کوئی خلافِ معمول چیز نظر نہ آئے۔ شہزاد کو امید تھی کہ ایک مہینے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

''مگر اس سے پہلے ہی...'' سوہانہ بات پوری نہ کر سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تب تم کیوں نکلیں؟''

سوہانہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''جب شہزاد ایک ہفتے پہلے آخری بار آیا تو اس نے مجھے لاکر کی چابی اور اپنا اجازت نامہ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ کیوں کر رہا ہے؟ اس نے کہا آدمی کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمہاری ساری کمائی اور دولت میرے پاس رہ جائے گی۔ اس نے بتایا کہ اس نے سب لاکر میں رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سوہانہ کو پچیس لاکھ کا چیک بھی دیا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو سوہانہ نے اسے دی تھی اور اس نے سونے میں سرمایہ کاری کرکے مزید پانچ لاکھ کمائے تھے۔ سوہانہ اس کی باتوں سے خوف زدہ ہو گئی اور اس نے شہزاد سے پوچھا کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟ تب اس نے ہنس کر کہا کہ وہ حفاظتی تدبیر کر رہا ہے۔ ''لیکن مجھے لگا کہ کوئی بات تھی۔ وہ کچھ فکرمند اور عجیب سا لگ رہا تھا مگر میرے اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے مجھے سب بتا دیا تھا کہ جینا... ہاؤس سے نکل کر مجھے کیا کرنا ہے۔''

''جب تم نے مجھے دیکھا تو تم نے کچھ ایسی باتیں کیں جیسے تمہیں کسی پر شک ہو کہ شہزاد کا قاتل وہی ہے۔''

''مجھے جینا ہاؤس والوں پر شک تھا۔'' سوہانہ نے کہا۔ ''جینا نے ایسے بدمعاش پال رکھے ہیں جو اس کے اشارے پر کسی کو بھی قتل کر سکتے ہیں اور وہ کئی بار ایسا کر چکے ہیں۔''

''یہ اتنی خطرناک عورت ہے؟'' حیات نے حیرت سے کہا۔

''اس سے بھی کہیں زیادہ... شہزاد کی خبر سنتے ہی میرا دھیان اس کی طرف گیا تھا اور مجھے شک ہوا کہ اسے ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا تھا لیکن جب اس نے مجھ سے کوئی بازپرس نہیں کی تو مجھے اطمینان ہوا اور میں نے فرار کے منصوبے پر عمل کیا۔''

''اب شہزاد نہیں رہا تب تم...؟''

''ہاں، وہ نہیں رہا لیکن وہ مجھے اس گند سے تو نکالنا چاہتا تھا اور میں خود کون سا اس میں رہنا چاہتی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میرے پاس اتنی دولت تھی کہ میں کہیں چھپ کر سادہ زندگی گزاروں تو ساری عمر کے لیے کافی ہوتی۔ ایک کروڑ روپے انویسٹ کرتی تو مجھے آرام سے لاکھ روپے مہینے کے ملتے رہتے اور اتنی رقم ایک اکیلے فرد کے لیے کافی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پولیس کے علم میں آنے کے بعد اب لاکر تک رسائی آسان نہیں ہے۔'' حیات نے بتایا۔ ''کل میں ڈی ایس پی کے ساتھ جا کر کورٹ سے آرڈر لوں گا۔ اس کے بعد ہی لاکر کھولنے کی اجازت ملے گی لیکن اس میں سے کچھ نکالا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح اکاؤنٹ سے رقم نہیں نکلے گی۔''

سوہانہ پریشان ہو گئی۔ ''تب کیا ہوگا؟ میرے پاس تو بس یہ دس لاکھ ہیں۔''

''تم فکر مت کرو اور کچھ عرصے یہاں رہو، اس دوران میں یہ معاملہ سیٹ ہو جائے گا۔''

''یہاں مجھے خطرہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں لاہور جاؤں گی۔''

''اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو، تب بھی کچھ دن تو رک جاؤ... میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم شہزاد کے قاتلوں کی گرفتاری میں مدد دو۔''

''میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''ابھی کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ممکن ہے تمہیں کوئی بات یاد آ جائے جس سے یہ معما حل ہو جائے۔'' حیات نے التجا کی۔ ''تم اس سے محبت کرتی تھیں، اس لیے اس کا تم پر حق بنتا ہے۔''

''اگر میری مدد سے شہزاد کا قاتل گرفتار ہو سکتا ہے تو اس کے لیے میں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں۔''

''میں تم سے شہزاد کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی۔''

''کیا وہ بھی تمہارے... میرا مطلب ہے تم سے اس کا کوئی ایسا تعلق جو...''

''نہیں۔'' سوہانہ نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ ''اس نے کبھی مجھے اس نیت سے ہاتھ نہیں لگایا۔''

''تم جانتی ہو، وہ شراب پیتا تھا؟''

''ہاں لیکن جب ہم نے فرار کا پلان بنایا تو اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

حیات کو ان بوتلوں کا خیال آیا جو سربمہر تھیں۔ یعنی شہزاد نے اپنے وعدے پر عمل بھی کیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے یہ بوتلیں بھی رکھی تھیں۔ ''اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ مارفین کا نشہ کرتا تھا، انجکشن کی مدد سے؟''

''شروع میں کرتا تھا لیکن چھ مہینے پہلے اس نے چھوڑ دیا تھا۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ اسے ان لتوں کا شکار کس نے بنایا تھا؟''

”کئی بار پوچھا لیکن وہ ٹال جاتا تھا۔ ایک بار اس نے بتایا کہ ایک دوست نے اسے شراب اور مارفین کے نشوں پر لگایا تھا۔“

”دوست کا نام؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ سوہانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ میں نے شہزاد کا کمرا کھول دیا ہے۔ تم وہیں رہو گی۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اب مجھے پتا چلا کہ شہزاد میں اتنی خرابیوں کے باوجود ایک مخصوص اچھائی کیوں تھی۔ وہ کبھی برائی میں حد سے آگے کیوں نہیں گیا۔“

”ہاں، ہمارے باپ نے ہمیں حلال کھلایا تھا اور میں نے بھی جو کمایا، اس کا ایک ایک روپیا حلال کا ہے۔ شاید اسی وجہ سے شہزاد ایک حد سے آگے نہیں گیا اور اسے سمجھ بھی آ گئی لیکن.....“ حیات نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سوہانہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اگر آپ کو میرے ماضی کا پتا چل جاتا تو کیا آپ لوگ مجھے قبول کر لیتے؟“

”ہمارا مسئلہ ثانوی ہوتا۔ اصل میں تو شہزاد کو تمہیں قبول کرنا تھا اور اس نے تمہیں قبول کر لیا تھا۔

”پھر بھی.....“

”جو گزر گیا، اس پر سوچنا یا بات کرنا بیکار ہے۔“ حیات نے نرمی سے کہا۔ ”تم اس معاملے میں سر مت کھپاؤ اور جا کر آرام کرو۔ امید ہے تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اور ہاں، شکیلہ یا امی کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف اتنا کہہ سکتی ہو کہ تم ایک مظلوم ہو، دنیا میں اکیلی ہو اور کچھ لوگوں سے خطرہ ہے۔ اتفاق سے میں تمہیں مل گیا اور میں نے تمہیں عارضی پناہ دی ہے۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ سوہانہ نے جواب دیا۔

حیات کمرے میں آیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ سوہانہ سے ملنے کے بعد بہت ساری باتوں سے پردہ اٹھ گیا تھا اور اب شہزاد کی بہتر تصویر سامنے آئی تھی۔ وہ برائی کے راستے سے ہٹ گیا تھا اور اس نے ایک کال گرل کو اس گندگی سے نکالنے کا سوچا تھا۔ اسے قدرت نے مہلت نہیں دی ورنہ وہ یقیناً سوہانہ سے شادی کر لیتا۔ حیات کے خیال میں اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ سوہانہ اپنی خوشی سے اس دلدل میں نہیں اتری تھی۔ وہ مجبور تھی اور انسان کی مجبوری قابلِ معافی ہوتی ہے۔ مگر یہ معما مزید الجھ گیا تھا کہ اس رات شہزاد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ اپنی جیپ میں کس کے ساتھ کہاں جا رہا تھا؟ جب قاتلوں نے اسے روکا اور پھر اس کا پیچھا کر کے اسے قتل کر دیا۔ قاتل کون تھے؟

سوہانہ سے ملنے کے بعد جینا ہاؤس والوں پر شبہ بہت کم ہو گیا تھا۔ اگر انہوں نے شہزاد کو مارا ہوتا تو وہ سوہانہ پر بھی سختی کرتے اور وہ اتنی آسانی سے جینا ہاؤس سے فرار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا فرار ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ جینا ہاؤس والوں کا شہزاد کے قتل سے تعلق نہیں تھا۔ حیات کی آنکھ دیر سے لگی اور دو گھنٹے بعد ہی الارم سن کر کھل گئی۔ اسے یاد آیا کہ اسے ڈی ایس پی ممتاز کے ساتھ کورٹ جانا تھا۔ اس نے جلدی سے اس سے کال کر کے ملاقات کا پوچھا۔ ”میں کہاں آؤں؟“

”ایسا کریں، کورٹ ہی آ جائیں۔“ ممتاز نے مشورہ دیا۔ ”وہ آپ کو پاس پڑے گا۔ آپ باہر میرا انتظار کیجیے گا۔“

حیات نو بجے کورٹ پہنچ گیا۔ پندرہ منٹ بعد ممتاز بھی آ گیا۔ وہ دونوں کورٹ میں پیش ہوئے اور ممتاز نے عدالت سے بینک لاکر کھولنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ اگرچہ حیات کو معلوم تھا کہ لاکر میں کیا ہو گا لیکن اس نے ممتاز پر ظاہر نہیں کیا اور نہ اس نے اسے سوہانہ کے بارے میں بتایا۔ اس کے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ سوہانہ یا جینا ہاؤس کا اس قتل سے تعلق ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھے بینک پہنچے اور اجازت نامہ منیجر کو پیش کیا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، بینک آپ سے تعاون کرے گا مگر شہزاد احمد کے پاس لاکر کی چابی تھی۔ اس کی ضرورت پڑے گی۔“

حیات سوہانہ سے چابی لے آیا۔ اس نے چابی دکھائی۔ ”میرے پاس ہے۔“

ممتاز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”آپ کو کہاں سے ملی؟“

”میں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ بینک لاکر کی چابی ہے۔“ حیات نے مطمئن کرنے والا جواب دیا۔

”لیکن آپ لاکر سے کچھ نکالیں یا اس میں کچھ رکھیں گے نہیں۔“ منیجر نے انہیں خبردار کیا۔

”میں قانون سمجھتا ہوں۔“ ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آپ پلیز اپنا کام کریں۔“

منیجر انہیں لاکر روم میں لایا۔ اس نے لاکر میں اپنی والی چابی لگائی، تالا کھولا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ممتاز نے شہزاد والی چابی لگا کر لاکر کھولا۔ سامنے ایک

چھوٹا بریف کیس رکھا تھا۔ ممتاز نے اسے اٹھایا تو خاصا وزنی لگا۔ یہ لاک نہیں تھا۔ اسے کھولا تو اس کے اندر سونے کی چھوٹی اینٹیں رکھی تھیں۔ یہ سو گرام والی اینٹیں تھیں اور ان کی تعداد پندرہ تھی۔ یعنی بریف کیس میں ڈیڑھ کلو گرام خالص سونا تھا۔ دوسری چیز ایک بڑا پلاسٹک کا لفافہ تھا جس میں پانچ ہزار کے نوٹوں والی بینک کی سیل بند چار گڈیاں تھیں۔ یہ بیس لاکھ روپے تھے۔ گویا لاکر میں تقریباً کروڑ روپے مالیت کا سونا اور نقدی تھی۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے لاکر بند کیا اور باہر آ گئے۔

”میرا خیال ہے، آپ کا کہنا درست ہے۔ شہزاد کوئی کام اور بھی کر رہا تھا، تب ہی اس کے پاس اتنی بڑی مالیت کی رقم اور سونا موجود تھا۔“

”مزید کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟“

”فی الحال تو نہیں۔“ ممتاز نے کہا۔ ”یہ اندھا کیس ہے جس میں سارے راستے ایک بند گلی میں کھل رہے ہیں۔“

”مجھے بھی شہزاد کا کیس اس طرح سے حل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔“ حیات نے مایوسی سے کہا۔ ”شہزاد کی چیزوں کا کیا بنے گا؟“

”گاڑی تو کورٹ آرڈر سے ملے گی لیکن سوٹ کیس اور باقی چیزیں آپ ابھی لے جا سکتے ہیں۔“

حیات اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن تک آیا جہاں ممتاز نے اسے سوٹ کیس اور شہزاد کے پاس سے ملنے والی چیزیں دیں۔ وہ گھر روانہ ہوا۔ اسے سوہانہ سے اپنی رات کی گفتگو یاد آ رہی تھی اور اس میں کوئی بات رہ رہ کر کھٹک رہی تھی۔ مگر ابھی وہ گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ گھر پہنچا اور سامان اپنے کمرے میں لے آیا۔ جمیلہ کی طبیعت سنبھل گئی تھی لیکن وہ زیادہ تر کمرے تک محدود رہتی تھی۔ شکیلہ بھی اپنے کمرے میں رہتی تھی البتہ جب ملازمائیں آتیں تو وہ ان کی نگرانی کرتی۔ سوہانہ شہزاد والے کمرے میں تھی۔ وہ جو بیگ لے کر آئی تھی، اس میں اس کے دو جوڑے بھی تھے اس لیے گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ سوہانہ کے کمرے تک آیا اور اس نے دستک دی تو اندر سے شکیلہ نکلی۔ وہ سوہانہ سے بات کر رہی تھی۔ حیات کو دیکھ کر وہ جلدی سے چلی گئی۔ حیات نے باہر سے کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”تو آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیے۔“ سوہانہ بولی۔ اس نے آج بڑا سا دوپٹا لیا ہوا تھا۔ حیات اندر آ گیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے آنٹی سے ملی ہوں۔“ سوہانہ نے

شریف لڑکی

فرانس کے سابق صدر پنکارا PINCKRA اپنی جوانی کے دور میں پیرس کے ممتاز وکیل تھے۔ وہ جنگ عظیم کے ابتدائی چھ سال میں فرانس کے صدر تھے۔ ان کو ایک لڑکی سے محبت تھی اور وہ اس سے شادی کے خواہاں تھے۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ شادی سے پہلے اس کے متعلق تحقیقات کرالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے پیرس کے ایک مشہور سراغ رساں کو خط لکھا کہ میں اپنی ہونے والی بیوی کے متعلق چھان بین کرنا چاہتا ہوں، ساتھ ہی انہوں نے ایک ہزار روپے کا چیک بھی بھیج دیا۔

پندرہ دن بعد سراغ رساں کا جواب آیا۔ لکھا تھا:

”لڑکی واقعی بڑی شریف ہے۔ محنت کشوں کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے لیکن کچھ عرصے سے ایک وکیل کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے جس کی لوگ بڑی برائی کرتے ہیں۔ اس کا نام پنکارا ہے۔ اگر وہ لڑکی اس وکیل سے قطع تعلق کر لے تو بہت اچھی اور شریف لڑکی ثابت ہو سکتی ہے۔“

(طارق علی صدیقی، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

کہا۔ ”وہ بہت دکھی ہیں۔“

حیات نے گہری سانس لی۔ ”ظاہر ہے، وہ ماں ہیں۔ شکیلہ تم سے کیا بات کر رہی تھی؟“

”وہ پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں اور آپ تک کیسے پہنچی۔“

”تم نے کیا بتایا؟“

”وہی جو آپ نے کہا تھا۔“ وہ بولی۔ ”لیکن شکیلہ بہت زیادہ سوالات کر رہی تھی۔ بعض اوقات مجھے جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔ شکر ہے آپ آ گئے ورنہ میں پریشان ہو گئی تھی۔“

”تم فکر مت کرو، میں اسے سمجھا دوں گا۔“

”اس نے ایک عجیب سی بات کی تھی۔ اس نے اچانک ہی باتوں کے دوران میں کہا کہ اگر شہزاد بھائی زندہ ہوتے تو آپ کو یہاں دیکھ کر خوش ہوتے۔ کیا اسے میرے اور شہزاد کے تعلق کا علم ہے؟“

”ممکن ہے، وہ دونوں بہن بھائی تھے اور ہر وقت کا ساتھ تھا۔ مجھے بھی شبہ ہے کہ شکیلہ شہزاد کی سرگرمیوں کے بارے میں جانتی ہے لیکن اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔“

"آپ کہیں تو میں اس سے پوچھوں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" حیات نے سوچ کر کہا۔ "میں نے ڈی ایس پی کے ساتھ جا کر شہزاد کا لاکر دیکھا۔ اس میں تقریباً ایک کروڑ روپے مالیت کا سونا اور نقدی موجود ہے۔ یہ شہزاد نے تمہارے لیے رکھا تھا؟"

سوہانہ نے سر ہلایا۔ "لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھے یہ سب حاصل کرنے میں کچھ وقت لگے گا؟"

"بالکل... کچھ وقت ضرور لگے گا کیونکہ جب تک اکاؤنٹس اور لاکر قانونی طور پر تمہیں منتقل نہ ہو جائے، کوئی اس میں سے کچھ نکالنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ اگر میرے ساتھ ڈی ایس پی نہ ہوتا تو میں سونا اور نقدی تمہارے لیے نکال لاتا۔"

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کروں گی۔ یہ بتائیں کہ پولیس نے کچھ معلوم کیا؟"

"نہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ شہزاد کے ساتھ جو ہوا، اچانک ہوا اور اس طرح ہونے والے قتل کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یقین سے کچھ کہنا تو دشوار ہے مگر لگ ایسا رہا ہے کہ اس ویران جگہ اس کا سامنا کچھ دشمنوں سے ہو گیا۔ وہ ان سے بھڑا یا وہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ بہر حال اس کشمکش میں شہزاد کے سر پہ وار لگا اور وہ مارا گیا۔ اب وہ لوگ کون ہیں اور شہزاد سے کیا دشمنی تھی، اس کا پتا چلانا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کا کسی سے تعلق نہیں تھا۔"

سوہانہ نے اچانک کہا۔ "کہیں اس کے دوستوں میں سے کسی کا کام نہ ہو۔ آخر اسے شراب اور مارفین پر بھی ان میں سے کسی نے لگایا تھا۔"

"اس کے تین دوست ہیں۔ تینوں اس معاملے سے لاتعلق پائے گئے۔ ان میں سے ایک تو کراچی میں اپنی بہن کے پاس تھا۔"

"میرا خیال ہے، ان تینوں کا تعلق دولت مند گھروں سے ہوگا۔ اس لیے ممکن ہے کہ پولیس نے ان کے بیانات کی پوری طرح چھان بین نہ کی ہو، ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ دوست، دوست کی مشکلوں اور دشمنی سے بے خبر ہو۔"

سوہانہ کی بات نے حیات کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ ان تینوں کا کہنا تھا کہ شہزاد ایک ہفتے سے ان سے نہیں ملا تھا اور سوہانہ سے بھی وہ ایک ہفتہ پہلے آخری بار ملا تھا۔ آخر اس دوران میں وہ کیا کرتا رہا تھا؟ حیات نے سوہانہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں ڈی ایس پی سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔"

حیات، جمیلہ کے پاس آیا۔ وہ جب سے آیا تھا، شہزاد کے قتل کے معمے میں الجھا ہوا تھا۔ ماں کے پاس بیٹھنے کا موقع کم ملا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ حیات... اسے چپ کرانے لگا۔ کچھ دیر میں وہ سنبھل گئی۔ "کاش تو باہر نہ جاتا تو شاید شہزاد زندہ ہوتا۔"

"یہ تو مقدر میں تھا۔"

"نہیں، دولت نے میرا گھر برباد کر دیا۔" جمیلہ بولی۔

"امی! وہ بگڑا ضرور تھا لیکن پھر راستے پر آ گیا تھا۔ اس نے بری عادتیں چھوڑ دی تھیں۔"

جمیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

"بس امی میں جان گیا ہوں۔ لیکن امی، وہ اپنے آخری ہفتے میں پریشان تھا۔ کیا آپ نے یہ بات محسوس نہیں کی تھی؟"

اس بار جمیلہ واضح چونکی۔ "حیات! تجھے کیسے پتا چلی یہ بات؟"

"امی! میں نے بہت سارا وقت یہ جاننے میں لگایا ہے۔ اسی لیے آپ کے پاس بھی کم رہا ہوں۔ آپ نے شہزاد سے پوچھا تھا؟"

جمیلہ نے سر ہلایا۔ "پوچھا تھا اور اس نے یہی کہا تھا کہ دولت نے ہمارے گھر کو برباد کر دیا۔ میں نے پھر پوچھا لیکن اس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔"

حیات سوچ میں پڑ گیا۔ شہزاد نے ایسا کیوں کہا؟ جبکہ وہ خود سدھر گیا تھا۔ اس نے نشہ چھوڑ دیا تھا اور اگر پہلے عورتوں کے چکر میں تھا تو اب وہ بھی نہیں تھا۔ وہ سوہانہ سے محبت کرنے لگا تھا اور ظاہر ہے اسی سے شادی کرتا۔ "امی! آپ کو شہزاد کی آخری ایک ہفتے کی مصروفیات یاد ہیں؟ وہ گھر میں کیا کرتا تھا اور باہر کب جاتا تھا؟"

"وہ عام طور سے شام کے وقت باہر جاتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔ آخری ہفتے میں وہ زیادہ تر گھر میں رہا تھا۔"

"کمرے میں رہتا تھا؟"

"نہیں، لاؤنج میں بیٹھا رہتا تھا جہاں ٹیلی فون ہے یا پھر ڈرائنگ روم میں ہوتا تھا۔ کمرے میں رات کو جاتا تھا۔"

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کس وجہ سے پریشان تھا؟"

"میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے ٹال دیتا تھا لیکن مجھے لگ رہا ہے اس کی پریشانی کا تعلق گھر سے تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ کاش حیات بھائی باہر نہ جاتے تو ہم اس حال کو نہ پہنچتے۔"

"آخر اس کی کیا وجہ تھی؟" حیات نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا، یہ بتایئے کہ اس دوران میں اس سے کوئی ملنے آیا یا اس کے فون آتے تھے؟"

"نہیں، اس دوران میں کوئی ملنے نہیں آیا۔ موسم بہت خراب تھا اور اس وقت برف باری ہو رہی تھی۔ شاید فون آتے تھے لیکن بہت زیادہ نہیں۔"

"پولیس نے شہزاد کا سامان دے دیا ہے لیکن اس میں اس کا موبائل نہیں ہے۔" حیات نے کہا۔ "صرف اس کا پرس، گھڑی، رومال، چابیوں کا گچھا اور اسی طرح کی چند عام چیزیں ہیں۔"

جمیلہ بے قرار ہو گئی کہ وہ یہ چیزیں دیکھے گی۔ حیات اپنے کمرے سے شاپر میں رکھی یہ سب چیزیں لے آیا۔ البتہ اس نے جمیلہ کو سوٹ کیس کے بارے میں نہیں بتایا۔ اگر وہ سوٹ کیس کا بتاتا تو شاید اسے باقی بات بھی بتانی پڑتی۔ جمیلہ شہزاد کا پرس اور دوسری چیزیں چہرے سے لگا کر رونے لگی۔ حیات نے انہیں رونے دیا۔ رونے سے دکھ کم تو نہیں ہوتا، اس زخم کو وقت ہی بھر سکتا تھا لیکن اندر کی گھٹن کم ہو جاتی۔ جمیلہ سنبھلی تو اس نے سوہانہ کے بارے میں پوچھا۔ "حیات! یہ بچی کون ہے اور تجھے کہاں سے ملی؟"

حیات نے ماں کو بھی وہی سب بتایا جو سوہانہ سے طے کیا ہوا تھا۔ جمیلہ دکھی ہو گئی۔ "اتنی پیاری بچی کا ایسا نصیب... شکر ہے کسی بُرے آدمی کے ہاتھ نہیں لگی ورنہ برباد ہو جاتی۔"

اگر جمیلہ کو معلوم ہو جاتا کہ سوہانہ کا تعلق کہاں سے ہے اور وہ کیسی زندگی گزارتی آئی ہے پھر شہزاد سے اس کا تعلق سامنے آجاتا تو شاید جمیلہ کا ردِعمل بالکل برعکس ہوتا مگر ابھی اسے سوہانہ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ حیات نے کہا۔ "اس کے کچھ جاننے والے لاہور میں ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کچھ دن میں جا کر اسے وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

"پتا نہیں وہ بھی رکھتے ہیں یا نہیں... کچھ اسے چین سے یہاں رہ لینے دے۔ اب میں خود اس کا خیال رکھوں گی۔"

دوپہر کا کھانا سوہانہ نے سب کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد حیات چہل قدمی کرنے باہر نکل آیا۔ ہوا رک گئی تھی لیکن سردی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بہر حال اسے کھلی فضا میں ٹہلنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ پیچھے باغ میں آیا جہاں رضوان زمین سے خشک پتے سمیٹ کر ایک گڑھے میں ڈال رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رضوان نے ادب سے سلام کیا۔ جواب دے کر حیات نے اس سے خیر خیریت پوچھی۔ "تم ذرا کام سے فارغ ہو جاؤ۔ تم سے بات کرنی ہے۔"

"جی صاحب! دس منٹ کا کام رہ گیا ہے۔"

حیات باغ کا معائنہ کرتا رہا۔ اب باغ مکمل پلاننگ سے لگایا گیا تھا، اس لیے یہاں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ درخت تھے۔ یہ سب اعلیٰ نسل کے درخت تھے اور ان کا پھل اچھی قیمت میں جاتا ہوگا۔ شہزاد نے واقعی محنت کی تھی۔ رضوان فارغ ہو کر آیا۔ "جی جناب۔"

"رضوان! تم یہاں تقریباً سال بھر سے ہو اور دن میں تم چوکیدار ہوتے ہو یعنی گھر میں کوئی آئے یا جائے تمہیں لازمی پتا ہوتا ہے؟"

"جی جناب... لیکن صبح آٹھ سے رات سات بجے تک... پھر میں سونے چلا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے... شہزاد کے قتل سے ایک ہفتہ پہلے تک گھر میں کون کون آیا تھا؟"

"کوئی بھی نہیں جناب... موسم بہت خراب تھا اور ایسے موسم میں کوئی باہر نہیں نکلتا۔"

"شہزاد باہر گیا تھا؟"

"جی، میرے سامنے ایک یا دو بار گئے تھے۔ اگر رات کو کسی وقت گئے ہوں تو مجھے پتا نہیں۔"

حیات خاصی دیر اس سے پوچھ کچھ کرتا رہا لیکن کوئی کام کی بات سامنے نہیں آئی۔ حیات کو محسوس ہوا کہ اس معاملے میں کوئی پراسراریت نہیں تھی۔ شہزاد کے ساتھ جو ہوا، اس کا پہلے سے کوئی پس منظر تھا بھی تو اس کا اس کی عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اس کی عام زندگی میں تو سب ہی نارمل نظر آ رہا تھا۔

شام کے وقت موسم کے تیور پھر خراب ہونے لگے۔ باہر تیز ہوائیں چلنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی برف کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ وہ سب رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ سوہانہ شاید اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حیات ابھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ جھنجلا رہا تھا اور اس کی وجہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ رات ہوتے ہوتے ہوا بہت تیز ہو گئی۔ جب وہ زور لگاتی تو کھڑکیوں سے آواز آتی۔ نشست گاہ اور اس سے ملحق لاؤنج کی روشنیاں بند تھیں۔ اچانک ایک سایہ نشست گاہ میں

داخل ہوا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ کال ملنے پر اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''میں بات کر رہی ہوں۔''

''میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن یہ تم فون سے کال کر...''

''موبائل سگنل نہیں ہیں۔'' وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟''

''ان حالات میں پلان پر عمل درآمد کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''

''لیکن اب میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔'' اس کے لہجے میں سختی تھی۔

''تم سمجھنے کی کوشش کرو... شہزاد کے قتل کی وجہ سے پولیس بہت سرگرم ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''اگر جینا ہاؤس والوں کو پتا...''

''اس بارے میں کوئی لفظ منہ سے مت نکالنا ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ خاموش رہیں۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

حیات اپنے کمرے میں سوچتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ اس بار وہ سوچ رہا تھا کہ اب ماں اور بہن کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ انہیں ساتھ لے جاتا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ باہر کوئی چلایا ہو۔ ممکن ہے عام حالات ہوتے تو حیات اس چیخ کو اپنا وہم سمجھتا کیونکہ ہواؤں کا شور بھی تھا لیکن ان حالات میں وہ چوکنا رہنا چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی الماری سے پستول نکالا۔ یہ شہزاد کا پستول تھا اور اس کا لائسنس بھی تھا۔ وہ جیکٹ اور گن ٹوپ پہن کر باہر نکلا۔ اس کے باوجود سردی نے ایک لمحے کو اسے سن کر دیا۔ آواز نیچے باغ کی طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی اس لیے وہ نیچے کی طرف بڑھا۔ وہ رضوان کی کوٹھری سے کچھ دور تھا کہ چیخ دوبارہ سنائی دی اور پھر رضوان کی کراہتی آواز آئی۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''جھوٹ مت بولو، وہ عورت یہیں ہے اسی بنگلے میں۔ تم ایک ملازم ہو، مالک سے وفاداری کے چکر میں اپنی جان مت گنواؤ۔'' ایک اجنبی کی غراتی آواز آئی۔

''کون ہے؟'' حیات نے گرج کر کہا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ وہ براہِ راست گولی چلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ''گولی مار دوں گا۔''

جواب میں ایک فائر ہوا اور گولی حیات کے پاس سے گزر گئی۔ وہ احتیاط بھول گیا اور زمین پر گرتے ہوئے اس سمت لگاتار کئی فائر کیے۔ کوئی چلایا پھر بھاگنے کی آواز آئی۔ حیات نے پھر دو ہوائی فائر کیے اور چلا کر رضوان سے پوچھا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

''جی جناب... وہ بھاگ گئے ہیں۔'' رضوان نے جواب دیا۔

پھر بھی حیات احتیاط سے آگے بڑھا اور ایک درخت کی اوٹ سے جھانکا۔ کوٹھری کے سامنے جلنے والے بلب کی روشنی میں رضوان زمین پر بندھا پڑا دکھائی دیا۔ حیات اس کے پاس سے گزر کر سڑک کی طرف بڑھا تھا کہ اسے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جب وہ سڑک تک پہنچا، گاڑی کی عقبی روشنیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ وہ واپس آیا اور رضوان کو کھولا۔ سردی اور خوف سے اس کی حالت بُری ہو رہی تھی۔ حیات اسے کوٹھری میں لے آیا جہاں انگیٹھی روشن تھی اور حرارت سے رضوان کی جان میں جان آئی۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشانات تھے۔ ''کیا ہوا تھا؟''

''وہ تین آدمی تھے جناب... مجھ سے ان بی بی کا پوچھ رہے تھے جو کوٹھی میں ہیں۔ میں نام نہیں جانتا لیکن وہ حلیہ بالکل وہی بتا رہے تھے مگر میں نے انکار کیا کہ یہاں ایسی کوئی عورت نہیں ہے۔''

''شاباش! تم نے حوصلے سے کام لیا۔ کچھ اندازہ ہے وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟''

''انہوں نے چہرے ٹوپیوں سے چھپا رکھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ لہجے سے اور اپنی حرکتوں سے بدمعاش لگ رہے تھے۔'' رضوان خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''صاحب! مجھے چھٹی دیں۔''

''تم ذرو مت... اگر تمہیں زیادہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے تو بنگلے کے اوپر اسٹور روم میں شفٹ ہو جاؤ۔''

رضوان کی چوٹیں معمولی تھیں اس لیے حیات اسے سونے کا کہہ کر بنگلے میں آ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو سوہانہ اسے نشست گاہ میں شال اوڑھے دکھائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ ''تم جاگ رہی ہو؟''

''ہاں، فائرنگ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ آپ کہاں گئے تھے اور باہر کیا ہو رہا تھا؟''

''کچھ لوگ ہمارے چوکیدار کو باندھ کر تشدد کر رہے تھے۔ وہ اس سے تمہارا پوچھ رہے تھے۔''

سوہانہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''وہ یقیناً جینا ہاؤس کے آدمی ہوں گے۔ انہوں نے یہاں میرا سراغ لگا لیا ہے۔''

''نہیں، رضوان نے تمہاری موجودگی سے انکار کیا ہے اور میں نے ہوائی فائر کیے تو وہ بھاگ گئے۔ مگر انہیں پتا کیسے چلا کہ تم یہاں ہو؟''

''آپ نہیں جانتے جینا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس نے کسی نہ کسی طرح پتا چلا لیا ہوگا۔ اب میری وجہ سے آپ لوگ بھی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔''

''تم فکر مت کرو، کچھ نہیں ہوگا۔''

''نہیں، مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

''اچھا، اس پر صبح بات کریں گے۔'' حیات نے کہا۔ ''ابھی تم جا کر آرام کرو۔''

مگر سوہانہ اس کے پیچھے آئی۔ ''میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

''اب اتنا خطرہ نہیں ہے... میں رپورٹ کرا دیتا ہوں۔''

''پولیس والے کچھ نہیں کر سکتے بلکہ یہ خود جینا کے نمک خوار ہیں۔ میں نے جینا ہاؤس میں کتنے اعلیٰ پولیس افسران کو آتے دیکھا ہے۔''

''اس صورت میں تمہارا باہر جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ راستے میں بیٹھے ہیں اور ممکن ہے گزرنے والوں کو چیک کر رہے ہوں۔ ابھی انہیں صرف شک ہے...''

''شک نہیں، میرے خیال میں انہیں اطلاع پہنچ گئی ہے۔'' سوہانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''کس نے پہنچائی ہے؟''

''ضروری نہیں ہے کسی نے اطلاع پہنچائی ہو۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

حیات نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے اگر میں یہاں کچھ اور رک گئی تو بالآخر جینا ہاؤس میرا مقدر بنے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' حیات نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔ تم شہزاد کی محبت ہو اور میں کسی صورت تمہیں دوبارہ اس زندگی میں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''اجازت۔'' وہ ہنسی۔ ''حیات صاحب! یہاں بہت کچھ آپ کی اجازت کے بغیر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔''

اقوالِ زریں

☆ عورت کی عزت شریف طبیعت والے لوگ کرتے ہیں۔ (حضور اکرمؐ)

☆ جو پاک دامن عورت پر تہمت لگائے اس کو سلام نہ کرو۔ (حضرت علیؓ)

☆ ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت نیک عورت ہے۔ (حضرت عمرؓ)

☆ خوب صورت عورت ایک لعل ہے اور نیک عورت خزانہ۔ (شمسین)

☆ عورت کی گود انسان کا پہلا مکتب ہے۔ (سینڈی)

☆ عورت سے بات کرتے وقت وہ سنو جو عورت کی آنکھیں کہتی ہیں۔ (وکٹر ہیگو)

(مرسلہ: عطیہ ناہید، ملتان چھاؤنی)

حیات چونکا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

سوہانہ کچھ کہنے جا رہی تھی کہ اس کی نظر سوٹ کیس پر پڑی۔ یہ شہزاد کی گاڑی سے نکلنے والا سوٹ کیس تھا۔ ''کیا یہ وہی سوٹ کیس ہے؟''

''ہاں۔'' حیات نے کہا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟'' سوہانہ نے تجسس سے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں... دیکھ سکتی ہو؟''

سوہانہ نے سوٹ کیس کھولا اور اس میں موجود کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ حیات کی توجہ نہیں تھی بلکہ وہ سوچ رہا تھا کہ سوہانہ کو اس کے کمرے سے چلے جانا چاہیے ورنہ امی یا شکیلہ نے دیکھ لیا تو کیا سوچیں گی۔ سوہانہ ایک ایک سوٹ دیکھ رہی تھی پھر وہ بُری طرح چونکی۔ ''یہ...''

حیات متوجہ ہوا۔ ''کیا ہوا؟''

سوہانہ ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا سوٹ لیے کھڑی تھی جس پر پیلے رنگ کا بارڈر لگا تھا اور کڑھائی ہوئی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔ حیات نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ اس سوٹ میں کوئی خاص بات ہے؟''

''نن... نہیں۔'' وہ بولی۔ ''کیا میں اسے لے سکتی ہوں؟''

"تمہیں پسند آیا ہے لیکن میرا خیال ہے یہ تمہیں نہیں آئے گا۔"

"میں واپس کر دوں گی۔"

حیات کا خیال تھا کہ وہ ڈیزائن کے لیے مانگ رہی ہے۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، لے جاؤ۔"

سوہانہ اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اگلی صبح حیات نے ناشتے کی میز پر محسوس کیا کہ جمیلہ کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ اس نے سوہانہ سے کوئی بات نہیں کی اور ناشتے کے بعد اٹھتے ہوئے بولی۔ "حیات! میرے کمرے میں آؤ۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

شکیلہ بھی چپ تھی۔ حیات ماں کے کمرے میں آیا۔ وہ کسی قدر برہم لگ رہی تھی۔ اس نے حیات سے کہا۔ "سوہانہ کل رات تمہارے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟"

اس پر حیات نے اسے پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح کچھ لوگوں نے فارم میں گھس کر رضوان پر تشدد کیا اور اس نے ہوائی فائرنگ کی تو وہ بھاگ گئے۔ اس نے سوہانہ کا ذکر درمیان سے نکال دیا تھا۔ مگر یہ بات سن کر بھی جمیلہ کی برہمی کم نہیں ہوئی۔ "اس لڑکی کا شہزاد سے کیا چکر تھا؟"

حیات چونکا۔ "امی! آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی؟"

"مجھے جیسے بھی پتا چلی لیکن تم مجھ سے چھپاتے رہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ ایک بُری عورت ہے اور اس کا تعلق ایک بُری جگہ سے ہے؟"

حیات دنگ رہ گیا۔ "امی! آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟"

"شکیلہ نے بتایا ہے۔ اس نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔"

حیات نے گہری سانس لی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شہزاد سوہانہ سے محبت کرتا تھا اور اس کا تعلق ایک بُری جگہ سے تھا لیکن اب نہیں ہے۔ شہزاد کی محبت میں وہ سب چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اس لڑکی کو اپنی چھت کے نیچے برداشت نہیں کر سکتی۔" جمیلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اسے ابھی یہاں سے نکال دو۔"

"وہ بہت دنوں کے لیے نہیں آئی ہے۔ میں اسے... بلاوجہ لایا بھی نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ شہزاد کے قتل سے اس کا کوئی تعلق ہے۔"

"اسی کی وجہ سے وہ مارا گیا ہے۔" جمیلہ تلخ لہجے میں بولی۔ "اگر یہ کہیں چلی گئی اور بعد میں اس کا کوئی تعلق نکلا تو ہم اسے کہاں تلاش کرتے پھریں گے؟"

"یہ پولیس کا کام ہے، وہ خود تلاش کر لے گی۔"

"پلیز امی! چند دن کی بات ہے۔" حیات نے التجا کی۔

جمیلہ مان نہیں رہی تھی مگر جب حیات نے بار بار اصرار کیا تو وہ اس شرط پر مانی کہ سوہانہ دو دن سے زیادہ یہاں نہیں رہے گی۔ حیات نے پھر کچھ نہیں کہا کہ دو دن کی مہلت بھی غنیمت تھی۔ اسے شکیلہ پر غصہ آرہا تھا کہ ایک تو اس نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں اور پھر جا کر جمیلہ سے کہہ بھی دیں۔ وہ اس سے بھی بات کر سکتی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ "تم نے میری اور سوہانہ کی باتیں چھپ کر سنی ہیں؟"

"ہاں۔" وہ جرأت سے بولی۔ "آپ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟ مجھے لگ رہا ہے کہ یہی شہزاد بھائی کی قاتل ہے۔"

"اگر وہی شہزاد کی قاتل ہے، تب بھی بچ نہیں سکے گی۔ لیکن بغیر ثبوت کے ہمیں اس پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔"

"آپ کے پاس ثبوت ہے کہ وہ بے گناہ ہے؟"

"ہاں، فی الحال حالات اس کی بے گناہی ثابت کر رہے ہیں۔" حیات نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب تم امی سے کوئی بات نہیں کرو گی۔"

شکیلہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے چہرے پر سخت تاثرات تھے۔ جب حیات یہاں سے گیا تھا تو شکیلہ گیارہ سال کی بچی تھی اور حیات سے اس کا رشتہ بہت احترام والا تھا۔ اب ان میں بے تکلفی نہیں تھی بلکہ وہ حیات کے سامنے بہت کم بولتی تھی۔ آنے والے دنوں میں بھی اس کا یہی رویہ برقرار رہا۔ فون پر وہ سلام دعا اور مختصر بات کرتی تھی۔ جب چار سال پہلے حیات آیا تو اس کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر آیا تھا وہ تب بھی کاموں میں یا اپنے میں مگن رہتی۔ خود سے بھائی سے بات نہیں کرتی تھی۔ البتہ اس نے ایک فرمائش خود سے کی تھی۔ اس نے حیات سے کہا۔ "مجھے موبائل چاہیے۔"

اس وقت تک کلر اسکرین اور کیمرے والے موبائل آگئے تھے لیکن خاصے مہنگے تھے۔ حیات نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور اس نے شکیلہ کو ایک اچھا سا موبائل دلا دیا۔ وہ خوش ہو گئی تھی اور بار بار اس کا شکریہ ادا کرتی تھی۔ پھر تین سال پہلے اس نے ایک آنے والے کے ہاتھ شکیلہ کے لیے آئی فون اور ایک جدید لیپ ٹاپ بھجوایا تھا۔ شہزاد کو کمپیوٹر کا شوق نہیں تھا لیکن شکیلہ کے لیے اس نے فون لائن کو ڈی ایس ایل کرا لیا اور وائی فائی کنکشن سیٹ کرایا تا کہ شکیلہ

آرام سے نیٹ استعمال کر سکے۔ حیات اب تک اسے بچی ہی سمجھتا آیا تھا لیکن آج اس نے جس طرح بات کی تھی، وہ بچوں والا انداز نہیں تھا۔

حیات پریشان ہو گیا۔ رات فارم میں گھس آنے والے آدمیوں کا واقعہ ہی کم نہیں تھا اوپر سے سوہانہ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی۔ حیات نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے بیگ لے لیا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"میں یہاں سے جا رہی ہوں۔" اس نے رخ پھیرتے ہوئے کہا لیکن حیات نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔

"کیوں؟"

"ٹھیک ہے، میرا پس منظر عزت دار نہیں ہے لیکن میں اتنی بے عزتی کے بعد یہاں نہیں رک سکتی۔"

"کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں لیکن آنٹی تک تو یہ بات پہنچ گئی ہے۔ کیا اب میں ان سے نظریں ملا سکوں گی؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"پلیز سوہانہ! یہ اچھا نہیں ہوا ہے لیکن باہر اس وقت تمہارے لیے خطرہ ہے۔"

"کیا خطرہ ہے؟ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔ اب وہ مجھے واپس نہیں لے جا سکتے۔" سوہانہ نے عزم کے ساتھ کہا۔ "آپ میری فکر چھوڑیں اور اس خطرے کی فکر کریں جو اس گھر کو ڈبو دینا چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" حیات چونکا۔

سوہانہ نے آنسو صاف کیے۔ "حیات! میری آپ سے درخواست ہے، مجھے جانے کی اجازت دیں۔ میں آپ کو ناراض کر کے نہیں جانا چاہتی۔"

"اگر تمہیں میری اتنی ہی فکر ہے تو تم میری بات کیوں نہیں مان رہی ہو؟ صرف دو دن اور رک جاؤ پھر میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گا۔" حیات نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اس کی ہدایت پر ملازمہ نے دوپہر کا کھانا سوہانہ کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کھانے کے لیے باہر نہیں آئے گی۔ کھانے کے بعد اس نے ممتاز کو کال کر کے رات والے واقعے کی اطلاع دی۔ اس نے پوچھا۔

"آپ ایف آئی آر درج کرانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں... میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ نقاب پوش تھے اور میرے ملازم پر تشدد کرتے رہے۔"

"وہ کیا چاہتے تھے؟"

"وہ رضوان سے گھر والوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" حیات نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اگر سچ بولتا تو اسے سوہانہ کے بارے میں بتانا پڑتا۔

"تب ممکن ہے وہ ڈاکو ہوں۔" ممتاز نے کہا۔ "میں شاہ پور میں گشت کرنے والوں کو ہدایت کر دیتا ہوں۔ وہ یقیناً رات کو کہیں آرام کرتے رہتے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔ میرا کوئی نقصان تو نہیں ہوا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔"

"آپ نے ٹھیک کیا۔" ممتاز بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اب شہزاد کے دوستوں کو پولیس اسٹیشن بلا کر ان سے بات کروں۔ گھر کے مقابلے میں یہاں ان سے ذرا مختلف انداز میں بات کی جا سکتی ہے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" حیات بولا۔ "مجھے یقین ہے، آپ جلد قاتل تک پہنچ جائیں گے۔"

"امید تو یہی ہے۔"

ممتاز سے بات کر کے حیات وہیں فون کے پاس بیٹھ گیا اور پھر اس نے بے خیالی میں فون کا ڈائل ہسٹری والا بٹن دبایا تو گزشتہ کالوں کا ریکارڈ سامنے آ گیا۔ اس نے فہرست دیکھی اور چونک گیا۔ اسے دو نمبر اجنبی لگے۔ ایک نمبر موبائل تھا لیکن دوسرا نمبر فکسڈ لائن تھا۔ حیات نے دونوں کو نوٹ کر لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ کالز کس وقت ہوئی تھیں۔ دونوں کالز گزشتہ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہوئی تھیں۔ حیات کی پیشانی پر بل آ گئے۔ یہاں سے کسی نے اس وقت کال کی تھی اور اس کے شاید ایک گھنٹے بعد وہ لوگ فارم میں گھسے تھے جو سوہانہ کا پوچھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا۔ موسم رات کے مقابلے میں بہتر تھا۔ آسمان پر بادل تھے لیکن برف باری یا طوفان کا امکان نہیں تھا۔ رات بھی برف باری تو کم ہوئی تھی لیکن ہوائیں بہت تیز اور یخ تھیں۔

اس نے شاہ پور کے ایک پی سی او سے پہلے موبائل نمبر ملوایا اور جب دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسری طرف موجود فرد "ہیلو... ہیلو" کرتا رہا اور حیات اس کی آواز پر غور کرتا رہا پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ حیات نے پی سی او والے کو دوسرا نمبر ملانے کو کہا، یہ فکسڈ نمبر تھا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی اور کسی سریلی آواز والی لڑکی نے کہا۔ "جینا ہاؤس۔"

حیات نے ریسیور رکھ دیا۔ پی سی او والا حیران تھا کہ اس نے دونوں کالز پر کوئی بات... نہیں کی۔ حیات نے ادائیگی کی اور باہر آ گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ جینا ہاؤس والے اس کے گھر تک کیسے آئے؟ انہیں وہیں سے کال کی گئی تھی اور ظاہر ہے یہ کال سوہانہ نے کی تھی۔ صرف وہی وہاں کے نمبرز جانتی تھی۔ حیات کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ اسے غصہ کم آتا تھا لیکن جب آتا تو بہت بے قابو کر دینے والا آتا تھا۔ اس وقت اسے ایسا ہی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گھر جانے سے گریز کرے۔ وہ اس مسئلے کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ حل کرنا چاہتا تھا۔ پھر اسے پہلے نمبر کا خیال آیا جو کسی موبائل کا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ وہ نمبر کس کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن پلٹنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر سوہانہ اس سازش میں اس فرد کے ساتھ شریک تھی تو وہ اس کے گھر میں کیوں موجود ہے؟ مگر حالات بتا رہے تھے کہ وہ اس کے ساتھ ملوث نہیں تھی، تب اسے کس نے کال کی تھی؟ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا، اس کے اندر ایک نیا شبہ سر ابھار رہا تھا۔

وہ سوچتا رہا اور سڑکوں پر چکراتا رہا۔ رات ہوئی تو وہ چونکا اور اس نے کار کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ اب اس کا دماغ ٹھنڈا تھا اور وہ جذبات میں آئے بغیر بات کر سکتا تھا۔ وہ فارم میں داخل ہوا لیکن کوٹھی کے پورچ میں ایک بڑی گاڑی کی جھلک دیکھ کر وہ راستے میں رک گیا۔ اس نے تیزی سے انجن اور لائٹیں بند کر دیں اور پھر اتر کر دبے قدموں اوپر بڑھا۔ یہ خاصی بڑی اور لگژری قسم کی گاڑی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی آدمی موجود تھا۔ اس کا ہیولا پورچ کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حیات دبے قدموں نیچے آیا اور اس نے رضوان کی کوٹھری میں جھانکا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ پھر اوپر آیا اور اس بار کوٹھی کی چار دیواری کے ساتھ گھومتا ہوا عقب میں نکلا۔ چار دیواری سات فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اسے پار کیا اور عقب میں کچن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے ڈر تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہ ہو لیکن خوش قسمتی سے وہ کھلا ہوا تھا۔ ملازمائیں سردیوں میں چھ بجے تک چلی جاتی تھیں اس لیے اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ نشست گاہ میں کوئی ہے، وہاں سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دبے قدموں وہاں تک آیا۔ وہاں کئی افراد تھے۔ ایک طرف صوفے پر جمیلہ اور شکیلہ ایک دوسرے سے جڑی بیٹھی تھیں۔ ان سے کچھ دور سوہانہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے صوفے پر ایک ادھیڑ عمر لیکن خوب صورت سفید فام عورت شاہانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے دو تنومند مقامی مرد مؤدب انداز میں کھڑے تھے لیکن ان کی عقابی نگاہیں سوہانہ، جمیلہ اور شکیلہ پر تھیں۔ حیات کو سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا کہ وہ عورت جینا ہے۔ وہ سوہانہ سے کہہ رہی تھی۔

"تم سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہیں تلاش نہیں کر سکوں گی؟"

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔" سوہانہ نے سکون سے کہا۔ "لیکن اگر تم یہ سوچ کر آئی ہو کہ مجھے یہاں سے لے جاؤ گی تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔"

"اچھا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "کیا کر لو گی؟"

جواب میں سوہانہ نے اپنا پستول نکالا تو جینا کے مستعد محافظوں نے لمحے بھر میں اپنے ہتھیار نکال کر سوہانہ پر تان لیے۔ ایک نے للکار کر کہا۔ "اسے پھینک دو۔"

سوہانہ مسکرائی۔ "درست... یہ مادام کے لیے نہیں ہے۔" سوہانہ نے پستول کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔ "میں خودکشی کر لوں گی۔"

"اتنا آسان سمجھا ہے۔" جینا مزید طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "مجھے پہلے خیال نہیں آیا کہ تم اس چھوکرے کے چکر میں ہو۔"

"چلو اب پتا چل گیا۔" سوہانہ نے کہا۔ "یہ تو طے ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"میں تمہیں لے کر جاؤں گی۔" جینا غرائی۔

"تب خدا حافظ۔" سوہانہ نے کہا اور ٹریگر دبانے لگی کہ حیات عقب سے جھپٹا اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر اوپر کر دیا۔ گولی چلی اور چھت کی طرف گئی۔ اس سے پہلے کہ سوہانہ دوبارہ گولی چلاتی، حیات نے اس سے پستول چھین لیا۔

"یہ کیا کر رہی تھیں؟"

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ "آپ... میں نے کہا تھا نا مجھے یہاں سے جانے دیں۔"

"تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔" حیات نے پختہ لہجے میں کہا۔ "جینا تمہیں نہیں لے جا سکے گی۔"

"میرا سوہانہ سے معاہدہ ہے۔" جینا تیکھے لہجے میں بولی۔ اس نے اپنے پرس سے رول کیا ہوا کاغذ نکال کر لہرایا۔ "یہ پانچ سال سے پہلے مجھے نہیں چھوڑ سکتی۔ ویسے تم کون ہو؟"

"میں شہزاد کا بڑا بھائی حیات احمد ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اس معاہدے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیا تم اسے لے کر کسی عدالت میں جاؤ گی؟"

"میں اپنے معاہدے کی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔" جینا نے غرور سے کہا۔

"سوہانہ میرے بھائی سے شادی کرنے والی تھی اس

لیے اب یہ ہماری عزت ہے۔'' حیات نے کہا۔ ''لیکن میں تم سے جھگڑا نہیں چاہتا۔ اس کا رویہ تم نے دیکھ لیا ہے، یہ مر جائے گی۔ کوئی اور راستہ نکالو۔''

سوہانہ کی حرکت نے جینا کو چونکا دیا تھا ورنہ وہ اسے بلف سمجھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ''ایک راستہ ہے... ابھی سوہانہ سے میرا معاہدہ گیارہ مہینے کا باقی ہے۔ اگر یہ مجھے اس عرصے کا ہرجانہ ادا کردے تو میں اسے معاہدے سے آزاد کردوں گی۔''

''کتنا ہرجانہ؟'' سوہانہ بولی۔

''میں بے انصافی نہیں کروں گی۔ گزشتہ سال میں تم نے مجھے پچیس لاکھ کما کر دیے۔ ان میں سے دس تمہارے تھے۔ اس لیے تم پچیس لاکھ دے دو تو میں تمہیں آزاد کردوں گی؟''

''پچیس لاکھ کیوں؟'' سوہانہ بولی۔

''مجھے منظور ہے۔'' حیات نے کہا اور سوہانہ کی طرف دیکھا۔ ''وہ پچیس لاکھ کا چیک اسے لا دو۔''

''میں چیک کا کام نہیں کرتی ہوں۔'' جینا نے کہا۔

''کیش کا چیک ہے۔'' حیات نے کہا۔ ''لیکن تمہیں کچھ عرصے انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی عدالتی حکم کے بغیر اکاؤنٹ سے کچھ نہیں نکالا جاسکتا۔''

سوہانہ نے چیک لا کر دیا۔ جینا نے دیکھا۔ ''شہزاد کے اکاؤنٹ کا ہے؟''

''ہاں، یہاں میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے ورنہ میں تمہیں کیش دے دیتا۔ تم بے شک معاہدہ اپنے پاس رکھو جب چیک کیش ہوجائے تب دے دینا۔''

''تم خاندانی آدمی ہو۔'' جینا نے جواب میں کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''مجھے تم پر اعتبار ہے۔'' وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دو گی؟'' حیات نے کہا۔

''پوچھو۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ سوہانہ یہاں موجود ہے؟''

''ایک فون کال سے اطلاع ملی تھی جو اسی گھر سے کی گئی تھی۔ لیکن یہ نہیں پتا کہ وہ کون تھی۔'' جینا نے کہا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے گرگے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پہلے ان کا رویہ جارحانہ تھا لیکن جب ان کے درمیان مفاہمت ہوگئی تو ان کے ہتھیار بھی واپس لباس میں چلے گئے تھے۔ حیات اس کے جانے کے بعد باہر نکلا۔ رضوان چوکیدار والی کوٹھری میں بند حال پڑا تھا۔ آج اس پر تشدد نہیں ہوا تھا لیکن وہ بہت زیادہ دہشت زدہ تھا۔ جیسے ہی حیات نے اسے آزاد کرایا، اس نے کہا۔ ''صاحب! مجھے تو معافی دو۔ اب میں یہاں ملازمت نہیں کرسکتا۔''

''مرضی تمہاری مگر اب کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تو جا کر اپنی کوٹھری میں آرام کرو۔''

حیات واپس آیا تو سوہانہ خاموش کھڑی تھی۔ جمیلہ اور شکیلہ اسے نفرت سے گھور رہی تھیں۔ حیات کے آتے ہی شکیلہ نے کہا۔ ''بھائی، اسی نے فون کرکے ان لوگوں کو اطلاع دی ہوگی۔''

''فون میں نے نہیں تم نے کیا تھا۔'' سوہانہ سکون سے بولی۔ ''اب اپنے بھائی کو بتاؤ کہ تمہارے پاس جینا ہاؤس کا نمبر کہاں سے آیا؟''

''یہ... یہ بکواس کررہی ہے۔'' شکیلہ ہکلائی۔

''حیات! تو اس کی بکواس سن رہا ہے، اسے باہر نکال۔'' جمیلہ غصے سے بولی۔ ''نہ جانے یہ گند کہاں سے ہمارے گھر میں آگئی۔''

''امی! گند ہمارے گھر میں پہلے سے موجود ہے۔'' حیات نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ ان دونوں کا خیال رکھیں گی لیکن افسوس آپ نے ان پر نظر نہیں رکھی۔ شہزاد اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ اسے سوہانہ کی محبت نے سنبھال لیا اور وہ شراب اور برائی کی دنیا سے نکل آیا لیکن...'' اس نے شکیلہ کو دیکھا۔

''میں... میں نے کچھ...''

''چپ کرو۔'' حیات گرجا۔ ''اگر تم میری بہن ہو تو شہزاد میرا بھائی تھا اور اس کا قاتل کوئی بھی ہو، میں اسے بخشوں گا نہیں۔ کیا تعلق ہے تمہارا منصور سے...؟''

''کوئی تعلق نہیں ہے... بھائی... کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وہ بلبلائی۔

''حیات تو...''

''امی! آپ چپ کر کے دیکھیں۔'' حیات بولا اور سوہانہ کی طرف مڑا۔ ''تم نے وہ لباس کیوں مانگا تھا مجھ سے جو سوٹ کیس سے نکلا تھا؟''

''میں نے ویسا ہی لباس شکیلہ کے پاس دیکھا تھا اور یہ ریڈی میڈ نہیں تھا بلکہ سلوایا گیا تھا۔'' سوہانہ بولی۔ حیات کمرے سے سوٹ کیس لے آیا اور ماں کے سامنے رکھ دیا۔

''اسے پہچانتی ہیں آپ؟ یہ سوٹ کیس اور یہ کپڑے...'' اس نے سوٹ کیس کھول دیا۔ جمیلہ کی پھٹی پھٹی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ اس نے کپڑے شناخت کرلیے تھے۔

''یہ سوٹ کیس شہزاد کی گاڑی سے ملا ہے جس رات اسے قتل کیا گیا۔'' یہ کہتے ہوئے حیات غصے سے بے قابو ہوگیا اور اس نے شکیلہ کے بال پکڑ کر اسے گھما کر صوفے پر پھینک دیا۔ وہ چیخ اٹھی مگر حیات کی دہاڑ اس سے بلند تھی۔ ''بول... تیرے یہ کپڑے وہاں کیسے آئے؟''

شکیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

سوہانہ اور حیات باغ میں ٹہل رہے تھے۔ مارچ کا آغاز تھا اور درختوں پر نئے پتے نمودار ہورہے تھے۔ سردی کا موسم گزر چکا تھا۔ زمین پر خوش رنگ گھاس اور پودے اگ رہے تھے۔ حیات سنجیدہ تھا۔ ''ہمارے معاشرے کو جینا جیسے لوگ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ باہر سے آنے والی دولت کا بے تحاشا استعمال... موبائلز اور انٹرنیٹ جیسی سہولتوں کا غلط استعمال ہے۔''

سوہانہ نے سر ہلایا۔ ''شہزاد کو میں جانتی ہوں اور میرے خیال میں شکیلہ بھی فطرت کی بری نہیں ہے۔ لیکن اسے کوئی چیک کرنے اور سمجھانے والا نہیں تھا۔ اسے آزادی ملی اور وہ بگڑ گئی۔''

''منصور سے اس کا رابطہ موبائل کی مدد سے ہوا اور وہ امی اور شہزاد سے چھپ کر اس سے رابطہ رکھتی تھی۔ لیکن اتنی ہمت نہیں رکھتی تھی کہ اس سے کہیں باہر ملتی۔ اس کے لیے منصور نے یہ ترکیب نکالی کہ اس نے شہزاد سے دوستی کرلی۔ شہزاد اس کی چال سے بے خبر تھا پھر اس نے شہزاد کو مزید غافل کرنے کے لیے اسے شراب اور بعد میں منشیات کی راہ پر لگا دیا۔ اس میں خود شہزاد کا قصور بھی تھا لیکن تم سے مل کر اسے احساس ہوگیا کہ وہ تباہی کے راستے پر چل رہا ہے۔ اس نے شراب اور منشیات ترک کردی۔''

اس دوران میں شہزاد کو شک ہوگیا کہ شکیلہ اور منصور کا آپس میں کوئی رابطہ ہے۔ وہ ان کی کھوج میں لگ گیا۔ جلد حقیقت اس کے سامنے آگئی اور اس نے شکیلہ پر سختی کی اور منصور کو بھی دھمکی دی کہ وہ اس کی بہن سے رابطہ نہیں کرے گا۔ شہزاد اس کی اصلیت جانتا تھا۔ منصور نہ صرف بدکردار تھا بلکہ شراب اور مارفین کا عادی بھی تھا۔ اس کے صرف شکیلہ سے نہیں بلکہ اور بھی کئی دوسری لڑکیوں سے تعلقات تھے۔ اس کا جینا ہاؤس آنا جانا تھا۔ ظاہر ہے، وہ وہاں عیاشی کے لیے جاتا تھا۔ وہ کسی صورت شکیلہ کے لیے مناسب نہیں تھا۔ شہزاد نے یہ سب شکیلہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے سر پر منصور کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شہزاد اسے منصور سے دور کرنے کے لیے یہ سب کہہ رہا ہے۔ شہزاد سے تلخ کلامی کے بعد منصور نے اس سے بدلہ لینے کے لیے شکیلہ کو گھر سے فرار پر اکسانا شروع کردیا۔ شروع میں وہ نہیں مانی تھی لیکن رفتہ رفتہ منصور نے اسے راضی کرلیا۔

طے ہوا کہ اکیس دسمبر کی رات شکیلہ گھر سے نکلے گی اور وہ دونوں پہلے لاہور جائیں گے جہاں وہ شادی کریں گے اور اس کے بعد وہ کراچی چلے جائیں گے جہاں منصور کے بہن بہنوئی رہتے تھے۔ منصور نے شکیلہ کو جھانسا دیا کہ وہ کراچی سے آگے کسی اور ملک چلے جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے آزاد زندگی گزاریں گے۔ شکیلہ اس کی باتوں میں آگئی۔ وہ رات بارہ بجے سے پہلے چپکے سے اپنا سامان لے کر گھر سے نکلی۔ سڑک پر منصور گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا۔ وہ روانہ ہوئے لیکن ان کی اور اصل میں شہزاد کی بدقسمتی کہ ان کا آپس میں آمنا سامنا ہوگیا۔ شہزاد نے گاڑی روک لی اور وہ شکیلہ کو منصور کے ساتھ دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے شکیلہ اور اس کا سامان اپنی جیپ میں رکھا اور پھر منصور کو مارنے کے لیے دوڑا۔ منصور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ جان بچانے کے لیے بھاگا۔ غصے سے بے قابو شہزاد اس کے پیچھے لگا رہا اور پھر جائے وقوعہ پر اس نے اسے جا لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ جیپ میں ہونے کی وجہ سے شہزاد نے جیکٹ اتار دی تھی اور صرف شرٹ میں تھا۔ دست بدست لڑائی کے دوران میں اس کی قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے۔ ایک موقع پر وہ گرا تو منصور نے پاس ہی پڑی بھاری شاخ اٹھائی اور شہزاد کے سر پر دے ماری۔ وار بہت قوت سے اور نازک جگہ تھا۔ شہزاد وہیں گر گیا۔ خوف زدہ منصور شاخ پھینک کر واپس بھاگا۔

اس دوران میں شکیلہ اتنی ڈری کہ جیپ سے اتر کر پیدل ہی شاہ پور کی طرف روانہ ہوگئی۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرکے وہ گھر پہنچی تو جمیلہ بے خبر سو رہی تھی۔ شکیلہ نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا اور منصور سے رابطہ کیا، تب منصور نے اسے بتایا کہ لڑائی کے دوران میں چوٹ لگنے سے شہزاد مر گیا ہے۔ منصور نے کچھ اس طرح بتایا کہ شکیلہ کو اس کی بات کا یقین آگیا۔ اس نے ڈراما کیا اور جمیلہ کو جگا کر بتایا کہ شہزاد اب تک گھر نہیں آیا۔ اسے سوٹ کیس کی فکر تھی جو شہزاد کی جیپ میں رہ گیا تھا لیکن اطمینان کی بات تھی کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کی طرف اشارہ کرتی۔ دوسری طرف منصور نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ کیا کہ فوری کراچی روانہ ہوگیا۔ مظفر آباد سے صبح سویرے چلنے والی ایک کوچ

سے اس نے سفر کیا اور جب وہ کراچی پہنچا تو شہزاد کے قتل کی اطلاع آچکی تھی۔ اس نے گھر والوں کی مدد سے یہ ظاہر کیا کہ وہ دو دن سے کراچی میں تھا۔

اگر شکیلہ گھر سے منصور کو اور جینا ہاؤس کال نہ کرتی تو شاید اس کا بھید نہ کھلتا۔ اصل میں وہ سوہانہ کے بارے میں جانتی تھی اور اسے ڈر تھا کہ کہیں سوہانہ کے توسط سے اس کا پول نہ کھل جائے۔ اس کے دل میں چور تھا کہ شاید شہزاد نے سوہانہ کو اس کے اور منصور کے تعلق کے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے اس نے پہلے ماں کو سوہانہ کے بارے میں بتایا اور پھر جینا ہاؤس کال کر دی۔ جینا ہاؤس کا نمبر منصور نے دیا تھا۔ اس کا مقصد بہر صورت سوہانہ کو یہاں سے چلتا کرنا تھا مگر حیات کی وجہ سے اس کا سوہانہ کو فوری نکالنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی پھر حیات گھر سے نکلا ہوا تھا تو جینا اپنے آدمیوں سمیت پہنچ گئی۔ وہ سوہانہ کو لے جانا چاہتی تھی۔ شکیلہ خوش ہو گئی لیکن صورتِ حال نے کچھ دیر بعد ایسا پلٹا کھایا کہ وہ خود گرفت میں آگئی اور اسے حیات کے سامنے اعتراف کرنا پڑا۔ حیات سے زیادہ جمیلہ کا بُرا حال تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی ہی اس کے بیٹے کی قاتل نکلے گی۔ وہ شکیلہ کو بے تحاشا مارنے لگی اور پھر خود بے ہوش ہو گئی۔

حیات نے اسی وقت ممتاز کو کال کی اور اس سے ملنے کو کہا۔ ممتاز نے اسے پولیس اسٹیشن بلوا لیا جہاں اس سے ساری بات سن کر اس نے منصور کا وارنٹ نکلوایا کیونکہ اسے یقین آگیا تھا کہ منصور ہی قاتل ہے۔ شاخ پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے اور وہ میچ کر جاتے تو پھر کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ منصور کو پولیس نے اس کے گھر سے گرفتار کیا۔ لکڑی پر پائے جانے والے فنگر پرنٹ اسی کے نکلے۔ پھر پولیس نے منصور نے جس کوچ سے سفر کیا، اس سے متعلق بھی معلومات حاصل کر لیں۔ راستے میں جہاں اس نے موبائل پر کال ریسیو کر کے بتایا تھا کہ وہ کراچی میں ہے موبائل کمپنی کی مدد سے وہ لوکیشن بھی نکال لی گئی تھی جو ملتان کے پاس کی تھی۔ پولیس نے اس پر تین سو دو کے تحت مقدمہ بنایا تھا اور ثبوت و گواہیاں اتنے مضبوط تھے کہ اسے کم سے کم عمر قید تو ہوتی۔ منصور کی گرفتاری اور اعتراف جرم کا سن کر شکیلہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور وہ دو ہفتے اسپتال میں داخل رہی لیکن اب اس کی حالت خاصی بہتر تھی۔

حیات نے شکیلہ کو معاف کر دیا تھا۔ وہ بہر حال اس کی بہن تھی۔ اس نے ماں کو بھی راضی کیا کہ وہ شکیلہ کو معاف کر دے۔ ماں کا دل تو ویسے ہی نرم ہوتا ہے۔ حیات چاہتا تھا کہ اب وہ دونوں اس کے ساتھ ہی برطانیہ چلیں۔ ان دنوں وہ ان کے ویزے لگوا رہا تھا۔ حیات خیالوں سے چونکا۔ سوہانہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ اچھا ہوا کہ منصور نے کہیں شکیلہ کا نام نہیں لیا ورنہ وہ بدنام ہو جاتی۔“

”ہاں اس لحاظ سے وہ اچھا ثابت ہوا۔ میں ممتاز کا بھی احسان مند ہوں۔ اس نے ذاتی کوشش کر کے شکیلہ کو اس کیس سے دور رکھا۔“ حیات نے کہا پھر اس نے سوہانہ کی طرف دیکھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ سونا اور رقم تمہیں مل چکی ہے۔“

سوہانہ ہچکچائی۔ ”ارادہ کیا ہے؟ بس اب اکیلے زندگی گزاروں گی۔ کوئی مجھے میرے ماضی سمیت قبول نہیں کرے گا اور میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔“

”میرے ذہن میں ایک تجویز ہے اگر تم غور کرو۔ اسے میری جذباتیت مت سمجھنا، میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور تب تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”کیسی تجویز؟“

”مجھے اور تمہیں، شہزاد سے محبت ہے... کیوں نہ ہم اس محبت کو آپس میں شیئر کر لیں۔“

سوہانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ مجھے پروپوز کر رہے ہیں... میرے بارے میں سب جانتے ہوئے بھی؟“

”ہاں کیونکہ میرا خیال ہے تم ایک اچھی لڑکی ہو اور بہت اچھی بیوی ثابت ہو گی۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے تو وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے جس کا حال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں بھی تمہیں خوش رکھ سکوں گا۔ تم خوش ہو گی تو شہزاد کی روح کو بھی سکون ملے گا۔ وہ تم سے محبت کرتا تھا اور یقیناً تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ ہمارے اس تعلق میں سب کی بہتری ہے۔ ہم انگلینڈ میں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ بولو کیا کہتی ہو؟“

سوہانہ مسکرائی تو اس کی مسکان میں شرم تھی۔ ”میرے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن آنٹی...“

”میں امی سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں اور وہ خوشی سے راضی ہیں۔“ حیات نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو سوہانہ کھل اٹھی۔ اس نے حیات کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں اوپر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔